درسِ ترمذی

شیخ الاسلام
حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
شیخ الحدیث جامعہ دار العلوم کراچی
کی تقریر "جامع ترمذی"

ترتیب وتحقیق
مولانا رشید اشرف سیفی

مکتبہ دار العلوم کراچی

درسِ ترمذی

شیخ الاسلام

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

شیخ الحدیث جامعہ دارالعلوم کراچی

کی تقریر جامع ترمذی

*

ترتیب وتحقیق

مولانا رشید اشرف سیفی

استاذ الحدیث جامعہ دارالعلوم کراچی

مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴

باہتمام : محمد قاسم کلکتی
طبع جدید : شوال ۱۴۳۱ھ ...... ستمبر 2010ء
فون : 5042280 - 5049455
ای میل : mdukhi@gmail.com

مکتبہ دار العلوم احاطہ جامعہ دار العلوم کراچی ﴿ ناشر ﴾

- ادارۃ المعارف احاطہ جامعہ دار العلوم کراچی
- مکتبہ معارف القرآن احاطہ جامعہ دار العلوم کراچی
- ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور
- دار الاشاعت اردو بازار کراچی
- بیت الکتب گلشن اقبال نزد اشرف المدارس کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مرتّب

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ!

صد شکر کہ درسِ ترمذی جلد ثالث تکمیل کے بعد آپ کے سامنے ہے، عزیز طلبہ اور مشتاقانِ علوم حدیث نے اس کے انتظار میں ایک عرصہ تک جو زحمت اٹھائی وہ مخفی نہیں، احقر کو بھی اس کا بخوبی اندازہ ہے، اسبابِ تاخیر اور اعذار کی تفصیل میں جائے بغیر اتنا عرض ہے کہ دار العلوم میں اپنے تعلیمی فرائض کی انجام دہی کے بعد اس ناکارہ کے بیشتر اوقات بالخصوص چھٹی کے ایام "درس ترمذی" ہی کے لئے وقف رہے، بلاشبہ یہی بندہ کی زندگی کے بہترین لمحات تھے،

اس علمی وتحقیقی کام کی مشکلات کم نہ تھیں اپنی بے مائیگی اور کم علمی کی بناء پر اس میں کہیں زیادہ اضافہ ہوا، اور اس کے لئے جس قدر دماغ سوزی اور عرق ریزی ہوئی اور جو محنت وکاوش کرنا پڑی اس کا تصور بھی مشکل ہے،

جلد ثالث میں بھی تحقیقی حواشی کے علاوہ بہت سے ایسے ابواب جن پر حضرت استاذ محترم ادام اللہ بقاءہ نے کوئی کلام نہ فرمایا تھا ضرورت محسوس ہونے پر ان میں سے متعدد ابواب کی مختصر شرح احقر نے کتب شروحِ حدیث کی طرف مراجعت کر کے لکھدی ہے، اس جلد میں ایسے ابواب کی مجموعی تعداد تینتیس ہے، متعدد ابواب میں معتدبہ اضافے اس کے علاوہ ہیں، دونوں طرح کے ابواب کی اپنے اپنے مقام پر نشاندہی بھی کردی گئی ہے،

الحمد للہ حاشیہ میں بھی بہت سی کار آمد ومفید باتیں اور اہم مباحث آگئی ہیں، اس جلد میں سہولت کے لئے حاشیہ کے بھی اہم فوائد ومباحث کی فہرست بنادی ہے۔

راقم الحروف کی تمام تر کوشش وکاوش کے باوجود عین ممکن ہے کہ ضبط و ترتیب یا تحقیق و تعلیق میں غلطیاں رہ گئی ہوں اس لئے اہل علم حضرات سے درخواست ہے کہ ایسی کسی بھی غلطی کا علم ہونے پر حوالہ کے ساتھ مطلع فرماکر احسان فرمائیں۔

آخر میں ان سب حضرات کا ممنون ہوں جنہوں نے اس کام میں کسی بھی درجہ میں مدد کرائی یا مفید مشوروں سے نوازا بالخصوص عزیزم مولانا نور البشر صاحب حفظہ اللہ جو اس کے ایک بڑے حصہ میں معین رہے اور عزیزان مولوی عبد القادر، مولوی عصمت اللہ اور مولوی حفیظ اللہ سلمہم جو ترتیب یا تصحیح کے مختلف مراحل میں مددگار رہے، اللہ تعالےٰ ان سب کو دنیا و آخرت میں اس کا بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے، آمین

جہاں تک صاحبِ امالی استاذ محترم حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہم کی شفقتوں اور علمی و فکری رہنمائی کا تعلق ہے سو احقر تشکر کے رسمی الفاظ سے احسان مندی کے ان جذبات کی توہین کرنا پسند نہیں کرتا جو بندہ کے دل میں ہیں:

توقع سے تیرے لطف و کرم کو بیشتر پایا
میں خود شرما گیا جب اپنا دامن مختصر پایا

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو زیادہ سے زیادہ نافع بناکر شرفِ قبول فرمائے، اور "حضرت استاذ محترم دام اقبالہم" اور اس "ناکارہ مرتب" کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

بندہ

رشید اشرف سیفی

عفا اللہ عنہ

دار العلوم کراچی پاکستان

۲۸، محرم الحرام ۱۴۱۳ھ

انتساب

والدِ بزرگوار پیکرِ محبت و شفقت۔

مجاہدِ ملت حضرت مولانا نور احمد صاحب قدس سرہ

کے نام

جنہوں نے مادہ پرستی اور رنگ و بُو کی اس دنیا میں راقم الحروف سمیت اپنی تمام اولاد کو عصرِ حاضر کی رسمی تعلیم گاہوں کے مقابلہ میں علومِ نبوّت کی درسگاہوں سے وابستہ کیا، حروف و نقوش کی خوشہ چینی کی یہ سعادت انہی کے طفیل حاصل ہوئی

وہ اسلام کے اُن خاموش رضاکاروں میں سے تھے جن کی پوری زندگی نام و نمود اور شہرت کے معروف ذرائع سے دور رہ کر تعلیمی تبلیغی اور سیاسی میدانوں میں کسی نہ کسی جہت سے خدمتِ دین میں صرف ہوئی۔ تحریکِ پاکستان سے لیکر روزِ وفات تک ملک و ملت کے نہ جانے کتنے ہی اہم کاموں میں انہوں نے بھرپور اور مؤثر حصہ لیا، لیکن اس طرح کہ جب ان کاموں کی تاریخ مرتب کی جائے تو شاید ان کا نام نہ آئے یا آئے مگر مختصر اور سرسری انداز میں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

رشید اشرف سیفی

خلاصۃ الفہارس

فہرست ابواب ومضامین درسِ ترمذی" جلد ثالث

ابواب ومضامین	صفحہ

ابواب ومضامین	صفحہ

ابواب ومضامین	صفحہ

ابواب ومضامین	صفحہ

ابواب ومضامین	صفحہ

صفحہ	ابواب ومضامین

ابواب ومضامین	صفحہ
ایک اہم مسئلہ (زم زم سے وضو اور غسل کا حکم)	۲۵۳

أبواب الجنائز
عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ابواب ومضامین	صفحہ

ابواب ومضامین	صفحہ

ابواب ومضامین	صفحہ

ابواب ومضامین	صفحہ

ابواب ومضامین	صفحہ

ابواب ومضامین	صفحہ
قولہ: وأمّا معاویة فصعلوك	۴۲۲
باب ماجاء فی العزل	۴۲۳
عزل کے جواز و عدمِ جواز سے متعلقہ روایات میں تعارض اور تطبیق	۴۲۳
ضبطِ ولادت یا خاندانی منصوبہ بندی	۴۲۴
باب ماجاء فی القسمة للبكر والثيب	۴۲۶
ایک اشکال اور اس کے جوابات	۴۲۷
باب ماجاء فی الزوجین المشرکین یسلم أحدهما	۴۲۹
احد الزوجین کے اسلام لانے کی صورت میں فسخِ نکاح کا سبب کیا ہے؟	۴۲۹
حضرت زینبؓ، حضرت ابوالعاصؓ کے پاس کتنے عرصے بعد لوٹائی گئیں؟ روایات میں تعارض اور تطبیق	۴۳۰
حضرت زینبؓ نکاحِ اول کے ساتھ لوٹائی گئیں یا نکاحِ جدید کے ساتھ، روایات میں تعارض اور رفعِ تعارض	۴۳۱
باب ماجاء فی الرجل یتزوج المرأة فیموت عنها قبل أن یفرض لها	۴۳۴
ابوابُ الرضاع	۴۳۶
باب ماجاء یحرم من الرضاع مایحرم من النسب	۴۳۶
ایک سوال اور اس کا جواب	۴۳۶
ایک اور اشکال اور اس کا جواب	۴۳۶
باب ماجاء فی لبن الفحل	۴۳۹
"لبن الفحل" ایک فقہی اصطلاح اور اس کا مفہوم	۴۳۹
اُب رضاعی کے واسطے سے رشتوں کی حرمت میں صدرِ اول ہی اختلاف تھا	۴۳۹
باب ماجاء لاتحرم المصة ولا المصتان	۴۴۰
رضاعت کی کتنی مقدار محرِّم ہے؟ اختلافِ فقہاء	۴۴۱
رضاعت کی کم سے کم مقدار کے بھی محرِّم ہونے کے حق میں دلائلِ جمہور	۴۴۲
حدیثِ باب کا جواب	۴۴۳
باب ماجاء فی شهادة المرأة الواحدة فی الرضاع	۴۴۵

ابواب ومضامین	صفحہ
باب ماجاء ماذکر أن الرضاعة لاتحرّم إلافی الصغردون الحولین	۴۴۶
مدتِ رضاعت سے متعلق اقوالِ فقہاء	۴۴۷
باب ماجاء فی الأمة تعتق ولہا زوج	۴۵۰
آزاد ہوجانے کی صورت میں باندی کے لئے خیارِ عتق محض شوہر کے غلام ہونے کی صورت میں ہے یا آزاد ہونے کی صورت میں بھی ؟	۴۵۰
حضرت بریرہؓ کی آزادی کے وقت ان کے شوہر غلام تھے یا آزاد ؟	۴۵۱
روایات میں تعارض	۴۵۱
رفع تعارض کے لئے ترجیح کا طریقہ	۴۵۱
تطبیق کا طریقہ	۴۵۲
باب ماجاء ان الولد للفراش	۴۵۳
حدیث "الولد للفراش وللعاہر الحجر" متواتر ہے	۴۵۳
اس روایت میں "حجر" سے کیا مراد ہے ؟	۴۵۵
فراش کی تین قسمیں اوران کے احکام	۴۵۵
میاں بیوی عرصے سے نہایت دور ہوں اور ملاقات ثابت نہ ہو تو بھی احناف کے نزدیک نسب ثابت ہوجاتا ہے	۴۵۵
مذکورہ مسئلہ میں احناف پر اعتراض کا علمی جائزہ	۴۵۵
باب ماجاء فی کراھیة أن تسافر المرأة وحدھا	۴۵۷
سفرِ حج کے لئے شوہر یا محرم نہ ہونے کی صورت میں وجوبِ حج ہوجائیگا یا نہیں	۴۵۷
ابواب الطلاق واللعان	۴۵۹
عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	
طلاق کے لغوی واصطلاحی معنی	۴۵۹
طلاق دینِ یہود میں	۴۵۹
طلاق دینِ نصاریٰ میں	۴۵۹

ابواب و مضامین	صفحہ
طلاق دینِ ہنود میں	۴۶۰
طلاق دینِ اسلام میں	۴۶۱
بابُ مَاجَاءَ فی طلاقِ السُّنّۃ	۴۶۳
طلاق "سنّت" اور طلاق "احسن" کا مفہوم	۴۶۳
طلاقِ سنّت پر "سنّت" کا اطلاق کس حیثیت سے ہے؟	۴۶۳
طلاق ابن عمرؓ فی الحیض	۴۶۴
حیض میں طلاق دینے کی صورت میں رجوع کا حکم	۴۶۴
"فَمَہْ" کی تحقیق	۴۶۴
قولہ: "أرأیت إن عجز واستحمق"	۴۶۵
حیض میں طلاق دینے کے بعد مزید طلاق حیض سے متصل طہر کے بجائے اس سے اگلے طہر میں دیجائے	۴۶۵
حکم وقوع الطلاق فی الحیض والاختلاف فیہ	۴۶۶
باب ما جاء فی الرجل یطلّق امرأتہ البتّۃ	۴۶۷
بحث الطلقات الثلاث	۴۶۸
کیا ایک ساتھ تین طلاقیں دینا جائز ہے؟	۴۶۸
طلقات ثلاث کے وقوع کا حکم	۴۷۰
اس بارے میں تین مذاہب	۴۷۰
عائلی قوانین میں ایک سنگین غلطی	۴۷۱
طلقات ثلاث کے وقوع کے بارے میں جمہور کے دلائل	۴۷۱
فریقِ مخالف کے دلائل اور ان کے جوابات	۴۷۵
حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت اور اس کے جوابات	۴۷۵
حضرت رکانہؓ کے واقعہ سے استدلال اور اس کے جوابات	۴۷۷
تین طلاقوں سے متعلق بعض غیر اسلامی قوانین کا نامعقول عذر اور اس کا حل	۴۸۰
بیک وقت دی جانے والی تین طلاقوں کو قابلِ تعزیر جرم قرار دیا جاسکتا ہے	۴۸۰

ابواب ومضامین	صفحہ

ابواب ومضامین	صفحہ
باب ماجاء فی مداراۃ النساء	۵۰۱
عورت کی پسلی کے ساتھ تشبیہ میں ایک نکتہ	۵۰۱
باب ماجاء فی الرجل یسألہ ابوہ أن یطلق زوجتہ	۵۰۲
کن چیزوں میں والدین کی اطاعت ضروری ہے اور کن میں نہیں ؟	۵۰۳
والدین کے مطالبہ پر بیوی کو طلاق دینے کا حکم	۵۰۴
باب ماجاء فی طلاق المعتوہ	۵۰۶
سکران کی طلاق واقع ہونے سے متعلق ایک اشکال اور اس کا جواب	۵۰۷
باب (بلا ترجمہ)	۵۰۸
حضرت عائشہ کے قول "فاستأنف الناس الطلاق مستقبلاً من کان طلق ومن لم یکن طلق" کا مطلب	۵۰۹
زمانۂ جاہلیت کے تصرفات ہدر ہیں	۵۰۹
باب ماجاء فی الحامل المتوفی عنها زوجها تضع	۵۰۹
متوفی عنہا زوجہا غیر حاملہ اور حاملہ غیر متوفی عنہا زوجہا کی عدت	۵۱۰
حاملہ متوفی عنہا زوجہا کی عدت کے بارے میں بظاہر آیات میں تعارض، اختلافِ فقہاء اور رفعِ تعارض	۵۱۰
" أبعد الأجلین " کے قول کی دو وجہیں	۵۱۱
باب ماجاء فی عدۃ المتوفی عنها زوجها	۵۱۱
عورتوں کے بناؤ سنگھار اور زیب وزینت کا جواز اور اس کی شرائط	۵۱۲
"مسألۃ الحداد" یعنی سوگ کا حکم	۵۱۳
سوگ کس زوجہ پر واجب ہے اور کس پر نہیں، اختلافِ فقہاء	۵۱۳
حدیثِ باب سے وجوب احداد پر کیسے استدلال ممکن ہے ؟ اشکال اور جواب	۵۱۴
کیا مطلقہ رجعیہ سوگ منائے گی ؟	۵۱۵
مطلقہ بائنہ یا مغلظہ کے حق میں سوگ کی حیثیت ، اختلافِ فقہاء	۵۱۵
حالتِ عذر میں معتدہ کے لئے سرمہ وغیرہ لگانے کا حکم	۵۱۶
قولہ : وقد کانت إحداکن فی الجاهلیة ترمی بالبعرۃ علی رأس الحول	۵۱۷
باب ماجاء فی کفارۃ الظهار	۵۱۷

تمت بالخیر

حاشیۂ درسِ ترمذی جلد ثالث کے اہم فوائد و مباحث کی فہرست

فوائد ومباحث	صفحہ

اَبْوَابُ الجَنَائِز ۲۵۵
عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم

فوائد و مباحث	صفحہ

فوائد و مباحث	صفحہ

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابوابُ الحجّ[1]

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حج کے لغوی و اصطلاحی معنی | حج کے لغوی معنی قصد و زیارت کے ہیں[2]۔ اور اصطلاحِ شرع میں "زیارۃ مکان مخصوص فی زمان مخصوص بفعل مخصوص" کو کہا جاتا ہے[3]۔

حج کس سن میں فرض ہوا؟ | حج کی فرضیت کے بارے میں متعدد اقوال ہیں[4]۔ جمہور کے نزدیک راجح یہ

---

[1] وهو بالفتح والكسر لغتان وبهما قرئ في التنزيل في السبعة ، وقال الطبري : الكسر لنجد والفتح لغيرهم۔ وفي "امالي الهجري" اكثر العرب يكسرون الحاء وعن الحسين الجعفي : إن الفتح الاسم ، والكسر المصدر وعن غيره عكسه۔ كذا في معارف السنن (ج ٦ ص ٢٣٧) ۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ ۔

[2] اصل الحج في اللغة : القصد ، وقال الخليل : كثرة القصد إلى معظم ، وفي الشرع : القصد إلى البيت الحرام بأعمال مخصوصة ۔ فتح الباري (ج ۳ ص ۲۹۹) كتاب الحج ، باب وجوب الحج وفضله ۔ ۱۲ مرتب عفی عنہ

[3] كما في كنز الدقائق (ص ۷۲) كتاب الحج ۔ علامہ ابن نجیمؒ مذکورہ تعریف کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں : والمراد بالزيارة الطواف والوقوف ، والمراد بالمكان المخصوص : البيت الشريف والجبل المسمى بعرفات ، والمراد بالزمان المخصوص : في الطواف : من طلوع الفجر يوم النحر إلى آخر العمر ، وفي الوقوف : زوال الشمس يوم عرفة إلى طلوع الفجر يوم النحر" البحر الرائق (ج ۲ ص ۳۰۷) ۱۲ مرتب

[4] قال العيني : ذكر القرطبي أن الحج فرض سنة خمس من الهجرة ، وقيل : سنة تسع ، قال : وهو الصحيح ، وذكر البيهقي أنه كان سنة ست ، وفي حديث ضمام بن ثعلبة ذكر الحج ، وذكر محمد بن حبيب ان قدومه كان سنة خمس من الهجرة ، وقال الطرطوشي : وقد روى أن قدومه على النبي صلى اللہ عليه وسلم كان في سنة تسع ، و ذكر الماوردي أنه فرض سنة ثمان ، وقال إمام الحرمين : سنة تسع أو عشر ، وقيل سنة سبع ، وقيل : كان قبل الهجرة وهو شاذ ۔ عمدة القاري (ج ۹ ص ۱۲۲) كتاب الحج ، قبيل باب وجوب الحج وفضله ۱۲ رشید اشرف

میں فرض ہوا۔[1]

فرضیتِ حج علی الفور ہے یا علی التراخی؟ اس میں اختلاف ہے کہ فرضیتِ حج علی الفور[2] ہے یا علی التراخی؟ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام ابو یوسفؒ اور بعض دوسرے فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ حج کی فرضیت علی الفور ہے، جبکہ امام محمدؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک اس کی فرضیت علی التراخی ہے۔ امام ابوحنیفہ کی بھی ایک روایت اسی کے مطابق ہے۔ اگرچہ ان کی اصح روایت پہلی ہی ہے۔ امام احمدؒ سے ایک روایت فرضیت علی الفور کی ہے دوسری علی التراخی کی۔[3] ثمرۂ اختلاف حق اثم میں ظاہر ہوگا، نہ حقِ قضاء و اداء میں۔[4]

پھر جن فقہاء نے وجوب علی الفور کا قول کیا ہے ان کے نزدیک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاخیر ایک عذر پر مبنی تھی کہ زمانۂ جاہلیت سے کفارِ عرب میں نسئ[5] کا رواج تھا، چونکہ سنہ ۱۰ھ میں ذی الحجہ اپنے صحیح مقام پر آرہا تھا اور اُس حساب

---

[1] قال الحافظ: ثم اختلف فی سنته فالجمهور علی أنها سنة ست لأنها نزل فیها قوله تعالیٰ "وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ" وهذا ینبنی علی أن المراد بالإتمام ابتداء الفرض، ویؤیده قراءة علقمة ومسروق وابراهیم النخعی بلفظ "وَأَقِیمُوا" أخرجه الطبری بأسانید صحیحة عنهم، وقیل المراد بالإتمام الإکمال بعد الشروع، وهذا یقتضی تقدم فرضه قبل ذلك، وقد وقع فی قصة ضمام ذکر الأمر بالحج، وکان قدومه علی ما ذکر الواقدی سنة خمس وهذا یدل ـ ان ثبت ـ علی تقدمه علی سنة خمس أو وقوعه فیها۔ کذا فی فتح الباری (ج ۳ ص ۳۰۰) باب وجوب الحج وفضله ـ حج کی فرضیت اور ضمام بن ثعلبہؓ کی مدینہ آمد سے متعلق کچھ کلام درسِ ترمذی (ج ۲ ص ۴۰۴) باب ماجاء إذا أدیت الزکوٰة فقد قضیت ما علیك کے تحت بھی گزر چکا ہے ۱۲ مرتب

[2] والمراد من الفور أن یلزمه المأمور به فی أول أوقات الإمکان، فمعنی وجوب الحج علی الفور تعین العام الأول عند استجماع شرائط الوجوب ـ کذا فی البنایة شرح الهدایة للعینی (ج ۳ ص ۴۲۸) بتغیر من المرتب ۱۲

[3] هذا ملخص ما فی "المجموع" و "قواعد ابن رشد" وشرح "الفتح" ـ کذا فی معارف السنن (ج ۶ ص ۲۳۸) ۱۲ مرتب

[4] قال الزیلعی فی التبیین (ج ۲ ص ۳، کتاب الحج) وثمرة الخلاف تظهر فی حق المأثم حتی یفسق وترد شهادته عند من یقول، هو علی الفور، ولو حج فی آخر عمره لیس علیه الإثم بالإجماع، ولو مات ولم یحج أثم بالإجماع اهـ مرتب

[5] لفظ "نسئ" مصدر ہے، جس کے معنی ہیں "مؤخر کرنا" عام مفسرین کے قول کے مطابق اس کی تفسیر یہ ہے کہ اہلِ عرب کو جب "اشہرِ حُرم" میں سے کسی مہینہ میں جنگ کرنے کی ضرورت پیش آتی تو خود ہی یہ فیصلہ کر لیتے کہ اس سال یہ مہینہ اپنی اصل جگہ نہیں ہے بلکہ فلاں مہینہ کی جگہ ہے، مثلاً اگر انہیں محرم میں جنگ کرنے کی ضرورت پیش آتی تو یہ فیصلہ کر لیتے کہ اس سال صفر محرم کی جگہ پر ہے اور محرم صفر کے موقع پر آئیگا، اسی کو "نسئ" کہا جاتا ہے۔

اس تفسیر کے مطابق "نسئ" کی صورت میں کسی مہینہ کی زیادتی لازم نہیں آتی۔

لیکن امام رازی کے نزدیک "نسئ" کی تفسیر یہ ہے کہ اہلِ عرب ہر تیسرے سال ایک مہینہ کا اضافہ کر دیتے تھے تاکہ ذی الحجہ کا مہینہ اور حج کا موسم ان کی خواہش کے مطابق شمسی سال کے مخصوص مہینہ اور مخصوص موسم میں آئے، اس سے ایک تو یہ خرابی لازم آتی کہ ←

کے مطابق تھا جو باری تعالیٰ کے ہاں معتبر ہے، اس لئے آپ نے تاخیر فرمائی اور سنہ ۱۰ھ کا انتظار کیا، اسی کی طرف آپ نے "الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السماوات والارض"[۱] سے اشارہ فرمایا۔[۲]

حج کی شرائط حج کی چند شرائط ہیں، اور یہ شرائط مجموعی اعتبار سے دو قسموں پر ہیں[۳]، ایک شرطِ وجوب[۴]، دوسرے شرطِ ادا[۵]، شرطِ وجوب کے فقدان سے وجوب فی الذمہ نہیں ہوتا[۶]۔ چنانچہ موت کے وقت وصیتِ حج بھی واجب نہیں ہوتی اور شرطِ ادا کے فقدان سے وجوب فی الذمہ باقی رہتا ہے[۷]۔ اور عدمِ ادا کی صورت میں وصیتِ حج بھی واجب ہوتی ہے۔ واللہ أعلم۔

باب ما جاء فی حرمة مکة

عن أبی شریح[۸] العدوی أنه قال لعمرو بن سعید - وهو یبعث البعوث إلی مکة -:

ہر تیسرا سال تیرہ[۱۳] مہینے کا ہو جاتا، دوسرے یہ کہ "شہر حرام" کی حرمت مؤخر ہو کر دوسرے مہینہ کی طرف منتقل ہو جاتی جو فی الواقع "شہر حرام" نہ ہوتا۔ واللہ اعلم قاموس القرآن (ص ۶۰۲) بتغییر من المرتب ۱۲

[۱] صحیح بخاری (ج ۲ ص ۶۳۲) کتاب المغازی، باب حجۃ الوداع ۱۲ م

[۲] قال ابن قدامة: "فأما النبی صلی اللہ علیه وسلم فانما فتح مکة سنة ثمان وانما أخره سنة تسع فیحتمل أنه کان له عذر من عدم الاستطاعة، أو کره رؤیة المشرکین عراة حول البیت، فأخر الحج حتی بعث أبابکر ینادی "أن لا یحج بعد العام مشرك ولا یطوف بالبیت عریان" ویحتمل أنه أخره بأمر اللہ تعالی لتکون حجة الوداع فی السنة التی استدار فیها الزمان کهیئته یوم خلق اللہ السموات والأرض، ویصادف وقفة الجمعة، ویکمل اللہ دینه"۔ المغنی (ج ۳ ص ۲۴۲) تحت مسألة: فمن فرط فیه حتی توفی أخرج عنه من جمیع ماله حجة وعمرة ۱۲ مرتب

[۳] کما بین الشیخ ابن الهمام فی فتح القدیر (ج ۲ ص ۱۲۰) کتاب الحج ۱۲ م

[۴] جیسے اسلام، بلوغ، عقل اور حریت ۱۲ م

[۵] جیسے احرام، مکان مخصوص وغیرہ ۱۲ م

[۶] حتی لو ملك ما به الاستطاعة حال کفره ثم أسلم بعد ما افتقر لا یجب علیه شیء بتلك الاستطاعة بخلاف ما لو ملکه مسلماً فلم یحج حتی افتقر حیث یتقرر الحج فی ذمته دیناً علیه۔ فتح القدیر (ج ۲ ص ۱۲۰) کتاب الحج ۱۲ مرتب

[۷] چنانچہ دوسری شرائط کی موجودگی میں احرام کی شرط کے بغیر بھی وجوب فی الذمہ ہو جاتا ہے ۱۲ م

[۸] أخرج هذا الحدیث البخاری فی صحیحه (ج ۱ ص ۲۱) کتاب العلم، باب لیبلغ العلم الشاهد الغائب۔ ومسلم (ج ۱ ص ۴۳۸) باب تحریم مکة الخ ۱۲ مرتب۔

ائذن لی أیها الأمیر! أحدثك قولاً قام به رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الغد من یوم الفتح سمعته أذنای ووعاه قلبی وأبصرته عینای حین تکلم به" عمرو بن سعید بن العاص مدینہ طیبہ میں یزید کا گورنر تھا، چونکہ حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت مکہ مکرمہ میں قائم ہوچکی تھی، اس لئے انہوں نے یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کردیا تھا، یزید نے ان کے مقابلہ کے لئے فوج روانہ کی تھی اسی سلسلہ میں عمرو بن سعید والی مدینہ کو لکھا تھا کہ وہ وہاں سے بھی کچھ فوجیں مکہ مکرمہ روانہ کرے، عمرو بن سعید اسی حکم کی تعمیل میں فوجیں بھیج رہا تھا[1] یہ اسی وقت کا واقعہ ہے۔"

"أنه حمد اللہ وأثنی علیه ثم قال: إن مکة حرمها اللہ[2] ولم یحرمها الناس، ولا یحل لامریٔ یؤمن باللہ والیوم الآخر أن یسفك بها دماً أو یعضد بها شجرة" حرم مکہ کی نباتات تین قسم کی ہیں، ایک وہ جو کسی شخص نے اپنی محنت سے اُگائی ہوں، اُن کو کاٹنا یا اکھیڑنا بالاتفاق جائز ہے، دوسری وہ کہ ان کو کسی نے اُگایا تو نہ ہو لیکن وہ ان ہی نباتات کی جنس سے ہوں جنہیں لوگ عام طور سے اُگاتے ہیں، اس دوسری قسم کی نباتات کو بھی کاٹنا اور اکھیڑنا جائز ہے، تیسری خودرو گھاس وغیرہ اس میں سے صرف اِذخر[3] کو کاٹنا اور اکھیڑنا جائز ہے، نیز خودرو پودوں میں سے اگر کوئی پودا مرجھا گیا ہو، یا جل گیا ہو یا ٹوٹ گیا ہو تو اس کو کاٹنا بھی جائز ہے

حاصل یہ کہ أو یعضد بها شجرة میں شجرہ سے مراد وہ گھاس اور پودے وغیرہ ہیں جو خود اُگے ہوں۔ ما ینبته الناس کی جنس میں سے بھی نہ ہوں، ٹوٹے ہوئے، جلے ہوئے اور مرجھائے ہوئے بھی نہ ہوں، نیز اذخر

---

[1] معارف السنن (ج ۶ ص ۲۴۱) ۱۲ م

[2] قال الحجازیون۔ مالك والشافعی وأحمد وإسحق وغیرهم۔ إن للمدینة حرماً مثل حرم مکة، فلا یجوز قطع شجرها ولا أخذ صیدها، ثم عند ابن أبی ذئب فیه جزاء مثل ما بمکة، وعند الشافعی فی القدیم: الجزاء أخذ السلب، وعند الآخرین لا یجب الجزاء ولا یحل أخذ السلب، وقال الثوری وعبداللہ بن المبارك وأبو حنیفة وأبو یوسف ومحمد: لیس للمدینة حرم کما کان لمکة فلا یحرم أخذ صیدها وقطع شجرها إلا أنه یکره کما قال القاری فی المرقاة۔ قال فی الکافی: لأن حل الاصطیاد عرف بالنصوص القاطعة فلا یحرم إلا بقاطع کذلك ولم یوجد، وأما تحریم مکة فنصوص الکتاب فیه صریحة۔ وراجع للتفصیل فتح الملهم (ج ۳ ص ۳۹۸) باب فضل المدینة، والمعارف للبنوریؒ (ج ۶ ص ۲۳۰ وص ۲۳۱) ۱۲ مرتب عفی عنہ

[3] ایک قسم کی خوشبودار گھاس، واحد: "إذخرة" ج: أذاخر ۱۲ م

بھی نہ ہوں۔ ایسے پودوں اور گھاس وغیرہ کا کاٹنا جائز نہیں اور کاٹنے کی صورت میں جزاء واجب ہے[۱]۔

فان أحد ترخص بقتال رسول الله صلى الله عليه وسلم فيها، فقولوا له: إن الله أذن لرسوله صلى الله عليه وسلم ولم يأذن لك، وإنما أذنت لي فيها ساعة من النهار، وقد عادت حرمتها اليوم كحرمتها بالأمس فليبلغ الشاهد الغائب۔ ساعة من النهار سے طلوعِ شمس سے لیکر عصر تک کا وقت مراد ہے جس میں مسلمانوں کو حرمِ مکہ میں قتال کی اجازت دی گئی تھی اور خونریزی کی حرمت اٹھالی گئی تھی، اس کے بعد اس پر اجماع ہے کہ وہ حرمت دوبارہ لوٹ آئی ہے اور کسی کے لئے وہاں خونریزی کرنا جائز نہیں ہے، حدیثِ باب میں "وقد عادت حرمتها اليوم" کا جملہ بھی اس پر دلالت کر رہا ہے۔

إن الحرم لا يعيذ عاصيا ولا فارا بدم ولا فارا بخربة[۲] اگر کوئی شخص کوئی جنایت کرکے حرم میں پناہ لے لے تو اگر اس کی جنایت ما دون النفس ہو تو بالاتفاق اس کا قصاص حرم میں لیا جاسکتا ہے[۳]۔ اور اگر جنایت قتل کی ہو تو یہ دیکھا جائے گا کہ اس نے جنایت کس جگہ کی ہے؟ اگر جنایت حرم میں کی ہے تو بھی اتفاق ہے کہ اس سے حرم ہی میں قصاص لیا جاسکتا ہے اور اگر حرم سے باہر کی ہے تو امام شافعیؒ اور امام مالکؒ اس کے بارے میں بھی جوازِ قتل کے قائل ہیں لیکن امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک اس سے حرم میں قصاص نہیں لیا جائے گا بلکہ اس کا کھانا پینا بند کردیا جائے گا یہاں تک کہ وہ حرم سے باہر نکل آئے پھر اس سے قصاص لیا جائیگا[۴]۔

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۲۳۹ و ۲۴۰) ۱۲ م

[۲] الخربة: بفتح المعجمة وسكون الراء يعني "الجناية" كما بيّن الترمذي وتبعت تفسيرها بالمرقة "في رواية المستملي۔ معارف السنن (ج ۶ ص ۲۴۲) امام ترمذی فرماتے ہیں: ويروى "بخزية" اس صورت میں مطلب یہ ہوگا" ولا فارا بجريمة يُستحيي منها" كما في "مجمع البحار" (ج ۲ ص ۳۶) ۱۲ مرتب

[۳] فان الأطراف جارية مجرى الأموال، فيقتص منه بخلاف الحدود، وذلك كمن سرق ثم التجأ إلى الحرم۔ كذا في المعارف" (ج ۶ ص ۲۴۰) ۱۲ مرتب

[۴] فتح الملهم (ج ۳ ص ۳۸۸) باب تحريم مكة وتحريم صيدها الخ أقوال العلماء فيمن جنى في غير الحرم ثم التجأ إليه ومعارف السنن (ج ۶ ص ۲۴۱) وفيه: ونقل ابن حزم عن جماعة من الصحابة المنع (أي منع القصاص) ثم قال: ولا مخالف لهم من الصحابة، ثم نقل عن جماعة من التابعين موافقتهم، ثم شنع على مالك والشافعي فقال: وقد خالفا في هذا هؤلاء الصحابة والكتاب والسنة، حكاه في العمدة (ج ۱۰ ص ۱۸۵) وراجعها لمزيد البيان۔ ۱۲ مرتب

حدیثِ باب مسلکِ احناف کی تائید کرتی ہے، جبکہ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ اس جملہ سے استدلال کرتے ہیں "إن الحرم لا یعیذ عاصیاً ولا فارّاً بدمٍ الخ"

احناف اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی حدیث نہیں، بلکہ عمرو بن سعید کا قول ہے جو صحابی نہیں[1] بلکہ یزید کا گورنر تھا اور اس کی شہرت بھی اچھی نہیں تھی[2]۔ اس کے مقابلے میں حضرت ابو شریحؓ بدرجہا بہتر و برتر ہیں کہ صحابی بھی ہیں اور فقیہ بھی۔

پھر خود شافعیہ کے مسلک کے مطابق بھی عمرو بن سعید کا یہ جملہ "کلمۃ حقٍّ أرید بہا الباطل" کی قبیل سے ہے کیونکہ حضرت عبد اللہ بن الزبیرؓ نہ "عاصی" تھے، نہ "فار بالدم" اور نہ "فار بخربۃ" بلکہ وہ خلیفۂ برحق تھے کیونکہ مکہ مکرمہ میں مسلمان ان کے ہاتھوں پہلے ہی بیعت کر چکے تھے[4]۔ واللہ اعلم

باب ما جاء فی ثواب الحج والعمرۃ

عن عبد اللہ (بن مسعود) قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: تابعوا بین الحج والعمرۃ فإنہما ینفیان الفقر والذنوب کما ینفی الکیر[6] خبث[7] الحدید والذہب[5]

[1] حافظ ابن حجر تقریب التہذیب (ج ۲ ص ۷۲ - رقم ۵۸۹) میں لکھتے ہیں: عمرو بن سعید بن العاص بن سعید بن العاص بن أمیۃ القرشی الأموی المعروف بـ"الأشدق" تابعی، ولی إمرۃ المدینۃ لمعاویۃ ولابنہ، قتلہ عبد الملک بن مروان سنۃ سبعین، وہم من زعم أن لہ صحبۃ، وإنما لأبیہ رؤیۃ، وکان مسرفاً علی نفسہ، من الثالثۃ، ولیست لہ فی مسلم روایۃ إلا فی حدیث واحد۔ (أخرج حدیثہ م (مسلم) مد (أبو داود فی المراسیل) ت (الترمذی) س (النسائی) ق (ابن ماجہ) ۱۲ مرتب

[2] چنانچہ ان کو "لطیم الشیطان" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، ابن حزم کہتے ہیں "ولا کرامۃ للطیم الشیطان أن یکون أعلم من صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" فتح الملہم (ج ۳ ص ۳۱۲) ۱۲ مرتب

[3] ان کے ترجمے کے لئے دیکھئے تقریب التہذیب (ج ۲ ص ۴۲۴) باب الکنی، حرف الشین المعجمۃ (رقم ۳) ۱۲ م

[4] معارف السنن (ج ۶ ص ۲۴۲) ۱۲ م

[5] الحدیث أخرجہ النسائی (ج ۲ ص ۳) کتاب مناسک الحج، فضل المتابعۃ بین الحج والعمرۃ ۱۲ م

[6] الکیر - بالکسر - الزق (دھونکنی) الذی ینفخ فیہ، وأما الموضع فیہ، وأما الموضع الذی یوقد فیہ الفحم (کوئلہ) من حانوت الحداد والصائغ فہو "الکور" - بضم الکاف - وقیل: بالعکس، وقیل لا فرق بینہما، والقول الأول قول صاحب "المحکم" وأکثر أہل اللغۃ علی أن الکیر حانوت الحداد والصائغ - وہذہ الأقوال کلہا ذکرہا البدر العینی فی "العمدۃ" (۵ - ص ۱۴۲) والحافظ فی "الفتح" (۴-۷۶) کذا فی المعارف (ج ۶ ص ۲۴۵) ۱۲ مرتب عفا اللہ

[7] الخبث - بفتح الخاء المعجمۃ والباء الموحدۃ - من الحدید ونحوہ: لوہے وغیرہ کا میل ۱۲ م

والفضّة"۔ حج سے صرف صغائر معاف ہوتے ہیں یا کبائر بھی؟ اس بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں "البحر الرائق" میں مفصل بحث کی ہے[1] اور ان کا میلان اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ حج سے کبائر بھی معاف ہوجاتے ہیں[2]۔ اکثر علماء کے نزدیک بھی یہی راجح ہے۔ حدیثِ باب اور "من حجّ للّٰہ[3] فلم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدتہ أمّہ" کی معروف حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے[4]۔

---

[1] دیکھئے (ج ۲ ص ۳۳۸ و ص ۳۳۹) باب الاحرام تحت شرح قول صاحب الکنز: "حامداً مکبّراً مهلّلاً ملبّیاً مصلّیاً داعیاً" ۱۲ مرتب

[2] کما قال الشیخ البنوری: و إلی التکفیر یظهر جنوحه، معارف السنن (ج ۶ ص ۲۴۵) لیکن علامہ ابن نجیم یہ بھی فرماتے ہیں "إن المسألة ظنّیة وإن الحجّ لا یقطع فیه بتکفیر الکبائر من حقوق اللّٰہ تعالیٰ فضلاً عن حقوق العباد۔ وإن قلنا بالتکفیر للکلّ فلیس معناه کما یتوهمه کثیر من الناس أن الدّین یسقط عنه وکذا قضاء الصلوات والصیامات والزکوٰة، إذ لم یقل أحد بذلك، وإنما المراد أن إثم مطل الدین وتاخیره یسقط، ثم بعد الوقوف بعرفة إذا مطل صار آثماً الآن الخ (ج ۲ ص ۳۳۸ و ۳۳۹) ۱۲ مرتب

[3] صحیح بخاری (ج ۱ ص ۲۰۶) کتاب المناسك، باب فضل الحج المبرور بروایة أبی هریرة ۱۲ م

[4] چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس کے تحت لکھتے ہیں: "ظاهره غفران الصغائر والکبائر والتبعات" (فتح الباری ص ۳۰۳ ج ۳، باب فضل الحج المبرور۔

نیز اور بھی متعدد احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے:

(۱) "إن الاسلام یهدم ما کان قبلهٗ وان الهجرة تهدم ما کان قبلها وإن الحج یهدم ما کان قبله" فی روایة ابن شماسة المهری۔ صحیح مسلم (ج ۱ ص ۷۶) کتاب الایمان، باب کون الإسلام یهدم ما قبلهٗ وکذا الحج والهجرة

(۲) عن طلحة بن عبید اللّٰه بن کریز أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال: ما رُأی الشیطان یوماً هو فیه أصغر ولا أدحر (بہت دھتکارا ہوا) ولا أحقر ولا أغیظ منه فی یوم عرفة، وما ذاك إلا لما رأی من تنزل الرحمة وتجاوز اللّٰه عن الذنوب العظام إلا ما رأی یوم بدر الخ.....

مؤطا امام مالك (ص ۳۵۶ و ۳۵۷) کتاب الحج، باب جامع الحج۔

(۳) حدثنا عبد اللّٰه بن کنانة بن عباس بن مرداس السّلمی أن أباه أخبره عن أبیه أن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم دعا لأمته عشیّة عرفة بالمغفرة فأجیب: إنی قد غفرتُ لهم ما خلا الظالم، ←

"ليس للحجة المبرورة ثواب إلا الجنة" حج مبرور کی تفسیر میں علماء کے متعدد اقوال ہیں، بعض نے فرمایا کہ حج مبرور اس حج کو کہتے ہیں جو جنایات سے خالی ہو۔ بعض نے فرمایا حج مبرور وہ ہے جس میں کوئی گناہ نہ ہو، بعض نے فرمایا کہ یہ وہ حج ہے جس میں کسی قسم کا ریا اور نام ونمود نہ ہو، بعض نے فرمایا حج مبرور سے مراد حج مقبول عند اللہ ہے جس کی علامت یہ ہے کہ جب وہ حج سے لوٹے تو تقویٰ اور پرہیزگاری کے اعتبار سے اس کا حال پہلے سے بہتر ہو[1] واللہ أعلم۔

باب ماجاء في التغليظ في ترك الحج

عن علی قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من ملك زادًا وراحلةً تبلغه إلى بيت الله ولم يحج فلا عليه أن يموت يهوديًا أو نصرانيًا الخ[2] مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص چونکہ حج کو چھوڑ کر اسلام کے ایک اہم شعار سے اعراض کا مرتکب ہوا ہے اس لئے وہ یہود ونصاریٰ کے

فاني آخذ للمظلوم منه، قال: أي رب! إن شئت أعطيت المظلوم من الجنة وغفرت للظالم، فلم يجب عشيته، فلما أصبح بالمزدلفة أعاد الدعاء فأجيب إلى ما سأل، قال: فضحك رسول الله صلى الله عليه وسلم أو قال تبسم، فقال له ابوبكر وعمر: بأبي أنت وأمي إن هذه لساعة ماكنت تضحك فيها فما الذي أضحكك؟ أضحك الله سنك۔ قال: إن عدو الله إبليس لما علم أن الله عزوجل قد استجاب دعائي، وغفر لأمتي، أخذ التراب فجعل يحثوه على رأسه ويدعو بالويل والثبور، فأضحكني ما رأيتُ من جزعه" سنن ابن ماجہ (ص۲۱۶) باب الدعاء بعرفة ۔ اس روایت کا ایک حصہ سنن ابی داؤد میں بھی تقریباً ابن ماجہ ہی کی سند کے ساتھ مروی ہے، دیکھئے (ج۲ ص۷۰۸) کتاب الأدب، باب في الرجل يقول للرجل: أضحك الله سنك ۔ ابن عباس بن مرداس سُلمی کی مذکورہ روایت پر تفصیلی کلام کے لئے دیکھئے فتح الملہم (ج۳ ص۲۹۱) باب حجة النبي صلى الله عليه وسلم، تكفير الكبائر بالحج والكلام على حديث ابن عباس بن مرداس ۔ ۱۲ رشید اشرف سیفی (حاشیہ صفحہ ھٰذا)

[1] ان تمام اقوال کی تفصیل کے لئے دیکھئے معارف السنن (ج۶ ص۲۲۵ و۲۲۶) ۔ علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ اس بحث کے آخر میں لکھتے ہیں: والذي يظهر لي أن يفسر الحج المبرور بقوله تعالىٰ: "فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ" فمن كان حجه بهذه الصفة فهو المبرور ۱۲ مرتب

[2] لم يخرج هذا الحديث من أصحاب الكتب الستة سوى الترمذي۔ كما قال الشيخ محمد فؤاد عبد الباقي في تعليقاته على سنن الترمذي (ج۳ ص۱۷۶)، طبع دار احياء التراث العربي) ۱۲ م

مشابہ ہوگیا۔ العیاذ باللہ۔

پھر ایسے شخص کو یہود و نصاریٰ کے ساتھ مشابہ قرار دینے میں یہ نکتہ ہے کہ حج ملتِ ابراہیمیہ کے شعائر میں سے ایک اہم شعار ہے، اور یہود و نصاریٰ نماز تو پڑھتے تھے لیکن حج نہیں کرتے تھے، اسی لئے تارکِ حج کو ان کے مشابہ قرار دیا گیا۔ ان کے مقابلہ میں مشرکین حج تو کرتے تھے لیکن نماز نہ پڑھتے تھے، اسی لئے ایک دوسری روایت میں تارکِ صلوٰۃ کو کفار و مشرکین کے مشابہ قرار دیا گیا ہے[1]۔ ارشاد ہے: "بین الرجل وبین الشرك والكفر ترك الصلوٰة[2]"

حدیثِ باب اگرچہ حارث کے ضعف اور ہلال بن عبداللہ کے مجہول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے[3] لیکن ایک سے زائد صحابۂ کرامؓ کی روایات اس کی شاہد ہیں[4]۔ واللہ اعلم — تمّ شرح الباب بزیادۃ من المرتب

[1] دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۲۴۹) قبیل باب ماجاء فی ایجاب الحج بالزاد والراحلۃ۔ ۱۲ م

[2] کنز العمال فی سنن الأقوال والأفعال (ج ۷ ص ۲۳۳) رقم ۱۹۰۸۱ الترهيب عن ترك الصلاة برمز "(مسلم) "د" (أبو داؤد) "ت" (الترمذی) "ہ" (ابن ماجۃ) عن جابر۔ ۱۲ مرتب

[3] کما قال الترمذی فی الباب ۱۲ م

[4] چنانچہ ابن سابط ابوامامہؓ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں "من لم یحبسہ مرض أو حاجۃ ظاهرة أو سلطان جائر ولم یحج فلیمت إن شاء یهودیا أو نصرانیا"۔ سنن کبریٰ بیہقی (ج ۴ ص ۳۳۴) کتاب الحج باب إمکان الحج۔

اس روایت کے بارے میں امام بیہقی فرماتے ہیں: وهٰذا وإن كان اسناده غير قوي فله شاهد من قول عمر بن الخطاب رضي الله عنه۔ اس شاہد کو ہم آگے نقل کریں گے۔

امام احمدؒ نے اپنی کتاب الایمان" میں "وکیع عن سفیان عن لیث عن ابن سابط" کے طریق سے یہ روایت مرسلاً نقل کی ہے: "قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من مات ولم یحج، ولم یمنعہ من ذلك مرض حابس أو سلطان ظالم أو حاجۃ ظاهرة"۔ نیز ابن ابی شیبہؒ نے "ابوالاحوص عن لیث" کے طریق سے اسے مرسلاً روایت کیا ہے۔ التلخیص الحبیر (ج ۲ ص ۲۲۲) کتاب الحج تحت رقم ۹۵۷۔

نیز ابن عدی نے حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے: من مات ولم یحج حجۃ الاسلام فی غیر وجع حابس أو حاجۃ ظاهرة أو سلطان جائر فلیمت أی المیتتین شاء إما یهودیا أو نصرانیا"۔ التلخیص الحبیر (ج ۲ ص ۲۲۳) اس میں عبدالرحمٰن القطامی اور ابوالمہزم متروک ہیں۔

بیہقی میں حضرت عمر بن الخطابؓ سے مرفوعاً مروی ہے: "لیمت یهودیا أو نصرانیا۔ یقولها ثلاث مرات۔ رجل مات ولم یحج ووجد لذلك سعۃ وخلیت سبیله" (ج ۴ ص ۳۳۴) باب امکان الحج۔

حافظ ابن حجرؒ التلخیص الحبیر میں اس حدیث موقوف کے بارے میں لکھتے ہیں: وإذا انضم هٰذا الموقوف إلی مرسل ابن سابط علم أن لهٰذا الحدیث أصلاً، ومحمله علی من استحل الترك، وتبین بذلك خطأ من ادعی أنه موضوع واللہ اعلم" (ج ۲ ص ۲۲۳) رشید اشرف عافاہ اللہ

باب ماجاء فی ایجاب الحج بالزاد والراحلة

عن[1] ابن عمر ؛ قال : جاء رجلٌ إلی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال : یارسول اللہ ما یوجب الحج ؟ قال: الزاد والراحلة ۔ اس حدیث کی بنا پر جمہور اس بات کے قائل ہیں کہ فرضیتِ حج کے لئے زاد اور راحلہ کا ہونا ضروری ہے ۔ لیکن امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص پیدل جانے اور بیت اللہ شریف تک پہنچنے پر قادر ہو تو راحلہ شرط نہیں، اسی طرح ان کے نزدیک زاد کی موجودگی بھی شرط نہیں کیونکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر آدمی قوی ہو تو وہ راستہ میں بھی کسبِ معاش کرسکتا ہے[2] ان کا استدلال آیتِ قرآنی " وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا[3] " سے ہے، جس میں زاد و راحلہ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ صرف استطاعتِ سبیل کا ذکر ہے، جو پیدل چلنے میں بھی ہوسکتی ہے ۔

جمہور اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ لفظ استطاعت کا اطلاق قدرتِ ممکنہ پر نہیں بلکہ قدرتِ میسّرہ پر ہوتا ہے، اور اس کی دلیل حضرت ابن عمرؓ کی حدیثِ باب ہے[4] ۔

اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ حدیثِ باب ابراہیم[5] بن یزید الخوزی کی وجہ سے ضعیف ہے بلکہ

---

[1] الحدیث أخرجہ ابن ماجہ فی سننہ (ص۲۰۸) أبواب المناسك، باب مایوجب الحج ۱۲ م

[2] ولوکان الاکتساب بالسؤال، کما فی بدایة المجتہد لابن رشد، وقیدہ غیرہ بمن عادتہ السؤال ۔ کما فی المعارف (ج۶ ص۲۵۱) ۔ وراجعہ لتفصیل المذاهب (ص۲۵۱ و۲۵۲) ۱۲ مرتب

[3] سورۂ آل عمران آیت ۹۷ پ۴ ۔ ۱۲ م

[4] اس کے علاوہ متعدد روایات و آثار میں " مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا " کی تفسیر "زاد و راحلہ" سے کی گئی ہے، جس سے یہ بات متعین ہوجاتی ہے کہ استطاعت سے قدرتِ ممکنہ مراد نہیں بلکہ قدرتِ میسّرہ مراد ہے ۔

چنانچہ حضرت عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ اور حضرت مجاہدؒ سے یہی تفسیر منقول ہے، دیکھئے مصنفِ ابن ابی شیبہ (ج ۴ ص۸۹ و ص۹۰) متی یجب علی الرجل الحج ۱۲ مرتب

[5] ابراهیم بن یزید الخوزی ۔ بضم المعجمة وبالزای (الخوزی ینسب إلی الخوز وهو هنا شعب بمکة یسمی شعب الخوز، ولیس منسوباً إلی خوزستان) أبو اسمٰعیل المکی مولی بنی أمیة، متروك الحدیث، من السابعة (طبقة کبار أتباع التابعین) مات سنة إحدی وخمسین (برمز "ت" (الترمذی) و"س" (النسائی) تقریب التهذیب (ج۱ ص۴۶، رقم ۳۰۳) ۱۲ مرتب

امام ترمذیؒ نے اس حدیث کی جو تحسین کی ہے اسی کی وجہ سے امام ترمذی پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ تصحیح وتحسینِ احادیث میں متساہل[1] ہیں۔

جمہور اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ امام ترمذی نے اس حدیث کی تحسین کثرتِ شواہد[2] اور امت کی تلقی بالقبول کی وجہ سے کی ہے، چنانچہ امام دارقطنی نے اپنی سنن میں اس حدیث کو متعدد طرق سے روایت کیا ہے[3] جو اپنے ضعف کے باوجود[4] ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہیں۔

---

[1] معارف السنن (ج ۶ ص ۲۵۰) ۱۲ م

[2] حافظ جمال الدین زیلعیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "روی من حدیث ابن عمر ومن حدیث ابن عباس ومن حدیث أنس ومن حدیث عائشة ومن حدیث جابر ومن حدیث عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ ومن حدیث ابن مسعود" آگے حافظ زیلعیؒ نے ہر ایک کی روایت ذکر کر کے اس پر تفصیلی کلام بھی کیا ہے۔ دیکھئے نصب الرایہ (ج ۳ ص ۷ تا ۱۰) کتاب الحج، أحادیث الفور فی الحج والتراخی ۱۲ مرتب

[3] سنن دارقطنی میں اس مفہوم کی تقریباً سترہ روایات متعدد صحابۂ کرامؓ سے مروی ہیں۔ اور خود حضرت ابن عمرؓ کی روایت بھی متعدد طرق سے مروی ہے، دیکھئے (ج ۲ ص ۲۱۵ تا ۲۱۸) کتاب الحج رقم ۱ تا ۱۷ ۱۲ مرتب

[4] اس بارے میں جتنی روایات مروی ہیں وہ سب کی سب عام محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں، سوائے حضرت حسن بصریؒ کی مرسل روایت کے جو متن میں آرہی ہے، چنانچہ حافظ زیلعیؒ نے ابن المنذر کا قول نقل کیا ہے "لا یثبت الحدیث الذی فیہ ذکر الزاد والراحلة مسندًا، والصحیح روایة الحسن عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مرسلاً"۔ نصب الرایہ (ج ۳ ص ۹) حافظ زیلعیؒ ہی نے امام بیہقیؒ کا بھی یہ قول نقل کیا ہے: "وروی من أوجه أخرى كلها ضعيفة" (ج ۳ ص ۸) اور خود امام بیہقیؒ ایک جگہ لکھتے ہیں: "وروی فیہ احادیث أخر لا یصح شیء منها" (بیہقی ج ۴ ص ۳۳۰، باب الرجل یطیق المشی)

لیکن مستدرک حاکم (ج ۱ ص ۴۴۲ و ۴۴۳، اول کتاب المناسک) میں حضرت انسؓ کی ایک مرفوع روایت مروی ہے جس کو امام حاکمؒ نے صحیح علی شرط الشیخین قرار دیا ہے، اور علامہ ذہبیؒ نے بھی تلخیص المستدرک میں اس پر سکوت کیا ہے۔

"حدثنا أبو بكر محمد بن أبي حازم الحافظ بالكوفة وأبو سعيد إسمٰعيل بن احمد التاجر قالا ثنا علی بن العباس بن الوليد البجلي ثنا علی بن سعيد بن مسروق الكندی ثنا ابن أبي زائدة عن سعيد بن أبي عروبة عن قتادة عن أنس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی قولہ تبارک وتعالیٰ: "وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا" قال: قيل: يا رسول الله! ما السبيل؟ قال: الزاد والراحلة،

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس کے علاوہ سنن سعید بن منصور اور سنن بیہقی میں یہ روایت حضرت حسن بصریؒ سے مرسلاً مروی ہے "قال : لمّا نزلت " وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا " قال رجل : یا رسول اللہ ! وما السبیل ؟ قال : زاد وراحلة " یہ روایت سنداً صحیح ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ (قال الحاکم :) هذا حديث صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه، وقد تابع حماد بن سلمة سعيداً على روايته عن قتادة -

امام حاکمؒ نے آگے یہ متابع بھی ذکر کیا ہے لیکن یہ متابع ابو قتادہ عبداللہ بن واقد الحرانی کی وجہ سے ضعیف ہے، لیکن پہلی روایت شاید صحیح ہو، اگرچہ امام بیہقیؒ ان دونوں روایتوں کے بارے میں لکھتے ہیں :

"وروی عن سعيد بن أبي عروبة وحماد بن سلمة عن قتادة عن انس عن النبي صلى الله عليه وسلم في الزاد والراحلة " ولا أراه (أي ولا أرى الموصول) إلا وهما " (سنن کبریٰ ج ۴ ص ۳۳۰) باب الرجل يطيق المشي ولا يجد زاداً ولا راحلة الخ

لیکن علامہ ابن الترکمانیؒ "الجوهر النقی" میں لکھتے ہیں :

" قلتُ : حديث قتادة عن أنس مرفوعاً أخرجه الدارقطني (في سننه ج ۲ ص ۲۱۶، كتاب الحج رقم ۶ و ۷ - م) وذكر بعض العلماء أن الحاكم أخرجه في المستدرك وقال : صحيح على شرطهما، فقول البيهقي (ولا أراه إلا وهماً) تضعيف للحديث بلا دليل فيحمله إلى أن لقتادة فيه إسنادين و كثيراً ما يفعل البيهقي وغيره مثل ذلك (ج ۴ ص ۳۲۶ و ۳۲۷) فليتأمل ۱۲ رشید اشرف سیفی

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ اللفظ لسعيد بن منصور، روایت کی سند یہ ہے " حدثنا هشام ثنا يونس عن الحسن " یہ روایت دوسری سندوں سے بھی مروی ہے، دیکھئے نصب الرایہ (ج ۳ ص ۹)

سنن بیہقی میں یہ روایت اس طرح مروی ہے :

أخبرنا أبو علي الروذباري أنبأ عبد الله بن عمر بن أحمد بن علي بن شوذب المقرئ بواسط ثنا شعيب بن أيوب ثنا أبو داود - يعني الحفري - عن سفيان عن يونس عن الحسن قال : سُئل النبي صلى الله عليه وسلم عن السبيل قال : الزاد والراحلة " امام بیہقیؒ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں : " وهذا شاهد لحديث ابراهيم بن يزيد الخوزي " ۔ دیکھئے (ج ۴ ص ۳۲۷) باب بيان السبيل الذي بوجوده يجب الحج إذا تمكن من فعله ۔ ۱۲ مرتب عفی عنہ

نیز حضرت عمرؓ[1] اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ[2] کے آثار بھی اس کے مطابق موجود ہیں۔
مختصر یہ کہ روایتِ باب متعدد شواھد و قرائن اور امت کی تلقی بالقبول کی وجہ سے قابلِ قبول ہے۔ واللہ اعلم

باب ماجاء کم فُرِضَ الحجُّ

عن علیٍّ[3] بن أبی طالب قال: لما نزلت "وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا" قالوا: یارسول اللہ! أفی کل عام؟ فسکت، فقالوا: یا رسول اللہ! أفی کل عام؟ قال: لا، ولو قلتُ: نعم لوجبت" اس پر اجماع ہے کہ حج کی فرضیت عمر میں مرۃ واحدۃ[4] ہے جیسا کہ حضرت علی کی حدیثِ باب سے ثابت ہوتا ہے[5]

---

[1] جیسا کہ سننِ سعید بن منصور میں مروی ہے "عن عمر بن الخطاب قال: لقد هممتُ أن أبعث رجالاً إلى هذه الأمصار فينظروا كل من له جدة ولم يحج، فيضربوا عليه الجزية، ما هم بمسلمين ماهم بمسلمين" التلخیص الحبیر (ج ۲ ص ۲۲۳، تحت رقم ۹۵۴) کتاب الحج — اور بیہقی میں یہ الفاظ ہیں: "ليمت يهودياً أو نصرانياً- يقولها ثلاث مرات- رجل مات ولم يحج ووجد لذلك سعة وخلّيت سبيله" (ج ۴ ص ۳۳۴) باب إمكان الحج۔

لیکن یہ دونوں اثر صریح نہیں ہیں البتہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ایک صریح اثر موجود ہے: "عن عطاء قال: قال عمر: "مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا" قال: "زاد وراحلة" (ج ۴ ص ۱۰۰ متی یجب علی الرجل الحج) ۱۲ مرتب عفی عنہ

[2] "عن ابن عباس مثل قول عمر بن الخطاب: السبيل: الزاد والراحلة" سنن دارقطنی (ج ۲ ص ۲۱۸) کتاب الحج، رقم ۱۱ و سنن کبریٰ بیہقی (ج ۴ ص ۳۳۱) باب الرجل یطیق المشی الخ ۱۲ مرتب

[3] الحديث أخرجه الترمذي في التفسير أيضاً تحت تفسير سورة المائدة (ج ۲ ص ۱۵۳) وأخرجه ابن ماجه في سننه (ص ۲۰۷) أبواب المناسك، باب فرض الحج ۱۲ مرتب

[4] كما قال النووي: "وأجمعت الأمة على أن الحج لا يجب في العمر إلا مرة واحدة بأصل الشرع وقد يجب زيادة بالنذر" الخ شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۳۲) باب فرض الحج مرة في العمر ۱۲ مرتب

[5] اس مفہوم کی روایات حضرت ابوہریرہؓ سے مسلم (ج ۱ ص ۴۳۲، باب فرض الحج مرة في العمر) اور نسائی (ج ۲ ص ۱ کتاب مناسک الحج باب وجوب الحج) میں، حضرت ابن عباسؓ سے سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۲۴۱، اول کتاب المناسک) نسائی (ج ۲ ص ۱ باب وجوب الحج) اور ابن ماجہ (ص ۲۰۷، باب فرض الحج) میں مروی ہیں ۱۲ مرتب

فقہاءؒ نے فرمایا کہ تکرارِ مامور بہ تکرارِ سبب پر موقوف ہے اور حج میں سبب وجوب بیت اللہ ہے جس میں تکرار نہیں، لہٰذا فرضیت میں بھی تکرار نہ ہوگا، بخلاف صلوٰۃ و صوم کے کہ ان کا سببِ وجوب اوقاتِ خمسہ اور شہرِ رمضان ہیں لہٰذا ان کے تکرار سے مامور بہ میں بھی تکرار ہوگا۔[1]

باب ماجاء کم حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم[2]

عن جابرؓ[3] بن عبد اللہ أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم حج ثلاث حجج، حجتین قبل أن یهاجر وحجة بعد ما هاجر ومعها عمرة[3]۔ اس پر روایات متفق ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد صرف ایک مرتبہ حج کیا[4]، اور اس پر بھی روایات کا اتفاق ہے کہ آپؐ نے بعثت کے بعد اور ہجرت سے پہلے ایک سے زائد حج کئے[5]، چنانچہ آپؐ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ آپؐ موسمِ حج میں حجاج کے مجمعوں میں جاتے اور انہیں دینِ اسلام کی دعوت دیتے، اور ارکانِ حج کی ادائیگی میں آپ اسوۂ ابراہیمی کی پیروی کرتے۔ چنانچہ آپ وقوفِ عرفات فرماتے تھے اور دوسرے قریشیوں کی طرح صرف وقوفِ مزدلفہ پر اکتفا نہیں کرتے تھے[6]۔

روایتِ باب میں ہجرت سے پہلے آپؐ کے صرف دو مرتبہ حج کرنے کا بیان ہے لیکن یہ روایت راجح نہیں[7]۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے نور الانوار (ص۳۱) مبحث الأمر، احتمال الأمر التکرار (مطبع یوسفی لکھنؤ، ہند) ۱۲ مرتب

[2] الحدیث أخرجه ابن ماجه فی سننه (ص۲۲۲) باب حجة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ مرتب

[3] قال الشیخ البنوری: ثم إن قوله "معها عمرة" فی حدیث جابر فی الباب یدل صراحة علی أنه صلی اللہ علیہ وسلم کان قارنًا فی حجة الوداع، وهذا یفید نافی مسألة أفضلیة القران کما سیأتی قریبًا۔ معارف السنن، (ج۶ ص۲۵۵) ۱۲ مرتب

[4] جیسا کہ روایتِ باب بھی اس پر دال ہے۔ ۱۲ م

[5] چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ "البدایہ والنہایہ" (ج ۵ ص۱۰۹) میں لکھتے ہیں: "ولکن حج قبل الهجرة مرات قبل النبوة و بعدها" کذا فی المعارف (ج ۶ ص۲۵۴) ۱۲ مرتب

[6] معارف السنن (ج ۶ ص ۲۵۴ و ۲۵۵) ۱۲ م

[7] بلکہ امام ترمذیؒ تو اس کے بارے میں فرماتے ہیں "هذا حدیث غریب" اور آگے لکھتے ہیں: وسألت محمدًا (أی البخاری) عن هذا فلم یعرفه من حدیث الثوری عن جعفر عن أبیه عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ورأیته لا یعد هذا الحدیث محفوظًا۔" اگرچہ سنن ابن ماجہ (ص۲۲۲ ، آخر حدیث من باب حجة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) میں اس کا ایک تابع موجود ہے۔ جس سے اس کا ضعف ختم ہوجاتا ہے، لیکن پھر بھی دوسری قوی روایات کی موجودگی میں اس کو ترجیح حاصل نہ ہوگی ۱۲ مرتب

کیونکہ دوسری روایات اس پر دال ہیں کہ آپ نے ہجرت سے پہلے دو سے زیادہ حج کئے اور یہی صحیح ہے، اس لئے کہ قبل الہجرۃ حج کے مواسم میں تین مرتبہ انصار مدینہ کے ساتھ آپ کی ملاقات ثابت ہے[1] جس سے معلوم ہوا کہ آپ نے قبل الہجرۃ دو سے زیادہ حج کئے، البتہ راجح یہ ہے کہ ان حجوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں[2]۔

فساق ثلاثة وستين بدنة وجاء عليٌّ من اليمن ببقيتها فيها جمل لأبي جهل

في أنفه بُرّة[3] من فضة فنحرها " اس روایت کے مطابق راجح یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تریسٹھ اونٹ ایک وقت میں بنفس نفیس قربان کئے جو آپ کی اور حضرت علیؓ کی عمر کے عدد کے مطابق تھے، اس سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک وقت میں سات اونٹ قربان کر چکے تھے، اس طرح آپ کے قربان کئے ہوئے اونٹوں کی تعداد ستر ہوگئی پھر بقیہ تیس اونٹ حضرت علیؓ نے نحر کئے، اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سو بدنوں کی قربانی مکمل ہوگئی، اس تشریح پر بیشتر روایات منطبق ہوجاتی ہیں[4]۔

---

[1] کذا فی البدایۃ والنہایۃ (ج ۵ ص ۱۱۱) دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۲۵۴) ۱۲ م

[2] علامہ بنوری لکھتے ہیں: "وأما قبل النبوة فالحجج ثابتة عنه صلى الله عليه وسلم، غير أنا لا ندري عددها" معارف (ج ۶ ص ۲۵۴) ۱۲ م

[3] هي حلقة تجعل في لحم الأنف وربما كانت من شعر، وأصلها بروة وتجمع على بُرى وبُرات وبُرين بضم باء كما في مجمع البحار (ج ۱ ص ۱۶۸) ۱۲ م

[4] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کی تفصیل متعدد صحابۂ کرامؓ نے مختلف انداز سے بیان کی ہے:

مسلم شریف میں حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی طویل روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں " ثم انصرف (النبي صلى الله عليه وسلم) إلى المنحر، فنحر ثلاثاً وستين بيده ثم أعطى علياً فنحر ما غبر (ج ۱ ص ۳۹۹) باب حجة النبي صلى الله عليه وسلم۔

سنن ابی داؤد میں حضرت علیؓ کی روایت ہے " لما نحر رسول الله صلى الله عليه وسلم بدنه فنحر ثلاثين بيده، وأمرني فنحرت سائرها" (ج ۱ ص ۲۴۵) باب الهدى إذا عطب قبل أن يبلغ۔

اس طرح دونوں روایات میں اختلاف ہوجاتا ہے اس لئے کہ حضرت جابرؓ کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تریسٹھ اونٹ اپنے ہاتھ سے قربان کئے تھے، باقی حضرت علیؓ نے قربان کئے، جبکہ خود حضرت علیؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس اونٹ بنفس نفیس قربان کئے تھے اور بقیہ حضرت علیؓ نے۔

اس اختلاف روایت کو ختم کرنے کے لئے حافظ ابن قیمؒ نے وہ توجیہ بیان کی ہے جو اوپر (بقیہ اگلے صفحہ پر)

یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اس قسم کی روایات میں اگر کوئی توجیہ بلا تکلف ہو جائے تو فبہا ورنہ دُور از کار تاویلیں کر کے احادیث کے ظاہری مفہوم کو بدل دینا کسی طرح مناسب نہیں۔

دراصل صحابہ کرامؓ کی توجہ مقصودِ حدیث اور مغزِ حدیث کی طرف زیادہ ہوتی تھی جبکہ غیر مقصود اور حواشی کی باتوں کی طرف ان کی اتنی توجہ نہ ہوتی، اس لئے بعض اوقات ایسی باتوں کے نقل کرنے میں روایات میں اختلاف ہو جاتا ہے اور ہر صحابی اپنے اپنے علم کے مطابق بیان کر دیتا ہے۔ یہاں بھی اسی طرح ہوا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

متن میں لکھی گئی، جس کا حاصل یہ ہے کہ ابوداؤد والی روایت میں کسی راوی کو مغالطہ ہوا ہے ورنہ درحقیقت تیس ۳۰ اونٹ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بلکہ حضرت علیؓ نے قربان کئے تھے، اس کی صورت یہ ہوئی کہ اولاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سات اونٹ اپنے دستِ مبارک سے قربان فرمائے جو حضرت علیؓ اور حضرت جابرؓ کسی کے مشاہدہ میں نہ آسکے، اسلئے کسی کی بھی روایت میں ان کا ذکر نہیں، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تریسٹھ اونٹ مزید قربان فرمائے جن کا حضرت جابرؓ کی روایت میں ذکر ہے، اس طرح ستر ۷۰ اونٹ قربان ہوگئے اور تیس ۳۰ اونٹ باقی بچے جن کو حضرت علیؓ نے قربان کیا، "فنحر ما غبر" اور "فنحرت سائرها" کا اصل مصداق بھی یہی ہیں۔ دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۲۵۶)۔

تطبیق کی دوسری صورت وہ ہے جو حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری (ج ۳ ص ۴۴۳، باب لا یعطی الجزار من الهدی شیئا) میں اور علامہ عینیؒ نے عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص ۵۳، باب لا یعطی للجزار الخ) میں بیان کی ہے کہ اولاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس ۳۰ اونٹ قربان کئے، پھر حضرت علیؓ کو قربان کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے سینتیس ۳۷ اونٹ قربان کئے، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید تینتیس ۳۳ اونٹ قربان کر کے تریسٹھ کا عدد مکمل کر لیا۔

حافظ ابن حجرؒ اور علامہ عینیؒ دونوں فرماتے ہیں کہ تطبیق کی یہ صورت اختیار کر لی جائے یا پھر مسلم کی روایت کو اصح ہونے کی بنیاد پر ترجیح دیدی جائے۔

علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "أنه صلى الله عليه وسلم نحر خمس بدن" معارف السنن (ج ۶ ص ۲۵۶ و ۲۵۷) آگے علامہ بنوریؒ فرماتے ہیں "تعرض المحدثون إلى إعلالها" اب اگر اس کو معلول مانا جائے تب تو اس روایت کی تطبیق کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اگرچہ علامہ بنوریؒ نے آگے لکھا ہے "ولم أقف على من أعل الحديث"

آگے وہ فرماتے ہیں: "قال شيخنا (الكشميري) ومحمله عندي أنه نحر ثلاثا وستين في مجلس، ثم في آخر نحر خمسا، فلا منافاة بين الروايتين" گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مجلسوں میں کل اڑسٹھ ۶۸ بدنے قربان کئے۔ اور بقیہ بتیس ۳۲ حضرت علیؓ نے قربان کئے جن کو کسر کا اعتبار نہ کر کے "ثلاثين" کے لفظ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

واللہ اعلم۔ ۱۲ رشید اشرف سیفی

فأمر رسول الله صلی الله علیہ وسلم من کل بدنة[1] ببضعة[2] فطبخت وشرب من مرقها۔ یہ شافعیہ کے خلاف حنفیہ کے مسلک کی دلیل ہے کہ قران اور تمتع کی قربانی دمِ شکر کے طور پر ہے نہ کہ دمِ جبر کے طور پر۔ جبکہ امام شافعیؒ اسے دمِ جبر قرار دیتے ہیں[3]۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ آپ نے یہاں اپنی قربانی کے گوشت کا شوربہ پیا، حالانکہ دمِ جبر کا گوشت خود شافعیہ کے مسلک پر کھانا جائز نہیں ہے[4]۔

باب ماجاء کم اعتمر النبی[5] صلی اللہ علیہ وسلم

عن ابن عباس[6] أن رسول الله صلی الله علیہ وسلم اعتمر أربع[7] عُمَر، عمرة الحدیبیة وعمرة الثانیة من قابل، عمرة القصاص فی ذی القعدة وعمرة الثالثة من الجعرانة[8]

---

[1] البَدَنة بفتحتین، وجمعها بُدْن۔ بالضم۔ ولا یختص عندنا بالإبل کما هو عند الشافعی، بل یعم البقر أیضاً" معارف (ج ۶ ص ۲۵۸) ۱۲ م

[2] البضعة۔ بفتح الباء لا غیر۔ وهی القطعة من اللحم، شرح نووی علیٰ م (ج ۱ ص ۳۹۹)۔ وفی "مجمع البحار" (ج ۱ ص ۱۸۷) هی بالفتح: القطعة من اللحم وقد تکسر۔ ۱۲ مرتب

[3] لسقوط المیقات وبعض الأعمال فی حق القارن والمتمتع۔ معارف (ج ۶ ص ۲۵۸) بزیادة ۱۲ م

[4] معارف السنن (ج ۶ ص ۲۵۷) ۱۲ م۔ [5] شرح باب از مرتب ۱۲

[6] الحدیث أخرجه أبوداؤد فی سننه (ج ۱ ص ۲۷۳) باب العمرة۔ وابن ماجه فی سننه (ص ۲۱۵ وص ۲۱۶) باب ماجاء کم اعتمر النبی صلی الله علیه وسلم۔ ۱۲ مرتب

[7] ثلاث منها کانت فی ذی القعدة إحرامها وأعمالها، وأما التی فی حجة الوداع فکان إحرامها فی ذی القعدة وأعمالها فی ذی الحجة" (کما سیظهر من التفصیل الآتی) معارف (ج ۶ ص ۲۵۹ و ۲۶۰) ۱۲ مرتب

[8] الجعرانة: بکسر الجیم وإسکان العین المهملة، وقد تکسر وتشدد الراء لغتان، قال ابن المدینی: أهل المدینة یثقلون وأهل العراق یخففون، وبالتخفیف قیده المتقنون۔ وقال الخطابی فی تصحیف المحدثین: إن هذا مما ثقلوه وهو مخفف، قاله الطبری فی "القری" وذکر البدر العینی: وإلی التخفیف ذهب الأصمعی وصوبه الخطابی وهی ما بین الطائف ومکة، وهی إلی مکة أقرب"۔

معارف السنن (ج ۶ ص ۵۰) ۱۲ مرتب

والرابعة التي مع حجته - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کل چار مرتبہ عمرہ کے لئے احرام باندھا، سب سے پہلے دوشنبہ یکم ذیقعدہ ۶ھ میں، لیکن مشرکینِ مکہ کے روکنے کی وجہ سے آپؐ یہ عمرہ ادا نہ فرما سکے، اور صلحِ حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا۔ چنانچہ آپؐ کو "ھدی" نحر کر کے اور حلق کرا کر حلال ہونا پڑا[1]۔ دوسرے ذیقعدہ ۷ھ میں عمرۃ القضاء[2] کے موقع پر، تیسرا عمرہ آپؐ نے غزوۂ حنین اور طائف کے مالِ غنیمت کی تقسیم سے فارغ ہو کر فرمایا، اس کے لئے آپؐ نے ۱۸ ذیقعدہ ۸ھ کو رات کے وقت جعرانہ سے احرام باندھا۔ چوتھا عمرہ آپؐ نے ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے ساتھ کیا، چنانچہ بروز شنبہ ۲۵ ذیقعدہ کو آپؐ احرام باندھ کر مدینہ سے روانہ ہوئے اور ۴ ذی الحجہ یکشنبہ کے دن آپ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر قران کیا[3]۔ (از مرتب)

باب ما جاء من أيّ موضع أحرم النبيّ صلى الله عليه وسلم

عن[4] جابر بن عبد الله قال: لمّا أراد النبي صلى الله عليه وسلم الحجّ أذن في

---

[1] معارف السنن (ج ٦ ص ٢٦٠) ١٢ م

[2] قال العلامة الشيخ محمد زكريا الكاندهلوي رحمه الله:

وفي الأوجز "تسمى عمرة القضية وعمرة القضاء وعمرة القصاص، زاد الزرقاني: وتسمى عمرة الصلح، ذكره الحاكم، وزاد صاحب الخميس "غزوة الأمن"، قال: وسُمّيت عمرة القضاء لأنها قضاء عن العمرة التي صدّ عنها بالحديبية" حجة الوداع وجزء عمرات النبي صلى الله عليه وسلم (ص ٢٨٧) الفصل الثالث في عمرة القضاء.

قال الشيخ البنوري رحمه الله:

"ثم إن ابن الهمام يقول: عمرة القضاء هي قضاء عن الحديبية، هذا مذهب أبي حنيفة، وذهب مالك إلى أنها مستأنفة لا قضاء عنها، وتسمية الصحابة وجميع السلف إياها بـ "عمرة القضاء" ظاهر في خلافه، والتسمية بـ "عمرة القضية" لا ينفيه فإنها كانت نتيجة للمقاضاة في الأولى، فيصح كل تعبير، غير أن التعبير بالقضاء يثبت كونها قضاء بلا معارض، انتهى ملخصاً ومختصراً بلفظي وراجعه. معارف (ج ٦ ص ٢٦٢) ١٢ مرتب عفا الله عنه۔

[3] ان عمروں سے متعلق مزید تفصیل کے لئے دیکھئے "حجۃ الوداع وجزء عمرات النبي صلى الله عليه وسلم" نیز دیکھئے سیرۃ المصطفیٰ (ج ٢ ص ٢٤٩ وما بعدها۔ وص ٢٤٥ تا ص ٢٤٨) وج ٣ ص ٦٧ وص ١٣٩) ١٢ مرتب

[4] الحديث لم يخرجه من أصحاب الكتب الستة سوى الترمذي۔ كما قال الشيخ محمد فؤاد عبد الباقي في تعليقاته على سنن الترمذي (ج ٣ ص ١٨١) ١٢ م

الناس فاجتمعوا، فلما أتى البیداء[1] أحرم"۔ اس پر تو اتفاق ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر بظاہر احرام ذوالحلیفہ[2] سے باندھا تھا لیکن اس میں روایات مختلف ہیں کہ آپؐ نے تلبیہ کب پڑھا؟ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے نماز کے فوراً بعد مسجد ہی میں تلبیہ پڑھ لیا تھا[3]، بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد سے نکلتے ہی درخت کے پاس پڑھا تھا[4]، بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپؐ اونٹنی پر اچھی طرح سوار ہو گئے تب پڑھا[5]۔ اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ "بیداء" میں پہنچ کر پڑھا[6]، اس طرح بظاہر اختلاف ہو جاتا ہے۔

---

[1] قال ابن الأثیر الجزری: "البیداء: البریة والمراد به فی الحدیث موضع مخصوص بین مکة والمدینة" جامع الأصول (ج ۳ ص ۸۳، تحت رقم ۱۳۶۲) ۱۲ مرتب

[2] بالمهملة والفاء مصغراً، مکان معروف بینه وبین مکة مائتا میل غیر میلین، قاله ابن حزم، وقال غیره: بینهما عشر مراحل، وقال النووی: بینها وبین المدینة ستة أمیال (وقیل: أربعة، وقیل: سبعة۔ حجة الوداع ص ۲۹) ووهم من قال بینهما میل واحد وهو ابن الصباغ، وبها مسجد یعرف بمسجد الشجرة خراب، وبها بئر یقال لها بئر علی (وهو نسبة إلی علیّ من الأعراب البدویین دون علی کرم الله وجهه۔ معارف ج ۶ ص ۲۶۹) ۔ فتح الباری (ج ۳ ص ۳۰۴ و ۳۰۵) باب مهل أهل مکة للحج والعمرة۔

واعلم أن ذا الحلیفة تسمی الیوم بـ "بیر علی" وبـ "أبیار علی" وهی علی تسعة کلومترات من المدینة۔ أنظر المعارف (ج ۶ ص ۲۶۹) وحجة الوداع (ص ۲۹) ۱۲ مرتب عافاه الله

[3] چنانچہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے "أن رسول الله صلی الله علیه وسلم أهلّ فی دبر الصلوٰة" سنن نسائی (ج ۲ ص ۱۷) کتاب مناسک الحج، العمل فی الإهلال۔ وسنن ترمذی (ج ۱ ص ۱۳۱ و ص ۱۳۲) باب ماجاء متی أحرم النبی صلی الله علیه وسلم۔

نیز سنن ابی داؤد میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں "فلما صلی (النبی صلی الله علیه وسلم) فی مسجده بذی الحلیفة رکعتیه أوجب فی مجلسه فأهلّ بالحج حین فرغ من رکعتیه" (ج ۱ ص ۲۴۲) باب وقت الإحرام ۱۲ مرتب

[4] چنانچہ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث باب میں اسی طرح مروی ہے وہ فرماتے ہیں "البیداء التی تکذبون فیها علی رسول الله صلی الله علیه وسلم، والله ما أهلّ رسول الله صلی الله علیه وسلم إلا من عند المسجد من عند الشجرة" ۱۲ مرتب

[5] چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کی روایت ہے "أن إهلال رسول الله صلی الله علیه وسلم من ذی الحلیفة حین استوت به راحلته" (ج ۱ ص ۲۰۶) کتاب المناسک باب قول الله تعالیٰ: یأتوک رجالاً وعلی کل ضامر۔ ۱۲ مرتب

[6] جیسا کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی حدیث باب میں یہی مذکور ہے، روایت متن میں ذکر کی جا چکی ہے ۱۲ م

لیکن حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے یہ اختلاف دور ہو جاتا ہے اور تمام روایات میں تطبیق ہو جاتی ہے وہ فرماتے ہیں کہ دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام مقامات پر تلبیہ پڑھا تھا، لہٰذا جس نے بھی جہاں آپ کا تلبیہ سن لیا اسی طرح روایت کر دیا[۱]۔

اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کا مدار خُصَیف[۲] ابن عبدالرحمن پر ہے جو ضعیف ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ خصیف کے بارے میں محدثین کا اختلاف ہے، جہاں بعض نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے وہیں متعدد محدثین نے ان کی توثیق بھی کی ہے۔ چنانچہ یحییٰ بن معینؒ، ابو حاتمؒ اور ابو زرعہؒ وغیرہ سے ان کی توثیق منقول ہے[۳]۔ پھر خصیف کی اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد امام ابو داؤد نے سکوت فرمایا ہے[۴]۔ جو ان کے نزدیک کم سے کم حسن ہونے کی دلیل ہے۔ نیز امام حاکمؒ نے ان کی حدیث کو صحیح علی شرط مسلم قرار دیا ہے اور علامہ ذہبیؒ نے اس پر سکوت کیا ہے[۵]۔ فإذن أقل أحوال هذا الحديث أن يكون حسناً[۶]۔

---

[۱] سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۲۴۶، باب وقت الاحرام) میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت اس طرح مروی ہے:

"عن سعيد بن جبير قال: قلت لعبد الله بن عباس: يا أبا العباس! عجبت لاختلاف أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم في إهلال رسول الله صلى الله عليه وسلم حين أوجب، فقال: إني لأعلم الناس بذلك، إنها إنما كانت من رسول الله صلى الله عليه وسلم حجة واحدة، فمن هناك اختلفوا، خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم حاجاً فلما صلى في مسجده بذي الحليفة ركعتيه أوجب في مجلسه، فأهل بالحج حين فرغ من ركعتيه، فسمع ذلك منه أقوام فحفظته عنه، ثم ركب فلما استقلت به ناقته أهل وأدرك ذلك منه أقوام، وذلك أن الناس إنما كانوا يأتون أرسالاً فسمعوه حين استقلت به ناقته يهل، فقالوا: إنما أهل حين استقلت به ناقته، ثم مضى رسول الله صلى الله عليه وسلم فلما علا على شرف البيداء أهل وأدرك ذلك منه أقوام، فقالوا: إنما أهل حين علا على شرف البيداء، وايم الله لقد أوجب في مصلاه، وأهل حين استقلت به ناقته، وأهل حين علا على شرف البيداء" ۱۲ مرتب

[۲] الخصيف: بالصاد المهملة مصغراً ابن عبدالرحمن الجزري، أبو عون، صدوق، سيئ الحفظ، خلط بآخره ورمي بالإرجاء من الخامسة مات سنة سبع وثلاثين وقيل غير ذلك/ ۴ (أي أخرج له الأئمة الأربعة سوى الشيخين) تقريب التهذيب (ج ۱ ص ۲۲۴، رقم ۱۲۶) ۱۲ مرتب

[۳] تفصیل کے لیے دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۲۷) باب ما جاء متی أحرم النبي صلى الله عليه وسلم ۱۲ م

[۴] سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۲۴۶) باب وقت الإحرام ۱۲ م

[۵] المستدرک مع تلخیص المستدرک (ج ۱ ص ۴۵۱ و ۴۵۲) تلبية ما على الأرض من يمين الملبي وشماله ۱۲ م

[۶] دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۲۶، و ص ۲۷ و ۲۸، متی أحرم النبي ﷺ) ۱۲ م

اس کے علاوہ حضرت ابوداؤد مازنیؓ سے ایک اور صریح روایت مروی ہے۔ فرماتے ہیں: "خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی أتی مسجد ذی الحلیفة فصلی أربع رکعات ثم أهلّ بالحج، فسمعه الذین کانوا فی المسجد، فقالوا: أهلّ من المسجد، ثم خرج فأتی براحلته بفناء المسجد فرکبها، فلما استوت به أهلّ، فسمعه الذین کانوا بفناء المسجد، فقالوا: أهلّ من فناء المسجد، ثم مضی، فلما علا البیداء أهلّ، فسمعه الذین کانوا بالبیداء فقالوا: أهلّ من البیداء، وصدقوا کلهم"[1]

لہٰذا حنفیہ کے نزدیک مستحب یہی ہے کہ تلبیہ احرام کی رکعتوں کے فوراً بعد پڑھ لیا جائے[2]۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ احرام کی پابندیاں احرام باندھ لینے اور رکعتیں پڑھ لینے یا صرف نیت کر لینے سے شروع نہیں ہوتیں تاوقتیکہ تلبیہ نہ پڑھ لے یا سوقِ ہدی نہ کر لے[3]۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی إفراد الحج

أقسام الحج والاختلاف فی الأفضل منها

حج تین قسم پر ہے: (۱) افراد[4] (۲) تمتع[5] (۳) قران[6]

---

[1] کتاب الکنی والاسماء للدولابی (ص۲۷ و ص۲۸) ۱۲۔

[2] والصحیح من مذهب الشافعی ومالك والجمهور أن الأفضل أن یحرم إذا انبعثت به راحلته" معارف السنن (ج ۶ ص۱۶۱) نقلاً عن المواهب وشرحه،
حضرت ابوداؤد مازنیؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایات کے علاوہ حضرت سعید بن جبیرؒ کے قول سے بھی مسلکِ احناف کی تائید ہوتی ہے، فرماتے ہیں: "فمن أخذ بقول ابن عباسؓ أهلّ فی مصلّاه إذا فرغ من رکعتیه" سنن ابی داؤد (ج۱ ص۲۴۶) باب فی وقت الاحرام ۱۲

[3] تفصیل کے لئے دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص۲۶۳) ۱۲ م

[4] المفرد بالحج هو الذی یحرم بالحج لا غیر۔ بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (ج ۲ ص۱۶۷) فصل وأما بیان ما یحرم به ۱۲ م

[5] المتمتع فی عرف الشرع فهو اسم لآفاقی یحرم بالعمرة ویأتی بأفعالها من الطواف والسعی أو یأتی بأکثر رکنها وهو الطواف أربعة أشواط أو أکثر فی أشهر الحج ثم یحرم بالحج فی أشهر الحج ویحج من عامه ذلك قبل أن یلم بأهله فیما بین ذلك إلماماً صحیحاً فیحصل له النسکان فی سفر واحد، سواء حل من إحرام العمرة بالحلق أو التقصیر أو لم یحل إذا کان ساق الهدی لمتعته فإنه لا یجوز التحلل بینهما، ویحرم بالحج قبل أن یحل من إحرام العمرة، وهذا عندنا، وقال الشافعی: سوق الهدی لا یمنع من التحلل۔ بدائع الصنائع (ج ۲ ص۱۶۸) ۱۲ مرتب

[6] القارن فی عرف الشرع فهو اسم لآفاقی یجمع بین احرام العمرة وإحرام الحج قبل وجود رکن العمرة ـ وهو الطواف ـ کله أو أکثره، فیأتی بالعمرة أولاً ثم یأتی بالحج قبل أن یحل من العمرة بالحلق او التقصیر، سواء جمع بین الاحرامین بکلام موصول أو مفصول، حتی لو أحرم بالعمرة، ثم أحرم بالحج بعد ذلك قبل الطواف للعمرة أو أکثره کان قارناً لوجود معنی القران، وهو الجمع بین الإحرامین، بدائع الصنائع (ج ۲ ص۱۶۷) ۱۲ مرتب۔

تمام فقہاء کے نزدیک ان میں سے ہر ایک قسم جائز ہے، اختلاف صرف افضلیت میں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سب سے افضل قران ہے پھر تمتع پھر افراد، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک سب سے افضل افراد ہے پھر تمتع پھر قران، امام احمدؒ کے نزدیک وہ تمتع سب سے افضل ہے جس میں سوقِ ہدی نہ ہو، پھر افراد، پھر قران[1]۔

دلائلِ فقہاء: امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا استدلال ان روایات سے ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا افراد کرنا مروی ہے، مثلاً حضرت عائشہؓ کی حدیثِ باب "أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أفرد الحج" اور حضرت ابن عمرؓ کی حدیثِ باب "أن النبي صلى الله عليه وسلم أفرد الحج وأفرد أبو بكر وعمر وعثمان" نیز حضرت جابرؓ سے بعض روایات اس کے مطابق

---

[1] أنظر "المعارف" للبنوري (ج ۶ ص ۲۰۳) وفيه: ثم المذكور هنا من المذاهب والترتيب هو المشهور عند أربابها، فعن الشافعي رواية أفضلية التمتع كما في شرح المهذب، وكذا عن مالك رواية التمتع، وعن الشافعي أفضلية القران في قول، كما في شرح مسلم للنووي، وعن مالك رواية أن القران أفضل من التمتع بل ذكر الزرقاني أنه المعتمد من مذهب مالك، وعن أحمد في رواية المروزي أن القران إن ساق الهدي، وإن لم يسق الهدي فالتمتع أفضل، كما في "المغني" (۳ - ۲۳۲) ومذهب أبي حنيفة هو مذهب سفيان الثوري وإسحٰق والمزني وابن المنذر وأبي إسحاق كما في شرح المهذب (۷ - ۱۵۲) واختاره ابن حزم كما في شرح المهذب (۷ - ۱۵۹)

(قال الشيخ البنوري:) ثم ههنا بحث آخر: أن الإفراد الذي هو أفضل من القران عند الشافعي وغيره هل هو الحج المفرد فقط؟ أو حج وبعده عمرة؟ وهذا أيضا يسمّى إفرادًا في الإصطلاح، فالتحقيق على أن الثاني هو المراد، وممن صرح بذلك النووي في شرح المهذب في موضعين، وصرح بأن القران أفضل من إفراد الحج من غير عمرة بلا خلاف، قال: ولو جعلت حجته صلى الله عليه وسلم مفردة لزم منه أن لا يكون اعتمر تلك السنة ولم يقل أحد أن الحج وحده أفضل من القران، أنظر شرح المهذب (۷ - ۱۶۰) ومثله في "الفتح" (۳ - ۲۴۰) ويقول المحقق ابن الهمام في "الفتح" (في باب القران): المراد بالإفراد في الخلافية أن يأتي بكل منهما منفردًا... أما مع الإقتصار على إحداهما فلا شك أن القران أفضل بلا خلاف اهـ

معارف (ج ۶ ص ۲۰۳ و ۲۰۴) ۲ مرتب عفا اللہ عنہ

مروی ہیں[1]۔

امام احمدؒ کا استدلال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تو قران تھا لیکن تمتع من غیر سوق الھدی کی تمنا تھی جو اس کی افضلیت کی دلیل ہے، چنانچہ آپؐ نے فرمایا تھا " لو استقبلت من أمری ما استدبرت ما أھدیت ولولا أن معی الھدی لأحللت[2] "

احناف کی جانب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قارن ہونے کے دلائل

(۱) پیچھے باب ماجاء کم حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی روایت گزر چکی ہے " ان[3] النبی صلی اللہ علیہ وسلم حج ثلاث حجج، حجتین قبل أن یہاجر، و حجۃ بعد ماھاجر ومعھا عمرۃ " یہ الفاظ اگرچہ قران اور تمتع دونوں کا احتمال رکھتے ہیں لیکن اس بات پر امت کا اتفاق ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع نہیں فرمایا، لہٰذا یہاں قران ہی متعین ہے۔

---

[1] چنانچہ سنن ابی داؤد میں ان سے مروی ہے " قال : أقبلنا مھلین مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالحج مفرداً " لیکن اس میں حج افراد کی صورت باقی نہیں رہتی، اس لئے کہ اس میں آگے یہ بھی مروی ہے حتی اذا قدمنا طفنا بالکعبۃ وبالصفا والمروۃ فأمرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن یحل منا من لم یکن معہ ھدی، قال : فقلنا : حل ماذا ؟ فقال : الحل کلہ ، فواقعنا النساء وتطیبنا بالطیب ولبسنا ثیابنا ولیس بیننا وبین عرفۃ إلا أربع لیال، ثم أھللنا یوم الترویۃ " (ج ۱ ص ۲۴۸) باب فی إفراد الحج۔

سنن ابی داؤد ہی میں حضرت جابرؓ کی ایک اور روایت مروی ہے " قال : اھللنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالحج خالصاً لا یخالطہ شئ " لیکن اس میں بھی افراد باقی نہیں رہتا، اس لئے کہ آگے مروی ہے " فقدمنا مکۃ لأربع لیال خلون من ذی الحجۃ فطفنا وسعینا، ثم أمرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن نحل، وقال: لولا ھدیی لحللت " (ج ۱ ص ۲۴۹) باب فی إفراد الحج۔

البتہ ابن عساکر کی ایک روایت ہے جو کسی قدر صریح ہے " عن جابر قال : أھل النبی صلی اللہ علیہ وسلم بحج لیس معہ عمرۃ "۔ کنز العمال (ج ۵ ص ۸۳، رقم ۶۲۱) کتاب الحج والعمرۃ من قسم الأفعال، الإفراد ۱۲ م

[2] اللفظ للبخاری فی صحیحہ من حدیث جابر (ج ۱ ص ۲۲۴) باب تقضی الحائض المناسک کلھا، و (ج ۱ ص ۲۴۰) أبواب العمرۃ، باب عمرۃ التنعیم ـــ وانظر الصحیح لمسلم (ج ۱ ص ۳۹۲) باب بیان وجوہ الإحرام الخ ۱۲ م

[3] سنن ترمذی (ج ۱ ص ۱۳۱) ۱۲ م

اس استدلال پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس روایت کا مدار زید بن حباب[1] پر ہے جو ضعیف ہیں، چنانچہ امام بخاریؒ اور امام ترمذیؒ دونوں ہی نے اس حدیث کو غیر محفوظ قرار دیا ہے[2]۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت میں زید بن حُباب متفرد نہیں، بلکہ سنن ابن ماجہ میں عبداللہ[3] بن داؤد خُرَیبی نے ان کی متابعت کی ہے[4]، حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ متابع غالباً امام ترمذیؒ اور امام بخاری کی

---

[1] زيد بن الحباب :- بضم المهملة وموحدتين - أبو الحسين العُكْلي - بضم المهملة وسكون الكاف - أصله من خراسان، وكان بالكوفة، ورحل في الحديث فأكثر منه، وهو صدوق يخطئ في حديث الثوري من التاسعة (طبقة من لم يروعنه غير واحد ولم يوثق) مات سنة ثلاث ومائتين، (أخرج له) م (مسلم) ٤ (الأئمة الأربعة سوى الشيخين) تقريب التهذيب (ج ١ ص ٢٧٣، رقم ١٢٨)

واضح ہے کہ زیر بحث روایت میں بھی زید بن حباب سفیان سے روایت کر رہے ہیں ۱۲ مرتب

[2] چنانچہ امام ترمذیؒ اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں "هٰذا حديث غريب" پھر آگے فرماتے ہیں :

"وسألت محمدًا (أي البخاري) عن هٰذا فلم يعرفه من حديث الثوري عن جعفر عن أبيه عن جابر عن النبي صلى الله عليه وسلم، ورأيته لا يعدّ هٰذا الحديث محفوظًا (ج ١ ص ١٣١) باب ما جاء كم حج النبي صلى الله عليه وسلم ۱۲ مرتب

[3] عبد الله بن داود بن عامر الهمداني، أبو عبد الله الخُرَيبي - بمعجمة وموحدة مصغرًا - كوفي الأصل، ثقة عابد، من التاسعة، مات سنة ثلاث وعشرة ومائتين، وله سبع وثمانون سنة، أمسك عن الرواية قبل موته، فلذلك لم يسمع منه البخاري. (أخرج له) خ (البخاري) ٤ (الأئمة الأربعة سوى الشيخين) تقريب التهذيب (ج ١ ص ٤١٢ و ٤١٣، رقم ٢٨٠) ۱۲ مرتب

[4] حدثنا القاسم بن محمد بن عباد بن عباد المهلبي ثنا عبد الله بن داود ثنا سفيان : قال حج رسول الله صلى الله عليه وسلم ثلاث حجات، حجتين قبل أن يهاجر وحجة بعد ما هاجر من المدينة وقرن مع حجته عمرة واجتمع ما جاء به النبي صلى الله عليه وسلم وما جاء به علي مائة بدنة، منها جمل لأبي جهل في أنفه برة من فضة، فنحر النبي صلى الله عليه وسلم بيده ثلاثا وستين، ونحر علي ما غبر، قيل له : من ذكره؟ قال: جعفر عن أبيه عن جابر، وابن أبي ليلى عن الحكم عن مِقْسَم عن ابن عباس"۔

سنن ابن ماجه (ص ٢٢٢) آخر حديث من باب حجة رسول الله صلى الله عليه وسلم ۱۲ مرتب

کے علم میں نہ آسکا اور انہوں نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیدیا[1]۔

اگر کہا جائے کہ "ومعہا عمرۃ" کا مفہوم تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج سے فارغ ہونے کے بعد احرامِ مستقل کے ذریعہ عمرہ کیا ہو، اور یہ بات "افراد" کے منافی نہیں، لہٰذا یہ حدیث قِران کے مفہوم میں صریح نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ سننِ ترمذی[2] اور مسندِ احمد[3] میں حضرت جابرؓ کی یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے "أنّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرن الحجّ والعمرۃ فطاف لهما طوافًا واحدًا" اس میں لفظِ "قرن" قِران کے مفہوم پر صریح ہے۔

(۲) صحیح بخاری[4] میں حضرت جابرؓ کی روایت میں حضرت عائشہؓ کا قول مروی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا "انطلقون بحجّة وعمرة وأنطلق بحجّة" اس میں اگرچہ قِران اور تمتع دونوں کا احتمال ہے لیکن تمتع کے بالاتفاق منفی ہونے کی وجہ سے قِران متعین ہے، نیز اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ بیشتر صحابہ کرام نے بھی قِران کیا تھا۔

(۳) اگلے باب[5] میں حضرت انسؓ کی روایت آرہی ہے فرماتے ہیں: سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] چنانچہ علامہ بنوریؒ نقل کرتے ہیں: "ویقول ابن کثیر فی البدایة والنہایة" (۵ - ۱۳۴): وهذه طریق لم یقف علیه الترمذی ولا البیهقی، وربما ولا البخاری حیث تکلم فی زید بن الحباب ظانًّا أنه انفرد به ولیس کذلك، معارف (ج ۶ ص۱۸۱) ۱۲ مرتب

[2] (ج ۱ ص۱۳۶) باب ما جاء أنّ القارن یطوف طوافًا واحدًا ۱۲ م

[3] معارف السنن (ج ۶ ص۱۸۱) ۱۲ م

[4] (ج ۲ ص۱۰۷۱) کتاب التمنی، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو استقبلت من أمری ما استدبرت و (ج ۱ ص۲۴۰) ابواب العمرۃ باب عمرۃ التنعیم۔ و (ج ۱ ص۲۲۳) کتاب المناسك، باب تقضی الحائض المناسك کلها۔

نیز مسلم میں خود حضرت عائشہؓ ہی کی روایت میں ہے "قلت یا رسول اللہ یرجع الناس بعمرۃ وحجّة وأرجع أنا بحجّة" (ج ۱ ص۳۹۰) باب بیان وجوہ الإحرام الخ ۱۲ مرتب

[5] باب ما جاء فی الجمع بین الحج والعمرۃ (ج ۱ ص۱۳۳) یہ روایت صحیحین میں بھی مروی ہے، دیکھئے صحیح بخاری (ج ۱ ص۲۳۱ و۲۳۲) کتاب المناسك باب نحر البدن قائمة، اس باب میں حضرت انسؓ کی دو روایتیں مذکور ہیں، ایک میں "لبّی بهما جمیعًا" کے الفاظ ہیں اور ایک میں "أهلّ بعمرۃ وحجّة" کے۔ نیز دیکھئے (ج ۲ ص۶۲۳) کتاب المغازی، باب بعث علی بن أبی طالب وخالد بن الولید إلی الیمن قبل حجة الوداع۔ اور صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۰۴ و۴۰۵) باب فی الإفراد والقران، جس میں "سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یلبّی بالعمرۃ والحج جمیعا" اور "سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: لبیك عمرۃ وحجًّا" کے الفاظ مروی ہیں، نیز دیکھئے (ج ۱ ص۴۰۸) باب جواز التمتع فی الحج والقران جس میں یہ الفاظ مروی ہیں: "سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أهلّ بهما جمیعًا، لبیك عمرۃ وحجًّا، لبیك عمرۃ وحجًّا" ۱۲ مرتب

يقول : لبيك بعمرة وحجة » شیخ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت کے بعض طرق میں یہ الفاظ مروی ہیں: "كنت آخذاً بزمام ناقة رسول الله صلى الله عليه وسلم وهي تقصع بجرّتها[1] ولعابها يسيل على يدي وهو يقول : لبيك بحجة وعمرة معاً[2] " نیز حافظ ابن کثیرؒ نے بزار کے حوالہ سے اس روایت میں حضرت انسؓ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں : " إني ردف أبي طلحة وإن ركبته لتمس ركبة رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو يلبي بالحج والعمرة[3] "۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انسؓ حجۃ الوداع کے موقعہ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت قریب تھے اور اس قرب کی حالت میں انہوں نے آپؐ کا تلبیہ سنا جو قران کا تلبیہ تھا،

اس پر علامہ ابن الجوزیؒ نے "التحقيق" میں یہ اعتراض کیا ہے کہ حضرت انسؓ اس وقت کمسن تھے، شاید وہ سمجھ نہ سکے[4]۔ نیز ان کا یہ بیان حضرت ابن عمرؓ کے بیان سے معارض ہے جو فرماتے ہیں: "وإني كنت تحت ناقة رسول الله صلى الله عليه وسلم يمسني لعابها أسمعه يلبي بالحج[5] " گویا انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف افراد کا تلبیہ پڑھتے ہوئے سنا۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ حضرت انسؓ کی عمر حجۃ الوداع کے موقعہ پر بیس سال تھی اور وہ حضرت ابن عمرؓ سے صرف ایک سال ہی چھوٹے تھے اس لئے محض کم سنی کی بنیاد پر ان کی روایت کو

---

[1] الجرة : ما يخرجه البعير من بطنه ليمضغه ثم يبلعه ، قصعت الناقة بجرتها : ردّت الطعام إلى فمها لتمضغه ۱۲ مرتب

[2] فتح القدير (ج۲ ص۲۰۳) باب القران ۱۲ مرتب

[3] معارف السنن (ج۶ ص۲۸۲) ۔ اور طحاوی میں یہ الفاظ مروی ہیں: كنت ردف أبي طلحة وركبتي تمس ركبة النبي صلى الله عليه وسلم فلم يزالوا يصرخون بهما جميعاً بالحجة والعمرة (ج۱ ص۳۲۱) باب ما كان النبي صلى الله عليه وسلم به محرماً في حجة الوداع ۔ اور صحیح بخاری کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: "كنت رديف أبي طلحة وإنهم ليصرخون بهما جميعاً الحج والعمرة (ج۱ ص۴۱۹) كتاب الجهاد، باب الارتداف بالغزو والحج ۔ اور مسند احمد میں یہ الفاظ مروی ہیں: "والله إن رجلي لتمس رجل رسول الله صلى الله عليه وسلم وإنه ليهل بهما جميعاً" معارف السنن (ج۶ ص۲۸۲) ۱۲ مرتب عفی عنہ

[4] نصب الرايه (ج۳ ص۹۹) باب القران ۔ فتح القدير (ج۲ ص۲۰۱) باب القران ۱۲ مرتب

[5] معارف السنن (ج۶ ص۲۸۲ و ۲۸۳) بحوالہ بیہقی ۱۲ م

ترک نہیں کیا جا سکتا، بالخصوص جبکہ وہ مثبت زیادہ ہیں[۱]

پھر یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ قارن کے تلبیہ میں یہ گنجائش ہے کہ چاہے تو صرف "لبیك بحجة" کہے، چاہے صرف "لبیك بعمرة" اور چاہے لبیك بحجة وعمرة[۲] لہذا یہ عین ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اوقات میں مختلف الفاظ فرمائے ہوں فکلٌ روی بما رأی۔

اس کے علاوہ حضرت انسؓ کی روایت کو اس اعتبار سے بھی ترجیح حاصل ہے کہ ان کی روایات کے درمیان کوئی تعارض نہیں۔ چنانچہ ان سے سوائے قران کے کوئی اور صورت مروی نہیں[۳]، بخلاف حضرت ابن عمرؓ کے کہ ان سے روایتیں مختلف ہیں، مذکورہ روایت افراد کی ہے لیکن انہی سے سنن[۴] نسائی میں "تمتع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حجة الوداع بالعمرة إلی الحج" کے الفاظ مروی ہیں، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے نزدیک بھی متمتع نہیں تھے، اس لئے یہاں تمتع سے اس کے اصطلاحی معنی نہیں بلکہ لغوی معنی مراد ہیں جو قران پر بھی صادق آتے ہیں۔ چنانچہ یہاں قران ہی مراد ہے، ترمذی[۵] میں بھی آگے "باب

---

[۱] معارف السنن (ج ۶ ص ۲۸۳) ۔ نیز صاحب "تنقیح" اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: "بل کان بالغاً بالإجماع، بل کان له نحو من عشرین سنة، لأن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم هاجر إلی المدینة ولأنس عشر سنین، ومات وله عشرون سنة، یدلّ علی ذلك ما أخرجاه واللفظ لمسلم (ج ۱ ص ۴۰۴ و ۴۰۵، باب الإفراد والقران) عن بکر عن أنس قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یلبّی بالحج والعمرة جمیعاً، قال بکر: فحدثت بذلك ابن عمر، فقال: لبّی بالحج وحده، فلقیت أنساً فحدّثته بقول ابن عمر، فقال أنس: ما تعدوننا إلا صبیاناً، سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول: لبیك عمرة وحجّاً" انتہی۔ نصب الرایہ (ج ۳ ص ۱۰۰) باب القران

نیز شیخ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: "وقول ابن الجوزی: إن أنساً کان إذ ذاك صبیاً لقصد تقدیم روایة ابن عمر علیه غلط، بل کان سن أنس فی حجة الوداع عشرین سنة أو إحدی وعشرین أو اثنتین وعشرین سنة أو ثلاثاً وعشرین سنة وذلك أنه اختلف فی أنه توفی سنة تسعین من الهجرة أو إحدی وتسعین أو اثنتین وتسعین أو ثلاث وتسعین، ذکر ذلك الذهبی فی کتاب العبر" وقدم النبی صلی اللہ علیه وسلم المدینة وسنه عشر سنین، فکیف یسوغ الحکم علیه بسن الصبا إذ ذاك؟ مع أنه إنما بین ابن عمر وأنس فی السن سنة واحدة أو سنة وبعض سنة"۔

فتح القدیر (ج ۲ ص ۲۰۱) باب القران ۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ

[۲] معارف السنن (ج ۶ ص ۲۸۳) ۱۲ م

[۳] چنانچہ تقریباً بیس جلیل القدر تابعین حضرت انسؓ سے قران کی روایت نقل کرتے ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۲۸۳ و ص ۲۸۴) ۱۲ م [۴] (ج ۲ ص ۱۴) کتاب مناسك الحج، باب التمتع ۱۲ م

[۵] (ج ۱ ص ۱۳۲) ۱۲ م

ماجاء فی التمتع" کے تحت حضرت ابن عمرؓ کی روایت آرہی ہے کہ ان سے "تمتع بالعمرۃ الی الحج" کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا "ھی حلال" پھر بعد میں فرمایا "لقد صنعہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" ان کے علاوہ صحیحین[1] میں انہی سے "فاھلّ بالعمرۃ ثم اھلّ بالحج" کے الفاظ منقول ہیں جو قران پر دلالت کر رہے ہیں، نیز موطأ[2] امام محمد میں صدقہ بن یسار فرماتے ہیں: سمعت عبد اللہ بن عمر ودخلنا علیہ قبل یوم الترویۃ بیومین أو ثلاثۃ ودخل علیہ الناس یسألونہ، فدخل علیہ رجل ثائر الرأس، فقال: یا أبا عبد الرحمن إنی ضفرت رأسی وأحرمت بعمرۃ مفردۃ، فماذا تری؟ قال ابن عمر: "لو کنت معک حین أحرمت لأمرتک أن تہل بہما جمیعاً"

(۴) بخاری[3] میں حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں "سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم بوادی العقیق[4] یقول: أتانی اللیلۃ آتٍ من ربی فقال: صلّ فی ہذا الوادی المبارک، وقل: عمرۃ فی حجۃ"

(۵) صحیح مسلم[5] میں حضرت علیؓ کا قول مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا "لقد علمت أنا قد تمتعنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: أجل" یہاں بھی تمتع اصطلاحی مراد نہیں بلکہ تمتع لغوی یعنی قران مراد ہے۔

(۶) ترمذی میں "باب ماجاء فی التمتع" کے تحت حضرت ابن عباسؓ کی روایت مروی ہے

---

[1] دیکھئے صحیح بخاری (ج ۱ ص ۲۲۹) باب من ساق البدن معہ۔ وصحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۰۳) باب وجوب الدم علی المتمتع الخ ۱۲ م

[2] (ص ۱۹۸ و ۱۹۹) باب القران بین الحجۃ والعمرۃ ۱۲ م

[3] (ج ۱ ص ۲۰۷ و ۲۰۸) کتاب المناسک، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم العقیق وادٍ مبارک۔ نیز دیکھئے (ج ۱ ص ۳۱۴) باب (بلا ترجمہ) بعد باب من أحیی أرضاً مواتاً، أبواب الحرث والمزارعۃ وما جاء فیہ ۱۲ مرتب

[4] قال صاحب مجمع البحار: العقیق ہو وادٍ من أودیۃ المدینۃ وورد أنہ وادٍ مبارک۔ ک: کرمانی ومنہ: أتانی آتٍ بالعقیق، والآتی جبرئیل، ولعل المراد بـ "صلِّ" سنۃ الاحرام، وقل: عمرۃ فی حجۃ، أی مدرجۃ فی حجۃ۔ یعنی القران۔ أو فی بمعنی مع۔ (ج ۳ ص ۶۴۳) ۱۲ مرتب

[5] (ج ۱ ص ۴۰۱ و ۴۰۲) باب جواز التمتع۔ روایت میں "أجل" کے بعد حضرت عثمان کے یہ الفاظ بھی مروی ہیں: "ولکنا کنا خائفین" اس کے مطلب اور تشریح کے لئے دیکھئے فتح الملہم (ج ۳ ص ۲۹۹) باب جواز التمتع ۱۲ مرتب

تمتع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی مات ، وأبو بکر حتی مات وعمر حتی مات وعثمان حتی مات رضی اللہ عنہم الخ[1] " یہاں بھی تمتع سے قِران مراد ہے کما مرّ۔

اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے قِران ثابت ہوجاتا ہے۔

(۷) پیچھے حضرت انسؓ کی روایت کے ذیل میں صحیحین[2] کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ذکر کی جاچکی ہے " فأهلّ بالعمرة ثم أهلّ بالحج " یہ الفاظ بھی قِران پر دال ہیں۔

(۸) صحیحین[3] ہی میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے اسی قسم کے الفاظ مروی ہیں۔

(۹) سننِ نسائی میں حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے " قال كنتُ مع علي بن أبي طالب

---

[1] معارف السنن (ج ۶ ص ۲۸۶) میں ترمذی " باب التمتع " کے حوالے سے روایت اسی طرح مروی ہے ، نیز نصب الرایہ (ج ۳ ص ۱۰۰ ، أحادیث القائلین بأفضلیة التمتع) میں بھی ترمذی کے حوالے سے روایت کے یہی الفاظ مروی ہیں ، لیکن جامع ترمذی کے ہمارے پاس موجود تین مختلف نسخوں میں روایت اس طرح ہے " تمتع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابوبکر وعمر وعثمان وأول من نهی عنه معاویة " کسی بھی نسخہ میں چاروں مقامات میں سے کسی بھی مقام پر حتی مات کے الفاظ موجود نہیں۔ واللہ أعلم

البتہ طحاوی (ج ۱ ص ۳۱۵ ، باب ما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم به محرمًا فی حجة الوداع) کی روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں ۔ بہرحال مقصود دونوں طرح کے الفاظ سے حاصل ہوجاتا ہے ۱۲ مرتب عفی عنہ

[2] صحیح بخاری (ج ۱ ص ۲۲۹) باب من ساق البدن معه ۔ وصحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۰۳) باب وجوب الدم علی المتمتع ۱۲ م

[3] بخاری (ج ۱ ص ۲۲۹) ۔ ومسلم (ج ۱ ص ۴۰۲) ۔ نیز حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ہے : " أهللت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعمرة في حجته " کنز العمال (ج ۵ ص ۹۵ ، باب القران (رقم ۶۹۱) بورمز " ن " ۱۲ مرتب

[4] (ج ۲ ص ۱۳) باب القران ۔ سننِ نسائی ہی میں " باب الحج بغیر نیة یقصده المحرم " کے تحت یہی روایت اس طرح مروی ہے " عن البراء قال : كنتُ مع علي حين أمّره النبي صلی اللہ علیہ وسلم على اليمن ، فأصبت معه أواقي فلما قدم علي على النبي صلی اللہ علیہ وسلم قال علي : وجدت فاطمة قد نضحت البيت بنضوح ، قال : فتخطيته ، فقالت لي : مالك ، فإن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قد أمر أصحابه فأحلّوا ؟ قال : قلت : إني أهللتُ بإهلال النبي صلی اللہ علیہ وسلم ، قال فأتيتُ النبي صلی اللہ علیہ وسلم فقال لي : كيف صنعت ؟ قلت : إني أهللتُ بما أهللت ، قال : فإني قد سقتُ الهدي وقرنت " (ج ۲ ص ۱۶) حضرت براء بن عازبؓ کی یہی روایت سننِ ابی داؤد میں بھی مروی ہے ، چنانچہ اس میں بھی " فإني قد سقتُ الهدي وقرنت " کے الفاظ موجود ہیں۔ (دیکھئے ج ۱ ص ۲۵۰) باب فی القران

نیز علامہ علی المتقیؒ نے الباوردی ، ابن قانع اور ابونعیم کے حوالے سے صبی بن معبد کی روایت (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حین أمّرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی الیمن، فلما قدم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال علیّ: فأتیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فقال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: کیف صنعت؟ قلتُ: أھللتُ بإھلالك، قال: فإنی سُقتُ الھدی وقرنتُ، قال: وقال صلی اللہ علیہ وسلم لأصحابہ: لو استقبلت من أمری ما استدبرت لفعلت کما فعلتم، ولکنی سقتُ الھدی وقرنتُ" اس موضوع پر اس سے زیادہ صریح روایت نہیں ہو سکتی جس میں آپؐ نے خود تصریح فرمادی کہ میں نے قران کیا ہے۔

(۱۰) مسند احمد میں حضرت انسؓ کی روایت میں بھی "ولکنی سقت الھدیَ وقرنتُ الحج والعمرۃ" کے الفاظ مروی ہیں[1]۔

(۱۱) صحیح بخاری[2] میں حضرت ابن عمرؓ ام المومنین حضرت حفصہؓ کے بارے میں نقل کرتے ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کنت قریب عھد بنصرانیۃ، فأسلمت ثم أردت الحج، فأتیت رجلاً من قومی یقال لہ ادیم التغلبی، فأمرنی أن أقرن "وأخبرنی أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قرن" فمررت بزید بن صوحان وسلمان بن ربیعۃ، فقالا لی: لأنتَ أضلّ من بعیرك، فوقع فی نفسی من ذلك، فمررتُ علی عمر، فسألتہ فقال: ھدیت لسنۃ نبیك صلی اللہ علیہ وسلم" کنز العمال (ج ۵ ص۸۴و۸۵) القران۔ رقم ۶۸۵۔

صُبیّ بن معبد کی روایت الفاظ کے فرق کے ساتھ سنن ابی داود (ج ۱ ص۲۵۰، باب فی الاقران) سنن نسائی (ج ۲ ص۱۲ و۱۳، باب القِران) اور سنن ابن ماجہ (ص۲۱۳، باب من قرن الحج والعمرۃ) میں بھی مروی ہے ۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ

حاشیہ صفحہ ھٰذا:

[1] پوری روایت اس طرح ہے "وعن أنس بن مالك قال: خرجنا نصرخ بالحج صُراخاً، فلما قدمنا مکۃ أمرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن نجعلھا عمرۃ وقال: لو استقبلت من أمری ما استدبرتُ لجعلتھا عمرۃ ولکن سقت الھدی وقرنت الحج والعمرۃ"۔ علامہ ہیثمیؒ مجمع الزوائد میں اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں "رواہ أحمد وأبو یعلی والطبرانی فی الأوسط، وفیہ أبو أسماء الصیقل، ولم أجد من روی عنہ غیر أبی إسحاق" (ج ۳ ص۲۳۵، باب فی القِران وغیرہ وحجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم) ۱۲ مرتب عفی عنہ

[2] (ج ۱ ص۲۱۳) باب التمتع والإقران والإفراد بالحج۔ و (ج ۱ ص۲۳۳) باب من لبّد رأسہ عند الإحرام والحلق۔ ۱۲ م

أنها قالت: یا رسول اللہ! ماشأن الناس حلوا بعمرۃ ولم تحلل أنت من عمرتك؟ قال: إنی لبدت رأسی وقلدت ھدیی، فلا أحل حتی أنحر" اور ایک روایت میں "فلا أحل حتی أحل من الحج" کے الفاظ آئے ہیں[1]

(۱۲) مسند احمد اور طحاوی میں حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے "سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: أھلوا یا آل محمد بعمرۃ فی حجۃ (اللفظ للطحاوی[3]) یہ قران کے بارے میں صریح قولی روایت ہے۔

یہ چند روایات بطور مثال پیش کی گئی ہیں ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قران فرمانا بیس[۲۰] سے زائد صحابہ کرام سے ثابت ہے[4]۔

---

[1] دیکھئے صحیح بخاری (ج ۱ ص۲۳۰) باب فتل القلائد للبدن والبقر۔ وصحیح مسلم (ج ۱ ص۴۰۳) باب بیان أن القارن لا یتحلل إلا فی وقت تحلل الحاج المفرد ۱۲ مرتب

[2] وقد اعترف النووی والحافظ وغیرھما من الشافعیۃ بأن ما تأوله الشافعیۃ فی مثل ھذا الحدیث تعسف، أنظر للتفصیل إعلاء السنن (ج ۱۰ ص۲۵۵ وص۲۵۶) أبواب وجوہ الإحرام، باب کون القران أفضل من التمتع والإفراد ۱۲ از استاذ محترم دام اقبالہم

[3] شرح معانی الآثار (ج ۱ ص۳۲۱) باب ماکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم بہ محرما فی حجۃ الوداع۔ علامہ ہیثمیؒ نے یہ روایت مسند احمد، مسند ابویعلی اور معجم طبرانی کبیر کے حوالہ سے مفصلاً نقل کی ہے اور معجم طبرانی کے یہ الفاظ ذکر کئے ہیں "أھلوا یا أمۃ محمد بحج وعمرۃ" اور آخر میں کہا ہے "رجال احمد ثقات" مجمع الزوائد (ج ۳ ص۲۳۵) باب فی القران وغیرہ وحجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ مرتب

[4] چنانچہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت انسؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت براء بن عازب، حضرت ابن عمر، حضرت صبی[۱۲] بن سعد رضی اللہ عنہم کی روایات پیچھے ذکر کی جاچکی ہیں۔ مزید حضرت عمران[۱۳] بن حصین کی روایت کے لئے دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۰۲ وص۴۰۳) باب جواز التمتع، حضرت ابوطلحہ[۱۴] کی روایت کے لئے دیکھئے سنن ابن ماجہ (ص۲۱۳) باب من قرن الحج والعمرۃ، حضرت سعد[۱۵] بن ابی وقاصؓ کی روایت کے لئے دیکھئے موطا امام مالک (ص۳۵۴) ماجاء فی التمتع، حضرت ابوقتادہ[۱۶] اور حضرت ابوسعید[۱۷] خدریؓ کی روایات کے لئے دیکھئے سنن دارقطنی (ج ۲ ص۲۸۶) باب المواقیت رقم ص۱۱۸ و ۱۱۹ اور حضرت ہرماسؓ، حضرت سراقہ[۱۹]، حضرت ابن ابی أوفیٰ اور حضرت ابوداؤد مازنیؓ کی روایات کے لئے دیکھئے مجمع الزوائد (ج ۳ ص۲۳۵ و ۲۳۶) باب فی القران وغیرہ وحجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ رشید اشرف سیفی

شافعیہ ان روایات کی یہ توجیہ کرتے ہیں[1] کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شروع میں تو افراد کا احرام باندھا تھا، لیکن بعد میں آپ نے اس کے ساتھ عمرہ کو شامل کر کے قران فرمالیا تھا[2]، اس بنا پر نہیں کہ قران افضل تھا بلکہ اس بنا پر کہ اس سے اہل جاہلیت کے ایک عقیدہ کی تردید مقصود تھی جو اشہر حج میں عمرہ کو جائز نہیں سمجھتے تھے اور اسے افجر الفجور قرار دیتے تھے، ان کا یہ مقولہ مشہور تھا[3] "إذا برأ الدبر وعفا الأثر وانسلخ صفر، حلّت العمرة لمن اعتمر" چنانچہ اس عقیدہ کی تردید کے لئے آپ نے حج اور عمرہ کو جمع فرمایا۔

---

[1] کما فی شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۰۵) باب فی الإفراد والقران۔ والمعارف للبنوری (ج ۶ ص ۲۷۵) ۱۲ م

[2] پھر ادخال عمرہ علی الحج کے بارے میں دو قول ہیں، ایک جواز کا اور ایک عدم جواز کا، علامہ نووی "شرح المہذب" میں لکھتے ہیں "وعلی الأصح لا یجوز لنا، وجاز للنبی صلی اللہ علیہ وسلم تلک السنة للحاجة"

علامہ بنوری فرماتے ہیں "وإنما اضطر الشافعیة إلی القول بذلک (أی إلی ذلک التوجیه) لکثرة الروایات فی قرانه صلی اللہ علیہ وسلم حتی لا یمکن لهم إنکارها، ثم قالوا بإدخاله صلی اللہ علیہ وسلم العمرة علی الحج، مع أن الروایات الصریحة فی قرانه صلی اللہ علیہ وسلم من بدء الأمر آبیة عن تأویلهم کل الإباء، والعجب من مثل الحافظ ابن حجر حیث سایر الشافعیة فی تأویلهم وأغمض عن کثیر من الروایات وهذا بعید عن مثله"۔ دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۲۷۵) ۱۲ مرتب

[3] جاہلیت کا یہ مقولہ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں منقول ہے، حضرت ابن عباسؓ اہل جاہلیت کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "کانوا یرون أن العمرة فی أشهر الحج أفجر الفجور فی الأرض ویجعلون المحرم صفر ویقولون "إذا برأ الدبر وعفا الأثر وانسلخ صفر حلّت العمرة لمن اعتمر" قدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم وأصحابه صبیحة رابعة مهلّین بالحج وأمرهم أن یجعلوها عمرة فتعاظم ذلک عندهم، فقالوا: یا رسول اللہ! أیّ الحل؟ قال: حلّ کلّه" (ج ۱ ص ۲۱۲، باب التمتع والإقران والإفراد بالحج)

روایت میں مذکور جاہلیت کے اس مقولہ کا مطلب یہ ہے کہ حج کی مشقت کے دوران اونٹوں کی پیٹھوں پر جو پالانوں کی وجہ سے زخم پڑ گئے تھے حج سے واپسی کے بعد جب وہ زخم مندمل ہو جائیں اور وہاں بال اُگنے لگیں اور زخموں کے نشانات ختم ہو جائیں اور صفر کا مہینہ ختم ہو جائے (یعنی وہ محرم جس کو انہوں نے صفر قرار دیا تھا ختم ہونے کے بعد اصل صفر شروع ہو جائے گویا اشہر حرم ختم ہو جائیں) اس وقت عمرہ جائز ہو جاتا ہے ۱۲ مرتب

لیکن یہ تاویل روایات پر منطبق نہیں ہوتی، اس لئے کہ متعدد روایات سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے ابتداہی سے قِران کا احرام باندھا تھا، جیساکہ حضرت انس[1]، حضرت براء بن عازب[2] اور حضرت علی[3] کی روایات سے معلوم ہوتا ہے، نیز حضرت ام سلمہؓ کی روایت "أھلّوا یا آل محمد بعمرۃ فی حجۃ"[4] بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ آپ نے ابتدا ہی سے قران کے لیے فرمایا تھا[5]۔

شافعیہ کا ایک استدلال اس سے بھی ہے کہ حضرت عمرؓ قِران سے منع کیا کرتے تھے، کما سیأتی فی "باب ماجاء فی التمتع"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا منشا قِران سے روکنا نہیں تھا بلکہ نہی سے ان کا منشا فسخ الحج إلی العمرۃ سے روکنا تھا وسیأتی تفصیلہ، إن شاء اللہ فی "باب ماجاء فی التمتع"۔

رہا حنابلہ کا یہ استدلال کرنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کی تمنا فرمائی تھی، سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تمنا اس بنا پر نہیں تھی کہ تمتع افضل تھا، بلکہ چونکہ اہل عرب میں یہ مشہور تھا کہ اشہر حج میں عمرہ کرنا جائز نہیں تو جب آپ نے لوگوں کو عمرہ کے بعد احرام کھولنے کا حکم دیا تو بہت سے لوگوں نے قدیم رسم کے مطابق اس کو ناپسند سمجھا اور اس ناپسندیدگی کا اظہار انہوں نے ان الفاظ سے کیا "أننطلق إلی منی وذکورنا تقطر[6]" اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر میں ہدی نہ لاتا اور تمتع کرتا تو اچھا تھا" تاکہ ان کے

---

[1] مجمع الزوائد (ج ۳ ص۲۳۵) باب فی القران وحجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ م

[2] و [3] سنن نسائی (ج ۲ ص۱۳) باب القران ــ و (ج ۲ ص۱۱) باب الحج بغیر نیۃ یقصدہ المحرم ۱۲ م

[4] شرح معانی الآثار (۱ ص۳۲۰) باب ما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم بہ محرمًا فی حجۃ الوداع ۱۲ م

[5] قال الشیخ البنوری فی المعارف (ج ۶ ص۲۹):

ثم ما تکلف البیہقی فی تأویلات روایات القران فی سننہ فقد أبی عنہا کبار أھل مذھبہ کالنووی والتقی السبکی وابن حجر وغیرھم بل سماھا الحافظ ابن حجر تعسفًا، والحافظ علاء الدین قد کشف عن تعسفہ وأجابہ بما شفی وکفی۔

ومن ضعف مذھب إمامہ فی المسألۃ رجع عنہا مثل المزنی وابن المنذر وأبی إسحاق المروزی من قدماء أتباعہ والتقی السبکی من متأخریھم، واضطر مثل النووی وابن حجر وغیرھما من الشافعیۃ والقاضی عیاض من المالکیۃ إلی القول بانتہاء أمرہ صلی اللہ علیہ وسلم إلی القران ۱۲ مرتب

[6] کما فی روایۃ أبی داؤد فی سننہ (ج ۱ ص۲۴۹) باب فی إفراد الحج ــ اور صحیح مسلم (ج ۱ ص۳۹۲، باب بیان وجوہ الإحرام الخ) میں یہ الفاظ مروی ہیں "فنأتی عرفۃ تقطر مذاکیرنا المنی" ۱۲ مرتب

خیالِ باطل کی تردید ہو سکتی[1]۔

افضلیتِ قِران کی وجوہِ ترجیح

پھر افضلیتِ قِران کی کچھ اور بھی وجوہِ ترجیح ہیں۔

(۱) قِران کی روایات افراد کی روایات کے مقابلہ میں عدداً زیادہ ہیں۔

(۲) جن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اِفراد مروی ہے ان سے قِران بھی مروی ہے جیسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرہ، لیکن ایسے صحابہ کرام متعدد ہیں جن سے صرف قِران مروی ہے افراد نہیں مثلاً حضرت انس، حضرت عمران بن حصین اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہم وغیرہ

(۳) افراد کی احادیث تمام تر فعلی ہیں لیکن قِران کی احادیث فعلی بھی ہیں اور قولی بھی، اور قولی فعلی کے مقابلہ میں راجح ہوتی ہے۔

(۴) افراد کی روایات میں بآسانی تأویل ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ قارن کے لئے صرف "لبّیك بحجّة" کہنا بھی جائز ہوتا ہے تو جن حضراتِ صحابہ نے صرف "لبّیك بحجّة" سُنا انہوں نے آپ کے احرام کو اِفراد سمجھا اور اسی کے مطابق روایت کردیا بخلاف قِران کے کہ اس کی روایات میں تاویل ممکن نہیں۔

(۵) کسی بھی روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے "أفردت" یا "تمتعت" فرمایا ہو، لیکن حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایات میں "قرنت" کی تصریح موجود ہے کما بیّنّا۔

(۶) قِران میں مشقت زیادہ ہے، اس لئے بھی وہ افضل ہے[2]۔ بخلاف تمتع اور افراد

---

[1] اس جواب کی تائید سنن ابی داؤد کی روایت کے اگلے الفاظ سے بھی ہوتی ہے "فبلغ ذلك (أی إنكارهم للحلق) رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال: لو أنّی استقبلت من أمری ما استدبرت ما أهدیت ولولا أنّ معی الهدی لأحللت" (ج ۱ ص ۲۴۹) باب فی إفراد الحج ۱۲ مرتب

[2] چنانچہ بخاری کی روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے "قالت عائشة یا رسول الله: یصدر الناس بنسکین وأصدر بنسك قیل لها: انتظری، فاذا طهرتِ فاخرجی إلی التنعیم فأهلّی ثم ائتینا بمكان كذا ولكنها (وفی نسخة ولكنه) علی قدر نفقتك أو نصبك" (ج ۱ ص ۲۴۰) أبواب العمرة، باب أجر العمرة علی قدر النصب معلوم ہوا کہ حج و عمرہ کی فضیلت مشقت کے بقدر ہے اور مشقت طویل احرام کی وجہ سے یقیناً قِران ہی میں زیادہ ہے۔
نیز ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا "فما الحاج؟" تو آپ نے ارشاد فرمایا "الشعث التفل" (پراگندہ بال اور میلا کچیلا) دیکھئے ابن ماجہ ص ۲۰۹ باب ما یوجب الحج) یعنی اصل حاجی وہ ہے جو حج کی مشقت اٹھاتے ہوئے پراگندہ حال اور میلا کچیلا ہو چکا ہو اور طویل احرام کے باعث قارن کے حق میں اس کا زیادہ امکان ہے ۱۲ مرتب عفی عنہ

کے، کران میں اتنی مشقت نہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی معروف حدیث ہے "أن النبي صلی اللہ علیہ وسلم سُئل: أيّ الحج أفضل؟ قال العج والثج"[1] یعنی جس حج میں تلبیہ اور قربانی زیادہ ہو وہ افضل ہے، قران میں تلبیہ بھی زیادہ ہوتا ہے اور قربانی بھی واجب ہوتی ہے بخلاف تمتع کے، کہ اس میں تلبیہ زیادہ نہیں ہوتا اور بخلاف افراد کے کہ اس میں قربانی واجب نہیں ہوتی۔ واللہ أعلم وعلمہ أتم وأحکم

باب ماجاء فی التمتّع

"عن محمد[3] بن عبد اللہ بن الحارث بن نوفل أنه سمع سعد بن أبي وقاص والضحاك بن قيس وهما يذكران التمتع بالعمرة إلى الحج، فقال الضحاك بن قيس: لا يصنع ذلك إلا من جهل أمر اللہ تعالى، فقال سعد: بئس ما قلت يا ابن أخي، فقال الضحاك: فإن عمر بن الخطاب قد نهى عن ذلك" حضرت عمر فاروق نیز حضرت عثمان غنی کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ وہ قران اور

---

[1] سنن ترمذی (ج ۱ ص ۱۳۲، باب ما جاء فی فضل التلبیة والنحر) واللفظ له ـ وسنن ابن ماجہ (ص ۲۱۰ باب رفع الصوت بالتلبیة)۔

العج: هو رفع الصوت بالتلبية، والثج: هو سيلان دم الهدى والأضاحي ۱۲ مرتب

[2] علامہ بنوری نے قران کی افضلیت کی ایک وجہ ترجیح یہ بیان کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "دخلت العمرة في الحج إلى يوم القيامة" (سنن ترمذی)۔ (ج ۱ ص ۱۴۲ ـ باب منه، بعد باب ما جاء فی العمرة أواجبة هی أم لا) کا تقاضا یہ ہے کہ عمرہ حج کا جزء ہو، وذلك لا يكون إلا بالقران ـ معارف (ج ۶ ص ۲۹)

علامہ ابن القیم نے قران اور روایاتِ قران کی ایک وجہ ترجیح یہ بیان کی ہے: "أن رواة الإفراد أربعة: عائشة، وابن عمر وجابر، وابن عباس. والأربعة رووا القران، فإن صرنا إلى تساقط رواياتهم سلمت رواية من عداهم للقران عن معارض، وإن صرنا إلى الترجيح وجب الأخذ برواية من لم تضطرب الرواية عنه، ولا اختلفت كالبراء وأنس وعمر بن الخطاب وعمران بن حصين وحفصة ومن معهم ممن تقدم" زاد المعاد (ج ۱ ص ۲۲۲) فصل فی أعذار الذين وهموا في صفة حجته۔

قران اور روایاتِ قران کی مزید وجوہ ترجیح کیلئے دیکھئے "معارف السنن" (ج ۶ ص ۲۸ تا ۲۹) اور "زاد المعاد فی هدی خير العباد" (ج ۱ ص ۲۲۲ تا ۲۲۳) فصل فی أعذار الذين وهموا في صفة حجته ۱۲ مرتب عفی عنہ

[3] الحديث أخرجه النسائي في سننه (ج ۲ ص ۱۶) كتاب مناسك الحج، باب التمتع ۱۲ م

تمتع سے منع فرمایا کرتے تھے۔[1]

علامہ نوویؒ نے تو اس نہی کو نہیِ تنزیہ پر محمول کرتے ہوئے فرمایا کہ چونکہ ان دونوں حضرات کے نزدیک افراد افضل تھا اس لئے قِران اور تمتع سے منع فرمایا کرتے تھے گویا ان کے نزدیک یہ حجِ اِفراد کی افضلیت کی دلیل ہے۔[2]

لیکن حنفیہ نے حضرت عمرؓ وغیرہ کی نہی کی متعدد توجیہات کی ہیں، ایک یہ کہ دراصل وہ ایک سال میں حج اور عمرہ دونوں کے لئے مستقل سفر کرنے کو تمتع اور قِران کے مقابلہ میں افضل قرار دیتے تھے اور یہ صورت حنفیہ کے نزدیک بھی یقیناً افضل ہے۔ یہ توجیہ نہی عن التمتع اور نہی عن القِران دونوں سے متعلق ہے۔[3]

اس توجیہ کی تائید مسلمؒ کی روایت سے ہوتی ہے جس میں حضرت عمرؓ فرماتے ہیں "فافصلوا حجّکم من عمرتکم فإنه أتم لحجّکم وأتم لعمرتکم" اور اس سے بھی زیادہ صریح مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت ہے "إن أتم لحجّکم وعمرتکم أن تنشئوا لکل منهما سفراً"[4]

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ نہی عن القِران اور نہی عن التمتع دونوں کی علیحدہ علیحدہ وجہ ہے۔[5] نہی عن القِران کی وجہ تو یہ تھی کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک اگر ایک انسان ایک سال میں دو سفر کرے ایک مستقلاً حج کے لئے اور دوسرا مستقلاً عمرہ کے لئے تو ان کے نزدیک یہ صورت قِران اور تمتع سے زیادہ

---

[1] حضرت عمرؓ کا منع فرمانا تو روایتِ باب سے ثابت ہو ہی رہا ہے، اور حضرت عثمانؓ کا منع فرمانا صحیحین کی روایت سے ثابت ہے، چنانچہ بخاری میں روایت ہے "عن مروان بن الحکم قال: شهدت عثمان وعلياً وعثمان ينهى عن المتعة وأن يجمع بينهما، فلما رأى على أهلّ بهما لبيك بعمرة وحجة قال: ما كنت لأدع سنة النبي صلى الله عليه وسلم لقول أحد" (ج ۱ ص ۲۱۳) باب التمتع والإقران والإفراد بالحج۔ اور مسلم میں سعید بن المسیبؒ سے مروی ہے "قال: اجتمع علي وعثمان بعسفان، فكان عثمان ينهى عن المتعة (ج ۱ ص ۴۰۲) باب جواز التمتع ۱۲ مرتب

[2] دیکھئے شرح نوویؒ علیٰ صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۰۲) باب جواز التمتع ۱۲ م

[3] معارف السنن (ج ۱ ص ۲۹۸) ۱۲ م

[4] (ج ۱ ص ۳۹۳) باب بیان وجوه الإحرام ۱۲ م

[5] فتح الباری (ج ۳ ص ۳۳۲) باب التمتع والقِران والإفراد بالحج ۱۲ م

[6] تفصیل کے لئے دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۲۹۸ تا ص ۳۰۲) ۱۲ م

افضل ہے اور ظاہر ہے کہ یہ صورت حنفیہ کے نزدیک بھی افضل ہے[1]، لیکن جو شخص سال میں دو سفر کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو اس کے لئے بھی حضرت عمرؓ کے نزدیک قران میں کوئی کراہت نہ تھی، بلکہ اُسے تمتع اور افراد سے افضل سمجھتے تھے جیسا کہ طحاوی[2] میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں: یقولون: إن عمر نهى عن المتعة، فقال عمر: لو اعتمرت فی عام مرّتین ثم حججت لجعلتها مع حجّتی[3]" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ تو قران کی تمنا کیا کرتے تھے پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس سے روکیں، لہٰذا ان کی نہی کا مطلب یہی ہے کہ قران دیسے تو تمتع اور افراد سے افضل ہے لیکن ایک صورت اس سے بھی افضل ہے لہٰذا اس کے بجائے اُس صورت کو اختیار کرنا چاہئے یعنی ایک سال میں حج کے لئے مستقل سفر کیا جائے اور عمرہ کے لئے مستقل، ولا اختلاف فیہ۔

اور نہی عن التمتع کی وجہ یہ مشہور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں حلال ہونے کے بعد عین حج کے موقعہ پر احرام باندھنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے[4]، اور یہ ایسا ہی تھا جیسا کہ بعض صحابہ کرامؓ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر اس کی

---

[1] جیسا کہ امام محمدؒ فرماتے ہیں: " قال محمد: یعتمر الرجل ویرجع إلی أهله ثم یحج ویرجع إلی أهله فیکون ذلك فی سفرین أفضل من القران، ولکن القران أفضل من الحج مفرداً والعمرة من مکة ومن التمتع والحج من مکة، لأنه إذا قرن کانت عمرته وحجته من بلده وإذا تمتع کانت حجته مکیة وإذا أفرد بالحج کانت عمرته مکیة فالقران أفضل، وهو قول أبی حنیفة رحمه الله والعامة من فقهائنا" موطا امام محمد (ص۲۰۰۲) باب القران بین الحج والعمرة ۱۲ مرتب عفی عنہ

[2] (ج ۱ ص ۳۱۶) باب ما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم به محرماً فی حجة الوداع ۱۲ م

[3] امام طحاوی نے مذکورہ روایت دو سندوں سے ذکر کی ہے

(۱) حدثنا سلیمان بن شعیب قال: ثنا عبد الرحمن بن زیاد قال: ثنا شعبة عن سلمة بن کهیل قال: سمعت طاؤسا یحدث عن ابن عباس ....

(۲) حدثنا حسین بن نصر قال: ثنا أبو نعیم قال: ثنا أبو نعیم قال سفیان عن سلمة عن طاؤس عن ابن عباس ..... ۱۲ م

[4] اس کی تائید مسلم کی روایت سے ہوتی ہے" عن أبی موسی أنه کان یفتی بالمتعة، فقال له رجل: رویدك ببعض فتیاك، فإنك لا تدری ما أحدث أمیر المؤمنین فی النسك بعد حتی لقیه بعد فسأله، فقال عمر: قد علمت أن النبی صلی اللہ علیه وسلم قد فعله وأصحابه ولکن کرهت أن یظلوا معرسین بهن فی الأراك ثم یروحون فی الحج تقطر رءوسهم" (ج ۱ ص ۴۰۰) باب جواز تعلیق الإحرام ۱۲ مرتب

کراہیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا "أنطلق إلى منىٰ وذکورنا تقطر"[1]

لیکن اس پر اشکال ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کیسے محض اپنی رائے سے تمتع کو مکروہ سمجھتے تھے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کا حکم دیا تھا[2]

اس لئے احقر کے نزدیک سب سے بہتر وجہ وہ ہے جو علامہ عثمانیؒ نے اعلاء السنن[3] میں بیان فرمائی ہے کہ درحقیقت حضرت عمرؓ تمتع اصطلاحی سے منع نہ فرماتے تھے بلکہ وہ "فسخ حج الی العمرہ" سے روکتے تھے جس کی تفصیل یہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے عقیدۂ جاہلیت کی بنا پر اشہر حج میں عمرہ کو مکروہ سمجھتے ہیں تو آپؐ نے اُن صحابۂ کرام کو جنہوں نے افراد کر رکھا تھا، یا بغیر سوقِ ہدی کے قران کا احرام باندھا ہوا تھا حکم دیا کہ فسخ حج الی العمرہ پر عمل کرتے ہوئے طواف وسعی کے بعد حلال ہو جائیں تاکہ اشہرِ حج میں عمرہ کی کراہیت سے متعلق عقیدۂ جاہلیت کی تردید ہو سکے، چنانچہ حضرت جابرؓ کی طویل روایت میں مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "فمن کان منکم لیس معه هدی فلیحل ولیجعلها عمرة"[4]

لیکن فسخ حج الی العمرہ کی یہ صورت صحابۂ کرامؓ کے ساتھ خاص تھی اور ان کے لئے بھی صرف اسی سال مصلحۃً جائز کی گئی تھی جیسا کہ سنن ابی داؤد[5] کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے "عن سلیم بن الأسود أن أبا ذر کان یقول فی من حج ثم فسخها بعمرة : لم یکن ذلك إلا للرکب الذین کانوا مع رسول الله صلی الله علیه وسلم" نیز سنن نسائی[6] میں حضرت بلال بن الحارثؓ کی روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں "قلت : یا رسول الله ، أفسخ الحج لنا خاصة أم للناس عامة؟ قال : بل لنا خاصة"[7]

---

[1] سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۲۴۹) باب فی إفراد الحج ۱۲ م

[2] جیسا کہ متعدد روایات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم فرمانا معلوم ہوتا ہے، چنانچہ مسلم میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا "ومن لم یکن منکم أهدی فلیطف بالبیت وبالصفا والمروة ولیقصر ولیحلل ثم لیحل بالحج ولیهد" (ج ۱ ص ۴۰۳) باب وجوب الدم علی المتمتع ۱۲ مرتب

[3] (ج ۱۰ ص ۲۶۰) باب إفراد الحج والعمرة الخ ۱۲ م

[4] صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۹۶) باب حجة النبی صلی الله علیه وسلم ۱۲ م

[5] (ج ۱ ص ۲۵۱ و ۲۵۲) کتاب المناسك، باب الرجل یهل بالحج ثم یجعلها عمرة ۱۲ م

[6] (ج ۲ ص ۲۲) کتاب المناسك، إباحة فسخ الحج بعمرة لمن لم یسق الهدی ۱۲ م

[7] سنن ابی داؤد میں یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے "قلت : یا رسول الله ، فسخ الحج لنا خاصة أو لمن بعدنا؟ قال : بل لکم خاصة" (ج ۱ ص ۲۵۲) باب الرجل یهل بالحج ثم یجعلها عمرة ۱۲ م

فسخ حج الی العمرہ کی یہ صورت اگرچہ خواص کے لئے تھی لیکن بعض لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اس کا جواز تمام مسلمانوں کے لئے ہے، اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تنبیہ فرمائی اور تمتع یا متعہ کے الفاظ کے ساتھ اس سے منع فرمایا، — واضح رہے کہ قرونِ اولیٰ میں یہ الفاظ متعدد معانی کے لئے استعمال ہوتے رہے ہیں جن میں سے ایک معنی تمتع اصطلاحی کے اور ایک فسخ الحج الی العمرہ کے بھی ہیں، کما ذکرہ الحافظ فی الفتح[1]، چنانچہ مسلم شریف[2] میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی روایت "کانت المتعۃ فی الحج لأصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاصۃ" میں "متعۃ فی الحج" سے مراد فسخ الحج الی العمرہ ہی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جن روایات میں حضرت عمرؓ یا حضرت عثمان غنیؓ سے نہی عن التمتع منقول ہے ان میں "فسخ الحج الی العمرہ" مراد ہے جس کا جواز حجۃ الوداع کے ساتھ خاص تھا، ورنہ تمتع اصطلاحی کے جواز میں ان میں سے کسی کو بھی شبہ نہ تھا[3]۔ بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تو تمتع کی تمنا مروی ہے، فرماتے ہیں "لو حججت لتمتعت

---

[1] (ج ۳ ص ۳۳۳) باب التمتع والقران والإفراد بالحج وفسخ الحج لمن لم یکن معہ ھدی — اس مقام پر لفظ تمتع کی تحقیق کرتے ہوئے حافظ فرماتے ہیں "أما التمتع فالمعروف أنہ الاعتمار فی أشھر الحج ثم التحلل من تلک العمرۃ والإھلال بالحج فی تلک السنۃ، قال اللہ تعالیٰ: فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ویطلق التمتع فی عرف السلف علی القران أیضا، قال ابن عبد البر: لاخلاف بین العلماء أن التمتع المراد بقولہ تعالیٰ: "فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ" أنہ الاعتمار فی أشھر الحج قبل الحج۔ قال: ومن التمتع أیضا القران، لأنہ تمتع بسقوط سفر للنسک الآخر من بلدہ، ومن التمتع: فسخ الحج أیضا الی العمرۃ انتہی ۱۲ مرتب

[2] (ج ۱ ص ۴۰۳) باب التمتع فی الحج، مسلم ہی میں حضرت ابو ذرؓ کی ایک روایت اس طرح مروی ہے "کانت لنا رخصۃ یعنی المتعۃ فی الحج" ۱۲ م

[3] اور یہ بھی کیسے سکتا ہے جبکہ تمتع اصطلاحی کا جواز کتاب اللہ سے ثابت ہے، ارشاد ربانی ہے "فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ" سورۂ بقرہ (آیت ۱۹۶ پ ۲) اسی لئے حضرت سالم بن عبد اللہ کے بارے میں مروی ہے "أنہ سئل عن نہی عمر عن متعۃ الحج، قال: لا، أبعد کتاب اللہ تعالیٰ؟" اور حضرت نافعؒ کے بارے میں مروی ہے "أن رجلا قال لہ: أنہی عمر عن متعۃ الحج؟ قال: لا" زاد المعاد (ج ۱ ص ۲۵۰، فصل فی إھلالہ صلی اللہ علیہ وسلم بالحج) بحوالہ مصنف عبد الرزاق

نیز سنن ابی داؤد میں حضرت عثمان کے بارے میں سندِ صحیح کے ساتھ مروی ہے "عن إبراھیم التیمی عن أبیہ قال: سئل عثمان عن متعۃ الحج، فقال: کانت لنا، لیست لکم" زاد المعاد (ج ۱ ص ۲۵۱) ۱۲ مرتب

ثم لو حججت لتمتعت " والله أعلم۔ وراجع لتفصيل البحث إعلاء السنن (ج ۱۰ ص۲۵۸ إلى ص۲۶۲، باب إفراد الحج والعمرة) فإنه کفٰی فی ھٰذا الباب بما لا مزید علیه۔

؎ ذکرہ الأثرم في سننه وغیرہ، کما في زاد المعاد (ج ۱ ص۲۵۰)

نیز زاد المعاد (ج ۱ ص۲۵۰) ہی میں مصنف عبد الرزاق کے حوالہ سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت مروی ہے "ھٰذا الذی یزعمون أنه نھٰی عن المتعة؟ - یعنی عمر - سمعته یقول: لو اعتمرت ثم حججت لتمتعت"۔

علامہ ابن الاثیر جزریؒ نے جامع الاصول (ج ۳ ص۱۱۱، رقم ۱۴۰۳، التمتع وفسخ الحج) میں سنن نسائی کے حوالہ سے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے "قال: سمعت عمر یقول: واللہ، لا أنھاکم عن المتعة وإنھا لفی کتاب اللہ ولقد فعلھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی: العمرة فی الحج" لیکن سنن نسائی کے مطبوعہ نسخہ میں یہ روایت "واللہ لأنھاکم عن المتعة الخ" کے الفاظ کے ساتھ مذکور ہے (دیکھئے ج ۲ ص۱۵، التمتع) معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابن الاثیرؒ کے پاس سنن نسائی کا جو نسخہ تھا اس میں روایت "لا أنھاکم" کے الفاظ کے ساتھ مذکور تھی، روایت کے سیاق سے اُسی نسخہ کی تائید ہوتی ہے، اور اگر روایت کے الفاظ "لأنھاکم" ہی مانے جائیں تب بھی روایت کا مطلب یہ ہوگا کہ میں خاص متعہ یعنی فسخ الحج الی العمرہ سے روکتا ہوں ورنہ متعہ اصطلاحی تو کتاب اللہ میں بھی موجود ہے اس سے روکنے کا کیا سوال؟۔

البتہ ایک روایت (جسے ہم پیچھے بھی ذکر کر چکے ہیں) ایسی ہے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ تمتع اصطلاحی کو ناپسند کرتے تھے اس میں حضرت عمرؓ فرماتے ہیں "قد علمت أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد فعله وأصحابه ولکن کرھت أن یظلوا معرسین بھن فی الأراك ثم یروحون فی الحج تقطر رؤوسھم" مسلم (ج ۱ ص۴۰۱، باب جواز تعلیق الإحرام) لیکن حقیقت یہ ہے کہ دوسرے دلائل کی روشنی میں یہ روایت بھی فسخ الحج الی العمرۃ ہی پر محمول ہے اور اس کا مفصل تسلی بخش جواب علامہ عثمانیؒ نے دیا ہے وہ اس روایت کے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"قالوا: فقوله: "فعله النبی صلی اللہ علیه وسلم وأصحابه (أی أمر به، لأنه صلی اللہ علیه وسلم لم یفسخ حجه إلی العمرة قط، کما تظافرت به الأحادیث) ولکن کرھت الخ" یدل علی أنه کان ینکر التمتع المعروف قلنا: إنه أطلق الکراھة وأراد التحریم، وکثیرا ما یطلق ذلك، ولم یکن لیمنع بالرأی ما جوزہ النبی صلی اللہ علیه وسلم، وإنما تمسك لحرمة الفسخ، بقوله تعالیٰ: "وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ" ورأی أن ما أمر به النبی صلی اللہ علیه وسلم أصحابه رضی اللہ عنھم إنما کان لعلة، وقد ارتفعت، وقوله: "ولکن کرھت أن یظلوا معرسین بھن فی الأراك" لیس لعلة النھی عن الفسخ، بل العلة إنما ھی فی قوله تعالیٰ: "وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ" الخ وذکر الکراھة إنما ھو لتأیید النص بکونه موافقا للقیاس" اعلاء السنن (ج ۱۰ ص۱۶۱) باب إفراد الحج والعمرۃ الخ ۱۲ مرتب عافاہ اللہ

فقال سعد : قد صنعها رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" اس سے یہ مراد نہیں کہ آپؐ نے تمتع اصطلاحی کیا تھا بلکہ یہاں تمتع سے جمع بین الحج والعمرۃ یعنی قران مراد ہے کیونکہ کسی کے نزدیک بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم متمتع نہیں تھے۔ البتہ حنابلہ کی ایک جماعت نے آپؐ کے متمتع ہونے کا دعویٰ کیا ہے[1]۔ اور اس کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ حضرت معاویہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کوہِ مروہ کے قریب مشقص[2] سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کا قصر کیا تھا[3]۔ اور مروہ کے قریب قصر اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ آپ عمرہ کر کے حلال ہو گئے ہوں اور یہ صورت صرف متمتع ہونے میں ممکن ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کا یہ واقعہ حج سے متعلق نہیں بلکہ عمرۂ جعرانہ سے متعلق ہے[4]۔

[1] کما قالہ القاضی أبو یعلی وغیرہ۔ زاد المعاد (ج ۱ ص۲۲۳) فصل فی أغلاط العلماء فی عمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم وحجتہ ۱۲ م

[2] ھو بکسر المیم وإسکان الشین المعجمة وفتح القاف، قال أبو عبید وغیرہ : ھو نصل (بھل) السہم إذا کان طویلاً لیس بعریض، شرح صحیح مسلم نووی (ج ۱ ص۴۰۸) باب جواز تقصیر المعتمر ۱۲ م

[3] عن ابن عباس أن معاویة بن أبی سفیان أخبرہ قال : قصرت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمشقص وھو علی المروة أو رأیتہ یقصر عنہ بمشقص وھو علی المروة ۔ صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۰۸) باب جواز تقصیر المعتمر من شعرہ، کتاب الحج ۔ وأخرجہ أبو داؤد بفرق فی اللفظ (ج ۱ ص۲۵۱) باب فی الإقران وأخرجہ البخاری فی صحیحہ (ج ۱ ص۲۳۳، باب الحلق والتقصیر عند الإحلال، کتاب المناسک) ولیس فیہ ذکر المروة ۔ ۱۲ مرتب

[4] چنانچہ امام نوویؒ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں : "وھذا الحدیث محمول علی أنہ قصر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی عمرة الجعرانة، لأن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی حجة الوداع کان قارناً کما سبق إیضاحہ وثبت أنہ صلی اللہ علیہ وسلم حلق بمنیٰ وفرق أبو طلحة رضی اللہ عنہ شعرہ بین الناس، فلا یجوز حمل تقصیر معاویة علی حجة الوداع، ولا یصح حملہ أیضاً علی عمرة القضاء الواقعة سنة سبع من الھجرة لأن معاویة لم یکن یومئذ مسلماً، إنما أسلم یوم الفتح سنة ثمان، ھذا ھو الصحیح المشھور، ولا یصح قول من حملہ علی حجة الوداع وزعم أنہ صلی اللہ علیہ وسلم کان متمتعاً لأن ھذا غلط فاحش فقد تظاھرت الأحادیث الصحیحة السابقة فی مسلم وغیرہ أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قیل لہ : ماشأن الناس حلوا ولم تحل أنت ؟ فقال : إنی لبدت رأسی وقلدت ھدیی فلا أحل حتی أنحر الھدی" وفی روایة : "حتی أحل من الحج" واللہ أعلم نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۰۸) باب جواز تقصیر المعتمر ۱۲ مرتب

لہٰذا اس سے آپؐ کے متمتع ہونے پر استدلال نہیں ہوسکتا[1]۔

قولہ : "وأوّل من نہی عنہ معاویۃ[2]" اس روایت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ تمتع سے منع فرماتے تھے بلکہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تمتع سے روکا۔

لیکن علامہ عثمانیؒ اعلاء السنن[3] میں اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ دراصل حضرت معاویہؓ کا مقصود حجِ تمتع سے روکنا نہ تھا بلکہ حضرت ابن عباسؓ کے فتوے کو رد کرنا مقصود تھا جو اس بات کے قائل تھے "من حاء مهلاً

---

[1] لیکن اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ بعض کتبِ حدیث میں حضرت معاویہؓ کی مذکورہ روایت ایسے الفاظ کے ساتھ مروی ہے جن سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ عمرہ سے نہیں بلکہ حج ہی سے متعلق ہے، چنانچہ سننِ ابی داؤد میں حسن بن علی کے طریق میں "أما علمت أني قصرت عن رسول الله صلی الله علیه وسلم بمشقص أعرابي على المروة" کے ساتھ "بحجته" کے الفاظ بھی مروی ہیں۔ دیکھئے (ج ۱ ص ۲۵۱) باب فی الإقران — اور مسند احمد میں یہ روایت "قیس بن سعد عن عطاء" کے طریق سے اس طرح مروی ہے "أن معاویة حدّث أنه أخذ من أطراف شعر رسول الله صلی الله علیه وسلم في أيام العشر بمشقص معي وهو محرم"۔ فتح الملہم (ج ۳ ص ۲۱۱) باب جواز تقصیر المعتمر۔

اس کا جواب یہ ہے کہ زیادہ صحیح روایت صحیحین ہی کی ہیں جن میں اس قسم کی زیادتیاں مروی نہیں ہیں اور دوسری روایات معلول ہیں یا حضرت معاویہؓ کے وہم پر محمول ہیں، چنانچہ حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں "وأما رواية من روى " في أيام العشر" فليست في الصحيح، وهي معلولة أو وهم عن معاوية، قال قيس بن سعد : "رواها عن عطاء عن ابن عباس عنه" والناس ينكرون هذا على معاوية، وصدق قيس فنحن نحلف بالله أن هذا ما كان في العشر قط" زاد المعاد (ج ۱ ص ۲۲۹) فصل في تمتعه صلی الله علیه وسلم وإحرامه۔

علامہ علی المتقی نے ابن جریر کی تہذیب الآثار کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے "عن جبیر بن مطعم قال : أتيتُ النبي صلی الله علیه وسلم على المروة في عمرة وهو يقص بمشقص وهو يقول : دخلت العمرة في الحج إلى يوم القيامة" کنز العمال (ج ۵ ص ۸۵، رقم ۶۹۲) القِران — اس روایت سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع فرمایا تھا۔ اس روایت کی سند کی احقر کو تحقیق نہیں، اگر یہ سنداً صحیح بھی ہو تب بھی ان روایاتِ متواترہ یا مشہورہ کے مقابلہ میں حجت نہیں ہوسکتی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقع پر صرف منیٰ ہی میں حلال ہوئے اس سے پہلے حلال نہیں ہوئے۔ کما مرّ ۱۲ مرتب عفی عنہ

[2] الحديث أخرجه النسائي بتغير في اللفظ، أنظر (ج ۲ ص ۱۵) کتاب مناسك الحج، التمتع ۱۲ م

[3] (ج ۱۰ ص ۲۷) باب إفراد الحج والعمرة الخ ۱۲ م

بالحج، فإن الطواف بالبيت يصيره إلى عمرة شاء أو أبى[1] "یعنی جو شخص حج افراد کا احرام باندھ کر آئے تو طوافِ بیت اللہ سے فسخِ حج الی العمرۃ ہو جائے گا وہ چاہے یا نہ چاہے، جب حضرت ابن عباسؓ کا یہ فتویٰ مشہور ہوا اور اس کی وجہ سے لوگوں میں اضطراب پیدا ہوا تو حضرت معاویہؓ نے اس کی تردید کے لئے لوگوں پر زور دیا کہ وہ صرف حجِ افراد کا احرام باندھیں اور عمرہ کو اس کے ساتھ جمع نہ کریں نہ بصورتِ قران اور نہ بصورتِ تمتع، ان کا مقصود تمتع یا قران سے روکنا نہ تھا بلکہ اس مسئلہ کو واضح کرنا تھا کہ بغیر عمرہ کے حج افراد بلا کراہت درست ہے۔ واللہ اعلم۔

باب ماجاء فیما لایجوز للمحرم لبسه

"لا تلبس[2] القميص[3] ولا السراويلات ولا البرانس[4] ولا العمائم ولا الخفاف[5] إلا أن يكون أحد ليست له نعلان فليلبس الخفين وليقطعهما ما أسفل من الكعبين" کعبین سے مراد وسطِ قدم کی ہڈی ہے نہ کہ ٹخنا، اور مطلب یہ کہ ہڈی جوتے میں چھپی نہیں رہنی چاہئے صرح به محمد وهو إمام في اللغة والفقه كليهما۔

ولا تلبسوا شيئا من الثياب مسه الزعفران ولا الورس[6] ولا تنتقب المرأة الحرام احرام کی حالت میں عورت کا چہرہ پر اس طریقہ سے نقاب ڈالنا کہ وہ نقاب اس کے چہرہ سے

---

[1] رواہ عبد الرزاق عن معمر عن قتادة عن أبي الشعثاء عن ابن عباس، كما في زاد المعاد (ج ۲ ص ۱۸۶) بتحقيق شعيب الأرنؤوط وعبد القادر الارنؤوط۔

[2] الحديث أخرجه البخاري في صحيحه (ج ۱ ص ۲۰۹ و ص ۲۱۰) باب ما لا يلبس المحرم من الثياب۔ ومسلم في صحيحه (ج ۱ ص ۳۷۲ و ص ۳۷۳) كتاب الحج، باب ما يباح للمحرم بحج أو عمرة لبسه وما لا يباح ۔ ۱۲ مرتب

[3] هكذا في نسختنا الهندية، وفي النسخة اللبنانية (ج ۳ ص ۱۹۴ و ۱۹۵) التي حققها الشيخ محمد فؤاد عبد الباقي "لا تلبسوا القمص" (بصيغة الجمع) وهكذا في جامع الأصول (ج ۳ ص ۲۳-۲۲) تحت رقم ۱۲۹۱، كتاب الحج النوع الأول في اللباس ۱۲ مرتب

[4] یہ "برنس" کی جمع ہے، ایک لمبی ٹوپی عرب میں پہنی جاتی تھی، یا وہ لباس جس کا کچھ حصہ ٹوپی کی جگہ کام دے ۱۲ م

[5] راجع للتفصيل عمدة القاري (ج ۹ ص ۱۶۱ و ۱۶۲) باب ما لا يلبس المحرم من الثياب ۱۲ م

[6] ایک قسم کی نبات جو رنگائی وغیرہ کے کام آتی ہے۔ اس سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے عمدة القاري (ج ۹ ص ۱۶۲) ۱۲ م

مس ہونے لگے جائز نہیں، البتہ نقاب اس طرح سے لٹکا لینا کہ وہ چہرہ سے مس نہ ہو حضرت عائشہؓ کی حدیث سے ثابت ہے وہ فرماتی ہیں: "کان الرکبان یمرّون بنا ونحن محرمات مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فإذا حاذوا بنا سدلت إحدانا جلبابها من رأسها علی وجهها فإذا جاوزونا کشفناہ"[1] معلوم ہوا کہ اجانب کی موجودگی میں اس طریقہ سے نقاب لٹکا لینا کہ وہ چہرہ سے مس نہ ہو محرمہ کے لئے ضروری ہے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو مردوں پر غضِ البصار واجب ہے[2]۔

" ولا تلبس القفازین " حنفیہ کا مسلک بظاہر اس کے خلاف ہے کیونکہ ان کے نزدیک عورت کیلئے دستانے پہننا جائز ہے[3]۔ اور اس حدیث کا جواب یہ ہے کہ اس میں "ولا تنتقب" سے لیکر "ولا تلبس القفازین" تک کا جملہ حضرت ابن عمرؓ کا ادراج ہے جس کو محدثین نے تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ امام بخاری نے بھی اپنی صحیح میں کئی جگہ یہ روایت نقل کی ہے[4]، لیکن ایک جگہ کے سوا کہیں یہ جملہ نقل نہیں کیا، اور جہاں نقل کیا ہے وہاں اپنے صنیع سے اس کے ادراج پر تنبیہ کردی ہے[5]۔ اس کے علاوہ اگر اس زیادتی کا مرفوع ہونا ثابت بھی ہو جائے تب بھی یہ کراہت تنزیہی پر محمول ہوگی۔ واللہ اعلم۔

---

[1] سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۲۵۴) باب فی المحرمۃ تغطی وجهها۔

امام محمد رحمہ اللہ اپنی مؤطا میں لکھتے ہیں: "ولا ینبغی للمرأۃ أن تنتقب، فإن أرادت أن تغطی وجهها، فلتسدل الثوب سدلاً من فوق خمارها علی وجهها وتجافیه عن وجهها وهو قول أبی حنیفة والعامة من فقهائنا" (ص ۲۱۱) باب ما یکرہ للمحرم أن یلبس من الثیاب ۱۲ مرتب

[2] کذا فی ردّ المحتار علی الدر المختار (ج ۲ ص ۱۸۹ و ۱۹۰) قبیل باب القران - وراجعه للتفصیل - وفی إعلاء السنن: "وقد ظفرت فی مسند الشافعی بأثر صریح فیما قالوہ وهو ما رواہ عن سعید بن سالم عن ابن جریج عن عطاء عن ابن عباس قال: "تدلی علیها من جلا بیبها ولا تضرب به، قلت: وما لا تضرب به"؟ فأشار إلی کما تجلبب المرأۃ، ثم أشار إلی ما علی خدها من الجلباب، فقال: لا تغطیه فتضرب به علی وجهها ولکن تسدله علی وجهها کما هو مسدولاً" الحدیث (۱۴۰) وفیه سعید بن سالم القداح مختلف فیه حسن الحدیث۔" (ج ۱۰ ص ۱۷) باب ما لا یلبس المحرم وما لا یغطیه من اعضاوہ ۱۲ مرتب

[3] أنظر للتفصیل منحة الخالق علی بحر الرائق (ج ۲ ص ۳۲۲) باب الإحرام ۱۲ مرتب

[4] وتوضیحه أن حدیث ابن عمر هذا أخرجه البخاری فی صحیحه ما یزید علی عشر مرّات فی العلم وفی الصلاۃ والمناسك واللباس، ولم یذکر هذه الزیادۃ فیها فهذا دلیل علی أنه لم یصح فیه هذه الزیادۃ مرفوعاً معارف السنن (ج ۶ ص ۳۳۳) ۱۲ م

[5] صحیح بخاری (ج ۱ ص ۲۴۸) باب ما ینهی من الطیب للمحرم والمحرمة - وراجع "المعارف" للتفصیل (ج ۶ ص ۳۳۳) ۱۲ م

باب ماجاء فی لبس السّراویل والخفّین للمحرم إذا لم یجد الإزار والنّعلین

عن[1] ابن عبّاس قال : سمعتُ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم یقول : المحرم إذا لم یجد الإزار فلیلبس السّراویل " امام شافعیؒ اور امام احمدؒ اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہیں چنانچہ ان کے نزدیک محرم کو اگر ازار مہیا نہ ہو تو سلا ہوا پاجامہ پہن سکتا ہے اور اس کے پہننے سے فدیہ بھی واجب نہیں، حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک اس صورت میں بھی سلا ہوا پاجامہ پہننا جائز نہیں بلکہ اگر اس کے پاس شلوار موجود ہو تو پھاڑ کر اُسے ازار بنالے پھر پہنے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو شلوار ہی پہن لے، لیکن اس صورت میں فدیہ ادا کرنا ضروری ہے۔ ہمارا استدلال ان مشہور روایات سے ہے جن میں محرم کو سلے ہوئے لباس کے پہننے سے روکا گیا ہے[2]۔ جہاں تک حدیثِ باب کا تعلق ہے وہ ہمارے نزدیک لبس بعد الشق پر محمول ہے۔

امام شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ سراویل کو پھاڑنے میں اضاعتِ مال ہے

ہمارا جواب یہ ہے کہ یہ اضاعت نہیں بلکہ کپڑے کو دوسرے طریقہ سے استعمال کرنا ہے۔ چنانچہ خود امام شافعیؒ اسی حدیث کے اگلے جزء میں یہی تشریح کرتے ہیں یعنی " إذا لم یجد النعلین فلیلبس الخفّین " اس کے بارے میں امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ "خفین" کو بعینہٖ پہننا جائز نہیں بلکہ ان کو اس طرح کاٹنا چاہیے کہ وہ کعبین سے نیچے ہو جائیں جس طرح وہ اضاعتِ مال نہیں اسی طرح شقِ سراویل بھی اضاعت نہیں[3]۔

---

[1] الحدیث أخرجہ البخاری فی صحیحہ (ج ۲ ص ۸۶۳) کتاب اللباس، باب السراویل، ومسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص ۳۷۳) کتاب الحج، باب مایباح للمحرم بحج أو عمرۃ لُبسہٗ ومالا یباح ۱۲ م

[2] روایات کے لئے دیکھئے جامع الاصول (ج ۳ ص ۲۱ تا ص ۲۵) ألفصل الثانی فی الإحرام، ألنوع الأول فی اللباس ۱۲ مرتب

[3] راجع للتفصیل معارف السنن (ج ۶ ص ۳۳۶)

وذکر فی المغنی (ج ۳ ص ۳۰۱ و ۳۰۳، باب ما یتوقی المحرم وما أبیح لہ ۔ مرتب) عدم الخلاف بین الأئمۃ الأربعۃ فی جواز لبس السراویل عند عدم الإزار، إلا أنہ قال : تجب الفدیۃ عند مالکؒ و أبی حنیفۃ ولا فدیۃ عند الشافعی و أحمد ۔ کذا فی المعارف (ج ۶ ص ۳۳۱) باب ماجاء فیما لا یجوز للمحرم لبسہٗ ۱۲ مرتب

واذا لم يجد النعلين فليلبس الخفين جمہور کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ خفین کو کعبین سے کاٹ کر جوتے کے طور پر استعمال کیا جائے، لیکن امام احمدؒ اسے اس کے ظاہر پر محمول کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جس کے پاس جوتے نہ ہوں تو وہ بند موزے بھی پہن سکتا ہے[1]۔

جمہور کی دلیل پچھلے باب میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے " لا تلبس القميص ولا السراويلات ولا البرانس ولا العمائم ولا الخفاف إلا أن يكون أحد ليست له نعلان فليلبس الخفين وليقطعهما ما أسفل من الكعبين " اس میں لبس خفین کے ساتھ " ما أسفل من الكعبين " کی قید صراحۃً لگادی گئی ہے، لہٰذا حضرت ابن عباسؓ کی حدیثِ باب کو اسی پر محمول کیا جائے گا[2] واللہ أعلم

باب مايقتل المحرم من الدواب

" عن[3] عائشة قالت : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : خمس فواسق يقتلن في الحرم ، الفأرة والعقرب والغراب والحديا والكلب العقور " بعض روایتوں میں " حية " کا بھی ذکر ہے[4] بعض میں " افعی "

---

[1] أنظر لتفصيل المسألة معارف السنن (ج ٦ ص ٣٣٦) ١٢ م

[2] بالخصوص جبکہ حضرت ابن عمرؓ کی روایت حضرت ابن عباس رضؓ کی حدیثِ باب کے مقابلہ میں اصح بھی ہے اور اس کے لئے مبیّن کی حیثیت رکھتی ہے۔ دیکھئے معارف السنن (ج ٦ ص ٣٣٦ و ٣٣٧) ١٢

[3] الحديث أخرجه البخاري في صحيحه (ج ١ ص ٢٤٦) ابواب العمرة باب مايقتل المحرم من الدواب، ومسلم في صحيحه (ج ١ ص ٣٨١) باب مايندب للمحرم وغيره قتله من الدواب في الحل والحرم ١٢ م

[4] چنانچہ مسلم میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے " قال حدثتني إحدى نسوة النبي صلى الله عليه وسلم أنه كان يأمر بقتل الكلب العقور والفأرة والعقرب والحديا والغراب والحية " (ج ١ ص ٣٨٢) باب مايندب للمحرم وغيره قتله من الدواب في الحل والحرم ١٢ مرتب

اور بعض میں "ذئب" اور "نمر" کا بھی ذکر ہے[1]۔ ترمذی کی اگلی روایت میں "السبع العادی" کا بھی ذکر ہے، اس اختلافِ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حلّتِ قتل کا حکم ان جانوروں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام فواسق کے لئے ہے۔

پھر فواسق کے مفہوم میں اختلاف ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک ان سے مراد غیر ماکول اللحم جانور ہیں چنانچہ وہ "حرمتِ اکل" کو "قتل کی علت جامعہ قرار دیتے ہیں۔ جبکہ حنفیہ اور مالکیہ "ابتداء بالاذیٰ" کو علت قرار دیتے ہیں[2]۔ چنانچہ ان کے نزدیک ہر وہ جانور مباح الدم ہے جو "ابتداء بالاذیٰ" کرتا ہو، اس کی تائید حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیثِ باب سے ہوتی ہے جس میں "یقتل المحرم السبع العادی" کے الفاظ مروی ہیں، "عادی" کے معنی "ظالم" کے ہیں۔ اور اس سے جوازِ قتل کی علت مستنبط ہوتی ہے کہ وہ "ظلم" اور "ابتداء بالاذیٰ" ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ "کلب" کے ساتھ "العقور[3]" کی قید لگائی گئی ہے اور "غراب" میں "ابقع[4]" کی

---

[1] کما فی "العمدۃ" للعینی: "وقال عیاض: جاء فی غیر کتاب مسلم ذکر الأفعی فصارت سبعًا، وفیہ نظر لأن الأفعی تدخل فی مسمی الحیۃ، وروی ابن خزیمۃ وابن المنذر زیادۃ علی الخمس وھو الذئب والنمر، فتصیر بھذا الاعتبار تسعًا، ولکن قال ابن خزیمۃ عن الذھلی أن ذکر الذئب والنمر من تفسیر الراوی للکلب العقور" (ج ۱۰ ص ۱۸۱) باب مایقتل المحرم من الدواب ۱۲ مرتب

[2] کما فی معارف السنن (ج ۶ ص ۳۴۰) ۱۲ م

[3] العقور: کاٹ کھانے والا۔ "الکلب العقور" سے کیا مراد ہے؟ اس کی مراد میں اختلاف ہے فقیل: ھو الکلب المعروف، حکاہ عیاض عن أبی حنیفۃ، و الأوزاعی والحسن بن حیی، وألحقوا بہ الذئب، وحمل زفر الکلب علی الذئب وحدہ، وذھب الشافعی والثوری وأحمد وجمھور العلماء إلی أن المراد کل مفترس غالبًا، وقال مالک فی "الموطأ": کل ما عقر الناس وعدا علیھم وأخافھم مثل الأسد والنمر والفھد والذئب ھو العقور، وکذا نقل أبو عبید عن سفیان، وقال بعضھم ھو قول الجمھور، وقال أبوحنیفۃ: المراد بالکلب ھنا الکلب خاصۃ، ولا یلتحق بہ فی ھذا الحکم سوی الذئب۔ ھذا ملخص ما فی "العمدۃ" (۵-۸۳) کذا فی معارف السنن (ج ۶ ص ۳۴۲-۳۴۳) ۱۲ م

[4] الغراب الأبقع ھو الذی فی صدرہ بیاض کما فی "المواھب" أو یخالط سوادہ بیاض۔ کما فی "المحکم" أو فی بطنہ وظھرہ بیاض قالہ أبو عمرو، کما فی العمدۃ، کذا فی المعارف (ج ۶ ص ۳۴۲) ۱۲ مرتب

قید ملحوظ ہے۔[1]

باب[2] ماجاء فی الحجامة للمحرم

"عن ابن[3] عباس أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم احتجم وھو محرم"

اس حدیث کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ، سفیان ثوریؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور اسحٰق بن راہویہؒ کا مسلک یہ ہے کہ محرم کے لئے پچھنے لگوانے میں کوئی حرج نہیں، جب تک کہ حجامت کی وجہ سے بال نہ کاٹے جائیں، البتہ اگر پچھنے لگوانے کے لئے بال کاٹے گئے تو کفارہ یعنی فدیہ دینا پڑیگا۔

امام مالکؒ کے ہاں اس مسئلہ میں تنگی ہے، چنانچہ ان کے نزدیک بغیر ضرورتِ شدیدہ کے پچھنے لگوانے کی اجازت نہیں، وہ حدیثِ باب کو ضرورت پر محمول کرتے ہیں[4]۔

واضح رہے کہ یہ ساری بحث محجوم یعنی پچھنے لگوانے والے کے بارے میں ہے ورنہ حاجم یعنی پچھنے لگانے والے کے حق میں امام مالکؒ کے نزدیک بھی ممانعت نہیں[5] واللہ اعلم

(از مرتب عفا اللہ عنہ)

---

[1] جیسا کہ مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایت میں مروی ہے "عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أنه قال: خمس فواسق يقتلن في الحل والحرم الحية والغراب الأبقع الخ (ج ۱ ص ۳۸۱) باب مايندب للمحرم وغيره قتله من الدواب في الحل والحرم

قال القرطبي: "هذا تقييد لمطلق الروايات التي ليس فيها الأبقع، وبذلك قالت طائفة...

وطائفة رأوا جواز قتل الأبقع وغيره من الغربان، ورأوا أن ذكر الأبقع إنما جرى لأنه الأغلب

ثم ردّه العيني وقال: الروايات المطلقة محمولة على هذه الرواية المقيدة التي رواها مسلم، وذلك لأن الغراب إنما أبيح قتله لكونه يبتدي بالأذى، ولا يبتدي بالأذى إلا الغراب الأبقع، والغير الأبقع لا يبتدي بالأذى، فلا يباح قتله كالعقعق وغراب الزرع" كذا في معارف السنن (ج ۶ ص ۴۱۷) ۱۲ مرتب

[2] شرحِ باب از مرتب ۱۲

[3] الحديث أخرجه البخاري في صحيحه (ج ۱ ص ۲۴۸) ابواب العمرة، باب الحجامة للمحرم، ومسلم في صحيحه (ج ۱ ص ۳۸۳) كتاب الحج باب جواز الحجامة للمحرم ۱۲ مرتب

[4] قال العيني: وقال قوم: لا يحتجم المحرم إلا من ضرورة، وروى ذلك عن ابن عمر وبه قال مالك، وحجة هذا القول أن بعض الرواة يقول: إن النبي صلى الله عليه وسلم احتجم لضرر كان به، رواه هشام بن حسان عن عكرمة عن ابن عباس أن رسول الله صلى الله عليه وسلم إنما احتجم وهو محرم في رأسه لأذى كان به، ورواه حميد الطويل عن أنس رضي الله تعالى عنه قال: احتجم رسول الله صلى الله عليه وسلم من وجع كان به" عمدة القاري (ج ۱۰ ص ۱۹۳) باب الحجامة للمحرم ۱۲ مرتب

[5] هذا كله ماخوذ من العمدة للعيني (ج ۱۰ ص ۱۹۲-۱۹۳) باب الحجامة للمحرم ۱۲ مرتب

باب ماجاء فی کراھیۃ تزویج المُحرِم

"إنّ المحرم لاینکِحُ ولایُنکِحُ" نکاحِ محرم کا مسئلہ معرکۃ الآراء خلافیات میں سے ہے، ائمہ ثلاثہ کے نزدیک حالتِ احرام میں نکاح ناجائز اور باطل ہے۔ اسی طرح اِنکاح بھی جائز نہیں[۱، ۲]۔

امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحابؒ کا مسلک یہ ہے کہ حالتِ احرام میں اِنکاح بھی جائز ہے اور نکاح بھی، البتہ جماع اور دواعیِ جماع حلال ہونے کے وقت تک جائز نہیں[۳]۔

ائمہ ثلاثہ کا استدلال حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثِ باب سے ہے "إن المحرم لاینکِح ولایُنکح"

نیز حضرت ابورافعؓ کی بھی حدیثِ باب سے ان کا استدلال ہے، وہ فرماتے ہیں "تزوّج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میمونۃ وھو حلال وبنیٰ بہا وھو حلال، وکنت أنا الرسول فیما بینہما[۴]" اُن کا ایک استدلال یزید بن الاصم کی روایتِ باب سے بھی ہے جو حضرت میمونہ سے نقل کرتے ہیں "قالت تزوّجنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو حلال[۵]"

---

[۱] الحدیث أخرجہ مسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص ۴۵۳) کتاب النکاح باب تحریم نکاح المحرم وکراھۃ خِطبتہ۔ وأبوداؤد فی سننہ (ج ۱ ص ۲۵۵) کتاب المناسک، باب المحرم یتزوّج ۱۲ م

[۲] کما فی المعارف (ج ۶ ص ۳۲۵) وفیہ: "وإلیہ ذھب اللیث والأوزاعی ویُروی عن عمر وعلی وابن عمر وزید بن ثابت من الصحابۃ، وعن سعید بن المسیّب وسالم وقاسم من التابعین" ۱۲ مرتب

[۳] وإلیہ ذھب إبراھیم النخعی وسفیان الثوری وعطاء والحکم بن عتیبۃ وعکرمۃ ومسروق والقاسم بن محمد بن أبی بکر وأبوہ محمد وابنہ عبدالرحمٰن وحماد بن أبی سلیمان، وقال ابن حزم: أجازہ طائفۃ، صحّ ذلک عن ابن عباس، وروی عن ابن مسعود ومعاذ، ورواہ الطحاوی عن أنس أیضًا، ھذا ملخص ما فی "الجوھر النقی" و"عمدۃ القاری" — کذا فی معارف السنن (ج ۶ ص ۳۲۶) ۱۲ مرتب

[۴] لم یخرجہ أحد من أصحاب الکتب الستّۃ سوی الترمذی، کذا قال الشیخ محمد فؤاد عبدالباقی، سننِ ترمذی (ج ۳ ص ۲۰۰، رقم الحدیث ۸۴۱) ۱۲ م

[۵] الحدیث أخرجہ مسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص ۴۵۴) کتاب النکاح، باب تحریم نکاح المحرم وکراھۃ خِطبتہ۔ وأبوداؤد فی سننہ (ج ۱ ص ۲۵۵) کتاب المناسک، باب المحرم یتزوّج، وابن ماجۃ فی سننہ (ص ۱۴۱) کتاب النکاح، باب المحرم یتزوّج ۱۲ م

حنفیہ کا استدلال اگلے باب (باب ماجاء فی الرخصۃ فی ذلک) میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ہے " أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم تزوج میمونۃ وھو محرم "[1]

جہاں تک حضرت عثمانؓ کی قولی حدیث " إن المحرم لاینکح ولاینکح " کا تعلق ہے سو حنفیہ کی جانب سے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ کراہت پر محمول ہے[2]۔ پھر ظاہر ہے کہ یہ کراہت بھی اس شخص کے لئے ہوگی جو نکاح کے بعد اپنے آپ پر قابو نہ پاسکے اور وطی میں مبتلا ہوجائے۔ زیادہ سے زیادہ اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے بیع وقت النداء ہے کہ وہ مکروہ ہے مگر منعقد ہوجاتی ہے[3]۔ اسی طرح فی حالۃ الاحرام اس شخص کے لئے مکروہ ہوگا جسے وقوع فی الفتنہ کا اندیشہ ہو لیکن منعقد پھر بھی ہوجائے گا[4]۔

اب اختلاف کا اصل مدار حضرت میمونہؓ کے نکاح کے بارے میں اختلاف پر رہ جاتا ہے، ائمہ ثلاثہؒ نے ان روایات کو ترجیح دی ہے جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت میمونہؓ کا نکاح آپؐ کے ساتھ حلال ہونے کی حالت میں ہوا تھا ان کے نزدیک ان روایات کی وجہ ترجیح یہ ہے کہ وہ خود حضرت میمونہ سے بھی مروی ہیں جو صاحبِ معاملہ ہیں

اس کے برخلاف حنفیہ نے حضرت ابن عباس کی روایت کو ترجیح دی ہے جس میں بحالتِ احرام نکاح کا ذکر ہے یہ تمام روایات پیچھے ذکر کی جاچکی ہیں

حضرت ابن عباس کی روایت کی وجوہِ ترجیح مندرجہ ذیل ہیں :-

---

[1] الحدیث أخرجہ البخاری فی صحیحہ (ج ۱ ص۲۴۸) أبواب العمرۃ، باب تزویج المحرم۔ و(ج ۲ ص۷۶۶) کتاب النکاح باب نکاح المحرم و(ج ۲ ص۶۱۱) کتاب المغازی، باب عمرۃ القضاء، وفیہ: تزوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم میمونۃ وھو محرم وبنیٰ بھا وھو حلال " ومسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص۴۵۳ و۴۵۴) کتاب النکاح، باب تحریم نکاح المحرم، والنسائی فی سننہ (ج ۲ ص۲۶) کتاب المناسک، الرخصۃ فی النکاح۔ و(ج ۲ ص۸۰) کتاب النکاح الرخصۃ فی نکاح المحرم۔ وأبو داؤد فی سننہ (ج ۱ ص۲۵۵) کتاب المناسک، باب المحرم یتزوج، والترمذی فی سننہ (ج ۱ ص۱۳۲) باب ماجاء فی الرخصۃ فی ذلک۔ وابن ماجۃ فی سننہ (ص۱۴۱) کتاب النکاح، باب المحرم یتزوج ۱۲ مرتب عفی عنہ

[2] کما فی المعارف (ج ۶ ص۳۳۸) واعلاء السنن (ج ۱۱ ص۹۹) کتاب النکاح، باب جواز النکاح فی حالۃ الإحرام ۱۲ م

[3] کما فی الإعلاء " (ج ۱۱ ص۹۹) ۱۲ م

[4] اور صاحب ہدایہؒ نے " لاینکح المحرم ولا ینکح " کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ روایت وطی پر محمول ہے (لأن النکاح فی معنی الوطء حقیقۃ وفی معنی العقد مجاز۔ ھدایہ (ج ۲ ص۳۰۱) کتاب النکاح۔ اس جواب کی تشریح کے لئے دیکھئے " البحر الرائق " (ج ۳ ص۱۰۱) کتاب النکاح، فصل فی المحرمات ۱۲ مرتب

① یہ روایت اصح ما فی الباب ہے اور اس موضوع کی کوئی روایت سنداً اس کے ہم پلہ نہیں[1]۔

② حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت تواتر کے ساتھ مروی ہے۔ چنانچہ بیس سے زائد فقہاءِ تابعین اس کو حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں[2]۔

③ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے متعدد شواہد موجود ہیں۔ چنانچہ نسائی[3]، طحاوی[4] اور مسند بزار[5] وغیرہ[6] میں حضرت عائشہؓ سے بھی یہی مروی ہے کہ حضرت میمونہؓ سے آپ کا نکاح بحالت احرام ہوا تھا، حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس روایت کی صحت کا اعتراف کیا ہے[7]۔ نیز سنن دارقطنی میں حضرت ابوہریرہؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے[8]۔ اس کی سند اگرچہ ضعیف ہے، لیکن حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے[9]۔ نیز عامر شعبیؒ اور مجاہد کی مرسل روایات بھی

---

[1] یہی وجہ ہے کہ یہ روایت تمام صحاحِ ستہ میں مروی ہے، حوالے پیچھے ذکر کئے جاچکے ہیں ۱۲ م

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۳۵ و ۳۵۱) باب ما جاء من الرخصة فی ذلك ۱۲ م

[3] تلاشِ بسیار کے باوجود احقر کو یہ روایت نسائی میں نہ مل سکی، اگرچہ علامہ بنوریؒ معارف السنن (ج ۶ ص ۳۵) میں لکھتے ہیں: "علا أن ابن عباس لم ینفرد بذلك كما یقوله ابن عبد البر، بل وافقه أم المؤمنین عائشة عند النسائی والطحاوی والبزار وابن حبان، وصححه ابن حبان، واعترف بصحته الحافظ فی الفتح" (۹-۱۴۳) ورد به قول ابن عبد البرؒ ۱۲ مرتب

[4] حدثنا محمد بن خزیمة قال: ثنا معلی بن اسد قال: ثنا أبو عوانة عن مغیرة عن أبی الضحی عن مسروق عن عائشة قالت: تزوج رسول الله صلی الله علیه وسلم بعض نسائه وهو محرم (ج ۱ ص ۳۷۵) کتاب مناسك الحج باب نکاح المحرم ۱۲ مرتب

[5] عن عائشة أن رسول الله صلی الله علیه وسلم تزوج وهو محرم واحتجم وهو محرم۔ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد علامہ ہیثمی لکھتے ہیں: روی بها الطبرانی فی الأوسط أن النبی صلی الله علیه وسلم تزوج میمونة وهو محرم، ورجال البزار رجال الصحیح۔ مجمع الزوائد (ج ۴ ص ۲۶۸) کتاب النکاح، باب نکاح المحرم ۱۲ مرتب

[6] مثلاً صحیح ابن حبان اور معجم طبرانی اوسط، جن کے حوالے پچھلے حواشی میں ذکر کئے جاچکے ہیں۔

[7] دیکھئے فتح الباری (ج ۴ ص ۴۵) باب تزویج المحرم۔ و (ج ۹ ص ۱۴۳) کتاب النکاح، باب نکاح المحرم قبیل باب نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن نکاح المتعة ۱۲ مرتب

[8] (ج ۳ ص ۲۶۳) رقم ۷۵ کتاب النکاح، باب المهر ولفظه: "تزوج رسول الله صلی الله علیه وسلم میمونة وهو محرم" ۱۲ مرتب

[9] چنانچہ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: وأما حدیث أبی هریرة أخرجه الدارقطنی، وفی اسناده کامل ابو العلاء وفیه ضعف لکنه یعتضد بحدیثی ابن عباس وعائشة" فتح الباری (ج ۹ ص ۱۴۳) باب نکاح المحرم ۱۲ م

حضرت ابن عباسؓ کی روایت کی شاہد ہیں[1]، اس کے علاوہ طحاوی میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت انسؓ کی روایات سے بھی حضرت ابن عباسؓ کی روایت کی تائید ہوتی ہے[2]۔

(۴) اصحاب سیر و تواریخ کی تصریحات سے بھی حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کی تائید ہوتی ہے کیونکہ ابن ہشام[3]، محمد بن اسحٰقؒ اور ابن سعدؒ[4] وغیرہ نے یہ واقعہ جس طرح بیان کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرۃ القضاء کے سفر میں سرف کے مقام پر پہنچ کر حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا جبکہ آپ محرم تھے، پھر عمرہ سے واپس آتے ہوئے سرف ہی کے مقام پر آپ نے بناء فرمائی جبکہ آپ حلال ہو چکے تھے۔

(۵) حضرت ابن عباسؓ کی روایت اس لئے راجح ہے کہ طبقات[5] ابن سعد کی تصریح کے مطابق ان کے والد حضرت عباسؓ اس نکاح کے عاقد تھے، حضرت میمونہؓ کے اولیاء میں سے اس وقت کوئی موجود نہ تھا[6]، اس لئے حضرت عباسؓ نے حضرت میمونہؓ کی طرف سے عقد کیا تھا[7]، لہٰذا عقدِ نکاح کے وقت اور مقام کے بارے میں حضرت عباسؓ اور ان کے صاحبزادہ سے زیادہ کوئی واقف

---

[1] چنانچہ علامہ بنوریؒ لکھتے ہیں: "و له شاهد من مرسل عامر الشعبي ومن مرسل مجاهد، كلاهما عند ابن أبي شيبة" معارف السنن (ج ٦ ص٣٥٨ و ٣٥٩)

لیکن یہ دونوں شواہد احقر کو مصنف ابن ابی شیبہ میں تلاش کے باوجود نہ مل سکے ۱۲ مرتب

[2] چنانچہ طحاوی میں حضرت ابن مسعودؓ کے بارے میں حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں: "أن ابن مسعودؓ كان لا يرى بأسًا أن يتزوج المحرم" اور حضرت انسؓ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن محمد بن ابی بکرؒ فرماتے ہیں: "قال: سألت أنس بن مالك عن نكاح المحرم، فقال: لا بأس به هل هو إلا كالبيع" (ج ١ ص٣٧٦) باب نكاح المحرم ۱۲ مرتب

[3] السيرة النبوية لابن هشام على هامش الروض الأنف للسهيلي (ج ٢ ص٢٥٥) عمرة القضاء

[4] حوالۂ بالا ۱۲ م

[5] چنانچہ "طبقات" میں ابن سعدؒ فرماتے ہیں: "وتزوجها رسول الله صلى الله عليه وسلم بسرف على عشرة أميال من مكة وكانت آخر امرأة تزوجها رسول الله صلى الله عليه وسلم وذلك سنة سبع في عمرة القضية ــــ (ج ٨ ص١٣٢) ترجمة ميمونة ــــ آگے (ص١٣٥، پر) ابن سعدؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت بھی نقل کی ہے "أخبرنا يزيد بن هارون أخبرنا هشام بن حسان عن عكرمة عن ابن عباس أن رسول الله صلى الله عليه وسلم تزوج ميمونة بنت الحارث بسرف وهو محرم ثم دخل بها بسرف بعد ما رجع ۱۲ مرتب

[6] (ج ٨ ص١٣٢ و ص١٣٣) ترجمة ميمونة ۱۲ م

[7] كما في معارف السنن (ج ٦ ص٣٥٥) باب ما جاء من الرخصة في ذلك ۱۲ م

[8] قال ابن هشام: وكانت جعلت أمرها إلى أختها أم الفضل، وكانت أم الفضل تحت عباس، فجعلت أم الفضل أمرها إلى العباس فزوجها رسول الله صلى الله عليه وسلم بمكة" سيرة النبوية لابن هشام على هامش الروض الأنف للسهيلي (ج ٢ ص٢٥٥) عمرة القضاء ۱۲ مرتب

نہیں ہوسکتا، یہاں تک کہ حضرت میمونہؓ بھی نہیں، کیونکہ وہ خود عاقد نہیں تھیں[1] اور عورتیں مجلسِ نکاح میں حاضر نہیں ہوتیں۔

(۶) یزید بن الاصمؒ حضرت میمونہؓ کا نکاح حالتِ حلّت میں روایت کرتے ہیں لیکن انہی کی ایک روایت حضرت ابن عباسؓ کے موافق بھی ہے، طبقات[2] میں ابن سعدؒ فرماتے ہیں "أخبرنا یزید بن هارون عن عمرو بن میمون بن مهران قال: کتب عمر بن عبد العزیز إلى أبي أن سل یزید بن الأصم أحراماً کان رسول الله صلى الله علیه وسلم حین تزوج میمونة أم حلالاً؟ فدعاه أبي فأقرأه الکتاب فقال: خطبها وهو حلال وبنى بها وهو حلال، وأنا أسمع یزید یقول ذلك" اس میں یزید بن الاصمؒ نے خطبہ اور بناء کے بارے میں تو یہ تصریح کردی کہ وہ حالتِ حلّت میں ہوئے تھے لیکن نکاح کا ذکر نہیں کیا حالانکہ سوال نکاح ہی کے بارے میں تھا یہ اس کی دلیل ہے کہ نکاح حالتِ احرام میں ہوا تھا، اگر نکاح حالتِ حلّت میں ہوا ہوتا تو خطبہ اور بناء کے ساتھ اس کا بھی ذکر کرتے، معلوم ہوا کہ جس روایت[3] میں یزید بن الاصمؒ نے "نکحها وهو حلال" کہا ہے اس میں "نکح" سے مراد بناء ہے نہ کہ نکاح، کیونکہ "نکاح" کا لفظ بکثرت "جماع" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے[4]۔

---

[1] أنظر معارف السنن (ج ۶ ص ۳۵۵) ۱۲ م

[2] (ج ۸ ص ۱۳۳) فی ترجمة میمونة ۱۲ م

[3] صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۵۳) باب تحریم نکاح المحرم وکراهة خطبته ۱۲ م

[4] بلکہ اس معنی میں حقیقت ہے "قال الأزهري: أصل النکاح في کلام العرب الوطء، وقیل للتزوج نکاح لأنه سبب للوطء المباح. الجوهري: النکاح الوطء وقد یکون العقد"۔ لسان العرب (ج ۲ ص ۶۲۶) مادّة "نکح"

اب رہیں وہ روایات جن میں "تزوّج" کے الفاظ ہیں، جیسے طحاوی (ج ۱ ص ۳۷۵) کتاب المناسك باب نکاح المحرم) میں یزید بن الاصم کی روایت میں "تزوّجها وهو حلال" کے الفاظ آئے ہیں، ایسی روایات کے بارے میں علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "معلوم ہوتا ہے کہ اس میں رواۃ کا تصرف ہے کہ انہوں نے "نکاح" کو "تزوّج" سے تعبیر کردیا، یا پھر لفظ "تزوّج" سے بھی مجازاً وطی کے معنی مراد ہیں لأن التزوّج سبب الوطء" معارف السنن (ج ۶ ص ۳۵۸) ۱۲ مرتب

(۷) واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت میمونہؓ سے حلال ہونے کی حالت میں نکاح کرنے کا امکان ہی نہیں کیونکہ اس پر بیشتر روایات متفق ہیں کہ یہ نکاح مقام سرف میں ہوا تھا اور یہ مقام مکہ مکرمہ سے تقریباً دس میل کے فاصلہ پر ہے[۱] اور حدودِ میقات کے اندر ہے اس لئے کہ اہلِ مدینہ کی میقات ذوالحلیفہ ہے جو مدینہ سے چھ سات میل کے فاصلہ پر ہے[۲]، لہذا آپ نے یقیناً سرف پہنچنے سے کافی عرصہ پہلے ذوالحلیفہ پر ہی احرام باندھ لیا ہوگا ورنہ لازم آئے گا کہ آپ میقات سے بغیر احرام گزرے جو کسی طرح معقول نہیں۔

اس کے جواب میں بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہ عمرۃ القضاء کا واقعہ ہے اور مواقیتِ احرام کی تعیین حجۃ الوداع کے موقعہ پر ہوئی[۳]۔

لیکن یہ جواب درست نہیں کیونکہ صحیح بخاری میں حضرت مسور بن مخرمہؓ کی ایک روایت مروی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ حدیبیہ کے سال بھی ذوالحلیفہ سے احرام باندھا تھا فرماتے ہیں "خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم عام الحدیبیۃ فی بضع عشرۃ مائۃ من أصحابہ فلما کان بذی الحلیفۃ قلّد الھدی وأشعر وأحرم منھا"[۴] معلوم ہوا کہ مواقیت کی تعیین عمرۃ القضاء سے ایک سال پہلے غزوۂ حدیبیہ کے موقعہ پر یا اس سے پہلے ہو چکی تھی، کم از کم اہلِ مدینہ کی میقات تو یقیناً مقرر ہو ہی چکی تھی[۵]۔

ان دلائل کی روشنی میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت راجح ہے[۶] اور حضرت یزید بن الاصمؒ

---

[۱] طبقات ابن سعد (ج ۸ ص ۱۳۲) ترجمۃ میمونۃ ۱۲ م

[۲] ذوالحلیفہ سے متعلق تحقیق دیکھیے "باب ما جاء من أیّ موضع أحرم النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے تحت حاشیہ میں ذکر کی جا چکی ہے ۱۲ م

[۳] "حکی الأثرم عن أحمد أنہ سئل : فی أیّ سنۃٍ وقّت النبی صلی اللہ علیہ وسلم المواقیت؟ فقال : عام حج" فتح الباری (ج ۳ ص ۳۰۲) باب مھلّ أھل الیمن ۱۲ م

[۴] بخاری (ج ۲ ص ۵۹۸) کتاب المغازی، باب غزوۃ الحدیبیۃ ۱۲ م

[۵] قال الشیخ البنوری : وقد اعترف الحافظ فی "الفتح" من کتاب العلم أن توقیت المواقیت قبل حجۃ الوداع بکثیر۔ معارف السنن (ج ۶ ص ۳۲۴) ۱۲ م

[۶] مختلف روایات سے حنفیہ کا مسلک تو ثابت ہوتا ہی ہے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ، (باقی اگلے صفحہ پر)

کی روایت میں یہ توجیہ ہوسکتی ہے کہ وہاں "تزوج" سے مراد بناء ہے، نیز حضرت ابو رافعؓ کی حدیث کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ عام لوگوں کو نکاح کا علم بناء سے ہوتا ہے اس لئے انہوں نے یہ سمجھا کہ نکاح بھی حلال ہونے کی حالت میں ہوا۔

شافعیہ کی طرف سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت کی متعدد توجیہات کی جاتی ہیں۔

ایک توجیہ امام ترمذیؒ نے ذکر فرمائی ہے "تزوجها حلالاً وظهر أمر تزويجها وهو محرم ثم بنى بها وهو حلال"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت عائشہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کی روایات پیچھے ذکر کیجاچکی ہیں) صحابہ کرامؓ کے آثار سے بھی ان کے مسلک کی تائید ہوتی ہے:۔

(۱) عن إبراهيم "أن ابن مسعودٌ كان لا يرى بأساً أن يتزوج المحرم"۔

(۲) عن عطاء "أن ابن عباس كان لا يرى بأساً أن يتزوج المحرمان"۔

(۳) عبداللہ بن محمد بن ابی بکرؒ فرماتے ہیں "سألتُ أنس بن مالكٌ عن نكاح المحرم، فقال: وما بأس به، هل هو إلا كالبيع؟"

ان تینوں آثار کے لئے دیکھئے طحاوی (ج ۱ ص ۳۷۶) کتاب مناسك الحج، آخر باب نکاح المحرم۔

(۴) علامہ عینیؒ طحاوی کے حوالے سے حضرت انسؓ کا مذکورہ اثر نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "وذكره أيضاً ابن حزم عن معاذ بن جبل" عمدة القاری (ج ۱۰ ص ۱۹۶)، أبواب العمرة، باب تزويج المحرم۔

جلیل القدر تابعین کی مراسیل بھی ان کی تائید میں موجود ہیں۔

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عطاء سے مروی ہے: "قال تزوج النبي صلى الله عليه وسلم ميمونة وهو محرم" عمدة القاری (ج ۱۰ ص ۱۹۶) باب تزويج المحرم۔

میمون بن مہران سے مروی ہے "قال: كنت جالساً عند عطاء، فجاءه رجل فقال: هل يتزوج المحرم؟ فقال عطاء: ما حرّم الله النكاح منذ أحلّه"

(۲) عامر شعبی سے مروی ہے "أن رسول الله صلى الله عليه وسلم تزوج ميمونة وهو محرم"

(۳) عن مجاهد قال: تزوج رسول الله صلى الله عليه وسلم ميمونة وهو محرم"

(۴) ابو یزید مدینی سے مروی ہے "أن النبي صلى الله عليه وسلم تزوج ميمونة وهو محرم"۔

موخر الذکر چاروں مراسیل کے لئے دیکھئے طبقات ابن سعد (ج ۸ ص ۱۳۳ تا ص ۱۳۷) ترجمة ميمونة رضي الله عنها"

رشید اشرف عفی عنہ

لیکن یہ توجیہ واقعات پر منطبق نہیں ہوتی کیونکہ نسائی[1] میں تصریح ہے کہ آپ نے حضرت میمونہؓ سے سرف کے مقام پر نکاح کیا تھا، اور سرف داخلِ میقات ہے، لہٰذا اس مقام پر پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر محرم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں، اس کے علاوہ جس طرح شافعیہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت " تزوّج میمونة وهو محرم " میں "ظهر أمر تزويجها وهو محرم" کی تاویل کرتے ہیں حنفیہ کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ حضرت یزید بن الاصم کی روایت میں یہی تاویل کرلیں اور کہیں " تزوّج میمونة وهو محرم وظهر أمر تزويجها وهو حلال " اور یہ تاویل حقیقت کے قریب بھی ہے اور واقعے کے مطابق بھی۔

امام ابن حبانؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کا یہ جواب دیا ہے[2] کہ اس میں "محرم" سے مراد داخلِ حرم ہونا ہے جیسے "أنجد" کے معنی ہیں "دخل النجد" اور "أتهم" کے معنی ہیں "دخل التهامة" اسی طرح "أحرم" کے معنی "دخل الحرم" کے بھی ہو سکتے ہیں لہٰذا مطلب یہ ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت میمونہؓ سے نکاح فرمایا تو وہ محرم یعنی داخلِ حرم تھے اگرچہ حلال تھے۔

بعض حضرات نے اس جواب کی تائید میں راعی کے اس شعر سے استدلال کیا ہے[3] ؎

قتلوا ابن عفان الخليفة محرمًا   ودعا فلم أر مثله مقتولًا[4]

---

[1] (ج ۲ ص۶۳) كتاب النكاح، الرخصة في نكاح المحرم ۱۲ م

[2] چنانچہ حافظ جلال الدین زیلعیؒ لکھتے ہیں " وقال ابن حبان : وليس في هٰذه الأخبار تعارض ولا أن ابن عباس وهم، لأنه أحفظ وأعلم من غيره، ولكن عندي أن معنى قوله " تزوّج وهو محرم " أي داخل في الحرم، كما يقال : أنجد و أتهم إذا دخل نجدًا وتهامة " الخ نصب الراية (ج۳ ص۱۷۲) كتاب النكاح، فصل في بيان المحرمات ۱۲ مرتب

[3] چنانچہ علامہ نوویؒ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کے جوابات دیتے ہوئے فرماتے ہیں " الجواب الثاني تأويل حديث ابن عباس على أنه تزوّجها في الحرم وهو حلال، ويقال لمن هو في الحرم: محرم، وإن كان حلالًا وهي لغة شائعة معروفة، ومنه البيت المشهور " قتلوا ابن عفان الخليفة محرمًا " أي في حرم المدينة " شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۵۳) كتاب النكاح، باب تحريم نكاح المحرم وكراهة خطبته ۱۲ مرتب

[4] ويروى " مخذولًا " أنظر " لسان العرب " (ج ۱۲ ص۱۲۳) مادة "حرم" ۱۲ م

حضرت عثمانؓ کی شہادت مدینہ میں ہوئی اور وہ اس وقت حالتِ احرام میں نہیں تھے، لہٰذا شعر میں "محرمًا" سے مراد داخلِ حرم ہے اور حرم سے مراد حرم مدینہ ہے۔

امام ابن حبانؒ کی تاویل کا پہلا جواب یہ ہے کہ لغت قیاس سے ثابت نہیں ہوتی[1] اور راعی کے شعر کا جواب یہ ہے کہ اس میں "محرم" سے مراد "داخل حرم" نہیں بلکہ "محقون الدم" ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ اس شعر میں "محرمًا" کے معنی کے بارے میں ہارون رشید کے دربار میں امام اصمعیؒ اور امام کسائیؒ کا مکالمہ ہو چکا ہے[2] جس کی ابتداء ایسے ہوئی کہ ہارون رشید نے امام کسائیؒ کی موجودگی میں امام اصمعیؒ سے پوچھا کہ راعی کے اس شعر میں "محرم" کے کیا معنی ہیں؟ تو امام اصمعیؒ نے جواب دیا "لیس معنی هذا أنه أحرم بالحج، ولا أنه فی شهر حرام، ولا أنه فی الحرم" امام کسائیؒ نے یہ سن کر فرمایا "ویحك فما معناه؟ چونکہ کسائیؒ "محرمًا" کے معنی کو ان تین معانی میں منحصر سمجھ رہے تھے اس لئے امام اصمعیؒ نے کہا "فما أراد عدی بن زید بقوله ؎

قتلوا کسری بلیل محرمًا فتولی لم یمتع بکفن

"ای احرام لکسری؟" اس پر ہارون رشید نے امام اصمعیؒ سے پوچھا "فما المعنی؟" تو انہوں نے جواب دیا "کل من لم یأت شیئًا یوجب علیه عقوبة فهو محرم لا یحل منه شئ" اس پر ہارون رشید نے کہا "أنت لا تطاق"[3]

واضح رہے کہ اصمعیؒ[4] لغت اور حدیث دونوں کے امام ہیں، لہٰذا ان کا قول اس باب

---

[1] چنانچہ علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ معارف السنن (ج ۶ ص ۳۵۳) میں لکھتے ہیں: "لم یثبت فی اللغة هذا المعنی فی هذه المادة، والقیاس بقولهم: أنجد وأتهم وأشأم وامثالها غیر صحیح فان اللغة لا تثبت بالقیاس، وإنما ثبت فی اللغة من معانیه، أحرم الرجل: دخل فی الشهر الحرام، کما فی "صحاح الجوهری" ۱۲ مرتب

[2] یہ مکالمہ صاحب "تلقیح" نے خطیب بغدادیؒ سے نقل کیا ہے اور خطیب بغدادیؒ نے اپنی سند سے اسحٰق موصلی سے نقل کیا ہے، دیکھئے "نصب الرایہ" (ج ۳ ص ۱۷۱) کتاب النکاح، فصل فی بیان المحرمات ۱۲ مرتب

[3] پھر راعی کے شعر میں "محرم" کی جو تفسیر امام اصمعیؒ نے بیان کی ہے وہ اس میں متفرد نہیں، بلکہ ازہری اور ابن بری نے بھی یہی تفسیر بیان کی ہے۔ کما فی المعارف (ج ۶ ص ۳۵۳) ۱۲ مرتب

[4] والأصمعی هو: ابو سعید عبد الملک بن قریب البصری من ائمة الحدیث، کما هو من ائمة اللغة روی له مسلم فی مقدمة صحیحه وأبو داؤد فی أسنان الإبل والترمذی فی حدیث أم زرع، بل له ذکر فی "صحیح البخاری" من کتاب الرقاق کما ذکره الحافظ فی "التهذیب" فی ترجمة أبو عبید القاسم بن سلام" معارف السنن (ج ۶ ص ۳۵۳) ۱۲ مرتب

میں قولِ فیصل کا درجہ رکھتا ہے۔

امام ابن حبانؒ کی تاویل کا دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت میمونہؓ کے نکاح کا سرف میں ہونا متعین ہے اور سرف داخلِ حرم نہیں، لہٰذا "محرم" کے معنی "داخل حرم" نہیں ہوسکتے۔[۱]

البتہ آخر میں حنفیہ پر چند اشکالات وارد ہوتے ہیں، ایک یہ کہ اس مسئلہ میں حنفیہ کی دلیل فعلی ہے اور حضرت عثمانؓ کی حدیث باب قولی ہے لہٰذا قولی کو فعلی پر ترجیح ہونی چاہیئے۔[۲]

دوسرے یہ کہ حنفیہ کے مستدلات مبیح ہیں اور شافعیہ کے مستدلات محرِّم، لہٰذا محرِّم کو ترجیح ہونی چاہئے۔

تیسرے یہ کہ حضرت میمونہؓ کے نکاح کے بارے میں روایات متعارض ہیں و اذا تعارضا تساقطا، لہٰذا اب حضرت عثمانؓ کی حدیث کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور اس میں "نہی عن نکاح المحرم" مصرح ہے۔

جواب یہ ہے کہ قولی کو فعلی کے مقابلہ میں اور محرّم کو مبیح کے مقابلہ میں ترجیح دینے کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب تطبیق ممکن نہ ہو، اور یہاں تطبیق ممکن ہے، قولی اور فعلی میں تو اس طرح کہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کو تو نکاح محرم کے جواز پر محمول کیا جائے اور حضرت عثمانؓ کی حدیث میں جو نہی ہے اس کو تنزیہ

---

[۱] امام ابن حبانؒ کی تاویل کا تیسرا جواب یہ ہے کہ بخاری کی روایت سے اس تاویل کی تردید ہوتی ہے "عن ابن عباس قال: تزوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم میمونة وهو محرم وبنی بها وهو حلال" (ج ۲ ص ۶۱۱، کتاب المغازی باب عمرة القضاء) اس روایت میں "محرم" اور "حلال" کے درمیان جو تقابل ہے وہ امام ابن حبانؒ کی تاویل کی تردید کر رہا ہے یا کم از کم اسے بعید قرار دے رہا ہے، کما یقوله الزیلعی فی نصب الرایة (ج ۳ ص ۱۷۲)

علامہ نوویؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کے جو جوابات دیئے ہیں ان میں سے ایک جواب یہ بھی ہے کہ حالتِ احرام میں نکاح کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے، کسی دوسرے کے لئے یہ جائز نہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں "والرابع جواب جماعة من أصحابنا أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان له أن یتزوج فی حال الإحرام، وهو مما خص به دون الأمة، وهذا أصح الوجهین عند أصحابنا" شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۵۳) کتاب النکاح باب تحریم نکاح المحرم وکراهة خطبته۔

علامہ عینیؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں "قلت: دعوی التخصیص تحتاج إلی دلیل" عمدة القاری (ج ۱۰ ص ۱۹۸) أبواب العمرة، باب تزویج المحرم ۱۲ مرتب عافاہ اللہ۔

[۲] چنانچہ علامہ نوویؒ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کے جوابات دیتے ہوئے فرماتے ہیں "والثالث أنه تعارض القول والفعل، والصحیح أنه حینئذ عند الأصولیین ترجیح القول، لأنه یتعدی إلی الغیر والفعل قد یکون مقصوراً علیه" شرح نووی علیٰ صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۵۳) باب تحریم نکاح المحرم وکراهة خطبته ۱۲ مرتب

پرمحمول کیا جائے، اور اس کی دلیل بھی موجود ہے وہ یہ کہ حضرت عثمانؓ کی یہ حدیث مسلم[1] میں ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے "لا ینکح المحرم ولا یُنکح ولا یخطب" یعنی اس میں نکاح کے ساتھ حالتِ احرام میں خِطبہ کی بھی ممانعت ہے حالانکہ خِطبہ کسی کے نزدیک بھی حرام نہیں، چنانچہ شوافع وغیرہ بھی "لا یخطب" کی نہی کو تنزیہ پرمحمول کرنے پرمجبور ہیں، لیکن روایات میں تطبیق دینے کے لئے ضروری ہے کہ "لا ینکح المحرم ولا یُنکح" کی نہی کو بھی تنزیہ پرمحمول کیا جائے کما ہو مذہب الحنفیۃ۔

جہاں تک مسیح اور محرّم کے تعارض کا تعلق ہے سو حضرت عثمانؓ کی حدیث تو تنزیہ پرمحمول ہے ہی حضرت یزید بن الاصمؓ کی روایت میں بھی "نکحہا وھو حلال[2]" کو بنیٰ بہا وھو حلال" یا خطبہا وھو حلال" کے معنی پرمحمول کرکے تطبیق دی جاسکتی ہے، کما بیّنّا۔

رہا تیسرا اشکال سو تطبیق کے بعد جس طرح ترجیح کی حاجت نہیں رہتی اسی طرح تساقط کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا، اس کے علاوہ "إذا تعارضا تساقطا" کا اصول اس وقت ہے جبکہ متعارضین قوت میں برابر ہوں حالانکہ پیچھے دلائل سے ثابت کیا جاچکا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث صحت کے اعتبار سے اقویٰ اور ارجح ہے[3]۔ لہٰذا وہ تعارض متحقق ہی نہیں ہوا جو تساقط پر منتج ہو۔ ھٰذا آخر

---

[1] (ج ۱ ص۴۵۳) باب تحریم نکاح المحرم وکراھۃ خطبتہ ۱۲ م

[2] صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۵۳) باب تحریم نکاح المحرم وکراھۃ خطبتہ ۱۲ م

[3] چنانچہ امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"والذین رووا أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم تزوجہا وھو محرم أھل علم، وأثبت أصحاب ابن عباس سعید بن جبیر وعطاء، وطاؤس ومجاھد وعکرمۃ وجابر بن زید، وھؤلاء کلھم أئمۃ فقہاء یحتج بروایاتھم وآرائھم والذین نقلوا عنھم فکذلک أیضا، منھم عمرو بن دینار وأیوب السختیانی وعبد اللہ بن أبی نجیح، فھؤلاء أیضا أئمۃ یقتدی بروایاتھم۔

ثم قد روی عن عائشۃ أیضا ما قد وافق ما روی عن ابن عباس، وروی ذلک عنھا من لا یطعن أحد فیہ أبو عوانۃ عن المغیرۃ عن أبی الضحیٰ عن مسروق، فکل ھؤلاء أئمۃ یحتج بروایاتھم، فما رووا من ذلک أولیٰ مما روی من لیس کمثلھم فی الضبط والثبت والفقہ والأمانۃ۔

وأما حدیث عثمان فإنما رواہ نبیہ بن وھب ولیس کعمرو بن دینار ولا کجابر بن زید ولا کمن روی ما یوافق ذلک عن مسروق عن عائشۃ، ولا لنبیہ أیضا موضع فی العلم کموضع أحد ممن ذکرنا، فلا یجوز إذا کان کذلک أن یعارض بہ جمیع ما ذکرنا ممن روی بخلاف الذی روی ھو"۔

شرح معانی الآثار (ج ۱ ص۳۷۱) کتاب مناسک الحج، باب نکاح المحرم ۱۲ مرتب عفی عنہ

ما أردنا إيراده في هذا البحث[1]۔ فخذوه وكونوا من الشاكرين۔

باب ما جاء في أكل الصَّيْد للمُحْرِم

محرم کے لیے خشکی کا شکار بنصِ قرآنی حرام ہے[2]، اسی طرح اگر محرم نے کسی غیر محرم کی شکار میں مدد کی ہو یا اشارہ کیا ہو یا دلالت[3] کی ہو، تب بھی اس شکار کا کھانا محرم کے لئے بالاتفاق حرام ہے، البتہ اگر محرم کی اعانت، دلالت یا اشارہ کے بغیر کسی غیر محرم نے شکار کیا تو محرم کے حق میں ایسے شکار کے جواز وعدمِ جواز کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

سفیان ثوریؒ اور اسحٰق بن راہویہؒ کا مسلک یہ ہے کہ ایسا شکار بھی مطلقاً ممنوع ہے صِیدَ لأجله ہو یا نہ ہو، حضرت ابن عمرؓ، طاؤسؒ اور جابر بن زیدؒ سے بھی یہی منقول ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحابؒ کے نزدیک محرم کے لئے ایسے شکار کا کھانا مطلقاً جائز ہے صِیدَ لأجله أو لا[4]۔

---

[1] نکاح محرم کی حرمت کے قائلین حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے آثار سے بھی استدلال کرتے ہیں:

حضرت عمرؓ کا اثر مؤطا امام مالک میں مروی ہے "عن داؤد بن الحصين أن أبا غطفان بن طريف المرّي أخبره أن أباه طريفاً تزوج امرأة وهو محرم، فردّ عمر بن الخطاب نكاحه" (ص۳۱۶) كتاب الحج، باب نكاح المحرم۔

حضرت علیؓ کا اثر مسند مسدد میں مروی ہے فرماتے ہیں: "أيما رجل تزوج وهو محرم انتزعنا منه امرأته ولم نجز نكاحه۔ المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية (ج۱ ص۳۳۲) كتاب الحج، باب ما يجتنبه المحرم

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ ان آثار کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لا حجة للخصم في آثار عمر وعلي في التفريق، فإنه يمكن أن يكون من قبل الزجر والتعزير سداً للذرائع وصيانة لهم من الوقوع في المحظور، فإنه من حام حول الحمى يوشك أن يرتقه۔ معارف السنن (ج۶ ص۶۳) ۱۲ مرتب

[2] یعنی يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ (سورۂ مائدہ آیت ۹۵ پ) اور أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۖ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا (سورۂ مائدہ آیت ۹۶) ۱۲ م

[3] الفرق بين الإشارة والدلالة أن الإشارة في المحسوس والمشاهد، والدلالة في الغائب الغير المشاهد۔ كما يقول صاحب "البحر الرائق" أنظر معارف السنن (ج۶ ص۳۱۶) ۱۲ مرتب

[4] حكى أبو عمر (ابن عبد البر) هذا القول عن عمر بن الخطاب وأبي هريرة والزبير بن العوام وكعب الأحبار ومجاهد، وعطاء في رواية، وسعيد بن جبير۔ عمدة القاري (ج۱۰ ص۱۶۴) باب جزاء الصيد ۱۲ مرتب

امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر غیر محرم نے محرم کے لئے یعنی اس کو کھلانے کی غرض سے شکار کیا تھا تو محرم کے لئے اس کا کھانا ناجائز ہے اور اگر اس نیت سے شکار نہیں کیا تھا تو جائز ہے[1]۔

سفیان ثوریؒ اور اسحٰق بن راہویہؒ کا استدلال "وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا" کے اطلاق سے ہے کہ اس میں "صید لأجلہ أولا" کی کوئی تفریق نہیں کی گئی، نیز ان کا استدلال اگلے باب (باب ما جاء فی کراھیۃ لحم الصید للمحرم) میں حضرت صعب بن جثامہؓ کی روایت سے بھی ہے:
أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرّ بہ بالأبواء أو بودّان، فأھدی لہ حمارًا وحشیًا فردّہ علیہ فلما رأی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما فی وجھہ من الکراھیۃ فقال: إنہ لیس بنا ردّ علیك ولکنا حرم"

لیکن اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو اسمیں یہ تصریح نہیں کہ وہ حمار وحشی مارا ہوا تھا، ہوسکتا ہے کہ انھوں نے زندہ پیش کیا ہو، جیسا کہ ترمذی کی روایت کا ظاہر بھی ہے[2] اور زندہ کا شکار قبول کرنا محرم کے لئے جائز نہیں، دوسرے اگر مان لیا جائے کہ وہ شکار کیا ہوا مقتول حمار وحشی تھا[3] تو ہوسکتا ہے کہ آپ نے سدّ اللذرائع اس کو رد فرمایا ہو۔

---

[1] مذاہب کی تفصیل کے لئے دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص۳۶۵ وص۳۶۱) ۱۲ مرتب

[2] اور بخاری کی روایت سے بھی متبادر یہی ہے بلکہ امام بخاری نے تو جب یہ روایت اپنی صحیح میں ذکر کی تو اس پر یہ ترجمۃ الباب قائم کیا "باب إذا أھدی للمحرم حمارًا وحشیًا حیًا لم یقبل" بخاری (ج ۱ ص۲۴۶) ابواب العمرۃ موطا امام مالک کی روایت کا ظاہر بھی یہی ہے، دیکھئے (ص۳۶۶ وص۳۶۷) ما لا یجوز للمحرم أکلہ من الصید مسلم کی بھی بعض روایات سے متبادر یہی ہے، دیکھئے (ج ۱ ص۳۷۹ باب تحریم الصید المأکول البرّی ۱۲ م

[3] چنانچہ مسلم کی بعض روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے، اس کی ایک روایت میں "أھدیت لہ من لحم حمار وحش" ایک میں "أھدی الصعب بن جثامۃ إلی النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجل حمار" ایک میں "عجز حمار وحش یقطر دمًا" اور ایک میں "شق حمار وحش" کے الفاظ آئے ہیں۔ دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص۳۷۹) باب تحریم الصید المأکول البرّی۔

امام شافعی کتاب الام میں فرماتے ہیں "حدیث مالك أن الصعب أھدی حمارًا: أثبت من حدیث من روی أنہ: أھدی لحم حمار، وقال الترمذی: روی بعض أصحاب الزھری فی حدیث الصعب "لحم حمار وحش" وھو غیر محفوظ" فتح الباری (ج ۴ ص۲۷) باب إذا أھدی للمحرم حمارًا وحشیًا حیًا لم یقبل.

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ائمہ ثلاثہ کا استدلال حضرت جابر کی حدیثِ باب سے ہے "عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: صید البر لکم حلال وأنتم حرم ما لم تصیدوہ أو یُصد لکم"[1]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مذکورہ کلام کی روشنی میں اگر ترجیح کے طریقہ پر عمل کیا جائے تو حنفیہ کی جانب سے صعب بن جثامہ کی روایت کا جواب واضح ہے یعنی زندہ شکار کا قبول کرنا محرم کے لئے جائز نہیں تھا اس لئے آپ نے رد فرمادیا۔

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: یحتمل أن یکون الصعب أحضر الحمار مذبوحاً ثم قطع منہ عضواً بحضرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقدمہ لہ، فمن قال: "أھدی حماراً" أراد بتمامہ مذبوحاً لا حیاً، ومن قال لحم حمار" أراد ما قدمہ للنبی صلی اللہ علیہ وسلم، قال: ویحتمل أن یکون من قال: "حماراً" أطلق وأراد بعضہ مجازاً، قال، ویحتمل أنہ أھداہ لہ حیاً، فلما ردہ علیہ ذکاہ وأتاہ بعضو منہ ظاناً أنہ إنما ردہ علیہ لمعنی یختص بجملتہ فأعلمہ بامتناعہ أن حکم الجزء من الصید حکم الکل، قال، والجمع مہما أمکن أولی من توھیم بعض الروایات۔ فتح الباری (ج ۴ ص ۲۷) باب إذا أھدی للمحرم۔

اب اگر تطبیق کو اختیار کیا جائے تو اس صورت میں بھی حنفیہ کا جواب واضح ہے یعنی پہلے تو آپؐ کو زندہ حمار وحشی پیش کیا گیا اس کو تو آپؐ نے اس لئے رد فرمایا کہ زندہ شکار کا قبول کرنا محرم کے لئے جائز نہیں اور بعد میں جب کاٹ کر پیش کیا گیا تو اس کو آپؐ نے سداً للذرائع منع فرمایا۔ (کما أجاب بہ الشیخ البنوری فی المعارف۔ ج ۶ ص ۳۶۶) اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپؐ کے علم میں یہ بات ہو کہ اس شکار میں کسی دوسرے محرم نے اشارۃً یا دلالۃً صعب بن جثامہؓ کی مدد کی ہے اس لئے رد فرمایا (کما أجاب بہ الشیخ السہارنفوری فی بذل المجہود۔ ج ۹ ص ۱۱۵، باب لحم الصید للمحرم۔ طبع دار الکتب العلمیہ، بیروت)

تمام روایات اس پر متفق ہیں کہ آپؐ نے یہ گوشت صعب بن جثامہؓ کو لوٹا دیا تھا، البتہ ابن وہب اور بیہقی نے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے "أن الصعب أھدی للنبی صلی اللہ علیہ وسلم عجز حمار وحش وھو بالجحفۃ فأکل منہ وأکل القوم۔ قال البیہقی: إن کان ھذا محفوظاً فلعلہ رد الحی وقبل اللحم۔ فتح الباری (ج ۴ ص ۲۷) باب إذا أھدی للمحرم الخ

اب اگر امام بیہقی کی بات کو اختیار کیا جائے تو صعب بن جثامہؓ کی روایت سے حنفیہ پر تو اعتراض ہی نہیں ہوسکتا اس لئے کہ مطلب یہ ہوگا کہ محرم کے لئے زندہ شکار کا قبول کرنا جائز نہیں اور گوشت کو اس لئے قبول فرمالیا کہ اس میں آپؐ کی یا کسی دوسرے محرم کی اعانت ودلالت واشارہ کا دخل نہ تھا۔ لیکن امام بیہقیؒ والی توجیہ پر ان تمام روایات کو چھوڑنا لازم آتا ہے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے یہ گوشت رد فرمادیا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس توجیہ کے بارے میں حافظ فرماتے ہیں: "وفی ھذا الجمع نظر" فتح الباری (ج ۴ ص ۲۷) ۔ بعد میں حافظ نے تمام روایات میں اپنے مسلک کے مطابق تطبیق بھی دی ہے ۔ حنفیہ کے مسلک کے مطابق تمام روایات میں اس طرح تطبیق ہوسکتی ہے کہ اولاً آپؐ کی خدمت میں زندہ حمار وحشی پیش کیا گیا، آپؐ نے اس کو رد فرمادیا لعدم جوازہ للمحرم، بعد میں اس کا گوشت پیش کیا گیا، آپؐ نے اس کو بھی اس شبہ کی بنا پر رد فرمادیا کہ کسی دوسرے محرم نے عملاً یا اشارۃً یا دلالۃً اس شکار میں حضرت صعبؓ کی مدد کی ہے، بعد میں جب آپ کو اس کی تحقیق ہوگئی کہ ایسی کوئی بات نہیں تو آپؐ نے اس کو قبول فرمالیا اور تناول فرمایا کما فی روایۃ البیہقی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم ۱۲ رشید اشرف سیفی عفا اللہ عنہ

[2] قال الشیخ البنوری رحمہ اللہ فی المعارف (ج ۶ ص ۳۶۵) ومسئلۃ سد الذرائع من أھم مسائل أصول الفقہ والحنفیۃ والشافعیۃ لم یذکروھا، وإنما یذکرھا المالکیۃ۔ ویتثبت بھا ابن تیمیۃ فی کتبہ کثیراً وحقیقتہ أن لا یکون للحکم منہیاً عنہ فی الشریعۃ، وإنما ینھی لئلا یتوسل بہ إلی المنھی عنہ، مثل نھی الفاروق وابن مسعود عن التیمم للجنب لکیلا یکون مؤدیاً إلی التیمم عند أدنی البرد ۔ ۱۲ مرتب

(حاشیہ صفحہ ھذا)

[1] الحدیث أخرجہ أبو داود (ج ۱ ص ۲۵۶) باب لحم الصید للمحرم، والنسائی (ج ۲ ص ۱۵) إذا أشار المحرم إلی الصید فقتلہ الحلال ۱۲ مرتب

حنفیہ کا استدلال اسی باب میں حضرت ابو قتادہ کی روایت سے ہے "أنه كان مع النبي صلى الله عليه وسلم حتى إذا كان ببعض طريق مكة تخلف مع أصحاب له محرمين وهو غير محرم، فرأى حمارًا وحشيًا، فاستوى على فرسه، فسأل أصحابه أن يناولوه سوطه، فأبوا، فسألهم رمحه، فأبوا عليه، فأخذه فشد على الحمار فقتله، فأكل منه بعض أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم وأبى بعضهم، فأدركوا النبي صلى الله عليه وسلم فسألوه عن ذلك، فقال: إنما هي طعمة أطعمكموها الله"[1] اسی حدیث کے بعض طرق میں یہ تفصیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتویٰ دینے سے پہلے صحابۂ کرامؓ سے پوچھا "أشرتم أو أعنتم أو أصدتم"[2] جب صحابۂ کرامؓ نے ان سوالات کا جواب نفی میں دیا تو آپؐ نے کھانے کی اجازت دیدی، اگر اس میں صائد کی نیت پر بھی مدار ہوتا تو جس طرح آپؐ نے دوسرے صحابۂ کرامؓ سے سوال کیا تھا اسی طرح سے حضرت ابو قتادہؓ سے بھی دریافت فرماتے کہ تم نے کس نیت سے شکار کیا تھا؟ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت ابو قتادہ نے یہ حمار وحشی صرف خود کھانے کے لئے شکار نہیں کیا تھا بلکہ تمام رفقاء کو کھلانا مقصود تھا۔ اس کی تائید بخاری[3]

---

[1] الحديث أخرجه البخاري في صحيحه (ج ١ ص ٢٤٥ و ٢٤٦) أبواب العمرة، باب إذا صاد الحلال فأهدى للمحرم الصيد أكله- وباب إذا رأى المحرمون صيدًا فضحكوا ففطن الحلال- وباب لا يعين المحرم الحلال في قتل الصيد- وباب لا يشير المحرم إلى الصيد لكي يصطاده الحلال و (ج ١ ص ٣٤٩ و ٣٥٠) كتاب الهبة، باب من استوهب من أصحابه شيئًا و (ج ١ ص ٤٠٢) كتاب الجهاد، باب اسم الفرس والحمار و (ج ١ ص ٤٠٥) كتاب الجهاد، باب ما قيل في الرماح و (ج ٢ ص ٨١٣) كتاب الأطعمة، باب تعرق العضد، و (ج ٢ ص ٨٢٥) كتاب الذبائح والصيد والتسمية، باب ما جاء في التصيد، وباب التصيد على الجبال — وأخرجه مسلم في صحيحه (ج ١ ص ٣٧٩ إلى ٣٨١) باب تحريم الصيد المأكول البري — ومالك في الموطأ (ص ٣٦٢ و ٣٦٣) ما يجوز للمحرم أكله من الصيد، وأبو داود في سننه (ج ١ ص ٢٥٥) باب تحريم الصيد للمحرم، والنسائي في سننه (ج ٢ ص ٢٣) ما يجوز للمحرم أكله من الصيد ١٢ مرتب عفي عنه

[2] كما في الصحيح لمسلم (ج ١ ص ٣٨١ باب تحريم الصيد المأكول البري) في رواية شعبة- قال شعبة: ولا أدري قال: أعنتم أو (قال) أصدتم — مسلم ہی کی ایک روایت میں "هل منكم أحد أمره أو أشار إليه بشيء قالوا: لا" اور ایک روایت میں "هل أشار إليه إنسان منكم أو أمره بشيء قالوا: لا يا رسول الله!" کے الفاظ آئے ہیں (ج ١ ص ٣٨١) — اور بخاری کی ایک روایت میں "أمنكم أحد أمره أن يحمل عليها أو أشار إليها قالوا: لا" کے الفاظ آئے ہیں (ج ١ ص ٢٤٥، باب لا يشير المحرم إلى الصيد لكي يصطاده الحلال) ١٢ مرتب

[3] (ج ١ ص ٣٤٩ و ص ٣٥٠) كتاب الهبة، باب من استوهب من أصحابه شيئًا ١٢ مرتب

کی روایت سے ہوتی ہے فرماتے ہیں "کنتُ یومًا جالسًا مع رجال من أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی منزل فی طریق مکۃ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نازل أمامنا والقوم محرمون وأنا غیر محرم، فأبصروا حمارًا وحشیًا وأنا مشغول أخصف نعلی فلم یؤذنونی به وأحبوا لو أنی أبصرته، فالتفت فأبصرته فقمت إلی الفرس فأسرجته ثم رکبت ونسیت السوط والرمح، فقلت لهم ناولونی السوط والرمح، فقالوا: لا واللہ لا نعینک علیه بشیء، فغضبت فنزلت فأخذتهما ثم رکبت فشددت علی الحمار فعقرته، ثم جئت به وقد مات فوقعوا فیه یأکلونه ثم إنهم شکوا فی أکلهم إیاه وهم حرم، فرحنا وخبأت (أی أخفیت) العضد معی، فأدرکنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فسألناه عن ذلک، فقال: معکم منه شیء فقلت: نعم فناولته العضد، فأکلها حتی نفدها وهو محرم"

اس میں خط کشیدہ الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوقتادہ نے محرمین کی جانب سے شکار کی رغبت کو محسوس کیا تو ان کے لئے حمارِ وحشی شکار کیا۔[1]

جہاں تک حضرت جابرؓ کی حدیثِ باب کا تعلق ہے سو حنفیہ کی طرف سے اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں۔

پہلا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوقتادہؓ کی حدیث حضرت جابرؓ کی حدیث کے مقابلہ میں سندًا اقویٰ اور اصح ما فی الباب ہے، اس لئے کہ حضرت جابر کی حدیث میں مطلب[2] متکلم فیہ ہے، ابوزرعہؒ، ابن حبانؒ اور امام دارقطنیؒ نے اگرچہ ان کی توثیق کی ہے[3] لیکن ابن سعد ان کے بارے میں فرماتے ہیں "کثیر الحدیث

---

[1] صحیح بخاریؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں "فبینما أنا مع أصحابه (صلی اللہ علیہ وسلم) یضحک بعضهم إلی بعض فنظرت فإذا أنا بحمار وحش فحملت علیه" (ج ۱ ص ۲۴۵، باب إذا صاد الحلال فأهدی للمحرم الصید أکله) اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "فبینما أنا مع أصحابه (صلی اللہ علیہ وسلم) یضحک بعضهم إلی إذ نظرت فإذا أنا بحمار وحش فحملت علیه" (ج ۱ ص ۳۸۲، باب تحریم الصید المأکول البری)

علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "فکان الضحک لأجل أنهم محرمون، وکأنهم أرادوا أن یفطن له أبو قتادة لیصطاده، فکان هو اصطاد لأجلهم" معارف السنن (ج ۶ ص ۳۶۳) ۱۲ مرتب

[2] (هو) ابن عبد اللہ بن المطلب بن حنطب بن الحارث بن عبید بن عمر بن مخزوم المخزومی، وقیل بإسقاط المطلب فی نسبه، وقیل إنهما اثنان۔ تهذیب التهذیب (ج ۱۰ ص ۱۷۸) ۱۲ م

[3] تهذیب التهذیب (ج ۱۰ ص ۱۷۸ و ۱۷۹) ۱۲ م

دلیس یحتج بحدیثہ[1] " اور حافظؒ فرماتے ہیں " صدوق کثیر التدلیس والإرسال[2] " اور ابو حاتمؒ فرماتے ہیں " لم یسمع من جابر[3] " خود امام ترمذیؒ فرماتے ہیں " المطلب لا نعرف لہ سماعاً عن جابر " مختصر یہ کہ اوّل تو ان کی توثیق و تضعیف میں اختلاف ہے ، اس کے علاوہ یہ حدیث منقطع بھی ہے جبکہ حضرت ابو قتادہؓ کی حدیث میں نہ کمزور درجہ کا کوئی راوی ہے اور نہ اس میں انقطاع کا شبہ ہے[5]۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کے بعض طرق میں حضرت جابرؓ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں " صید البر لکم حلال ما لم تصیدوہ أو یصاد لکم[6] " اس صورت میں معنی بالکل بدل جاتے ہیں ، کیونکہ " أو " بمعنی " إلا " ہوگا اور اس کے بعد " أن " مقدر ہوگا اور تقدیر یوں ہوگی " ما لم تصیدوہ إلا أن یصاد لکم[7] "

---

[1] میزان الاعتدال (ج ۴ ص ۱۲۹ ، رقم ۸۵۹۳) — اور حافظؒ تہذیب التہذیب (ج ۱۰ ص ۱۷۸) میں نقل کرتے ہیں " وقال ابن سعد : کان کثیر الحدیث ولیس یحتج بحدیثہ لأنہ یرسل کثیراً ولیس لہ لقی وعامۃ أصحابہ یدلسون " ۱۲ مرتب

[2] تقریب التہذیب (ج ۲ ص ۲۵۴ ، رقم ۱۱۶۰) ۱۲ مرتب

[3] حافظؒ تہذیب التہذیب (ج ۱۰ ص ۱۷۹) میں نقل کرتے ہیں " قال ابن أبی حاتم فی المراسیل عن أبیہ : لم یسمع من جابر ولا من زید بن ثابت ولا من عمران بن حصین ولم یدرک أحداً من الصحابۃ إلا سہل بن سعد ومن فی طبقتہ " ۱۲ مرتب ۔

[4] کما فی الباب ۱۲ م

[5] امام شافعیؒ حضرت جابرؓ کی روایت کے بارے میں فرماتے ہیں " ھذا أحسن حدیث روی فی ھذا الباب وأقیس " کذا نقل الترمذی فی الباب ۔

علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : قال شیخنا : والأحسن حدیث أبی قتادۃ وھو حدیث الصحیحین أقول : وقد علمت حال إسنادہ وما فیہ من المغامز فکیف یکون أحسن ؟ واللہ أعلم " معارف السنن (ج ۶ ص ۳۶۳) ۱۲ مرتب

[6] سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۲۵۶) کتاب المناسک ، باب لحم الصید للمحرم — وسنن نسائی (ج ۲ ص ۲۵) إذا أشار المحرم إلی الصید فقتلہ الحلال ۱۲ م

[7] چنانچہ صاحب بذل المجہود فرماتے ہیں : " وھذا یؤید الحنفیۃ فلفظۃ " أو " الواقعۃ ھٰھنا بمعنی " إلا أن " استثناء من المفہوم المتقدم ، فإن قولہ " ما لم تصیدوہ " بمعنی الاستثناء ، فکأنہ قال : لحم الصید لکم فی الإحرام حلال إلا أن تصیدوہ إلا أن یصاد لکم " فیکون الاستثناء الثانی من مفہوم الاستثناء الأول " ۔ بذل المجہود فی حل أبی داؤد (ج ۹ ص ۱۳۳) باب لحم الصید للمحرم ۱۲ مرتب

تیسرا جواب یہ ہے کہ اگر "أو یصدکم" ہی کی روایت لی جائے تب بھی یہ اسی طرح سدِ ذرائع کے لئے ہو سکتی ہے جس طرح صعب بن جثامہؓ کی روایت، اور زیادہ سے زیادہ نہی تنزیہی پر محمول ہے۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ "أو یصدکم" کے معنی یہ ہیں کہ "أو یصدبإعانتکم أو إشارتکم أو دلالتکم"[۱]۔ واللہ أعلم

قولہ: مع أصحاب لہ محرمین وھو غیر محرم" شراح اس بارے میں حیران رہے ہیں کہ حضرت ابو قتادہؓ داخلِ میقات میں غیر محرم کیسے تھے؟ وقد أشکل ذلك علی الحنفیة والشافعیة جمیعاً۔ چنانچہ اس کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں[۲]۔ سب سے بہتر جواب طحاویؒ[۳] حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے[۴]، وہ فرماتے ہیں "بعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أبا قتادة الأنصاری علی الصدقة وخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وأصحابہ وھم محرمون حتی نزلوا عسفان فإذا ھم بحمار وحش قال وجاء أبو قتادة وھو حل الخ"

---

[۱] والجواب الخامس: "أن اللام (فی یصدلکم) لیس فی معنی "لأجلکم" بل ھی للتوکیل کما فی قولہ: بعت لہ ثوباً، واشتریت لہ لحماً، وإذا احتمل کلا الوجہین لم یتعین فی الحل علی الوجہ الأول" معارف السنن ۶ص ۳۶۲) ۱۲ م

[۲] علامہ عینیؒ لکھتے ہیں: "وقال القشیری فی الجواب عن عدم إحرام أبی قتادة: یحتمل أنہ لم یکن مریداً للحج، أو أن ذلك قبل توقیت المواقیت، وزعم المنذری أن أھل المدینة أرسلوہ إلی سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعلمونہ أن بعض العرب ینوی غزو المدینة، وقال ابن التین: یحتمل أنہ لم ینو الدخول إلی مکة وإنما صحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیکثر جمعہ، وقال أبو عمر: یقال إن أبا قتادة کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وجہہ علی طریق البحر مخافة العدو فلذلك لم یکن محرماً إذا اجتمع مع أصحابہ لأن مخرجھم لم یکن واحداً" عمدة القاری (ج۱۰ ص۱۶۱) باب إذا صاد الحلال فأھدی للمحرم الصید أکلہ ۱۲ مرتب

[۳] (ج۱ ص۳۳۳) باب الصید یذبحہ الحلال فی الحل ھل للمحرم أن یأکل منہ أم لا؟ ۱۲ م

[۴] چنانچہ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: قلتُ: أحسن الأجوبة ما ذکر فی حدیث أبی سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ عمدة (ج۱۰ ص۱۶۱)

اور علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وھذا أقوی من کل ما قیل فی حل ھذا الإشکال لأنہ صرح بہ فی نفس الحدیث معارف (ج ۶ ص۳۶۲) ۱۲ مرتب

جواب کا حاصل یہ ہے کہ حضرت ابوقتادہؓ مدینہ سے مکہ کے ارادہ سے نہیں چلے تھے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بعض علاقوں سے زکوٰۃ وصول کرنے پر مامور فرمایا تھا، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحابؓ مکہ مکرمہ روانہ ہوئے تو راستہ میں ابوقتادہؓ بھی مل گئے، شکار کا مذکورہ واقعہ اسی وقت پیش آیا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

باب ما جاء فی صید البحر للمحرم

خرجنا[1] مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حج أو عمرۃ فاستقبلنا رجل من جراد، فجعلنا نضربہ بسیاطنا و عصینا، فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: کلوہ فإنہ من صید البحر" سمندری شکار محرم کے لئے بنص[2] قرآنی جائز ہے، البتہ ٹڈی کے بارے میں ابوسعید اصطخریؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ وہ بھی صید البحر میں داخل ہے[3]۔ ان کا استدلال حدیث باب سے ہے۔

لیکن جمہور کے نزدیک ٹڈی صید البر میں سے ہے اور اس کے شکار پر جزا واجب ہے[4]۔ ان کا استدلال مؤطا امام مالک میں حضرت عمرؓ کے اثر سے ہے "لتمرۃ[5] خیر من جرادۃ"، نیز مؤطا امام مالک ہی میں حضرت عمرؓ کے ایک اور اثر[6] میں "أطعم

---

[1] الحدیث أخرجہ أبو داؤد (ج ۱ ص ۲۵۶) باب الجراد للمحرم، وابن ماجہ فی سننہ (ص ۲۳۲) أبواب الصید، باب صید الحیتان والجراد ۱۲ م

[2] أحل لکم صید البحر وطعامہ متاعا لکم وللسیارۃ۔ (سورۂ مائدہ آیت ۹۶ پ ۷) ۱۲ م

[3] ابن المنذر نے حضرت ابن عباسؓ، کعب احبار اور عروہ بن زبیر کا مسلک بھی یہی نقل کیا ہے۔

امام احمدؒ سے بھی اس بارے میں دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ اس کا شمار صید البحر میں ہے اور اس میں کوئی جزا نہیں اور ایک یہ کہ اس کا شمار صید البر میں ہے اور اس میں جزا ہے۔ دیکھئے المغنی (ج ۳ ص ۵۰۸) باب الفدیۃ وجزاء الصید، الفصل الخامس ۱۲ مرتب

[4] دیکھئے المغنی (ج ۳ ص ۵۰۸ و ۵۰۹) ۱۲ م

[5] مؤطا امام مالک (ص ۳۴۰) فدیۃ من أصاب شیئا من الجراد وھو محرم — پوری روایت اس طرح ہے "عن یحیی بن سعید أن رجلا جاء إلی عمر بن الخطاب سألہ عن جرادۃ قتلہا وھو محرم، فقال عمر لکعب: تعال حتی نحکم فقال کعب: درھم، فقال عمر: إنک لتجد الدراھم، لتمرۃ خیر من جرادۃ"۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

قبضۃ من طعام[1]" کے الفاظ آئے ہیں، امام شافعیؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے بھی "فیہا (فی الجرادۃ) قبضۃ من طعام" کی روایت نقل کی ہے ۔ ذکرہ الحافظ فی التلخیص[2]

جہاں تک حدیثِ باب کا تعلق ہے سو وہ جمہور کے نزدیک ابو المہزم[3] یزید بن سفیان

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مؤطا امام مالک کی مذکورہ روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کعب احبار کا مسلک بھی وہ نہیں جو ابن المنذر نے بیان کیا ہے کہ وہ صید البحر میں سے ہے بلکہ ان کا مسلک جمہور کے مطابق ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا مسلک پہلے وہی ہو اور بعد میں اس سے رجوع کر لیا ہو۔ واللہ اعلم ۱۲ مرتب

(حاشیہ صفحہ ھٰذا) [1] مؤطا امام مالک (ص۳۲۸) فدیۃ من أصاب شیئاً من الجراد وھو محرم۔ پوری روایت اس طرح ہے "عن زید بن أسلم أن رجلاً جاء إلی عمر بن الخطاب، فقال یا أمیر المؤمنین إنی أصبت جرادات بسوطی وأنا محرم، فقال له عمر: أطعم قبضۃ من طعام" ۱۲ م

[2] (ج ۲ ص۲۸۳) باب محرمات الإحرام، آثار الباب ۔ چنانچہ حافظؒ لکھتے ہیں "وأما (أثر) ابن عباس فرواہ الشافعی والبیہقی من طریق القاسم بن محمد قال: کنت عند ابن عباس فسأله رجل عن جرادۃ قتلها وھو محرم، فقال ابن عباس: فیھا قبضۃ من طعام، ورواہ سعید بن منصور من ھٰذا الوجه وسندہ صحیح"

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابن عباسؓ کا یہ اثر بھی منقول ہے "عن القاسم قال سئل ابن عباس عن المحرم یصیب الجرادۃ، فقال: تمرۃ خیر من جرادۃ (ج ۴ ص۸) فی المحرم یقتل الجرادۃ

مصنف عبد الرزاق میں حضرت ابن عباس کا یہ اثر بھی منقول ہے "أدنی ما یصیبه المحرم الجراد، ولیس فیما دونها جزاء، وفیها تمرۃ" (ج ۴ ص۴۱۱، رقم ۸۲۵۰) باب الھر والجراد۔

ان تمام آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کا مسلک بھی جمہور کے مطابق ہے لا کما نقله ابن المنذر، یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کا مسلک پہلے یہی ہو کہ جراد صید البحر میں سے ہے لیکن بعد میں انہوں نے اس سے رجوع کر لیا ہو

حافظؒ نے ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے حضرت ابن عمرؓ کا اثر بھی نقل کیا ہے۔ عبد اللہ بارقی کہتے ہیں "کان ابن عمر یقول: فی الجراد قبضۃ من طعام" اور سعید بن منصور کے حوالہ سے ایک اور اثر نقل کیا ہے، ابو سلمہ ابن عمرؓ کے بارے میں فرماتے ہیں "أنه حکم فی الجراد بتمرۃ" التلخیص الحبیر (ج ۲ ص۲۸۳) باب محرمات الإحرام، آثار الباب ۱۲ مرتب عفی عنہ

[3] ابو المہزم بتشدید الزاء المکسورۃ، التمیمی، البصری، اسمه یزید، وقیل: عبد الرحمن بن سفیان، متروک، من الثالثۃ (الطبقۃ الوسطی من التابعین) —— تقریب التہذیب (ج ۲ ص۴۷۳، رقم ۱۵۰)

حافظ ذہبیؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: ضعّفوہ، وھو بکنیته أشھر، روی عن شعبۃ ثم ترکه، روی عنه حسین المعلم وعبد الوارث وجماعۃ، ضعّفه ابن معین، وقال النسائی متروک، قال ابن عدی: ما یرویه غیر محفوظ، وقال مسلم: سمعت شعبۃ یقول: رأیت أبا المہزم ولو یعطی درھما لوضع حدیثا وقال أیضا سمعت شعبۃ یقول: کان أبو المہزم مطروحا فی مسجد ثابت، لو أعطاہ انسان فلسا لحدثه سبعین حدیثا —— ھٰذا ملخص ما فی میزان الاعتدال (ج ۴ ص۴۲۶، رقم ۹۷۰۱) ۱۲ مرتب

کی وجہ سے ضعیف ہے، جو متروک ہے لہٰذا اس سے استدلال درست نہیں۔

نیز اگر اس روایت کو درست بھی تسلیم کیا جائے تب بھی آپؐ کے فرمان "فإنه من صید البحر" کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ صید البحر کے مشابہ ہے من حیث یحل میتۃً ولا یحتاج الی الذبح، قالہ علی القاریؒ[1]۔

واضح رہے کہ حدیثِ باب میں لفظِ "رِجْل" بکسر الراء وسکون الجیم ہے، وھو من الجراد کالجماعۃ الکثیرۃ من الناس[2]۔ واللہ أعلم

باب ماجاء فی الضبع یصیبھا المحرم

"عن[3] ابن أبی عمار قال: قلتُ لجابر: الضبع، أصیدٌ ھی؟ قال: نعم، قال: قلت: آکلھا؟ قال: نعم، قال: قلت: أقاله رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم؟ قال: نعم" ضبع ایک درندہ ہے جسے فارسی میں "کفتار" اور اردو میں "ہنڈار" یا "بجو" کہتے ہیں، حنفیہ کے نزدیک اگر وہ یا اور کوئی درندہ از خود حملہ آور ہوا اور اُسے محرم قتل کردے تو کوئی جزا واجب نہیں اور اگر محرم اُسے ابتداءً قتل کرے تو جزا ہے[4] جو زیادہ سے زیادہ

---

[1] چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "قال العلماء: إنما عدّہ من صید البحر لأنه یشبه صید البحر من حیث میتته ولما قیل من أن الجراد یتولّد من الحیتان کالدیدان، ولا یجوز للمحرم قتل الجراد، ولزمه بقتله قیمته اھ ولا یصح التفریع کما لا یخفی علی الثانی

البتہ ملا علی قاریؒ نے ترمذی کی روایتِ باب کے صحیح ہونے کی تقدیر پر روایات میں تطبیق کی صورت بھی بیان کی ہے، فرماتے ہیں: أقول: لو صح حدیث أبی داود والترمذی المذکور سابقاً کان ینبغی أن یجمع بین الأحادیث بأن الجراد علی نوعین بحری وبری، فیعمل فی کل منھما بحکمه

مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح (ج ۵ ص ۳۸۹) باب المحرم یجتنب الصید، الفصل الثانی ۱۲ مرتب

[2] کما فی مجمع البحار (ج ۲ ص ۲۹۵) ۱۲ م

[3] لم یخرجه من أصحاب الکتب الستة غیر الترمذی، قاله الشیخ محمد فؤاد عبد الباقی۔ سنن ترمذی (ج ۳ ص ۲۰۷، رقم ۸۵۱) أقول: أخرجه النسائی فی سننه (ج ۲ ص ۱۹۸، کتاب الصید والذبائح، الضبع) وابن ماجه فی سننه (ص ۲۳۳، ابواب الصید، باب الضبع) بتغییر یسیر فی اللفظ ۱۲ مرتب

[4] البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک محرم کے لئے درندہ کو ابتداءً قتل کرنا بھی جائز ہے اور قتل کرنے کی صورت میں اس پر کوئی جزا نہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے بدائع الصنائع (ج ۲ ص ۱۹۷) فصل واما بیان أنواعه ۱۲ مرتب

ایک بکری ہوگی[1] حدیثِ باب میں اُسے جو صید قرار دیا گیا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ اسے از خود قتل کرنے سے جزا واجب ہے۔

ضبع کی حلّت وحُرمت حدیثِ باب میں "قلتُ: آکلها؟ قال: نعم" سے ضبع کی حلّت معلوم ہوتی ہے، یہ مسئلہ اصل میں تو "کتاب الأطعمة" کا ہے، یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ ضبع حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک حرام اور شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک حلال ہے۔

شافعیہ اور حنابلہ حدیثِ باب سے استدلال کرتے ہیں جبکہ حنفیہ اور مالکیہ کی دلیل وہ احادیث ہیں جن میں "کل ذی ناب من السباع" کو حرام قرار دیا گیا ہے،[2] اس کلیہ میں ضبع بھی داخل ہے[3]

---

[1] یہ تفصیل معارف السنن (ج ۲ ص ۳۷۶) سے ماخوذ ہے۔ ۱۲ مرتب

[2] چند روایات درج ذیل ہیں:

(۱) عن أبي هريرة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: كل ذي ناب من السباع فأكله حرام.

(۲) عن ابن عباس قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن كل ذي ناب من السباع وعن كل ذي مخلب من الطير.

یہ دونوں روایات صحیح مسلم میں مروی ہیں، دیکھئے (ج ۲ ص ۱۴۷) کتاب الصيد والذبائح، باب تحريم أكل كل ذي ناب من السباع۔

(۳) عن خالد بن الوليد قال: غزوتُ مع رسول الله صلى الله عليه وسلم خيبر فأتت اليهود، فشكوا أن الناس قد أسرعوا إلى حظائرهم، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ألا لا يحل أموال المعاهدين إلا بحقها، وحرام عليكم الحمر الأهلية وخيلها وبغالها وكل ذي ناب من السباع وكل ذي مخلب من الطير.

سنن ابی داؤد (ج ۲ ص ۵۳۳) کتاب الاطعمة باب ماجاء في أكل السباع۔

(۴) عن أبي ثعلبة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن اكل كل ذي ناب من السباع۔

دیکھئے صحیح بخاری (ج ۲ ص ۸۲۸) کتاب الذبائح والصيد والتسمية، باب اكل كل ذي ناب من السباع وصحیح مسلم (ج ۲ ص ۱۴۷) کتاب الصيد والذبائح، باب تحريم أكل كل ذي ناب من السباع۔ وسنن أبی داؤد (ج ۲ ص ۵۳۳) کتاب الأطعمة، باب ماجاء في أكل السباع۔ وسنن نسائی (ج ۲ ص ۱۹۹) کتاب الصيد والذبائح باب تحريم أكل السباع۔ وسنن ترمذی (ج ۱ ص ۱۷۳) أبواب الصيد، باب في كراهية كل ذي ناب وذي مخلب وسنن ابن ماجۃ (ص ۲۳۲) أبواب الصيد، باب أكل كل ذي ناب من السباع۔ (باقی حاشیہ صفحہ پر)

اس کے علاوہ ترمذی اور ابن ماجہ میں خزیمہ بن جزء رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے "أو یأکل الضبع أحد[۱]" یہ حدیث اگرچہ عبد الکریم[۲] بن ابی المخارق کیوجہ سے ضعیف ہے لیکن "تحریم کل ذی ناب" والی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

(۵) حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کل ذی نهبة وعن کل ذی مجثمة وعن کل ذی ناب من السباع" رواہ أحمد والبزار باختصار والطبرانی فی الکبیر، و قال البزار: أسنادہ حسن۔

(۶) عن أبی أمامة قال: خرجنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی غزوة غزاها، فأمر منادیاً، فنادی إن الجنة لا تحل لعاص، ألا وان الحمر الأهلیة حرام وکل ذی ناب أو قال کل ذی ظفر، وفی روایة: وکل سبع ذی ظفر أو ناب. رواہ الطبرانی فی الکبیر فی حدیث طویل تقدم فی الجنائز وفیه لیث بن أبی سلیم وهو ثقة ولکنه مدلس وبقیة رجاله ثقات۔

مؤخر الذکر دونوں روایات کے لئے دیکھئے مجمع الزوائد (ج ۴ ص ۴۰-۳۹) کتاب الصید والذبائح، باب فی کل ذی ناب أو ظفر وما نهی عنه ۱۲ رشید اشرف عفی عنہ

[۳] اس بات کی تائید مصنف عبد الرزاق کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے "عبد الرزاق عن الثوری عن سهیل بن أبی صالح قال: جاء رجل من أهل الشام، فسأل ابن المسیب عن أکل الضبع، فنهاه، فقال له: فان قومك یأکلونها۔ أو نحو هذا۔ قال: إن قومی لا یعلمون، قال سفیان: وهذا القول أحب إلیّ، فقلت لسفیان: فأین ما جاء عن ابن عمر وعلی وغیرهما؟ فقال: ألیس قد نهی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن أکل ذی ناب من السباع، فترکها أحب إلیّ قال: وبه یأخذ عبد الرزاق" (ج ۴ ص ۵۱۳، رقم ۸۶۸۴) کتاب المناسك، باب الضبع ۱۲ مرتب

(حاشیہ صفحہ هذا)

[۱] ترمذی میں پوری روایت اس طرح ہے "عن حبان بن جزء عن أخیه خزیمة بن جزء قال: سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن أکل الضبع، فقال: أو یأکل الضبع أحد؟ وسألته عن أکل الذئب، فقال ویأکل الذئب أحد فیه خیر؟ (ج ۲ ص ۵) أبواب الأطعمة، باب ما جاء فی أکل الضبع ۔ اور ابن ماجہ کی روایت اس طرح ہے" عن خزیمة بن جزء قال: قلت یا رسول اللہ! ما تقول فی الضبع، قال: ومن یأکل الضبع؟" (ص ۲۳۳) ابواب الصید باب الضبع ۱۲ مرتب

[۲] عبد الکریم بن أبی المخارق: بضم المیم وبالخاء المعجمة، أبو أمیة المعلم البصری، نزیل مکة، واسم أبیه قیس، وقیل: طارق، ضعیف الخ" تقریب التهذیب (ج ۱ ص ۵۱۶، رقم ۱۲۸۵)

ان پر درس ترمذی (ج ۱ ص ۱۹۹) باب النهی عن البول قائماً کے تحت کلام گذر چکا ہے، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے میزان الاعتدال (ج ۲ ص ۶۴۶، رقم ۵۱۴۲) وتهذیب التهذیب (ج ۶ ص ۳۷۶ تا ص ۳۷۹)

احادیث اس کی مؤید ہیں[1]۔

جہاں تک حدیثِ باب کا تعلق ہے اس میں فنی اعتبار سے دو اشکالات ہیں اول تو یہ کہ یحییٰ بن سعید قطان نے کہا ہے کہ اس کے راوی ابن ابی عمار نے اس کو مرفوعاً روایت کرکے غلطی کی ہے، دراصل یہ حدیث حضرت عمرؓ پر موقوف تھی، خود امام ترمذیؒ نے بھی جریر بن حازمؒ کے حوالہ سے اس کا موقوف ہونا بیان کیا ہے، لیکن بعد میں حدیثِ باب کو اصح قرار دیا ہے، بہرکیف اس میں رفع اور وقف کا اختلاف موجود ہے[2]۔ دوسرے یہی حدیث سنن ابی داؤد[3] میں آئی ہے اور اس میں کھانے کا کوئی ذکر نہیں، پوری روایت اس طرح ہے۔ "عن جابر بن عبد اللہ قال: سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الضبع، فقال: ھو صید، ویجعل فیہ کبش إذا صادہ المحرم"

ان وجوہ کی بنا پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی راوی نے ضبع کے صید ہونے کا مطلب یہ سمجھا کہ وہ حلال ہے حالانکہ شکار حرام جانوروں کا بھی ہوتا ہے[4]۔ اور اس بنا پر اس نے اکل والا حصہ بڑھا دیا۔

---

[1] اس کے علاوہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ایک ایسی مرفوع روایت مروی ہے جس میں "ضبع" کی صراحۃً ممانعت موجود ہے "نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الضب والضبع وعن الکلب وکسب الحجام ومھر البغی (الدورقی) کنز العمال (ج ۲۰ ص ۲۲) کتاب المعیشۃ، الضب ۱۲ مرتب

[2] دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۳۷۱) ۱۲ م

[3] (ج ۲ ص ۵۳۳) کتاب الأطعمۃ، باب فی أکل الضبع ۱۲ م

[4] علامہ ابن قدامہؒ نے صید ہونے کی تین شرائط بیان کی ہیں فرماتے ہیں: "والصید: ما جمع ثلاثۃ أشیاء وھو أن یکون مباحاً أکلہ، لا مالک لہ، ممتنعاً المغنی (ج ۳ ص ۵۰۰) باب الفدیۃ وجزاء الصید الفصل الرابع۔

معلوم ہوا کہ ان حضرات کے نزدیک صید کے لئے ماکول اللحم ہونا ضروری ہے اور حدیثِ باب میں "ضبع" کو صید قرار دیا گیا ہے، اول تو اس میں کھانے کا صراحۃً ذکر ہے، دوسرے جس روایت میں اکل کا ذکر نہیں اس میں بھی لفظ "صید" کی وجہ سے ضبع حلال اور ماکول اللحم قرار پائے گا

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ لفظِ صید ماکول اللحم کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ماکول اللحم اور غیر ماکول اللحم دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے چنانچہ شعر ہے ؎

صید الملوک أرانب وثعالب　　　وإذا رکبت فصیدی الأبطال

امام رازیؒ نے اس شعر کی نسبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف کی ہے، کما فی نصب الرایۃ، دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۳۷۱) ۱۲ مرتب عفی عنہ

نیز حافظ ماردینیؒ فرماتے ہیں کہ عبدالرحمٰن[1] بن ابی عمار نقلِ حدیث میں زیادہ مشہور نہیں اور ثقات کی مخالفت میں ان کی روایت مقبول نہیں جبکہ حدیثِ باب صرف انہی سے مروی ہے اور "کل ذی ناب من السباع" والی حدیث بلاشبہ ثابت اور صحیح ہے[2]۔ واللہ أعلم

باب ماجاء فی الاغتسال لدخول مکۃ[3]

عن[4] ابن عمر قال: اغتسل النبی صلی اللہ علیہ وسلم لدخول مکہ بفخ[4]"

یہ حدیث اگرچہ سنداً ضعیف ہے، کما صرح بہ الترمذیؒ[5] لیکن دو وجوہ سے اسے قبول کرلیا گیا ہے، ایک تو اس لئے کہ یہ مؤید بالتعامل[6] ہے، دوسرے اس لئے کہ فضائل میں حدیثِ ضعیف بھی مقبول

---

[1] عبد الرحمن بن عبد اللہ بن أبی عمار لکنہ ما علمت بہ بأسا۔ میزان الاعتدال (ج ۲ ص۵۷۹، رقم ۴۸۱۷) ۱۲ م

[2] قال الحافظ علاء الدین الترکمانی فی "الجوهر النقی" (۲ - ۲۲۵): حدیث النهی عن کل ذی ناب من السباع صحیح ثابت مشهور مروی عن عدۃ طرق، فلا تعارض بہ حدیث "الضبع صید" لأنہ انفرد بہ عبد الرحمن بن أبی عمار، ولیس هو بمشهور بنقل العلم، ولا ممن یحتج بہ إذا خالفہ من هو أثبت منہ، کذا قال صاحب التمهید" معارف السنن (ج ۶ ص۲۶۲) ۱۲ مرتب

[3] لم یخرجہ من أصحاب الکتب الستۃ غیر الترمذی ۔ قالہ الشیخ محمد فؤاد عبد الباقی ۔ سنن ترمذی (ج ۳ ص۲۰۸) رقم ۸۵۲) ۱۲ م

[4] هی موضع بمکۃ، وقیل: واد دفن بہ عبد اللہ بن عمر، وهو أیضاً ما أقطعہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم عظیم بن الحارث ۔ مجمع بحار الأنوار (ج ۴ ص۱۰۱) ۱۲ م

[5] چنانچہ وہ فرماتے ہیں: وعبد الرحمن بن زید بن أسلم ضعیف فی الحدیث، ضعفہ أحمد بن حنبل وعلی بن المدینی وغیرهما ولا نعرف هذا الحدیث مرفوعاً إلا من حدیثہ ۔ ۱۲ م

[6] تعامل اور تلقی بالقبول کی وجہ سے حدیثِ ضعیف صحیح کے درجہ میں آجاتی ہے، یہ قاعدہ درسِ ترمذی (ج ۱ ص۸۵ و ۸۶) میں "احادیث کی تصحیح وتضعیف کے اصول وقواعد" کے تحت وضاحت کے ساتھ ذکر کیا جاچکا ہے، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے "الأجوبۃ الفاضلۃ للأسئلۃ العشرۃ الکاملۃ" للعلامۃ اللکنویؒ (ص۵۱ و ۵۲) نیز دیکھئے "التعلیقات الحافلۃ علی الأجوبۃ الفاضلۃ" للشیخ عبد الفتاح أبوغدہ (ص۲۲۸ تا ص۲۳۸) ۱۲ مرتب

ہوتی ہے[1]۔ لیکن اس دوسرے قاعدہ کے بارے میں ایک بات یاد رکھنی ضروری ہے :-

فضائل کے باب میں حدیثِ ضعیف تین شرائط کے ساتھ مقبول ہے

علامہ سیوطیؒ نے "تدریب الراوی" میں اور حافظ سخاویؒ نے "القول البدیع فی الصلوٰۃ علی الحبیب الشفیع" میں حافظ ابن حجرؒ سے نقل کیا ہے کہ حدیثِ ضعیف فضائل کے باب میں تین شرائط کے ساتھ مقبول ہوتی ہے۔

(۱) اس کا ضعف بہت شدید نہ ہو فیخرج من انفرد من الکذابین والمتہمین بالکذب ومن فحش غلطہ۔

(۲) اس کا مضمون شریعت کے اصولِ ثابتہ میں سے کسی اصل معمول بہ کے تحت داخل ہو، فیخرج ما یخترع بحیث لایکون لہٗ أصل أصلاً

(۳) أن لایُعتقد عند العمل بہٖ ثبوتہ، بل یعتقد الاحتیاط لئلا یُنسب الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم مالم یقلہ۔

اس مسئلہ کی پوری تفصیل علامہ عبدالحی لکھنویؒ کی کتاب "الاجوبۃ الفاضلۃ" میں موجود ہے[2]۔

باب ماجاء فی کراھیۃ رفع الیدین عند رُؤیۃ البیت

سئل جابر بن عبداللہ : أیرفع الرجل یدیہ إذا رأی البیت؟ فقال: حججنا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فکنّا نفعلہ[3]۔ بیت اللہ شریف کو دیکھ کر دعا کرنا متعدد

---

[1] لیکن ان دونوں وجوہ کو اس مقام پر ذکر کرنا اس وقت درست ہوتا جبکہ زیرِ بحث مسئلہ کا مدار صرف حدیثِ باب پر ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں بلکہ مسئلۃ الباب صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ ہی کی ایک اور روایت سے ثابت ہوجاتا ہے "عن نافع قال: کان ابن عمر إذا دخل أدنی الحرم امسک عن التلبیۃ، ثم یبیت بذی طوی ثم یصلی بہ الصبح ویغتسل ویحدث أن نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یفعل ذلک" ـ امام بخاریؒ نے اس روایت پر یہ ترجمہ قائم کیا ہے "باب الاغتسال عند دخول مکۃ" دیکھئے (ج ۱ ص۲۱۲) کتاب المناسک ۱۲ مرتب

[2] دیکھئے (ص۳۶ تا ص۵۹) بحث قبول الحدیث الضعیف فی فضائل الاعمال ۱۲ مرتب

[3] ترمذی کے ہمارے پاس موجود تمام نسخوں میں روایت اسی طرح ہے یعنی "فکنّا نفعلہ" (بغیر ہمزۃ الاستفہام) جامع الاصول (ج ۳ ص۱۶۲، رقم ۱۴۲۳، الباب الحادی عشر فی دخول مکۃ والنزول بھا) میں بھی ترمذی

باقی حاشیہ صـــ پر

آثار و روایات سے ثابت ہے[1]، جن میں سے سند کے اعتبار سے سب سے زیادہ بے غبار حضرت عمرؓ کا اثر ہے جو مستدرک حاکم وغیرہ میں مروی ہے "ان عمر کان اذا نظر الی البیت قال: اللّٰھم أنتَ السَّلامُ وَمنكَ السَّلام فحیّنا ربّنا بالسَّلام" ذکرہ الحافظ فی التلخیص[2] وسکت علیہ، چنانچہ اس موقعہ پر دعا بالاتفاق مستحب ہے۔

البتہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ یہ دعا رفعِ یدین کے ساتھ ہو یا بغیر رفع کے، امام شافعیؒ نے تو فرمایا ہے کہ "ولست أکرہ رفع الیدین عند رؤیة البیت ولا استحبّہ ولکنہ عندی حسن[3]"

خود احناف کے بھی اس مسئلہ میں دو قول ہیں،

امام طحاوی نے ترکِ رفع کو ترجیح دی ہے اور حضرت جابرؓ کی حدیث[4] سے استدلال کیا ہے

(حاشیۂ صفحۂ گذشتہ)

کے حوالہ سے روایت اسی طرح نقل کی گئی ہے، لیکن معارف السنن (ج ۶ ص۳۲) کے متن میں "أفکنّا نفعلہ" (بہمزۃ الاستفہام) کے الفاظ ہیں، شرح میں بھی حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "أفکنا نفعلہ: الھمزۃ للإنکار" سنن ترمذی کے حاشیہ "نفع قوت المغتذی (ج ۱ ص۱۳۵، حاشیہ ۲) میں لکھا ہے "قولہ: فکنا نفعلہ: الھمزۃ للإنکار"۔ ملا علی قاری نے بھی "أفکنا نفعلہ" کے الفاظ نقل کئے ہیں. مرقاۃ المفاتیح (ج ۵ ص۳۱۸) باب دخول مکۃ والطواف، الفصل الثانی۔ بہرحال اگر روایت ہمزۂ استفہام کے ساتھ مانی جائے تو مطلب بالکل بدل جائیگا۔

نسائیؒ اور ابو داؤدؒ کی روایات سے استفہام والی صورت کی تائید ہوتی ہے اس لئے کہ نسائی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں "سئل جابر بن عبد اللّٰہ عن الرجل یری البیت أیرفع یدیہ؟ قال: ما کنت أظن أن أحداً یفعل ھذا إلا الیھود، حججنا مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فلم نکن نفعلہ" (ج ۲ ص۳۲) کتاب مناسک الحج ترک رفع الیدین عند رؤیۃ البیت) اور ابو داؤد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: "سئل جابر بن عبد اللّٰہ عن الرجل یری البیت یرفع یدیہ؟ فقال: ما کنت أری أحداً یفعل ھذا إلا الیھود قد حججنا مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فلم یکن یفعلہ" (ج ۱ ص۲۵۵، کتاب المناسک، باب فی رفع الید إذا رأی البیت) ۱۲ مرتب عفی عنہ

(حاشیہ صفحۂ ھذا) [1] دیکھئے التلخیص الحبیر (ج ۲ ص۲۴۲ و ۲۴۳، باب دخول مکۃ وبقیۃ أعمال الحج إلی آخرھا) اور مجمع الزوائد (ج ۳ ص۲۳۸، باب ما یقول إذا نظر الی البیت) نیز دیکھئے سنن نسائی (ج ۲ ص۳۲ و ۳۳، الدعاء عند رؤیۃ البیت) ۱۲ مرتب

[2] (ج ۲ ص۲۴۳) باب دخول مکۃ الخ ۱۲ م

[3] کذا فی معارف السنن (ج ۶ ص۳۲) اور حافظ ابن حجرؒ نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں "لیس فی رفع الیدین عند رؤیۃ البیت شئ فلا أکرھہ ولا أستحبہ" تلخیص (ج ۲ ص۲۴۲) باب دخول مکۃ الخ ۱۲ مرتب

[4] یعنی "عن جابر بن عبد اللّٰہ أنہ سئل عن رفع الأیدی عند البیت فقال: ذاك شئ یفعلہ الیھود، قد حججنا مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فلم یفعل ذلك"۔ طحاوی (ج ۱ ص۳۳۳) باب رفع الیدین عند رؤیۃ البیت ۱۲ م

اوراسی کو فقہائے حنفیہ کا مسلک بتایا ہے[۱]۔

لیکن صاحبِ غنیۃ الناسک نے متعدد محققینِ حنفیہ کا قول نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک رفع یدین مستحب ہے[۲]۔ اوران محققین نے ابن ہمامؒ اور ملا علی قاریؒ کا بھی نام لیا ہے[۳]۔

قائلینِ استحباب مسندِ شافعی میں حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع حدیث سے استدلال کرتے ہیں " ترفع الأیدی فی الصلاۃ، وإذا رأی البیت، وعلی الصفا والمروۃ[۴]" البتہ اس روایت کے ایک راوی سعید بن سالم القداح متکلم فیہ ہیں[۵]۔

نیز امام شافعیؒ ہی نے حضرت ابن جریجؒ سے مرسلاً روایت کیا ہے " أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان إذا رأی البیت رفع یدیہ وقال: اللّٰھم زد ھٰذا البیت تشریفاً وتکریماً وتعظیماً ومھابۃ، وزد من شرفہ وکرمہ ممن حجّہ واعتمرہ تشریفاً وتکریماً وتعظیماً وبِرّاً[۶]" لیکن اس میں بھی سعید بن سالم ہیں اور یہ معضل[۷] بھی ہے کیونکہ ابن جریج اس کو براہِ راست

---

[۱] طحاوی (ج ۱ ص ۳۳۲) ۱۲ م

[۲] دیکھئے فتح القدیر (ج ۲ ص ۱۴۷) باب الإحرام ۱۲ م

[۳] دیکھئے مرقاۃ المفاتیح (ج ۵ ص ۳۱۸) باب دخول مکۃ والطواف۔ الفصل الثانی ۱۲ م

[۴] دیکھئے مسند الامام الشافعی بترتیب الشیخ محمد عابد السندی (ص ۳۳۹، رقم ۸۶۵) کتاب الحج، الباب السادس فیما یلزم الحاج بعد دخول مکۃ إلی فراغہم من مناسکہم ۔ پوری روایت اور سند اس طرح ہے:

" أخبرنا سعید بن سالم عن ابن جریج قال: حُدِّثتُ عن مِقْسم مولی عبد اللہ بن الحارث عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أنہ قال: " ترفع الأیدی فی الصلاۃ وإذا رأی البیت، وعلی الصفا والمروۃ، وعشیۃ عرفۃ، وبجمع، وعند الجمرتین وعلی المیّت" ۱۲ مرتب

[۵] حافظ لکھتے ہیں: سعید بن سالم القداح، أبو عثمان المکی، أصلہ من خراسان أو الکوفۃ صدوق یہم، رُمی بالإرجاء، وکان فقیہاً من کبار التاسعۃ۔

تقریب التہذیب (ج ۱ ص ۲۹۶، رقم ۱۷۲)

ان کے بارے میں جارحین ومعدلین کے اقوال کے لئے دیکھئے "میزان الاعتدال فی نقد الرجال" (ج ۲ ص ۱۳۹، رقم ۳۱۸۶) ۱۲ مرتب

[۶] مسند الامام الشافعی (ص ۳۳۹، رقم ۸۶۴) ۱۲ م

[۷] المعضل ھو: ما سقط من اسنادہ اثنان فأکثر علی التوالی۔ تیسیر مصطلح الحدیث للدکتور محمود الطحان (ص ۷۵) ۱۲ مرتب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کر رہے ہیں۔

البتہ امام ازرقی نے اس کو "اخبارِ مکہ" میں اس طرح روایت کیا ہے "عن ابن جریج قال: حُدِّثتُ عن مکحول أنہ قال: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم إذا رأی البیت رفع یدیہ فقال: اللّٰھم زد ھٰذا البیت تشریفاً[1] الخ" پھر بھی اس میں دو جگہ انقطاع باقی رہا[2]۔

انہی مذکورہ مغامز کی بنا پر امام شافعی اور امام طحاوی رحمہما اللہ نے رفع یدین کو سنّت قرار دینے سے انکار کیا ہے، لیکن صاحبِ غنیۃ الناسک نے ان روایات کو مجموعی طور پر قابلِ استدلال قرار دے کر حضرت جابرؓ کی حدیثِ باب[3] کے بارے میں فرمایا ہے کہ "المثبت مقدم علی النافی[4]" واللہ اعلم

باب ما جاء فی استلام الحجر والرکن الیمانی دون ما سواھما

عن[5] أبی الطفیل قال: کنا مع ابن عباس ومعاویۃؓ لا یمرّ برکن إلا استلمہ فقال لہ ابن عباس: إن النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن یستلم إلا الحجر الأسود[6] والرکن الیمانی[7]۔" حجرِ اسود اور رکنِ یمانی کے حکم میں یہ فرق ہے کہ اگر حجرِ اسود کی تقبیل یا استلام کا موقع

---

[1] اخبار مکۃ (ج ۱ ص ۲۷۹) ما یقال عند النظر إلی الکعبۃ ۱۲ مرتب

[2] ایک ابن جریجؒ اور مکحولؒ کے درمیان، دوسرا مکحولؒ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ۱۲ م

[3] یعنی "سئل جابر بن عبد اللہ: أیرفع الرجل یدیہ إذا رأی البیت؟ فقال حججنا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فکنا نفعلہ" ۱۲ م

[4] ملا علی قاری نے بھی ان روایات کو ترجیح دی ہے جو مثبتِ رفع ہیں، لیکن تمام روایات میں تطبیق کی صورت کو ارجح قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں "أقول: الأولی الجمع بینھما بأن یحمل الاثبات علی أول رؤیۃ والنفی علی کل مرۃ" مرقاۃ شرح مشکوٰۃ (ج ۵ ص ۳۱۱) باب دخول مکۃ والطواف ۱۲ مرتب

[5] الحدیث أخرجہ البخاری (ج ۱ ص ۲۱۸) باب من لم یستلم إلا الرکنین الیمانیین ـ ومسلم ج ۱ ص ۴۱۲) باب استحباب استلام الرکنین الیمانیین فی الطواف دون الرکنین الآخرین ۱۲ م

[6] وھو الذی فی رکن الکعبۃ القریب بباب البیت من جانب الشرق ویقال لہ الرکن الأسود، ارتفاعہ من الارض ذراعان وثلثا ذراع، وقال الأزھری: ارتفاعہ من الارض ثلاثۃ أذرع إلا اسبعم أصابع۔ عمدۃ القاری (ج ۹ ص ۲۳۹) باب ما ذکر فی الحجر الاسود ۱۲ مرتب

[7] حجرِ اسود کے بالمقابل بیت اللہ کا جنوب مغربی گوشہ ۱۲ م

نہ ملے تو دور سے اشارہ کرکے ہاتھوں کو چوم لینا مسنون ہے[1]۔ لیکن رکنِ یمانی میں اگر ہاتھ سے استلام کا موقع مل جائے فبہا، ورنہ دور سے اشارہ مسنون نہیں[2]۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ حجرِ اسود کی طرح رکنِ یمانی کی تقبیل ثابت نہیں[3]۔ البتہ امام ازرقیؒ نے "اخبارِ مکہ[4]" میں ایک روایت حضرت مجاہد سے مرسلاً نقل کی ہے کہ "کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یستلم الرکن الیمانی ویضع خدّہ علیہ" غالباً اسی روایت کی بنا پر امام محمد سے رکنِ یمانی کی تقبیل کا قول مروی ہے[5]۔

نیز امام ازرقی نے متعدد ایسی روایات نقل کی ہیں جن سے حجرِ اسود اور رکنِ یمانی کے استلام

---

[1] جمہور یعنی امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام اوزاعیؒ کا مسلک یہی ہے، وھو قول ابن عمر وابن عباس وأبي هريرة وأبي سعيد وجابر وعطاء بن أبي رباح وابن أبي مليكة وعكرمة بن خالد وسعيد بن جبير ومجاهد وعمرو بن دينار۔

البتہ امام مالکؒ اس بات کے قائل ہیں کہ حجرِ اسود کی تقبیل کا موقع نہ ملنے کی صورت میں ہاتھوں کا چومنا مسنون نہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۹ ص۲۴۰و۲۴۱) باب ما ذکر فی الحجر الأسود ۱۲ مرتب

[2] چنانچہ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں: فاذا عجز عن استلامه فلا يشير إليه إلا رواية عن محمد، كذا في شرح اللباب۔ دیکھئے منحۃ الخالق علی البحر الرائق (ج ۲ ص۳۳۰) باب الإحرام ۱۲ م

[3] البحر الرائق (ج ۲ ص۳۳۰) باب الإحرام ۱۲ م

[4] (ج ۱ ص۳۳۷ و ص۳۳۸) تقبیل الرکن الیمانی ووضع الخد علیہ ۱۲ م

[5] چنانچہ صاحبِ البحر الرائق فرماتے ہیں: "وأما اليماني فيستحب ان يستلمه ولا يقبله، وعند محمد هو سنة، و تقبيله مثل الحجر الأسود" (ج ۲ ص۳۳۰) باب الإحرام

سنن دارقطنی میں حضرت ابن عباسؓ کی ایک مرفوع روایت سے بھی امام محمدؒ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے "ثنا محمد بن مخلد نا الرمادي نا يحيى بن أبي بكير أنا إسرائيل عن عبد الله بن مسلم بن هرمز عن سعيد بن جبير عن ابن عباس قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقبل الركن اليماني ويضع خده عليه" (ج ۲ ص۲۹۰) باب المواقيت رقم ۲۴۲

اس کے علاوہ اور بھی متعدد دلائل سے امام محمدؒ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے البحر الرائق (ج ۲ ص۳۳۰) ۱۲ مرتب

کے وقت دعا کی قبولیت کی خاص امید معلوم ہوتی ہے[1]۔ مثلاً حضرت ابن عمرؓ کا اثر ہے "علی الرکن الیمانی ملکان موکلان یؤمنان علی دعاء من یمرّ بهما وإن علی الأسود مالا یحصیٰ" رواه الأزرقی[2]، وفی اسنادہ سعید بن سالم وفیه مقال۔

فائدہ "اخبارِ مکہ" کے مؤلف امام ابوالولید أزرقیؒ[3] امام بخاریؒ کے ہم عصر ہیں[4]۔ اخبارِ مکہ میں اکثر وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں[5]، ان کے دادا احمد بن محمد الازرقی ہیں۔ ان کی کنیت بھی ابوالولید ہے[6]۔ اور یہ امام بخاریؒ کے استاذ ہیں[7]۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں ان سے روایات لی ہیں[8]۔

---

[1] مثلاً "عن مجاهد قال: من وضع یده علی الرکن الیمانی ثم دعا استجیب له"

"عن مجاهد قال: مامن انسان یضع یده علی الرکن الیمانی و یدعو الا استجیب له"

اخبار مکة وما جاء فیها من الآثار (ج ۱ ص۳۳۹) استلام الرکن الیمانی وفضله۔

یہ دونوں روایات رکن یمانی سے متعلق ہیں، حجرِ اسود اور رکنِ یمانی دونوں کا تذکرہ جس روایت میں ہے وہ متن میں آرہی ہے۔ ۱۲ مرتب

[2] اخبار مکة (ج ۱ ص۳۴۲) باب مایقال من الکلام بین الرکن الاسود والیمانی ۱۲ مرتب

[3] ابن الندیم صاحب "الفہرست" نے ان کا نام ونسب اس طرح بیان کیا ہے:

"الأزرقی واسمه محمد بن عبدالله بن احمد بن محمد بن الولید بن عقبة بن الأزرق" مقدمہ اخبار مکہ (ص۱۱) ۱۲ مرتب

[4] اس لئے کہ امام بخاری کی ولادت ۱۹۴ھ میں ہوئی اور وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی (کما فی مقدمة البخاری للشیخ احمد علی السہارنفوری ص۳) اور صاحبِ اخبار مکہ کی وفات بقول ابن عزم تونسی ۲۱۲ھ میں اور بقول صاحب کشف الظنون ۲۲۳ھ میں، اور راجح قول کے مطابق اس کے بھی کئی سال بعد ہوئی کما یظهر من کلام صاحب "العقد الثمین فی تاریخ البلد الأمین" دیکھئے مقدمہ اخبار مکہ (ص۱۱ تا ۱۳) ۱۲ مرتب عفی عنہ

[5] چنانچہ فاسی العقد الثمین میں لکھتے ہیں: محمد بن عبدالله .... أبوالولید الأزرقی المکی مؤلف "اخبار مکة" حدث فیه عن جماعة، منهم جده أبوالولید أحمد بن محمد الأزرقی" مقدمہ اخبار مکہ (ص۱۱) ۱۲ مرتب

[6] حوالۂ بالا ۱۲

[7] وفی التهذیب: قال الحاکم أبوعبدالله فی تاریخ نیسابور: ممن سمع منه البخاری بمکة أبوالولید احمد بن محمد الأزرقی۔ مقدمہ صحیح بخاری للشیخ احمد علی السہارنفوری (ص۳) ۱۲ مرتب (باقی حاشیہ ص پر)

باب ماجاء فی الصلاۃ بعد العصر وبعد الصبح فی الطواف لمن یطوف

"عن[1] جبیر بن مطعم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: یا بنی عبد مناف: لا تمنعوا أحداً طاف بھذا البیت وصلی أیۃ ساعۃ شاء من لیل أو نہار" اس حدیث سے استدلال کرکے امام شافعی اور امام احمد اس بات کے قائل ہیں کہ طواف کے بعد کی دو رکعتیں اوقاتِ مکروہہ میں بھی ادا کی جاسکتی ہیں[2]۔

جبکہ امام ابوحنیفہ اور ایک روایت کے مطابق امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ یہ رکعتیں اوقات مکروہہ میں ادا نہیں کی جاسکتیں[3] بلکہ فجر اور عصر کے بعد طواف کرنے والے کو یہ چاہئے کہ وہ طواف کرتا رہے اور آخر میں تمام طوافوں کی رکعات طلوع یا غروب کے بعد ایک ساتھ ادا کرے۔

احناف کے دلائل حنفیہ کا پہلا استدلال احادیث النہی بعد الفجر وبعد العصر سے ہے جو معنیً متواتر ہیں اور مطلق ہیں[4]۔

ٖ مثلاً دیکھئے صحیح بخاری (ج ۱ ص۴۸۹) کتاب الانبیاء، باب قول اللہ عزوجل وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا۔ "حدثنا احمد بن محمد المکی قال سمعت ابراھیم بن سعد" ۱۲ مرتب

(حاشیہ صفحہ ھٰذا)

[1] الحدیث أخرجہ أبوداؤد فی سننہ (ج ۱ ص۲۶۱) کتاب المناسک، باب الطواف بعد العصر والنسائی (ج ۲ ص۳۵) کتاب مناسک الحج، إباحۃ الطواف فی کل الأوقات۔ وابن ماجہ (ص۸۹) أبواب إقامۃ الصلوات والسنۃ فیھا، باب ماجاء فی الرخصۃ فی الصلاۃ بمکۃ فی کل وقت ۱۲ مرتب

[2] عطاءؒ، طاوسؒ، قاسمؒ، عروۃ بن الزبیرؒ اور امام اسحٰقؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۹ ص۲۷۴) باب الطواف بعد الصبح والعصر ۱۲ م

[3] حضرت سعید بن جبیرؒ، حسن بصریؒ، مجاہدؒ، سفیان ثوریؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔ عمدہ (ج ۹ ص۲۷۴) ۱۲ م

[4] ان روایات کے لئے دیکھئے صحیح بخاری (ج ۱ ص۸۲ و۸۳) کتاب مواقیت الصلوۃ، باب الصلوۃ بعد الفجر حتی ترتفع الشمس وباب لا تتحری الصلاۃ قبل غروب الشمس وباب من لم یکرہ الصلاۃ إلا بعد العصر والفجر۔ سنن ابی داؤد (ج ۱ ص۱۸۱) باب من رخص فیھما إذا کانت الشمس مرتفعۃ۔ سنن نسائی (ج ۱ ص۶۸) النھی عن الصلاۃ بعد الصبح، والنھی عن الصلاۃ بعد العصر۔ سنن ابن ماجہ (ص۸۹) باب النھی عن الصلاۃ بعد الفجر وبعد العصر ۱۲ مرتب

دوسرا استدلال حضرت عمرؓ کے اثر سے ہے "عن حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف أن عبدالرحمٰن بن عبد القاری أخبرہ أنہ طاف بالبیت مع عمر بن الخطاب بعد صلاۃ الصبح، فلما قضی عمر طوافہ نظر فلم یر الشمس، فرکب حتی أناخ بذی طوی، فصلی رکعتین[1]"

تیسرا استدلال مسند احمد میں حضرت جابرؓ کی روایت سے ہے جو سندِ صحیح کے ساتھ مروی ہے "لم نکن نطوف بعد صلوٰۃ الصبح حتی تطلع الشمس ولا بعد العصر حتی تغرب[2]"۔

چوتھا استدلال مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عائشہؓ کے اثر سے ہے "أنھا قالت: إذا أردت الطواف بالبیت بعد صلوٰۃ الفجر أو العصر فطف وأخر الصلاۃ حتی تغیب الشمس أو حتی تطلع فصل لکل أسبوع رکعتین[3]"

---

[1] اللفظ للموطا (ص۳۸۵) کتاب الحج، الصلاۃ بعد الصبح والعصر فی الطواف، وأخرجہ البخاری فی صحیحہ تعلیقاً (ج۱ ص۲۲۰) باب الطواف بعد الصبح والعصر، والترمذی أیضاً فی الباب تعلیقاً

حافظؒ فرماتے ہیں: وقد رویناہ بعلو فی أمالی ابن مندہ من طریق سفیان ولفظہ "ان عمر طاف بعد الصبح سبعاً ثم خرج إلی المدینۃ فلما کانت بذی طوی وطلعت الشمس صلی رکعتین" فتح الباری (ج۳ ص۳۹۰) باب الطواف بعد الصبح والعصر ۱۲ م

[2] اس روایت کے بارے میں علامہ عینیؒ فرماتے ہیں "وروی أحمد فی مسندہ بسند صحیح من حدیث ابی الزبیر عن جابر" عمدہ (ج۹ ص۲۶۲) باب الطواف بعد الصبح والعصر اور حافظؒ فرماتے ہیں: وروی أحمد بإسناد حسن عن أبی الزبیر عن جابر" فتح الباری (ج۳ ص۳۹۱)۔ علامہ ہیثمیؒ اس روایت کو مکمل ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "رواہ احمد وفیہ ابن لہیعۃ وفیہ کلام وقد حسنوا حدیثہ" مجمع الزوائد (ج۳ ص۲۴۵) باب اوقات الطواف ۱۲ مرتب

[3] مصنف ابن ابی شیبہ کا الدار السلفیہ بمبئی ہند کا جو نسخہ احقر کے پاس موجود ہے، اس میں یہ روایت احقر کو تلاش کے باوجود نہ مل سکی، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حج سے متعلقہ مصنف ابن ابی شیبہ کے چند ابواب طبع ہونے سے رہ گئے ہیں، اس لئے کہ کتاب الحج اس کی چوتھی جلد میں ہے جو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، فی قولہ تعالیٰ: فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ" سے شروع ہو رہی ہے، جبکہ تیسری جلد کے آخر میں لکھا ہوا ہے "تم الجزء الثالث من الکتاب المصنف والحمد للہ وحدہ ویتلوہ کتاب الحج أولہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ما قالوا فی ثواب الحج"۔

البتہ حافظؒ نے ابن ابی شیبہ ہی کے حوالہ سے "عن محمد بن فضیل عن عبد الملک عن عطاء عن عائشۃ" کے طریق سے یہ روایت نقل کی ہے اور آگے فرماتے ہیں "وھذا إسناد حسن، فتح الباری (ج۳ ص۳۹۲) باب الطواف بعد الصبح والعصر۔ علامہ عینیؒ نے بھی ابن ابی شیبہ ہی کے حوالہ سے اسی طریق سے یہ روایت ذکر کی ہے اور اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ عمدہ (ج۹ ص۲۶۳، ۲۶۴) مرتب عفی عنہ

پانچواں استدلال مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابوسعید خدریؓ کے اثر سے ہے "أنه طاف بعد الصبح فلما فرغ جلس حتی طلعت الشمس[۱]"۔

چھٹا استدلال صحیح بخاری[۲] میں حضرت ام سلمہؓ کی روایت سے ہے "أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال وهو بمكة وأراد الخروج ولم تكن أم سلمة طافت بالبیت وأرادت الخروج، فقال لها رسول الله صلی الله علیه وسلم: إذا أقیمت الصلوٰة للصبح فطوفی علی بعیرك والناس یصلّون، ففعلت ذلك ولم تصل حتی خرجت" یہاں حضرت ام سلمہؓ کا طواف کی رکعتین حرم میں نہ پڑھنا بجز اس کے کسی وجہ سے نہیں ہوسکتا کہ فجر کے بعد ان کا پڑھنا درست نہ تھا ورنہ وہ حرم کی فضیلت نہ چھوڑتیں۔

جہاں تک حدیثِ باب کا تعلق ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں "أیة ساعة" سے ساعاتِ غیر مکروہہ مراد ہیں اور اس فرمان کا مقصد بنو عبد مناف کو یہ ہدایت کرنا ہے کہ وہ آنے جانے والوں کے لئے حرم کا راستہ ہر وقت کھلا رکھیں، دراصل بنو عبد مناف کے مکانات بیت اللہ شریف اور حرم کا احاطہ کئے ہوئے تھے جب یہ دروازے بند کرلیتے تو کوئی آدمی حرم تک نہ پہنچ سکتا، اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ طواف و نماز پر پابندی عائد نہ کریں، اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ حرم شریف میں نماز پڑھنے والے کے لئے کوئی وقت مکروہ نہیں[۳]۔

حدیثِ باب کا صحیح مفہوم اور زیرِ بحث مسئلہ کی تفصیل کتاب الصلوٰۃ میں بھی گذر چکی ہے[۴]۔

باب ماجاء فی کراهیة الطواف عُریانا

عن[۵] زید بن أثیع قال: سألتُ علیًا بأیّ شیْ بعثت؟ قال: بأربع، لا یدخل الجنة إلّا نفس مسلمة ولا یطوف بالبیت عریان" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ

---

[۱] علامہ عینیؒ نے یہ روایت سننِ سعید بن منصور اور مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ عمدہ (ج ۹ ص۲۴۲) باب الطواف بعد الصبح والعصر ۱۲ مرتب

[۲] (ج ۱ ص۲۲۰) باب من صلی رکعتی الطواف خارجًا من المسجد ۱۲ م

[۳] دیکھئے "الکوکب الدری" (ج ۱ ص۲۸۳) ۱۲ م

[۴] دیکھئے درس ترمذی (ج ۱ ص۲۲۳ تا ص۲۲۵) باب ماجاء فی کراهیة الصلوٰۃ بعد العصر وبعد الفجر ۱۲ م

[۵] الحدیث لم یخرجه من اصحاب الکتب الستة سوی الترمذی قاله الشیخ محمد فؤاد عبد الباقی سنن ترمذی (ج ۳ ص۲۲۲) ۱۲ مرتب

کے حج میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مکہ مکرمہ بھیجا تھا تاکہ وہ میدانِ عرفات اور منیٰ میں جہاں تمام قبائلِ عرب کا اجتماع ہوتا تھا سورۂ برارت میں نازل شدہ احکام کا اعلان کردیں، بعد میں آپؐ نے اسی سلسلہ میں حضرت علیؓ کو بھی بھیجا تھا[1]

زید بن اُثیع نے حضرت علیؓ سے یہی پوچھا تھا کہ آپ کو کن احکامات کی تعلیم دے کر بھیجا گیا؟ حضرت علیؓ نے اس کے جواب میں چار احکام ذکر کئے جن میں سے ایک "ولا یطوف بالبیت عریان ہے"، روایت کا یہی حصہ ترجمۃ الباب سے مطابقت رکھتا ہے

مشرکین کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ننگے ہوکر بیت اللہ کا طواف کرتے تھے اور اپنے اس شنیع فعل کی یہ حکمت بیان کرتے تھے کہ جن کپڑوں میں ہم نے گناہ کئے ہیں انہی کپڑوں میں بیت اللہ کا طواف کرنا بے ادبی ہے[2]۔ حدیثِ باب میں اسی سے روکا جارہا ہے کہ عریاناً طواف کرنے کی اجازت نہیں، باری تعالیٰ نے بھی "وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً الخ"[3] سے اس کی قباحت بیان فرمائی ہے اور آگے "يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ"[4] سے ستر پوشی کو ضروری قرار دیا ہے۔

چنانچہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک طواف میں سترِ عورت شرط ہے جبکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے[5] اگر اس نے کشفِ عورت کے ساتھ طواف کیا تو اس پر اعادہ واجب ہے۔ اور اعادہ نہ کرنے کی صورت میں دم دینا ضروری ہوگا، امام احمدؒ کی بھی ایک روایت یہی ہے[6]۔

---

[1] دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۹ ص۲۶۵) باب لایطوف بالبیت عریان ولا یحج مشرک ۱۲ م

[2] تفصیل کیلئے دیکھئے معارف القرآن (ج ۳ ص۵۳۲ تا ۵۳۳) تحت تفسیر قولہ تعالیٰ "وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً الخ" سورۂ اعراف آیت ۲۸) ۱۲ مرتب

[3] سورۂ اعراف آیت ۲۸ پ ۸ - ۱۲ م

[4] سورہ اعراف آیت ۳۱ پ ۸ - ۱۲ م

[5] علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ معارف السنن (ج ۶ ص۳۰۳ و ۳۰۴) میں فرماتے ہیں:

"قال شیخنا رحمہ اللہ: فإن قیل: إن ستر العورة فرض فی نفسہ، فکیف یکون واجباً للحج؟ قلت: لامنافاۃ بینہما، فإنہ قد یکون الشیئ فرضاً فی نفسہ وواجباً لغیرہ اھ. یعنی انہ اجتمع ہناک امران: فرض وواجب، فمن طاف عریاناً ارتکب کبیرتین: ترک الفرض وترک الواجب" ۱۲ مرتب

[6] مذاہب کی مذکورہ تفصیل کے لئے دیکھئے المغنی لابن قدامہ (ج ۳ ص۳۷۷) باب ذکر الحج، ودخول مکۃ، مسألۃ: قال: ویکون طاہراً فی ثیاب طاہرۃ - نیز دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۹ ص۲۶۶) باب لایطوف بالبیت عریان ۱۲ مرتب

باب ماجاء فی الصلاۃ فی الکعبۃ

عن بلال[1]: أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلّی فی جوف الکعبۃ. قال ابن عباس لم یصل و لکنہ کبّر " یہ فتح مکہ کا واقعہ ہے[2] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کعبہ میں نماز پڑھنے کے بارے میں روایات متعارض ہیں، حضرت بلال کی حدیثِ باب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے داخل ہونے کے بعد وہاں نماز بھی پڑھی جبکہ حضرت عبداللہ بن عباس اور فضل بن عباس کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے وہاں نماز نہیں پڑھی بلکہ صرف تکبیر کہی ہے[3]

جمہور نے حضرت بلالؓ کی روایت کو ترجیح دی ہے، اول تو اس لئے کہ حضرت بلالؓ کی روایت مثبت ہے اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت نافی، والمثبت مقدم علی النافی۔

دوسرے حضرت بلالؓ کعبہ میں داخل ہوتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے جبکہ حضرت ابن عباسؓ ساتھ نہیں تھے، اس لئے کہ کعبہ میں داخل ہوتے وقت آپ کے ساتھ کل تین صحابی تھے۔ ایک حضرت بلالؓ، دوسرے حضرت اسامہ بن زیدؓ اور تیسرے حضرت عثمان بن طلحہؓ، حضرت ابن عباسؓ ساتھ نہ تھے[4]

---

[1] الحدیث لم یخرجہ من اصحاب الکتب الستۃ سوی الترمذی. قالہ الشیخ محمد فؤاد عبد الباقی۔ سنن ترمذی (ج ۳ ص ۲۲۳) ۱۲ م

[2] جیساکہ مسلم میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ دیکھئے (ج ۱ ص ۴۲۸) باب استحباب دخول الکعبۃ وقال البیہقی: وھذا الدخول فی حجتہ، وذکر ابن حبان دخولہ صلی اللہ علیہ وسلم البیت مرتین فی الفتح وفی حجۃ الوداع، معارف السنن (ج ۶ ص ۳۰۲ و ص ۳۰۴) ۱۲ مرتب

[3] بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں " فدخل البیت فکبر فی نواحیہ ولم یصل فیہ " (ج ۱ ص ۲۱۸) کتاب المناسک، باب من کبّر فی نواحی الکعبۃ

اور حضرت فضل بن عباسؓ کی روایت مسند احمد اور معجم طبرانی کبیر میں مروی ہے: " ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قام فی الکعبۃ فسبّح وکبّر ودعا واستغفر ولم یرکع ولم یسجد " (قال الہیثمی) " رواہ احمد والطبرانی فی الکبیر بنحوہ ورجالہ رجال الصحیح " مجمع الزوائد (ج ۳ ص ۲۹۳) باب الصلوٰۃ فی الکعبۃ ۱۲ مرتب

[4] چنانچہ بخاری میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے " قال: دخل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم البیت ھو واُسامۃ ابن زید وبلال وعثمان بن طلحۃ " الخ (ج ۱ ص ۲۱۷) کتاب المناسک، باب اغلاق البیت ویصلی فی أیّ نواحی البیت شاء ۱۲ مرتب

لیکن اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ صحیح مسلم[1] کی روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "أخبرني أسامة بن زيد أن النبي صلى الله عليه وسلم لما دخل البيت دعا في نواحيه كلها ولم يصل فيه حتى خرج" اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے،

اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ کعبہ میں داخل ہونے کے بعد یہ حضرات علیحدہ علیحدہ ہو گئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ناحیہ میں تھے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ آپ کے قریب، جبکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان ابن طلحہ رضی اللہ عنہ دوسرے نواحی میں تھے اور کعبہ کا دروازہ چونکہ بند کر دیا گیا تھا[2]، اس لئے اندھیرا سخت تھا اور بیچ میں ستون بھی حائل تھے اس لئے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ آپ کو نماز پڑھتے ہوئے نہ دیکھ سکے، بالخصوص جبکہ آپ نے صرف دو رکعتیں پڑھی تھیں[3]۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ مسند ابو داؤد طیالسی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کعبہ کی اندرونی دیواروں پر تصویریں بنی ہوئی دیکھیں تو ان کو مٹانے کے لئے

---

[1] (ج ۱ ص ۴۲۹) باب استحباب دخول الكعبة للحاج وغيره والصلوٰة فيها ۱۲ م

[2] چنانچہ صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں "فأغلقوا عليهم الباب" صحیح بخاری (ج ۱ ص ۲۱۱) باب إغلاق البيت۔ صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۲۸) باب استحباب دخول الكعبة ۱۲ مرتب

[3] عن عثمان بن طلحة أن النبي صلى الله عليه وسلم صلى في البيت ركعتين "..... رواه احمد والطبراني في الكبير ورجال احمد رجال الصحيح - مجمع الزوائد (ج ۳ ص ۲۹۲) باب ثالث في الصلاة في الكعبة

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "وأما نفي أسامة فسببه أنهم لما دخلوا الكعبة اغلقوا الباب واشتغلوا بالدعاء، فرأى أسامة النبي صلى الله عليه وسلم يدعو، ثم اشتغل أسامة بالدعاء في ناحية من نواحي البيت، والنبي صلى الله عليه وسلم في ناحية أخرى وبلال قريب منه ثم صلى النبي صلى الله عليه وسلم، فرآه بلال لقربه ولم يره أسامة لبعده واشتغاله بالدعاء، وكانت صلاة خفيفة فلم يرها أسامة لإغلاق الباب مع بعده واشتغاله بالدعاء، وجاز له نفيها عملا بظنه وأما بلال فحققها فأخبر بها. والله اعلم. شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۲۸) باب استحباب دخول الكعبة۔

وزاد الحافظ في الفتح (ج ۳ ص ۳۷۵، باب من كبر في نواحي الكعبة): ولأن بإغلاق الباب تكون الظلمة مع احتمال أن يحجبه عنه بعض الاعمدة، فنفاها عملا بظنه ۱۲ مرتب عفی عنہ

حضرت اسامہ بن زیدؓ کو پانی لانے کا حکم دیا لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت نماز پڑھی ہو جبکہ حضرت اسامہ پانی لینے کے لئے گئے ہوئے ہوں اس لئے اُنہیں آنحضرت صلی اللہ کے نماز پڑھنے کا علم نہ ہوسکا ہو[1]۔

حضرت بلالؓ کی روایت کی ایک وجہ ترجیح یہ بھی ہے کہ وہ نہ صرف بیت اللہ میں آپؐ کے قریب تھے بلکہ جب حضرت ابن عمرؓ نے ان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا "ما صنع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ؟" تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھنے کی پوری کیفیت بیان فرمادی کہ "جعل عمودین عن یسارہ وعموداً عن یمینہ وثلاثة أعمدة وراءہ ، وکان البیت یومئذ علی ستة أعمدة ثم صلی[2]۔"

---

[1] حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

وقال المحب الطبری : یحتمل ان یکون أسامة غاب عنہ بعد دخولہ لحاجة ، فلم یشھد صلوٰتہ انتہی ویشھد لہ ما رواہ أبو داؤد الطیالسی فی مسندہ عن ابن أبی ذئب عن عبد الرحمٰن بن مہران عن عمیر مولی ابن عباس عن اسامة قال : دخلتُ علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الکعبة فرأی صوراً فدعا بدلو من ماء فأتیتہ بہ فضرب بہ الصور ، فھذا الاسناد جید ، قال القرطبی ، فلعلہ استصحب النفی لسرعة عودہ انتہی" فتح الباری (ج ۳ ص۳۷۵) باب من کبّر فی نواحی الکعبة

لیکن اس دوسرے جواب پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ حضرت فضل بن عباسؓ بھی "عدم صلوٰة" کے راوی ہیں اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیت اللہ شریف میں داخل ہوتے وقت وہ بھی آپؐ کے ساتھ تھے چنانچہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے "أن الفضل بن عباس أخبرہ أنہ دخل مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یصلّ فی الکعبة ولکنہ لما خرج فنزل رکع رکعتین عند باب البیت ، رواہ احمد وروی الطبرانی معناہ فی الکبیر ، ورجال احمد رجال الصحیح - مجمع الزوائد (ج ۳ ص۲۹۲) باب الصلوٰة فی الکعبة

معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباسؓ "عدم صلوٰة" کی روایت حضرت اسامہ بن زیدؓ سے بھی نقل کرتے ہیں اور حضرت فضل بن عباسؓ سے بھی، حضرت اسامہ بن زیدؓ کے بارے میں تو یہ کہنا درست ہوسکتا ہے کہ جس وقت وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کام سے باہر گئے اسی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں ادا فرمائیں لیکن حضرت فضل بن عباسؓ تو بظاہر اندر ہی رہے ہوں گے۔ ان کے بارے میں صرف پہلا جواب درست ہوسکتا ہے ۱۲ مرتب

[2] صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۲۸) باب استحباب دخول الکعبة ، اور بخاری کی روایت میں یہ الفاظ ہیں "جعل عموداً عن یسارہ وعموداً عن یمینہ وثلثة اعمدة وراءہ" الخ (ج ۱ ص۷۲) کتاب الصلوٰة ، باب الصلوٰة بین السواری فی غیر جماعة ۱۲ مرتب

زرقانی اور حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے میں روایات کو تعددِ واقعات پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے، دارقطنی کی ایک ضعیف روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے[1]۔

اسی بنا پر علماء کا اتفاق ہے کہ کعبہ میں نماز پڑھنا جائز اور درست ہے البتہ حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ صلاۃ فی الکعبہ کو علی الاطلاق ناجائز کہتے تھے، کیونکہ وہاں پورے کعبہ کا

---

[1] قال الشیخ البنوری رحمہ اللہ:

"قال شیخنا رحمہ اللہ: وکان من الممکن ان یوفق بین روایتی الإثبات والنفی بالحمل علی تعدد الواقعتین، ولکن المحدثین لم یتوجھوا إلیہ ومالوا إلی الترجیح

قال الراقم: ولکن قال الزرقانی: أو أنہ دخل البیت مرتین، صلی فی أحدھما ولم یصل فی الآخر قالہ المھلب ثم ذکر الزرقانی بعد بحث: فلا یمتنع أنہ دخل عام الفتح مرتین، ویکون المراد بالوحدۃ التی فی خبر ابن عیینۃ وحدۃ السفر لا الدخول، وعند الدارقطنی من طریق ضعیفۃ ما یشھد لھذا الجمع اھ معارف السنن (ج ۶ ص۳۰۷ و ۳۰۸)

سنن دارقطنی میں روایت اس طرح ہے:

"حدثنا الحسین بن اسماعیل ثنا عیسی بن أبی حرب الصفار ثنا یحیی بن أبی بکیر عن عبد الغفار بن القاسم، حدثنی حبیب بن أبی ثابت حدثنی سعید بن جبیر عن ابن عباس قال: دخل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم البیت، فصلی بین الساریتین رکعتین، ثم خرج فصلی بین الباب والحجر رکعتین، ثم قال: ھذہ القبلۃ، ثم دخل مرۃ أخری فقام فیہ یدعو ثم خرج ولم یصل"۔

صاحب "التعلیق المغنی" اس کے تحت لکھتے ہیں: "قال البیھقی: ھذہ الروایۃ إن صحت ففیہ دلالۃ علی أنہ علیہ السلام دخل البیت مرتین فصلی مرۃ وترک مرۃ إلا أن فی ثبوت الحدیث نظرا"

سنن الدارقطنی مع التعلیق المغنی (ج ۲ ص۵۱) کتاب الصلوٰۃ، باب صلوٰۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الکعبۃ رقم ۳

مذکورہ روایت حضرت ابن عباسؓ کی تھی سنن دارقطنی (ج ۲ ص۵۱، رقم ۱) ہی میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی بھی ایک روایت مروی ہے جس سے تعددِ واقعات کا پتہ چلتا ہے:

"حدثنا عبد اللہ بن محمد بن عبد العزیز ثنا وھب بن بقیۃ ثنا خالد، عن ابن أبی لیلی عن عکرمۃ بن خالد عن یحیی بن جعدۃ عن عبد اللہ بن عمر قال: دخل النبی صلی اللہ علیہ وسلم البیت ثم خرج وبلال خلفہ، فقلت لبلال: ھل صلی؟ قال: لا، قال: فلما کان الغد دخل فسألت بلالاً ھل صلی؟ قال: نعم، صلی رکعتین، استقبل الجزعۃ وجعل الساریۃ عن یمینہ"

اس روایت کی سند بھی حسن ہے چنانچہ صاحب "التعلیق المغنی" اس کے تحت لکھتے ہیں: "قال السھیلی فی الروض الأنف: سندہ حسن" اگر علامہ سہیلیؒ کے قول کے مطابق اس روایت کو صحیح مانا جائے تو تعددِ واقعات والی صورت تقریباً متعین ہوجاتی ہے۔

واللہ اعلم ۱۲ رشید اشرف عفی عنہ

استقبال نہیں ہو سکتا بلکہ بعض کعبہ کا استدبار لازم آتا ہے[1]

جمہور کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ جمیع کعبہ کا استقبال شرط نہیں بلکہ بعض کا استقبال کافی ہے، حضرت بلال کی حدیثِ باب اور "وجُعلت لی الارض مسجداً وطهوراً"[2] سے جمہور کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

پھر جمہور کے نزدیک کعبہ میں فرائض ونوافل دونوں جائز ہیں۔ البتہ امام مالک فرماتے ہیں کہ نوافل جائز ہیں اور فرائض مکروہ ہیں[3]۔ اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی ثابت ہے کہ آپ نے داخلِ کعبہ میں صرف نوافل ادا فرمائے تھے۔

جواب یہ ہے کہ صلوٰۃ فی الکعبہ میں وجہ اشکال صرف یہ بات ہو سکتی تھی کہ اس میں بعض کعبہ کا استدبار ہوتا ہے لیکن آپ نے اپنے عمل سے یہ بتا دیا کہ یہ چیز جوازِ صلوٰۃ کے منافی نہیں ہے لہٰذا اب نماز میں کوئی اشکال نہ رہا، اور مطلقِ صلوٰۃ کے ثابت ہونے کے بعد فرائض کے عدمِ جواز پر کوئی دلیل ہونی چاہئے جو مفقود ہے، لہٰذا فرائض ونوافل میں کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ واللہ اعلم

باب ما جاء فی کسر الکعبۃ

"لولا أن قومك حديث عهد بالجاهلية لهدمت الكعبة وجعلت لها بابين"[4]

---

[1] وقال به بعض المالكية والظاهرية والطبري۔ فتح الباري (ج ۳ ص۳۷۲) باب إغلاق البيت ويصلي في أي نواحي البيت شاء ۱۲ م

[2] في رواية جابر بن عبد الله، صحيح بخاري (ج ۱ ص۴۸) كتاب التيمم، قبيل باب إذا لم يجد ماءً ولا تراباً ۱۲ م

[3] كما بيّن الترمذي في الباب، وقال الحافظ: "وقال المازري: المشهور في المذهب منع صلاة الفرض داخلها ووجوب الإعادة، وعن ابن عبد الحكم الإجزاء، وصححه ابن عبد البر وابن العربي، وعن ابن حبيب يعيد أبداً، وعن أصبغ إن كان متعمداً، وأطلق الترمذي عن مالك جواز النوافل، وقيده بعض أصحابه بغير الرواتب وما تشرع فيه الجماعة، وفي شرح العمدة لابن دقيق العيد: كره مالك الفرض أو منعه، فكأنه أشار إلى اختلاف النقل عنه في ذلك" فتح الباري (ج ۳ ص۳۷۲) باب إغلاق البيت ويصلي في أي نواحي البيت شاء ۱۲ مرتب

[4] الحديث أخرجه البخاري في صحيحه (ج ۱ ص۲۱۵) كتاب المناسك، باب فضل مكة وبنيانها۔ ومسلم في صحيحه (ج ۱ ص۴۲۹ و۴۳۰) كتاب الحج، باب نقض الكعبة وبنائها ۱۲ مرتب

بیت اللہ شریف کی تعمیر کے تاریخی ادوار | کعبہ مشرفہ کی تعمیر دس مرتبہ ہوئی۔

① سب سے پہلی تعمیر ملائکہ نے تخلیقِ آدم سے دو ہزار سال پہلے کی تھی، اور اس کا مقصد بیتِ معمور کی محاذات میں زمین پر ایک عبادت گاہ تعمیر کرنا تھا

② دوسری مرتبہ اِسے حضرت آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا۔

③ تیسری مرتبہ اسے حضرت آدم علیہ السلام کے بعض صاحبزادوں نے تعمیر کیا، یہ تعمیر طوفانِ نوحؑ کے وقت تک برقرار رہی، اور طوفان کے وقت اُٹھالی گئی یا طوفان سے ختم ہو کر مٹ گئی۔

④ چوتھی بار اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا بعض حضرات نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کعبہ کا بانیٔ اول قرار دیا ہے[1] لیکن راجح یہی ہے کہ وہ بانیٔ اول نہیں ہیں، قرآن کریم کا اندازِ بیان بھی اسی کی تاکید کرتا ہے اس لئے کہ ارشاد ہے "وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ[2]" اس میں "رفع القواعد" کا ذکر ہے تاسیس کا نہیں، معلوم ہوا کہ کعبہ کی بنیادیں پہلے سے موجود تھیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں کو بلند کر کے بیت اللہ تعمیر کیا تھا

⑤ پانچویں مرتبہ اسے عمالقہ نے تعمیر کیا۔

⑥ چھٹی مرتبہ اِسے بنو جرہم نے تعمیر کیا۔

⑦ ساتویں تعمیر قصی بن کلاب نے کی۔

⑧ آٹھویں مرتبہ قریش نے اجتماعی چندے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بعد اور بعثت سے پہلے کعبہ کی تعمیر کی۔ اس تعمیر میں حجرِ اسود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے رکھا، اب تک کعبہ کے دو دروازے چلے آتے تھے، ایک مشرق میں اور ایک مغرب میں، لیکن قریش نے چونکہ حلال کمائی سے تعمیر کا اہتمام کیا تھا اور یہ کمائی کم پڑگئی تھی اس لئے کعبہ کا کچھ حصہ تعمیر میں آنے سے رہ گیا جسے حطیم کعبہ کہتے ہیں، نیز کعبہ کے دو دروازے تھے قریش نے صرف ایک دروازہ باقی رکھا۔[3]

---

[1] حافظ ابن کثیرؒ کا میلان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔ دیکھئے تفسیر ابن کثیر (ج ۳ ص ۲۱۶) تحت تفسیر قولہ تعالیٰ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ الآیہ، سورہ حج، نیز دیکھئے (ج ۱ ص ۱۶۲ و ص ۱۷۳) تحت تفسیر قولہ تعالیٰ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ الآیۃ (سورہ بقرہ) ۱۲ مرتب

[2] سورۂ بقرہ آیت ۱۲۷ پ ۱ - ۱۲ م

[3] نیز مشرقی اور مغربی جانب سے بھی اس کی چوڑائی کسی قدر کم کردی اور اس کے دروازے کو بھی اونچا کردیا تاکہ جس کو چاہیں داخل کریں اور جس کو چاہیں روک دیں، اس طرح قریش کی تعمیر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کے مقابلہ میں تقریباً چار تغیرات واقع ہوگئے کما بیّنا۔ دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۱۲۹ و ۱۳۰) ۱۲ مرتب

حدیثِ باب کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کو بناءِ ابراہیمی کے مطابق تعمیر کرنے کا ارادہ فرمایا تھا، لیکن اس خیال سے ارادہ ترک فرما دیا کہ زمانۂ جاہلیت کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا، اور قریش کے لوگ ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں، ایسا نہ ہو کہ اس پر وہ کوئی خلفشار پیدا کر دیں اور کہنے لگیں کہ کعبہ کو اس کی آبائی بنیادوں سے گرایا جارہا ہے۔ اس طرح یہ بات فتنہ کی صورت میں عرب میں پھیل جائے۔

⑨ نویں مرتبہ حضرت عبداللہ بن الزبیر نے اپنے عہدِ خلافت میں کعبہ کو از سرِ نو تعمیر کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے پیش نظر اسے بناءِ ابراہیمی پر تعمیر فرمایا۔

⑩ دسویں بار اسے حجاج بن یوسف نے تعمیر کیا اور حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ کے کئے ہوئے اضافے کو چھوڑ کر پھر اسے قریش کی بنیادوں پر کعبہ کو تعمیر کیا، چنانچہ پھر حطیم باہر رہ گئی اور کعبہ کا دروازہ ایک ہو گیا[۱]۔

اس کے بعد ہارون رشید نے گیارہویں مرتبہ اس کو بناءِ ابراہیمی کے مطابق تعمیر کرنے کا ارادہ کیا لیکن امام مالکؒ نے ان کو روک دیا اور فرمایا کہ اگر آپ نے ایسا کیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ کعبہ کی تعمیر اور انہدام بازیچۂ سلاطین بن کر نہ رہ جائے۔ ہارون رشید نے امام مالکؒ کا مشورہ قبول کیا اور تعمیر کا ارادہ ترک کر دیا[۲]۔ اس وقت سے اب تک کعبۂ مکرمہ حجاج بن یوسف ہی کی تعمیر پر چلا آرہا ہے، مرمتیں تو اگرچہ بارہا ہوتی رہی ہیں، لیکن بناء وہی ہے[۳]۔

---

[۱] کعبۂ مشرفہ کی تعمیر کے تاریخی ادوار کی مذکورہ تفصیل کسی قدر کمی اور زیادتی کے ساتھ معارف السنن (ج ۶ صفحہ ۱۴۳ تا ۱۵۱) سے ماخوذ ہے، وراجعہ للتفصیل ۱۲ مرتب

[۲] چنانچہ حافظؒ لکھتے ہیں: "حکی ابن عبد البر وتبعہ عیاض وغیرہ عن الرشید أو المهدی أو المنصور أنه أراد أن یعید الکعبة علیٰ ما فعله ابن الزبیر، فناشده مالك فی ذلك، وقال: أخشی أن یصیر ملعبة للملوك، فترکه" فتح الباری (ج ۳ ص ۳۵۵) باب فضل مکة وبنیانها ۱۲ مرتب

[۳] اس تشریح کے مطابق دسویں مرتبہ کی تعمیر بیت اللہ کی آخری تعمیر ثابت ہوئی اور گیارہویں مرتبہ تعمیر کی نوبت نہ آئی۔

ان دس مرتبہ کی تعمیرات کو ایک شاعر نے چند اشعار میں بیان کیا ہے ؎

بنی بیت رب العرش عشر فخذهم ملائکة الله الکرام وآدم
فشیث وابراهیم ثم عمالق قصی قریش قبل هذین جرهم
وعبد الاله بن الزبیر بنی کذا بناء لحجاج وهذا متمم

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بہرحال حدیثِ باب سے فقہاء نے یہ اصول مستنبط کیا ہے کہ اگر کسی مستحب کام کے کرنے سے کسی فتنہ کا اندیشہ ہو اور مسلمانوں میں افتراق کا خطرہ ہو تو اس مستحب کام کو ترک کر دینا چاہئے۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی الصلاۃ فی الحِجر

عن علقمة بن أبي علقمة عن أبيه " ترمذی کے اکثر نسخوں میں سند اسی طرح ہے[1] جبکہ نسائی[2] کی روایت میں سند اس طرح ہے: " حدثني علقمة بن أبي علقمة عن أمه عن أبيه " اور ابوداؤد[3] میں سند اس طرح ہے " عن علقمة عن أمه " یہی سند درست ہے اس لئے کہ علقمہ اکثر اپنی والدہ ہی سے روایت کرتے ہیں جن کا نام مرجانہ[4] ہے، اس لئے ظاہر یہی ہے کہ نسائی اور ترمذی کے نسخوں میں تصحیف ہوئی ہے[5]۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

معارف السنن (ج ۶ ص ۳۱۵) بحوالہ التفسیر المجمل۔ سنہ ۱۰۳۹ھ میں سیلاب سے بیت اللہ شریف کو بہت نقصان پہنچا اور بیت اللہ شریف تقریباً منہدم ہوگیا اور سلطان مراد خان عثمانی نے اسے دوبارہ تعمیر کیا۔ یہ تعمیر سنہ ۱۰۴۰ھ میں مکمل ہوئی، راجح یہی ہے کہ یہ مستقل تعمیر تھی اس طرح بیت اللہ شریف کی تعمیرات کا عدد گیارہ ہو جاتا ہے اور آخری تعمیر سلطان مراد بن سلطان احمد عثمانی کی قرار پاتی ہے۔

محمد علی بن علان نے تین ابیات میں ان گیارہ تعمیرات کا ذکر کیا ہے

بنى الكعبة أملاك، آدم، ولده — شيث، فإبراهيم، ثم العمالقة

وجرهم، قصى، مع قريش، وتلوهم — هو ابن زبير ثم حجاج لاحقه

ومن بعد هذا قد بنى البيت كله — مراد بني عثمان فشيد رونقه

اس آخری تعمیر سے متعلق مکمل تفصیل کے لئے دیکھئے حاشیہ اخبارِ مکہ (ج ۱ ص ۳۵۵ تا ۳۷۳)، نیز دیکھئے تاریخ مکۃ المکرمۃ (ج ۲ ص ۹۵ تا ۱۰۲) ۱۲ مرتب عفی عنہ

(حاشیہ صفحہ ہٰذا)

[1] جبکہ بعض نسخوں میں سند اس طرح ہے " عن علقمة بن أبي علقمة عن أمه عن أبيه " مثلاً سنن ترمذی طبع دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، بتحقیق الشیخ محمد فؤاد عبد الباقی، دیکھئے (ج ۳ ص ۲۲۵، رقم ۸۷۶) ۱۲ م

[2] (ج ۲ ص ۳۴) کتاب مناسک الحج، الصلوٰۃ فی الحجر ۱۲ م

[3] (ج ۱ ص ۲۷۷) باب الصلاۃ فی الکعبۃ ۱۲ م

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

عن عائشة قالت: كنت أحب أن أدخل البيت فأصلي فيه" اس کی تفصیل ازرقی کی "اخبار مکہ"[۱] میں حضرت سعید بن جبیرؒ کی روایت سے معلوم ہوتی ہے "أن عائشة سألت النبي صلى الله عليه وسلم أن يفتح لها الباب ليلاً، فجاء عثمان بن طلحة بالمفتاح إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: يا رسول الله! إنها لم تفتح بليل قط، قال: فلا تفتحها، ثم قال لعائشة ان قومك لما بنوا البيت قصرت بهم النفقة، فتركوا بعض البيت في الحجر فادخلي الحجر فصلي فيه".

ہوسکتا ہے کہ حضرت عائشہؓ دن میں پردہ کی وجہ سے بیت اللہ شریف میں داخل نہ ہوئی ہوں پھر چونکہ بیت اللہ شریف کا دروازہ رات کو نہیں کھولا جاتا تھا اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہ فرمایا کہ آپؐ کے اہل بیت کی وجہ سے بیت اللہ کے عام رواج میں کوئی خلل پڑے اور بیت اللہ شریف کے دربانوں کو اپنی عادت تبدیل کرنی پڑے، اس لئے آپؐ نے حضرت عائشہؓ کو حجر میں نماز پڑھنے کا حکم فرمایا۔

"فأخذ رسول الله صلى الله عليه وسلم بيدي فأدخلني الحجر وقال: صلي في الحجر إن أردت دخول البيت فإنما هو قطعة من البيت، ولكن قومك استقصروه حين بنوا الكعبة فأخرجوه من البيت"

"حِجر" (بکسر الحاء) بیت اللہ کی شمالی دیوار کے بعد چھ ذراع کی جگہ کو کہتے ہیں، بعض نے کہا کہ سات ذراع کی جگہ کو، اور اس کے بعد نصف دائرے کی صورت میں جو جگہ ہے اس کو حطیم کہتے ہیں

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

[۷] چنانچہ علامہ عینی لکھتے ہیں: "أما أمة فاسمها مرجانة، ذكرها ابن حبان في الثقات" عمدة القاري (ج ۹ ص ۲۱۷) باب فضل مكة وبنيانها ۱۲ مرتب

[۸] حافظ ابن حجرؒ اور علامہ عینیؒ نے تو ترمذی اور نسائی کی روایات بھی "عن أمه" کی سند سے ذکر کی ہیں، معلوم ہوا کہ ترمذی اور نسائی کے بھی بعض نسخوں میں ابوداؤد کے مطابق "عن أمه" کی سند سے روایت آئی ہے۔ دیکھئے فتح الباری (ج ۳ ص ۳۵۰) باب فضل مكة وبنيانها۔ وعمدة القاري (ج ۹ ص ۲۱۸) باب فضل مكة وبنيانها ۱۲ مرتب

(حاشیہ صفحۂ ہذا)

[۱] (ج ۱ ص ۳۱۵) الجلوس في الحجر وما جاء في ذلك ۱۲

کبھی حطیم نصف دائرہ اور حجر کے مجموعہ کو بھی کہا جاتا ہے[1]، حجر ہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجر علیہما السلام کی قبریں ہیں کما ہو المعروف[2]، چنانچہ بعض تابعین مثلاً حضرت عمر بن عبد العزیز وغیرہ کے آثار سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے[3]، اور خالد بن عبد الرحمٰن بن خالد بن سلمۃ المخزومیؒ کہتے ہیں کہ وہ جگہ جہاں حضرت اسماعیلؑ کی قبر ہے میزاب اور حجر کے مغربی دروازہ کے درمیان ہے[4]۔

پھر حطیم کو حطیم اس لئے کہا جاتا ہے "لأن الناس کانوا یحطمون هنالك بالأیمان[5]" یعنی لوگ وہاں قسموں کے لئے ہجوم کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے اس کو "حطیم" کہا جانے لگا[6]۔

"حجر" کے بیت اللہ کا حصہ ہونے پر جمہور کا اتفاق ہے اس لئے کہ یہ وہی حصہ ہے جسے قریش نے بناءِ کعبہ کے وقت چھوڑ دیا تھا، کما فی حدیث الباب، البتہ حطیم کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ بیت اللہ کا جزء ہے یا نہیں؟[7]

---

[1] یہ تفصیل معارف السنن (ج ۶ ص۲۱۶ و ۲۱۷) سے ماخوذ ہے ۱۲ م

[2] چنانچہ علامہ ابن الاثیرؒ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارے میں لکھتے ہیں: "ودفن عند قبر أمه هاجر بالحجر" الکامل فی التاریخ (ج ۱ ص۱۲۵) ذکر خبر ولد إسمٰعیل بن إبراهیم ۱۲ مرتب

[3] چنانچہ حسان الانماطی کہتے ہیں: "قال: رأیت عمر بن عبد العزیز فی الحجر فسمعته یقول: شکا إسمٰعیل علیه السلام إلی ربه عزوجل حر مكة فأوحی الله تعالیٰ إلیه أنی أفتح لك باباً من الجنة فی الحجر، یجری علیك منه الروح إلی یوم القیٰمة وفی ذلك الموضع توفی"۔

نیز صفوان بن عبد اللہ بن صفوان جمحی کہتے ہیں: "حفر ابن الزبیر الحجر فوجد فیه سفطا من حجارة خضر فسأل قریشاً عنه فلم یجد عند أحد منهم فیه علماً، قال: فأرسل إلی عبد الله بن صفوان فسأله فقال: هذا قبر إسماعیل علیه السلام فلا تحرکه، قال فترکه"۔

دونوں روایات کے لئے دیکھئے "أخبار مكة وما جاء فیها من الآثار" (ج ۱ ص۳۱۲) ذکر الحجر۔

ان دونوں روایات سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قبر کے بارے میں پتہ چلتا ہے اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی قبر کے بارے میں ہم پیچھے "الکامل لابن الاثیر" کا حوالہ ذکر کر چکے ہیں ۱۲ مرتب عفی عنہ۔

[4] أخبار مكة (ج ۱ ص۳۱۲) ذکر الحجر ۱۲ م

[5] کذا ذکر الأزرقی عن ابن جریج فی أخبار مكة (ج ۲ ص۲۴) ما جاء فی الحطیم وأین موضعه) ولكنه ذكر عنه أن الحطیم ما بین الرکن والمقام وزمزم والحجر ۱۲ از استاذ محترم دام اقبالہم۔

[6] حطیم کی وجہ تسمیہ سے متعلق مزید تحقیق کے لئے دیکھئے لسان العرب (ج ۱۲ ص۱۳۹ و ۱۴۰، مادۂ "حطم") ۱۲ م

[7] تفصیل کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۹ ص۲۱۸ و ۲۱۹) باب فضل مكة وبنیانها۔ واضح رہے کہ "حجر" کا اطلاق حطیم پر بھی ہوتا ہے ۱۲ م

بہرحال مصلّی کا اس طریقہ سے نماز پڑھنا کہ صرف حجر کا استقبال ہو رہا ہو اور بیت اللہ کے کسی حصّہ کا استقبال نہ ہو رہا ہو، درست نہیں اس لئے کہ استقبالِ قبلہ کی شرط دلائلِ قطعیہ سے ثابت ہے[1]۔ جبکہ حجر کا بیت اللہ کا جز ہونا اخبارِ آحاد[2] سے ثابت ہے جو ظنّی ہیں۔ لہٰذا حجر کا بیت اللہ کا جزء ہونا قطعی نہ ہوا اس لئے صرف اس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھنے سے استقبالِ قبلہ کی شرط قطعی طور پر پوری نہ ہو سکے گی، اسی لئے نماز بھی درست نہ ہوگی۔ پھر جب حجر کا یہ حکم[3] ہے تو صرف حطیم کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھنے سے بطریقِ اولیٰ نماز نہ ہوگی۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی فضل الحجر الأسود والرکن والمقام

عن[4] ابن عباس قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: نزل الحجر الأسود من الجنّۃ وھو أشدّ بیاضًا من اللبن، فسوّدتہ خطایا بنی آدم» اس کا ظاہری مفہوم یہ ہے

---

[1] چنانچہ علامہ عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں: «وإنما فرض استقبال القبلۃ لقولہ تعالیٰ «فَوَلِّ وَجْھَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوھَکُمْ شَطْرَہٗ» (سورہ بقرہ آیت ۱۴۴ پ۲ ـ م) قال بعض المفسّرین: معنی الشطر الوسط، فمعناہ فولّ وجھک وسط المسجد الحرام وھو الکعبۃ فإنھا واقعۃ فی وسط المسجد الحرام، وإلیہ مال القاضی البیضاوی، وأخرج ابن أبی حاتم عن رفیع قال: شطرہ تلقاءہ بلسان الحبش، فالمراد بالمسجد الحرام ھو الکعبۃ»

پھر آگے چل کر علامہ لکھنوی لکھتے ہیں: «وفی الباب أحادیث کثیرۃ أغنانی شھرتھا عن ذکرھا ھھنا»

دیکھئے السعایہ فی کشف مافی شرح الوقایہ (ج ۲ ص۶۵) باب شروط الصلاۃ، استقبال القبلۃ۔

نماز میں استقبالِ قبلہ کی شرط اجماع سے بھی ثابت ہے، چنانچہ ابن رشدؒ لکھتے ہیں: «اتفق المسلمون علی أن التوجہ نحو البیت شرط من شروط صحۃ الصلاۃ لقولہ تعالیٰ «وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْھَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ» أما إذا أبصر البیت فالفرض عندھم ھو التوجہ إلی عین البیت، ولا خلاف فی ذلک»

بدایۃ المجتھد ونھایۃ المقتصد (ج ۱ ص۸۰) الباب الثالث من الجملۃ الثانیۃ فی القبلۃ ۱۲ مرتب عفی عنہ

[2] مثلاً حضرت عائشہؓ کی حدیث باب ۱۲ م

[3] دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۹ ص۲۱۱) باب فضل مکۃ وبنیانھا۔ اور معارف السنن (ج ۶ ص۳۱۸ و ۳۱۹) ۱۲ مرتب

[4] الحدیث لم یخرجہ من أصحاب الکتب الستۃ أحد سوی الترمذی۔ قالہ الشیخ محمد فؤاد عبدالباقی۔ سنن ترمذی (ج ۳ ص۲۲۶، طبع بیروت) ۱۲ م

کہ حجرِ اسود کا استلام کرنے والوں کے گناہوں کی سیاہی پتھر پر منعکس ہوگئی اور احادیثِ صحیحہ کی خبر کے بعد اس میں شک کی گنجائش نہیں[۱] اور یہ کہنا درست نہیں کہ تاریخ سے حجرِ اسود کا کسی وقت سفید ہونا ثابت نہیں اس لئے کہ یہ زمانۂ قبل از تاریخ کی بات بھی ہوسکتی ہے اور بعد کی ہو تب بھی احادیثِ صحیحہ کے مقابلہ میں تاریخ کی کوئی وقعت نہیں[۲]

دوسرا مطلب بعض لوگوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ خطایا کا مطلب یہ ہے کہ بنی آدم کی غلطی کی وجہ سے یہاں کئی مرتبہ آگ لگی اور اس کی وجہ سے حجرِ اسود سیاہ ہوگیا[۳]

---

[۱] کذا فی معارف السنن (ج ۶ ص ۴۲)۔

حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں لکھتے ہیں: "اعترض بعض الملحدین علی الحدیث الماضی، فقال: کیف سودته خطایا المشرکین ولم تبیضه طاعات أهل التوحید، وأجیب بما قال ابن قتیبة: لو شاء الله لکان ذلك، وإنما أجری الله العادة بأن السواد یصبغ ولا ینصبغ علی العکس من البیاض"۔ (ج ۳ ص ۳۷۰) باب ما ذکر فی الحجر الأسود۔

علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ معارف السنن (ج ۶ ص ۴۲) میں لکھتے ہیں: "ویقول شیخنا (الأنور): ولا یلزم ما یقال: انه کیف لا یبیضه حسناتهم وسودته خطایاهم لأن النتیجة تابعة للأخس الأرذل دائماً"۔ ۱۲ مرتب

[۲] مذکورہ اعتراض وجواب کی تفصیل کے لئے دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۴۳) ۱۲ م

[۳] چنانچہ اخبار مکہ میں بناءِ کعبہ سے متعلق محمد بن اسحاق کی ایک طویل روایت مروی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں "فلما وضع جبریل الحجر فی مکانه وبنی علیه إبراهیم وهو حینئذ یتلألأ تلألؤاً من شدة بیاضه، فأضاء نوره شرقاً وغرباً ویمناً وشاماً، قال: فکان نوره یضیئ إلی منتهی أنصاب الحرم من کل ناحیة من نواحی الحرم قال: وإنما شدة سواده لأنه أصابه الحریق مرة بعد مرة فی الجاهلیة والإسلام، فأما حریقه فی الجاهلیة فانه ذهبت امرأة فی زمن قریش تجمر الکعبة، فطارت شرارة فی أستار الکعبة، فاحترقت الکعبة واحترق الرکن الأسود، واسود وتوهنت الکعبة، فکان هو الذی هاج قریشاً علی هدمها وبنائها، وأما حریقه فی الإسلام ففی عصر ابن الزبیر أیام حاصره الحصین بن نمیر الکندی، احترقت الکعبة واحترق الرکن فتفلق بثلاث فلق حتی شد شعبة بن الزبیر بالفضة، فسواده لذلك" (ج ۱ ص ۶۵-۶۶) ما ذکر من بناء إبراهیم الکعبة۔

مزید روایات کے لئے دیکھئے اخبار مکہ (ج ۱ ص ۱۹۸) باب ما جاء فی حریق الکعبة۔ و (ج ۱ ص ۱۹۹) باب ما جاء فی بناء ابن الزبیر الکعبة۔ و (ج ۱ ص ۳۲۸ و ۳۲۹) ما جاء فی فضل الرکن الأسود ۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ

بعض حضرات نے حدیث کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ یہاں "خطایا" سے مراد عام گناہ نہیں بلکہ ایک خاص غلطی ہے، وہ یہ کہ اہلِ جاہلیت حجرِ اسود کو ہاتھ وغیرہ لگاتے ہوئے صفائی کا اہتمام نہ کرتے تھے جس سے وہ سیاہ ہوگیا، اس بارے میں امام ازرقی نے "اخبار مکہ" میں بعض روایات بھی نقل کی ہیں[1]۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی تقصیر الصلاۃ بمنیً[2]

عن[3] حارثة بن وهب قال: صلّیتُ مع النبیّ صلی الله علیه وسلم بمنیً آمن

---

[1] مذکورہ قول کا کوئی صریح حوالہ تلاشِ بسیار کے باوجود نہیں مل سکا، البتہ "اخبار مکہ" (ج ۱ ص ۳۲۲ تا ۳۲۹، باب ما جاء فی فضل الرکن الاسود) میں چند ایسی روایات مروی ہیں جن سے اس قول کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے:

(۱) عطاء ابن ابی رباحؒ فرماتے ہیں: "الرکن حجر من حجارة الجنة، ولولا مامسه من الأنجاس لکان کما نزل"

(۲) عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں: "کان الحجر الأسود أبیض کاللبن وکان طوله کعظم الذراع، وما سوداه إلا من المشرکین کانوا یمسحونه"۔

(۳) عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ ہی سے مروی ہے: "لولا ما مسه من أنجاس الجاهلیة وأرجاسهم ما مسه ذو عاهة إلا برأ"۔

(۴) عثمانؓ کہتے ہیں: "أخبرنی زهیر أنه بلغه أن الحجر من رضراض (الحصی الذی یجری علیه الماء - م) یاقوت الجنة وکان أبیض یتلألأ، فسوده أرجاس المشرکین وسیعود إلی ما کان علیه"

(۵) عن عبد الله بن عباس أنه کان یقول: لولا أن الحجر تمسه الحائض وهی لا تشعر والجنب وهو لا یشعر ما مسه أجذم ولا أبرص إلا برأ"۔

لیکن بظاہر ان روایات میں "ارجاس" و "انجاس" سے معنوی وحکمی ناپاکیاں مراد ہیں، اس لئے ظاہری میل کچیل کا اثبات اس سے مشکل ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ "ارجاس" و "انجاس" سے ظاہری ومعنوی دونوں قسم کی ناپاکیاں مراد ہوں ۱۲ م

[2] منی بالکسر والتنوین، فی درج الوادی الذی ینزله الحاج ویرمی فیه الجمار، من الحرم، سمّی بذلک لما یمنی به من الدماء ای: یراق، قال الله تعالی "مِنْ مَنِیٍّ یُمْنٰی"، وقیل: لأن آدم علیه السلام تمنّی فیها الجنة، قیل: منی من مهبط العقبة إلی محسّر، وهو مذکّر معروف، وقال ابن الأعرابی: امنی القومُ ومنی الله الشیءَ: قدّره، وبه سمّی منی، وقال ابن شمیل: سمّی منی لأن الکبش مُنِیَ به أی ذبح۔ وهی بُلیدة علی فرسخ من مکة طولها میلان" وراجع للتفصیل معجم البلدان (ج ۵ ص ۱۹۸) ۱۲ مرتب

[3] الحدیث أخرجه النسائی فی سُننه (ج ۱ ص ۲۱۲) کتاب تقصیر الصلاة فی السفر، باب الصلاة بمنی — وأبو داؤد فی سننه (ج ۱ ص ۲۷۰) کتاب المناسک، باب القصر لأهل مکّة والبخاری فی صحیحه (ج ۱ ص ۲۲۵) کتاب المناسک باب الصلاة بمنی ۱۲ م

ما كان الناس و أكثرہ رکعتین[1] " مطلب یہ کہ قصرِ صلوٰۃ کی اجازت کے ساتھ " اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا[2] " کے جو الفاظ آئے ہیں ان سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قصرِ صلوٰۃ کی اجازت حالتِ خوف کے ساتھ مشروط ہے لیکن راوی کہتے ہیں کہ ہیں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسی حالت میں قصر کیا ہے جبکہ نہ دشمن کا خوف تھا اور نہ ہی ہماری تعداد کم تھی، اس سے معلوم ہوا کہ خوف قصر کے لئے شرط نہیں اور قرآن کریم میں مفہومِ شرط معتبر نہیں[3]۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں نماز میں قصر کیا تھا، اِس قصر کی علت میں اختلاف ہے، جمہور یعنی امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، سفیانِ ثوریؒ، عطاءؒ اور زہریؒ وغیرہ کا مسلک یہ

---

[1] مطلب یہ کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ میں دو رکعتیں اس حال میں پڑھیں کہ لوگ پہلے کے مقابلہ میں سب سے زیادہ مامون اور تعداد کے اعتبار سے سب سے زیادہ کثیر تھے۔

واضح رہے کہ " آمن ما كان الناس و أكثرہ " میں " آمن " أمن سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے جس کی اضافت " ماکان الناس " کی طرف ہو رہی ہے اور " ما كان الناس " میں " ما " مصدریہ ہے پھر " آمن " " صلیت " کی ضمیر سے حال واقع ہے اور " أكثرہ " کا عطف " آمن " پر ہے اور ضمیرِ مجرور " ما كان الناس " کی طرف لوٹ رہی ہے۔ دیکھئے معارف السنن (ج ۲ ص ۴۳۱)۔

علامہ سندھیؒ نقل کرتے ہیں: " قال أبو البقاء: آمن و أكثر منصوبان نصب الظرف، والتقدير: " زمن آمن ما كان الناس " لحذف المضاف وأقيم المضاف إليه مقامه " حاشیۂ سندھی علی النسائی۔ (ج ۱ ص ۲۱۲) کتاب تقصیر الصلاۃ فی السفر، باب الصلاۃ بمنیٰ ۱۲ مرتب

[2] پوری آیت اس طرح ہے " وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا " (سورہ نساء آیت ۱۰۱ پ ۵) یعنی: اور جب تم زمین میں سفر کرو، سو تم کو اس میں کوئی گناہ نہ ہوگا کہ تم نماز کو کم کر دو اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ تم کو کافر لوگ پریشان کریں گے ۱۲ مرتب

[3] دیکھئے مجموعہ رسائل ابن عابدین جلد اول، شرح عقود رسم المفتی (ص ۴۱ تا ۴۲)۔

اور حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: " وأما قوله تعالى: (اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا) فقد يكون هذا خرج مخرج الغالب حال نزول هذه الآية، فإن في مبدأ الإسلام بعد الهجرة كان غالب أسفارهم مخوفة، بل ما كانوا ينهضون إلا إلى غزو عام أو في سرية خاصة، وسائر الأحيان حرب للإسلام وأهله، والمنطوق إذا خرج مخرج الغالب أو على حادثة فلا مفهوم له، كقوله تعالى (وَلَا تُکْرِهُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا) وكقوله تعالى (وَرَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ مِّنْ نِّسَآئِکُمْ) الآية۔ تفسیر ابن کثیر (ج ۲ ص ۳۴۲، طبع دار الاندلس، بیروت) ۱۲ مرتب عافاہ اللہ۔

[3] کما فی حدیث حارثہ بن وھب فی الباب ۱۲ م

ہے کہ یہ قصر سفر کی بناء پر تھا، چنانچہ ان کے نزدیک اہل مکہ کے لئے منیٰ میں قصر نہیں ہوگا

جبکہ امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ اور اسحاق بن راہویہؒ وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ منیٰ میں قصر کرنا اسی طرح مناسکِ حج میں سے ہے جیسے عرفات و مزدلفہ میں جمع بین الصلوٰتین، لہٰذا جو لوگ مسافر نہ ہوں بلکہ مکہ یا اس کے آس پاس سے آئے ہوں وہ بھی منیٰ میں قصر کریں[1]۔

امام مالکؒ کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں قصر کرنے کے بعد کسی بھی نماز کے بعد مقیمین کو اتمام کی ہدایت نہیں فرمائی[2] جیسا کہ آپ کا معمول تھا[3]، معلوم ہوا کہ یہ قصر بوجہ سفر نہ تھا بلکہ مناسکِ حج میں سے تھا اور اہلِ مکہ پر بھی واجب تھا۔

جمہور کی طرف سے علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ "فصلّی بنا رکعتین" سے اس بات پر استدلال کرنا درست نہیں کہ مکی بھی منیٰ میں قصرِ صلوٰۃ کریگا اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو منیٰ میں مسافر تھے اور آپ نے مسافروں والی نماز پڑھی، جہانتک نماز سے فراغت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتمام کا حکم دینے کا تعلق ہے سو آپ نے اس کی ضرورت اس لئے محسوس فرمائی کہ پہلے آپ اس کی وضاحت فرماچکے تھے، خصوصاً جبکہ یہ مسئلہ بھی بالکل واضح اور عام تھا[4]۔

امام مالکؒ نے مؤطا[5] میں نقل کیا ہے "أن عمر بن الخطاب لما قدم مكة صلى بهم ركعتين ثم انصرف فقال يا أهل مكة، أتموا صلاتكم فإنا قوم سفر" اس کے بعد امام مالکؒ فرماتے ہیں: "ثم صلى عمر بن الخطاب ركعتين بمنى ولم يبلغنا أنه قال لهم شيئاً" اس کا جواب بھی وہی ہے جو علامہ خطابی نے دیا ہے کما نقلنا

علامہ خطابی کا مذکورہ جواب علیٰ سبیل التسلیم تھا، امام مالکؒ کی دلیل کا ایک دوسرا جواب بھی دیا گیا ہے، جو علیٰ سبیل الانکار ہے کہ ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں نماز

---

[1] مذکورہ تفصیل کے لئے دیکھئے معارف السنن (ج ٦ ص٤٣١ و ٤٣٢) ١٢ م

[2] دیکھئے عارضۃ الأحوذی (ج ٤ ص١١٢ و ١١٣) باب تقصیر الصلاۃ بمنیٰ ١٢ م

[3] چنانچہ سنن ابی داؤد میں حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے "قال: غزوت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم وشهدت معه الفتح، فأقام بمكة ثماني عشرة ليلة لا يصلي إلا ركعتين، ويقول: يا أهل البلد: صلوا أربعاً فإنا قوم سفر" (ج ١ ص١٧٢) کتاب الصلاۃ، باب متی یتم المسافر ١٢ مرتب

[4] معالم السنن فی ذیل مختصر سنن ابی داؤد (ج ٢ ص٤١٧) کتاب المناسک، باب القصر لأہل مکۃ ١٢ م

[5] (ص٢٢٩) کتاب الحج، صلاۃ منیٰ ١٢ م

سے فراغت کے بعد اتمام کا حکم نہیں دیا، ہوسکتا ہے کہ آپ نے حکم دیا ہو لیکن یہ بات ہم تک منقول ہوکر نہ پہنچ سکی ہو اور یہ قاعدہ مسلّم ہے کہ عدمِ ذکرِ شئ عدمِ شئ کو مستلزم نہیں[1]

ایک جواب[2] یہ بھی دیا گیا ہے کہ اگر آپ کی مذکورہ دلیل کو صحیح تسلیم کرلیا جائے کہ منیٰ میں قصرِ صلوٰۃ سفر کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ مناسکِ حج کا ایک جزء ہے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ اہلِ منیٰ بھی حج کرتے وقت منیٰ میں قصر کریں حالانکہ ان کے حق میں قصرِ صلوٰۃ کے آپ بھی قائل نہیں[3] واللہ اعلم

فائدہ مناسکِ حج میں ایک بات خاص طور پر یہ نظر آتی ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے بہت سے معروف قاعدوں کو توڑا ہے تاکہ یہ بات ذہن نشین ہو جائے کہ کسی بھی فعل میں بذاتہٖ کچھ نہیں رکھا، اصل چیز اتباعِ حکم ہے، چنانچہ آٹھ ذی الحجہ کو منیٰ میں اُس دن کی آخری چار اور اگلے دن کی فجر کی نماز پڑھنے کے سوا کوئی کام نہیں[4]، حالانکہ مسجدِ حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ کے برابر ہے[5] لیکن آج حکم یہ ہے کہ مسجدِ حرام کو چھوڑ کر صحرا میں نمازیں پڑھو، اس میں تربیت یہ دینی ہے کہ جب تک اللہ کا حکم تھا مسجدِ حرام میں نماز پڑھنا باعثِ ثواب تھا اور جب اللہ کا دوسرا حکم آگیا تو اب وہاں نماز پڑھنا خلافِ سنت اور صحرا میں نماز پڑھنا زیادہ موجبِ ثواب ہے۔

---

[1] معارف السنن (ج ۶ ص۴۳۳) بزیادۃ وایضاح ۱۲ م

[2] یہ جواب زیادت وایضاح کے ساتھ امام طحاویؒ کے کلام سے ماخوذ ہے کما نقل العینی فی العمدۃ (ج ۷، ص۱۱۹) أبواب تقصیر الصلاۃ، باب الصلاۃ بمنیٰ ۱۲ مرتب

[3] چنانچہ موطا امام مالک میں وہ فرماتے ہیں: "وإن کان أحد ساکنا بمنی مقیما به فإن ذلك یتم الصلاۃ بمنیٰ" (ص۲۹۴) کتاب الحج، صلاۃ منی۔

لیکن یہ ساری بحث اس بنیاد پر ہے کہ امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ منیٰ میں قصر سفر کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ مناسکِ حج میں سے ہونے کی وجہ سے ہے لیکن بعض حضرات نے اس کو راجح قرار دیا ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک بھی منیٰ وغیرہ میں قصر سفر کی وجہ سے ہے نسک کی وجہ سے نہیں البتہ دوسرے اسفار میں تو قصرِ صلوٰۃ کے لئے تحدیدِ مسافت ہے لیکن مکہ سے منیٰ وغیرہ کے سفر میں قصرِ صلوٰۃ کے لئے تحدیدِ مسافت نہیں۔ دیکھئے کشف المغطا عن وجہ الموطا (ص۲۲۶)، رقم الحاشیۃ ۴، صلوٰۃ منیٰ یوم الترویۃ والجمعۃ بمنی وعرفۃ۔ نیز دیکھئے جزء حجۃ الوداع (ص۲۰) اختلافھم فی أن القصر والجمع بعرفۃ ومنیٰ للسفر أو للنسك ۱۲ مرتب

[4] چنانچہ پچھلے سے پیوستہ باب (باب ماجاء فی الخروج إلی منیٰ والمقام بھا) میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت مروی ہے "صلّی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمنی الظهر والعصر والمغرب والعشاء والفجر ثم غدا إلی عرفات" ۱۲ م

[5] کما فی روایۃ أنس بن مالك مرفوعا: "وصلاته (ای صلاۃ الرجل) فی المسجد الحرام بمائۃ الف صلاۃ" سنن ابن ماجہ (ص۱۰۲) باب ماجاء فی الصلاۃ فی المسجد الجامع ۱۲ مرتب

باب ماجاء فی الوقوف بعرفات[1] والدعاء فیها

عن عائشة[2] قالت: كانت قريش ومن كان على دينها وهم الحمس يقفون بالمزدلفة، يقولون: نحن قطين الله، وكان من سواهم يقفون بعرفة، فأنزل الله تعالى «ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ» "حُمْسٌ" "أحمس" کی جمع ہے، اس کے معنی ہیں صاحبِ قوت وشدت، یہ قریش اور ان کے آس پاس کے چند قبیلوں کا لقب ہے یعنی کنانہ، جدیلۂ قیس، اور بنو عامر بن صعصعہ[3]، ان قبیلوں کو "حمس" اس لئے کہا جاتا تھا کہ انہوں نے ایام حج میں اپنے اوپر سختی کی ہوئی تھی اور دوسرے اہل عرب سے زیادہ پابندیاں عائد کی ہوئی تھیں، یہ لوگ احرام باندھنے کے بعد اپنے اوپر گوشت کو حرام کر لیتے تھے، بالوں کے خیموں میں نہیں جاتے تھے اسی طرح متعدد جائز کاموں سے احتراز کرتے تھے، پھر جب مکہ لوٹتے تھے تو اپنے پہلے کپڑوں کو اتار رکھتے تھے اور حمس کے کپڑوں کے سوا طواف کو جائز نہیں سمجھتے تھے[4]، اس کے علاوہ حج کے دوران عرفات میں وقوف کرنے کے بجائے

---

[1] هو علم للموقف وهو منصرف إذ لا تأنيث فيها، قاله الكرمانی ـ وسميت عرفات بهذا الاسم إما لأنها وصفت لإبراهيم عليه الصلاة والسلام، فلما بصرها عرفها، أو لأن جبريل عليه الصلاة والسلام حين كان يدور به فی المشاعر أراه إياها فقال: قد عرفت، أو لأن آدم عليه الصلاة والسلام هبط من الجنة بأرض الهند وحواء عليها السلام بجدّة فالتقيا ثمه فتعارفا، أو لأن الناس يتعارفون بها، أو لأن إبراهيم صلى الله عليه وسلم عرف حقيقة رؤياه فی ذبح ولده ثمه، أو لأن الخلق يعترفون فيها بذنوبهم أو لأن فيها جبالاً، والجبال هی الأعراف وكل عال فهو عرف» عمدة القاری (ج ۱۰ ص۱) باب الوقوف بعرفة وراجعه لمزيد التحقيق، والكشاف (ج ۱ ص۲۴۶) ومعجم البلدان (ج ۴ ص۱۰۴)۔
حدودِ عرفات کے بارے میں مجاہدؒ حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں: «حد عرفة من الجبل المشرف على بطن عرنة إلى أجبال عرنة إلى الوصيق إلى ملتقى الوصيق إلى وادی عرفة» اخبار مکہ (ج ۲ ص۱۹۴) ذکر عرفة وحدودها والموقف بها ۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ

[2] الحديث أخرجه البخاری فی صحيحه (ج ۱ ص۲۲۶) كتاب المناسك باب الوقوف بعرفة، و (ج ۲ ص۶۴۸ و ص۶۴۹) كتاب التفسير، تفسير سورة البقرة، باب قوله ثم أفيضوا من حيث أفاض الناس ـ ومسلم فی صحيحه (ج ۱ ص۳۹۳ و ص۴۰۱) باب حجة النبی صلى الله عليه وسلم ۱۲ مرتب

[3] تشریح کے لئے دیکھئے لسان العرب (ج ۶ ص۵۸) مادة "حمس" ۱۲ مرتب

[4] مزید تشریح کے لئے دیکھئے عمدة القاری (ج ۱۰ ص۳) باب الوقوف بعرفة ـ وفتح الباری (ج ۳ ص۵۱۶) ۱۲ م

مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے کیونکہ عرفات حدودِ حرم سے باہر ہے جبکہ مزدلفہ حدودِ حرم میں ہے اور یہ لوگ اپنے آپ کو حرم کے مجاورین سمجھتے تھے اور کہتے تھے "نحن قطین اللہ" یعنی "سکّان اللہ" اس لئے حدودِ حرم سے باہر نکلنا پسند نہ کرتے تھے، قرآن کریم نے ان کو اس طریقہ کے بدلنے کا حکم دیا اور فرمایا "ثُمَّ اَفِیضُوا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ"[1] یعنی تمہارا وقوف اُسی جگہ ہونا چاہئے جہاں پر تمام لوگ وقوف کرتے ہیں۔

"قَطِینٌ" "قاطن" کی جمع ہے جو قَطَنَ بالمکان (اقامت کرنا) سے ماخوذ ہے[2]۔
واللہ أعلم

باب ماجاء أن عرفة كلها موقف

عن علی بن أبی طالب قال: وقف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعرفة فقال: هٰذه عرفة وهو الموقف، وعرفة كلها موقف[3] امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ عرفات میں بطنِ عُرَنَہ[4] اور مزدلفہ میں وادی محسّر میں وقوف کیا تو مکروہ ہوگا لیکن وقوف ہو جائیگا[5]

---

[1] سورۃ بقرہ، آیت ۱۹۹ پ۲ - ۱۲ م

[2] جامع الأصول (ج ۳ ص۲۳۴ و ۲۳۵) الباب الخامس فی الوقوف، رقم نمبر ۱۵۲۰ - ۱۲ م

[3] الحدیث أخرجه أبو داؤد فی سننه (ج ۱ ص۲۶۶) کتاب المناسك. باب الصلاة بجمع، باختصار - و ابن ماجة فی سننه (ص۲۱۶) باب الموقف بعرفات ۱۲ م

[4] "عُرَنَة" (بضم العین وبفتح الراء والنون) بروزنِ "هُمَزَة" - قال الأزهری: بطن عرنة واد بحذاء عرفات وقال غیره: بطن عرنة مسجد عرفة والمسیل کله "معجم البلدان (ج ۴ ص۱۱۱ طبع: دار صادر بیروت)
واضح رہے کہ بطنِ عرنہ ایک چھوٹی وادی ہے جو بجانب مغرب مسجدِ نمرہ سے متصل ہے اور مکہ مکرمہ کے رُخ پر ہے، گویا وہ عرفات کی مغربی سرحد ہے۔ "حج ومقاماتِ حج" (ص۹۵) بتغیر ۱۲ مرتب

[5] امام مالکؒ سے بطنِ عرنہ میں وقوف کرنے والے کے بارے میں دو روایتیں مروی ہیں، ایک یہ کہ وقوف معتبر نہیں، دوسری یہ کہ وقوف تو درست ہو جائیگا لیکن مکروہ ہوگا اور اس پر دم ہوگا۔
حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: والأوجه عندی أن المرجح هی الروایة الأولی وإن کانت عامة نقلة المذاهب حکوا عن الروایة الثانیة فقط، لأن عامة فروعهم علی الأولی کما تقدم عن الدردیر وهو ظاهر کلام الباجی إذ لم یذکر الروایة الثانیة وإلیه یشیر ما تقدم عن شرح الخرشی فی بیان المسجد، و فی شرح اللباب هٰذا قول ضعیف ینسب إلی الامام مالك حیث قال: قال مالك: هی من عرفة حتی لو وقف بها أجزاه وعلیه دم کذا روی القاضی أبو الطیب عن مالك، وهٰذا خلاف مذهب الفقهاء جمیعا، ونص أصحابه أنه لا یجوز أن یقف بعرفة کما هو مذهبنا اهـ اوجز المسالك (ج ۳ ص۴۴۸) الوقوف بعرفة والمزدلفة۔
وادی محسّر کے بارے میں امام مالکؒ کا بظاہر وہی مسلک ہے جو عُرنہ کے بارے میں ہے لیکن اس کا کوئی صریح حوالہ احقر کو نہ مل سکا ۱۲ مرتب

حنفیہ کا مسلک علامہ ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں یہ نقل کیا ہے کہ وقوف ہی نہ ہوگا۔[1] لیکن صاحبِ بدائع نے وادی محسّر کے بارے میں تو یہی کہا ہے کہ وقوف کراہت کے ساتھ ہو جائے گا۔[2] لیکن بطنِ عُرنہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا بظاہر ان کے خیال میں وہاں بھی وقوف کراہت کے ساتھ ہو جائیگا، لعدم الفارق۔[3]

حضرت مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے معارف السنن[4] میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگر بطنِ عُرنہ کا عرفات میں اور محسّر کا مزدلفہ میں شامل ہونا ثابت ہو جائے تو امام مالکؒ اور صاحبِ بدائعؒ کا قول قوی ہے کیونکہ قرآن کریم میں "عرفات" اور "المشعر الحرام" کے الفاظ آئے ہیں۔[5] لہٰذا بطنِ عُرنہ اور محسّر میں وقوف کرنے سے مطلقِ قرآن پر عمل ہو گیا، البتہ اخبارِ آحاد[6] کی وجہ سے کراہت باقی رہی، ہاں اگر یہ ثابت ہو کر عرنہ اور محسّر بالترتیب عرفات اور مزدلفہ کا جز ہی نہیں ہیں تو پھر وقوف ہی درست نہ ہوگا اور حدیث میں عُرنہ کو عرفہ سے مستثنیٰ کرنا جزئیت کی دلیل ہے لأن الأصل فی الاستثناء الاتصال۔

ثم أتی جمعًا[7] یہ مزدلفہ کا دوسرا نام ہے اور اس کا تیسرا نام "المشعر الحرام" ہے۔[8]

---

[1] چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "و اعلم أن ظاهر كلام القدوری و الهداية وغيرهما فی قولهم مزدلفة كلها موقف إلا وادی محسر وكذا عرفة كلها موقف إلا بطن عرنة أن المكانين ليسا مكان وقوف، فلو وقف فيهما لا يجزيه كما لو وقف فی منى، سواء قلنا أن عرنة و محسرا من عرفة ومزدلفة أو لا"۔
فتح القدیر (ج ۲ ص۱۶۳) باب الإحرام ۱۲ مرتب

[2] بدائع الصنائع (ج ۲ ص۱۳۶) و أما مكانه فجزء من أجزاء مزدلفة ۱۲ م

[3] اس لئے کہ صاحبِ بدائعؒ نے "عرفات كلها موقف إلا بطن عرنة ومزدلفة كلها موقف إلا وادی محسر" اور "مزدلفة كلها موقف وارتفعوا عن المحسر" کی روایات ذکر کی ہیں اور ان کو کراہت پر محمول کرکے وادی محسّر میں وقوف کو مکروہ کہا ہے، پھر چونکہ اول الذکر روایت میں "محسّر" کے ساتھ ساتھ "عرنہ" کا بھی ذکر ہے، اس لئے جو حکم محسّر کا ہوگا وہی عُرنہ کا ہوگا ۱۲ مرتب عفی عنہ

[4] (ج ۶ ص۴۴) ۱۲

[5] چنانچہ ارشاد ہے: "فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ" سورۂ بقرہ آیت ۱۹۸ پ ۲ - ۱۲ م

[6] دیکھئے نصب الرایہ (ج ۳ ص۶۱ تا ۶۲) کتاب الحج، باب الاحرام، الحديث التاسع والثلاثون ۱۲ م

[7] بفتح الجيم وسكون الميم هی المزدلفة وسمی به لأن آدم عليه الصلاة والسلام اجتمع فيها مع حواء عليها السلام وازدلف إليها أی دنا منها، أو لأنه يجمع فيها بين الصلاتين وأهلها يزدلفون أی يتقربون إلى الله تعالى بالوقوف فيها (قلت) أصلها مزتلفة لأنها من "زلف" فقلبت التاء دالا لأجل الزای"۔
عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص۴) باب الوقوف بعرفة ۱۲ مرتب

[8] چنانچہ شیخ ابن ہمامؒ لکھتے ہیں: "وفی كلام الطحاوی أن للمزدلفة ثلاثة أسماء. المزدلفة، والمشعر الحرام وجمع" فتح القدیر (ج ۲ ص۱۶۳) باب الاحرام ۱۲ م

"فلمّا أصبح أتى قُزَح" قُزَح قاف کے ضمّہ کے ساتھ بروزن "زُفر" ہے علمیت اور عدل کی وجہ سے غیر منصرف ہے، یہ اس پہاڑ کا نام ہے جس پر مزدلفہ میں امام وقوف کرتا ہے[1]

"ثمّ أفاض حتّی انتهى إلى وادي مُحَسِّر"[2] عام طور پر مشہور ہے کہ وادئ محسّر وہ جگہ ہے جہاں پر اصحابِ فیل کو ہلاک کیا گیا تھا[3]، لیکن علامہ دسوقی رحمہ اللہ نے شرح متن خلیل (ج ۲ ص ۴۵) کے حاشیہ میں نقل کیا ہے کہ وادئ محسّر اصحابِ فیل کی ہلاکت کی جگہ نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ حرم کے اندر ہے اور اصحابِ فیل کو حرم سے باہر ہلاک کیا گیا تھا[4]۔

لہٰذا صحیح بات یہ ہے کہ وادئ محسّر وہ جگہ ہے جہاں پر ایک شخص نے حالتِ احرام میں شکار کر لیا تھا اس پر ایک آسمانی آگ آئی اور اس آدمی کو جلا ڈالا، اسی لئے اس کو "وادی النار" بھی کہتے ہیں[5]۔

"فقرع[6] ناقته فخبّت[7] حتّی جاوز الوادي فوقف" وادی محسّر پہنچ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] قزح کی مذکورہ تفصیل معارف السنن (ج ٦ ص ۴۲۲) سے ماخوذ ہے ۱۲ م

[2] المُحَسِّر، بضم الميم وفتح الحاء المهملة وتشديد السين المهملة وكسرها، هو وادٍ بين مزدلفة ومنًى. وقال بعضهم: ما صب منه في المزدلفة فهو منها وما صب منه في منًى فهو منها وصوّبه بعضهم، وسُمّي بذلك لأنه حسر فيه فيل اصحاب الفيل أي أعيا، وقيل: لأنه يحسر سالكيه ويتعبهم" معارف السنن (ج ٦ ص ۴۲۱ و ۴۲۲) ۱۲ مرتب۔

[3] چنانچہ حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے اور محب طبری کے کلام سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، لیکن علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ اس بحث کو لکھتے ہوئے فرماتے ہیں: "هذا ملخص ما ذكره ابن كثير والرازي والقرطبي والزمخشري والسيوطي والآلوسي وغيرهم من المفسرين، ولم أجد من صرّح منهم بأن ذلك كان في وادي محسر إلا ما قاله المحب الطبري كما أسلفناه منه" معارف السنن (ج ٦ ص ۴۲۲) ۱۲ مرتب

[4] معارف السنن (ج ٦ ص ۴۲۲ و ۴۲۳) ۱۲ م

[5] عمدة القاري (ج ۱۰ ص ۱۱) باب من قدّم ضعفة أهله فيقفون بالمزدلفة ۱۲ م

[6] یعنی آپ نے اپنی اونٹنی کو چابک سے مارا پس وہ دوڑنے لگی ۱۲ م

[7] یہ "خبب" سے ماخوذ ہے اور مضاعف ہے، باب نصر سے ماضی کا واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ گھوڑے کی دوڑ کے سات درجات ہیں ہر درجہ کا عربی میں علیحدہ نام ہے، ان میں سے پہلے درجہ کو "خبب" کہتے ہیں کما فی فقہ اللغۃ (ص ۲۰۱) فصل في ترتيب عدو الفرس۔

گھوڑے کے علاوہ دوسرے جانوروں کی دوڑ کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے کما فی حدیث الباب ۱۲ مرتب

نے سرعت اختیار کی اور اس کو تیز رفتاری سے عبور کرلیا اس لئے کہ جس جگہ عذابِ خداوندی نازل ہوا ہو وہاں ٹھہرنا نہ چاہیے[1]۔

ثم أتاه رجل فقال: یا رسول الله إنی أفضت[2] قبل أن أحلق قال: إحلق ولا حرج أو قصر ولا حرج، قال: وجاء آخر فقال: یا رسول الله انی ذبحت قبل أن أرمی، قال: إرم ولا حرج" یوم النحر یعنی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو حجاج کے ذمہ چار مناسک ہوتے ہیں:

① رمی ② قربانی (قارن اور متمتع کے لئے) ③ حلق یا قصر ④ طوافِ زیارت[3]۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان افعال کا بالترتیب کرنا ثابت ہے[4]

مناسکِ اربعہ میں ترتیب کا حکم اور اس بارے میں فقہاء کے مذاہب پھر مذکورہ چار کاموں میں سے شروع کے تین ہیں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ترتیب واجب ہے اور اس ترتیب کے عامداً یا ناسیاً یا جاہلاً ترک کرنے پر دم واجب ہے، البتہ طوافِ زیارت کو بقیہ

---

[1] چنانچہ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے "قال لما مر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالحجر، قال: لا تدخلوا مساکن الذین ظلموا أنفسهم أن یصیبکم ما أصابهم إلا أن تکونوا باکین، ثم قنع رأسه وأسرع السیر حتی جاز الوادی" صحیح بخاری (ج ۲ ص ۶۳۷) کتاب المغازی، باب نزول النبی صلی اللہ علیہ وسلم الحجر۔
امام شافعیؒ نے وادی محسر میں آپؐ کے اِسراع کے بارے میں فرمایا "یجوز أن یکون فعل ذلک لسعة الموضع" یعنی چونکہ وادیٔ محسر میں جگہ کشادہ تھی اور چلنے میں کوئی دقت نہ تھی اس لئے آپ وہاں تیز تیز چلے، ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ وادی شیاطین کا ٹھکانا تھی اس لئے آپؐ نے اِسراع کو اختیار فرمایا اور ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ وادی نصاریٰ کا موقف تھی اس لئے آپؐ نے وہاں سے جلد گذر جانے کو پسند فرمایا۔ دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۲۴۲) ۱۲ مرتب

[2] میں نے طوافِ افاضہ یعنی طوافِ زیارت کرلیا۔ ۱۲ م

[3] دیکھئے "البحر الرائق" (ج ۳ ص ۲۲) باب الجنایات
علامہ ابن رشدؒ اس ترتیب کے بارے میں فرماتے ہیں: "أجمع العلماء علی أن هذا سنة الحج" بدایة المجتهد (ج ۱ ص ۲۵۸) کتاب الحج، القول فی رمی الجمار ۱۲ مرتب

[4] دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۹۹ و ۴۰۰) باب حجة النبی صلی اللہ علیہ وسلم، فی حدیث جابر الطویل۔ حضرت انس بن مالکؓ کی روایت سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان افعال کو بالترتیب کرنا ثابت ہے، اگرچہ ان کی روایت میں طوافِ زیارت کا ذکر نہیں ہے، دیکھئے سنن أبی داؤد (ج ۱ ص ۲۷۲) باب الحلق والتقصیر ۱۲ مرتب

مناسک یا ان میں سے کسی پر مقدم کرنے پر کوئی دم نہیں[1]

امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر اس نے حلق کو رمی پر مقدم کیا تو اس پر دم ہے، لیکن اگر حلق کو نحر پر مقدّم کیا یا نحر کو رمی پر مقدم کیا تو کچھ واجب نہیں، اور اگر طوافِ زیارت کو رمی پر مقدم

---

[1] معارف السنن (ج ۶ ص ۲۴۵) میں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک اسی طرح نقل کیا گیا ہے یعنی ترتیب توڑنے پر دم واجب ہے، خواہ ترتیب عامدًا توڑی گئی ہو یا ناسیًا یا جاہلاً، لیکن معارف السنن میں اس کا کوئی صریح حوالہ منقول نہیں، البتہ مبسوطِ سرخسیؒ کی عبارت سے امام ابوحنیفہ کا یہی مسلک سمجھ میں آتا ہے چنانچہ اس میں امام ابوحنیفہ کا مسلک ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے: "من قدم نسکًا علی نسك کأن حلق قبل الرمی او نحر القارن قبل الرمی أو حلق قبل الذبح فعلیہ دم عند أبی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ" (ج ۴ ص ۴۱ و ۴۲) باب الطواف۔ اس میں مطلق فسادِ ترتیب پر دم کا حکم لگایا گیا ہے اور فسادِ ترتیب عام ہے خواہ عامدًا ہو یا ناسیًا یا جاہلاً۔

جہاں تک صاحبین کے مسلک کا تعلق ہے سو صدر الشہیدؒ نے "جامع صغیر" کی شرح میں اس قارن کے بارے میں جس نے حلق قبل الذبح کر لیا ہو ان دونوں حضرات کا مسلک یہ نقل کیا ہے کہ اس پر ایک دمِ جنایت ہے دیکھئے "منحۃ الخالق علی البحر الرائق" لابن عابدین (ج ۳ ص ۲۴) باب الجنایات

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صاحبینؒ ترتیب کے ٹوٹنے پر دم کے قائل ہیں یا کم از کم قارن کے حق میں حلق قبل الذبح کی صورت میں دم کے قائل ہیں۔

الجامع الصغیر (ص ۱۳۳ و ص ۱۳۴، باب فی الحلق والتقصیر۔ طبع ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی) میں بھی "قارن حلق قبل أن یذبح" کی صورت میں صاحبین کا یہ مسلک بیان کیا ہے کہ اس پر ایک دم ہے اگرچہ اس کے دمِ جنایت ہونے کی تصریح نہیں ہے

لیکن مبسوطِ سرخسیؒ (ج ۴ ص ۴۲، باب الطواف، طبع: مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۲۴ھ) میں صاحبین کا مسلک "لا یلزمہ الدم بالتقدیم والتاخیر" بیان کیا گیا ہے۔ موطا امام محمدؒ میں بھی امام محمدؒ اپنا مسلک ان الفاظ کے ساتھ بیان کرتے ہیں" قال محمد: وبالحدیث الذی روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نأخذ أنہ قال: لاحرج فی شیٔ من ذلك" (ص ۲۳۵) باب من قدم نسکا قبل نسك۔ فتح القدیر میں شیخ ابن ہمام نے بھی صاحبین کا مسلک ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے: "والدم الذی یجب عندھما دم القران لیس غیر لا للحلق قبل أوانہ" (ج ۲ ص ۲۵۵) باب الجنایات (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کیا تو درست نہ ہوگا۔ لہٰذا اس کو چاہئے کہ پہلے رمی کرے پھر نحر کرے، پھر طوافِ زیارت دوبارہ کرے[۱]

امام شافعیؒ کے نزدیک مناسکِ اربعہ میں ترتیب مسنون ہے اور ترتیب کے ساقط ہونے پر کوئی دَم وغیرہ نہیں، یہ امام شافعیؒ کا قولِ مشہور ہے، اور اُن کا ایک قول یہ بھی ہے کہ تقدیم حلق علی الرمی کی صورت میں دم واجب ہے[۲]

امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ اِن مناسک میں اگر ترتیب جہل یا نسیان کی وجہ سے ٹوٹی ہے تو کوئی دَم وغیرہ نہیں، البتہ اگر ترتیب عامدًا اور عالماً توڑی گئی ہے تو اس کے بارے میں ان کی دو۲ روایتیں ہیں، ایک یہ کہ اس کا یہ فعل اگرچہ مکروہ ہے لیکن اس پر کوئی دم نہیں[۳]، دوسری روایت یہ ہے کہ اس پر دم ہے[۴]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ان تصریحات کی روشنی میں راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب کے ٹوٹنے سے صاحبینؒ کے نزدیک دم واجب نہیں۔ پھر جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک شروع کے تین مناسک میں ترتیب واجب ہے، طوافِ زیارت میں نہیں، طوافِ زیارت کو ترتیب سے ساقط کرنے کی امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کیا دلیل ہے وہ احقر کو معلوم نہ ہوسکی، البتہ مبسوطِ سرخسیؒ میں حضرت عائشہؓ کی ایک روایت نقل کی گئی ہے "أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: إن أول نسکنا فی ھذا الیوم أن نرمی ثم نذبح ثم نحلق"۔ اس روایت میں مذکورہ مناسک میں ترتیب کا بیان ہے لیکن طوافِ زیارت کا کوئی ذکر نہیں جس کا ظاہر یہ ہے کہ اس میں ترتیب ضروری نہیں۔ دیکھئے مبسوط (ج ۴ ص۶۶، باب رمی الجمار)۔ لیکن حافظ جمال الدین زیلعیؒ نے اس کو "غریب" کہا ہے۔ دیکھئے نصب الرایہ (ج ۳ ص۹۱) باب الاحرام ۱۲

رشید اشرف عفی عنہ

(حاشیہ صفحہ ھٰذا)

[۱] یہ تفصیل المغنی (ج ۳ ص۴۴۸، باب صفۃ الحج، فصل: و فی یوم النحر أربعۃ اشیاء۔ وفصل: فإن قدم الإفاضۃ علی الرمی) سے ماخوذ ہے ۱۲ مرتب

[۲] لیکن اس قول کو علامہ نوویؒ نے ضعیف قرار دیا ہے، تفصیل کیلئے دیکھئے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۲۱) باب جواز تقدیم الذبح علی الرمی الخ ۱۲ م

[۳] وھو المذھب، نص علیہ، وعلیہ أکثر الأصحاب، وجزم بہ فی المحرر، والوجیز وغیرھما۔ وقدمہ فی الفروع والرعایتین والحاویین وغیرھم۔ وصححہ فی التصحیح وغیرہ۔ واختارہ ابن عبدوس فی تذکرتہ وغیرہ" الإنصاف (ج ۴ ص۴۲ باب صفۃ الحج) طبع دار احیاء التراث العربی ۱۳۷۴ھ ۱۲ مرتب

[۴] یہ روایت ابو طالب وغیرہ نے نقل کی ہے جبکہ ابن عقیل کی روایت امام ابوحنیفہ کے مطابق ہے، یعنی ترتیب خواہ عامداً چھوڑی گئی ہو یا ناسیاً یا جاہلاً بہر صورت دم ہے، کذا فی الانصاف (ج ۴ ص۴۲) وراجع للتفصیل، والمغنی لابن قدامۃ (ج ۳ ص۴۴۸ و ص۴۴۹) باب صفۃ الحج، فصل و فی یوم النحر اربعۃ اشیاء ۱۲ مرتب

بہرحال ائمہ ثلاثہ ایک حد تک عدمِ وجوبِ ترتیب کے قائل ہیں۔ ان حضرات کا استدلال حدیثِ باب میں " أحلق ولا حرج " اور " ارم ولا حرج " سے ہے۔ نیز حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بھی ان حضرات کا استدلال ہے جو فرماتے ہیں: " ماسئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یومئذ عمن قدم شیئا قبل شئ إلا قال: " لا حرج لا حرج [1] "

امام ابوحنیفہ کا استدلال مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابن عباسؓ کے ایک فتوے سے ہے: " من قدم شیئاً من حجہ أو أخرہ فلیھرق لذلک دماً [2] " اس کی سند میں اگرچہ کسی قدر ضعف [3] ہے لیکن طحاویؒ [4] میں یہ اثر سندِ صحیح کے ساتھ مذکور ہے۔

---

[1] طحاوی (ج ۱ ص ۳۵۹) باب من قدم من حجہ نسکاً قبل نسک۔

نیز ان حضرات کا استدلال حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت سے ہے جس میں وہ فرماتے ہیں: " فجاءہ رجل فقال: لم أشعر فحلقت قبل أن أذبح، قال: إذبح ولا حرج، فجاء آخر فقال: لم أشعر فنحرت قبل أن أرمی، قال: إرم ولا حرج، قال: فما سئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن شئ قدم ولا أخر إلا قال: إفعل ولا حرج " صحیح بخاری (ج ۱ ص ۱۸ کتاب العلم باب الفتیا وھو واقف علی ظھر الدابۃ وغیرھا۔

نیز حضرت جابرؓ کی روایت سے بھی ان کا استدلال ہے جو بخاری میں تعلیقاً مروی ہے " قال: سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمن حلق قبل أن یذبح ونحوہ فقال: لا حرج لا حرج " جامع الاصول (ج ۳ ص ۳۳۲، ۲۹۳) الباب الثامن فی التحلل وأحکامہ، الفصل الاول فی تقدیم بعض أسبابہ علی بعض، رقم الحدیث ۱۶۰۶۔

نیز اسامہ بن شریکؓ کی روایت سے بھی استدلال ہے۔ دیکھئے سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۲۷۱) باب فی من قدم شیئاً قبل شئ فی حجہ ۱۲ مرتب عفی عنہ

[2] ابن ابی شیبہ نے یہ روایت " حدثنا سلام بن مطیع أبو الأحوص عن إبراھیم بن مہاجر عن مجاھد عن ابن عباس " کی سند سے نقل کی ہے کذا فی نصب الرایہ (ج ۳ ص ۱۲۹) باب الجنایات ۱۲ م

[3] اس اثر کو ابراہیم بن مہاجر کی وجہ سے ضعیف کہا گیا ہے جن کو اکثر محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے البتہ امام احمدؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: " لا باس به " دیکھئے میزان الاعتدال (ج ۱ ص ۶۷، رقم ۲۲۵)۔ حافظ ابن حجرؒ نے بھی فتح الباری میں اس اثر پر ابراہیم بن مہاجر کے ضعف کا اعتراض کیا ہے دیکھئے (ج ۳ ص ۵۶۹، باب الفتیا علی الدابۃ عند الجمرۃ) لیکن حافظؒ ہی نے الدرایۃ فی تخریج احادیث الہدایہ میں ابن ابی شیبہ کی سند کو " حسن " اور طحاوی کی سند کو " احسن منہ " قرار دیا ہے۔ دیکھئے (ج ۲ ص ۴۱، باب الجنایات فی الإحرام، رقم ۵۰۵) ۱۲ مرتب

[4] (ج ۱ ص ۳۶۱) باب من قدم من حجہ نسکاً قبل نسک ۱۲ م

واضح رہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی " لاحرج " والی روایت کے راوی ہیں لہٰذا ان کا مذکورہ فتویٰ اس بات کی دلیل ہے کہ روایات میں " لاحرج " سے مراد وجوبِ دم کی نفی نہیں ہے، بلکہ محض گناہ کی نفی ہے، واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کرامؓ کے حج کرنے کا یہ پہلا موقعہ تھا اور اس وقت تک مناسکِ حج کا صحیح علم لوگوں کو نہیں ہوا تھا اس لئے فسادِ ترتیب کا گناہ اٹھالیا گیا تھا اس کی تائید طحاویؒ میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے ہوتی ہے جو فرماتے ہیں: " سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو بین الجمرتین عن رجل حلق قبل أن یرمی قال: لاحرج، وعن رجل ذبح قبل أن یرمی قال: لاحرج، ثم قال: عباد اللہ! وضع اللہ عزّوجلّ الحرج والضیق وتعلموا مناسککم فانہا من دینکم" اس سے واضح ہے کہ آپؐ نے حرج کی نفی اس بنا پر فرمائی تھی کہ مناسکِ حج عام نہیں تھے لیکن یہ وجوبِ دم کے منافی نہیں[۲] اسی بنا پر حضرت ابن عباسؓ جو " لاحرج " کے واقعات کے عینی شاہد اور ان کے راوی ہیں اپنے فتویٰ میں اس کی تصریح فرماتے ہیں کہ اس صورت میں دم واجب ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہی ہے کہ نفیِ اثم وجوبِ دم کے منافی نہیں[۳] جیسا کہ اگر حالتِ احرام میں کسی شخص کو تکلیف یا بیماری کی وجہ سے حلق کرنا پڑے تو وہ بنصِ قرآنی[۴] جائز ہے اور اس پر کوئی گناہ نہیں، اس کے باوجود اس کے بدلہ میں دم وغیرہ

---

[۱] (ج ۱ صفحہ ۳) باب من قدم من حجہ نسکا قبل نسک ۱۲ م

[۲] حضرت اسامہ بن شریکؓ کی روایت سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے فرماتے ہیں: " خرجت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم حاجًّا، فکان الناس یأتونہ، فمن قال: یا رسول اللہ سعیت قبل أن أطوف، او قدمت شیئًا أو أخرت شیئًا، فکان یقول: لاحرج، لاحرج، إلّا علی رجل اقترض عرض رجل مسلم وھو ظالم فذلک الذی حرج وھلک" ابوداؤد (ج ۱ صفحہ ۲۷۶) باب من قدم شیئًا قبل شئ فی حجہ

اس روایت میں " لاحرج، لاحرج إلّا علی رجل اقترض عرض رجل مسلم الخ " کے الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ " لاحرج " سے مراد " لا إثم " ہے، وجوبِ دم کی نفی مقصود نہیں۔ واللہ اعلم۔ ۱۲ مرتب

[۳] حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے فتوے کی روشنی میں " لاحرج " والی روایات کی مذکورہ تشریح امام طحاویؒ کے کلام سے ماخوذ ہے، دیکھئے شرح معانی الآثار (ج ۱ صفحہ ۳) باب من قدم من حجہ نسکا قبل نسک ۱۲ مرتب

[۴] وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّن رَّأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ " سورہ بقرہ آیت ۱۹۶ پ ۲ - ۱۲ م

دینا بالاتفاق واجب ہے[1]

حجۃ الوداع کے موقعہ پر زیر بحث مسئلہ میں بھی یہی صورت تھی کہ فسادِ ترتیب کا گناہ مناسک سے ناواقفیت کی بنا پر اٹھا لیا گیا تھا (اور "لاحرج" جیسے جملوں سے بھی یہی مراد تھی) اگرچہ دم پھر بھی واجب تھا لیکن عدمِ گناہ کا حکم بھی اُس وقت تھا، اب جبکہ مناسکِ حج کی پوری تفصیل سامنے آچکی ہے اس لئے جاہل کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہا، اس لئے جہالت کی وجہ سے فسادِ ترتیب کی صورت میں دم تو ہوگا ہی، گناہ بھی ہوگا۔

امام طحاویؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے مسلک پر "وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ" سے بھی استدلال کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں محصر کو تقدیم نحر علی الحلق کا حکم دیا گیا ہے چنانچہ تقدیم حلق علی النحر باجماع جائز نہیں ہے اور موجبِ دم ہے، جب محصر کا یہ حکم ہے تو قارن وغیرہ کا بھی یہی حکم ہونا چاہئے کہ حلق قبل النحر درست نہ ہو اور ترتیب توڑنے پر دم ہو[2]

فائدہ مہمہ واضح رہے کہ حنفیہ کی عام کتبِ فقہ میں امام ابوحنیفہؒ کا وہی مسلک بیان کیا گیا ہے جو ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں، یعنی فسادِ ترتیب کی صورت میں بہرصورت دم ہے خواہ وہ فساد عامداً ہو یا ناسیاً یا جاہلاً، چنانچہ پیچھے زیر بحث مسئلہ کی تحقیق اسی کے مطابق کی گئی ہے۔

لیکن "کتاب الحجۃ علی أھل المدینۃ" میں امام محمدؒ لکھتے ہیں: "عن أبي حنيفة في الرجل يجهل وهو حاج فيحلق رأسه قبل أن يرمي الجمرة أنه لا شئ عليه" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک بھی یہ ہے کہ فسادِ ترتیب جاہلاً کی صورت میں کوئی دم وغیرہ نہیں[4]۔ اگر امام ابوحنیفہؒ

---

[1] کما فی عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص ۱۵۳) أبواب العمرۃ، باب قول اللہ تعالیٰ فمن کان منکم مریضاً الخ ۱۲ م

[2] شرح معانی الآثار (ج ۱ ص ۳۶۱) باب من قدّم من حجّہ نسکاً قبل نسک ۱۲ م

[3] (ج ۲ ص ۳۷) باب الذی یجھل فیحلق رأسہ قبل أن یرمی جمرۃ العقبۃ ۱۲ م

[4] گویا امام ابوحنیفہؒ کا عمل درج ذیل احادیث کے ظاہر پر ہے:-

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت جس میں وہ فرماتے ہیں: "فجاء رجل فقال: یارسول اللہ لم أشعر فنحرت قبل أن أرمي قال: إرم ولاحرج، وقال آخر: یارسول اللہ لم أشعر فحلقت قبل أن أذبح، قال: إذبح ولاحرج" مؤطا امام محمد (ص ۲۳۴ و ۲۳۵) باب من قدّم نسکاً قبل نسک ۱۲ م

(۲) مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ ہی کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: فقام إليه رجل

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی اس آخری روایت کو اختیار کر کے یوں کہا جائے کہ ان کے نزدیک فسادِ ترتیب جاہلاً اور ناسیاً کی صورت میں کوئی دَم نہیں اور حدیثِ باب اُسی پر محمول ہے اور دم صرف متعمّداً کی صورت میں ہے اور حضرت ابن عباسؓ کا فتویٰ اِسی متعمّداً کی صورت پر محمول ہے تو یہ صورت اسہل بھی ہے اور روایات کے ظاہر کے مطابق بھی، نیز اِس صورت میں حضرت ابن عباسؓ کی روایتِ مرفوعہ اور ان کے فتوے میں کسی قسم کا تعارض باقی نہیں رہتا[۱] واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ أعلم۔ تم شرح الباب بزیادات من المرتب

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

فقال: ماکنتُ أحسب یارسول اللہ أن کذا وکذا قبل کذا وکذا الخ" اس میں بھی آپ نے آخر میں "افعل ولاحرج" ہی فرمایا۔ (ج ۱ ص۴۲۲) باب جواز تقدیم الذبح علی الرمی الخ

(۳) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ ہی کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: "فما سمعتہ سئل یومئذ عن أمر مما ینسی المرء ویجہل من تقدیم بعض الأمور قبل بعض وأشباھھا إلا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إفعلوا ذلک ولاحرج" مسلم شریف (ج ۱ ص۴۲۱)۔

مؤخر الذکر روایت کا تقاضا یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جس طرح فسادِ ترتیب جاہلاً کی صورت میں دم نہیں، اِسی طرح ناسیاً کی صورت میں بھی دَم نہ ہو، اس لئے کہ اِس آخری روایت میں جہل کے ساتھ نسیان کی بھی تصریح ہے ۱۲ مرتب

(حاشیہ صفحۂ ھٰذا)

[۱] امام محمدؒ اپنی "مؤطا" میں لکھتے ہیں: "قال محمد: وبالحدیث الذی روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نأخذ أنہ قال: لاحرج فی شئ من ذلک" وقال أبوحنیفۃ رحمہ اللہ: لاحرج فی شئ من ذلک، ولم یر فی شئ من ذلک کفارۃ إلا فی خصلۃ واحدۃ: المتمتع والقارن إذا حلق قبل أن یذبح قال: علیہ دم، وأما نحن فلا نری علیہ شیئاً" (ص۲۳۵) باب من قدّم نسکاً قبل نسک۔

اس روایت سے تو امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ معلوم ہوتا ہے کہ فسادِ ترتیب خواہ جاہلاً ہو یا ناسیاً یا عامداً کسی بھی صورت میں دَم نہیں ہے، البتہ صرف اس صورت میں دم ہے جبکہ متمتع اور قارن حلق قبل النحر کرلیں اور اس صورت میں بھی عامداً یا ناسیاً یا جاہلاً کی کوئی تصریح نہیں ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ متمتع اور قارن اگر حلق قبل النحر کرلیں تو بہرصورت دَم ہوگا خواہ یہ فسادِ ترتیب عامداً ہو یا ناسیاً یا جاہلاً۔

علامہ عبدالحی لکھنویؒ رحمہ اللہ مذکورہ عبارت کے تحت لکھتے ہیں کہ: "إلا فی خصلۃ واحدۃ" میں حصر غیر حقیقی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے التعلیق الممجد علی مؤطا الامام محمدؒ (ص۲۳۵، رقم الحاشیۃ ۱۲)

لیکن اس حصر کو غیر حقیقی کہنا ظاہر کے خلاف اور تکلف سے خالی نہیں۔ فتأمل۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

باب ماجاء فی الجمع بین المغرب والعشاء بالمزدلفۃ

أن[1] ابن عمر صلی بجمع، فجمع بین الصلاتین باقامۃ، وقال: رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فعل مثل ھذا المکان[2] حج کے موقعہ پر دو مرتبہ جمع بین الصلاتین مشروع ہے۔ ایک تو عرفات میں جمع بین الظہر والعصر جمع تقدیم، اور دوسرے مزدلفہ میں جمع بین المغرب والعشاء

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

بہرحال مذکورہ بالا تمام تحقیق سے امام ابوحنیفہؒ کی تین روایات سامنے آتی ہیں:۔

(۱) "من قدم نسکاً علی نسك کأن حلق قبل الرمی أو نحر القارن قبل الرمی أو حلق قبل الذبح فعلیہ دم" کما فی المبسوط للسرخسی (ج ۴ ص ۴۱ و ۴۲) باب الطواف۔

(۲) "عن أبی حنیفۃ فی الرجل یجہل وھو حاج فیحلق رأسہ قبل أن یرمی الجمرۃ أنہ لاشیٔ علیہ" کتاب الحجۃ علی أھل المدینۃ (ج ۲ ص ۳۶۷) باب الذی یجہل فیحلق رأسہ قبل أن یرمی جمرۃ العقبۃ۔

(۳) تیسری روایت مؤطا امام محمدکی، جواسی حاشیہ کے شروع میں ہم نے ابھی ذکرکی ہے یعنی "لاحرج فی شیٔ من ذلك، ولم یر فی شیٔ من ذلك کفارۃ إلا فی خصلۃ واحدۃ: المتمتع والقارن إذا حلق قبل أن یذبح قال: علیہ دم"

عام کتبِ حنفیہ میں اگرچہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک پہلی ہی روایت کے مطابق نقل کیا گیا ہے اور اسی پر فتویٰ بھی ہے کما فی اللباب فی شرح الکتاب للمیدانی (ج ۱ ص ۲۰۰) باب الجنایات۔ لیکن اگلی دو روایات کی موجودگی میں اصحابِ فتاویٰ کو اس پر غور کی ضرورت ہے کہ فسادِ ترتیب جاہلاً یا ناسیاً کی صورت میں دم کے سلسلہ میں چھوٹ دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ بالخصوص جبکہ یہ "لاحرج" والی روایات کا ظاہر بھی ہے، اگرچہ اس میں شک نہیں کہ دم والی روایت احوط ہے ۱۲ رشید اشرف عفی عنہ۔

(حاشیہ صفحۂ ھذا)

[1] الحدیث أخرجہ البخاری فی صحیحہ (ج ۱ ص ۲۲۷) کتاب المناسك، باب من جمع بینہما ولم یتطوع۔ ومسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص ۴۱۷) کتاب الحج، باب الإفاضۃ من عرفات إلی المزدلفۃ واستحباب صلوتی المغرب والعشاء جمعاً بالمزدلفۃ فی ھذہ اللیلۃ ۱۲ مرتب

[2] قولہ: "فعل مثل ھذا المکان" ھکذا فی نسختنا الھندیۃ، وفی نسخۃ البیروتیۃ بتحقیق الشیخ محمد فؤاد عبدالباقی "فعل مثل ھذا فی ھذا المکان" انظر (ج ۳ ص ۲۳۵، رقم ۸۸۷) ۱۲ مرتب

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جمع تاخیر۔ پھر حنفیہ کے نزدیک عرفات میں جمع بین الصلوٰتین مسنون ہے اور مزدلفہ میں واجب، جبکہ دوسرے حضرات کے نزدیک مزدلفہ میں بھی مسنون ہی ہے واجب نہیں[1]۔

عرفات میں جمع تقدیم کی شرائط | امام ابوحنیفہؒ، سفیان ثوریؒ اور ابراہیم نخعیؒ کے نزدیک عرفات میں جمع تقدیم کی چھ شرائط ہیں :-

① احرامِ حج۔
② تقدیم الظہر علی العصر[2]۔
③ الوقت والزمان، یعنی یوم عرفہ اور زوال کے بعد کا وقت۔
④ مکان، یعنی وادیٔ عرفات یا اس کے آس پاس کا علاقہ کمسجد نمرۃ من أی جہۃ کان۔
⑤ دونوں نمازوں کا باجماعت ہونا، چنانچہ اگر انفراداً نماز پڑھ لی تو جمع کرنا درست نہ ہوگا۔
⑥ امام اعظم یا اس کے نائب کا ہونا[3]، لہٰذا اگر ان دونوں کی غیر موجودگی میں جمع بین الصلوٰتین کرلی تو جمع درست نہ ہوگی۔

واضح رہے کہ صاحبین اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک شروع کی چار شرائط کافی ہیں، آخری دو شرائط

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

[4] عرفات اور مزدلفہ کی جمع بین الصلوٰتین جمہور کے نزدیک جمعِ نسک ہے یعنی مناسکِ حج کا ایک جزء ہے جبکہ امام شافعی کے نزدیک یہ جمع جمعِ سفر ہے " فمن کان حاضرًا أو مسافرًا دون مرحلتین کأھل مکۃ لم یجز لہ الجمع عندہٗ کما لا یجوز لہ القصر۔ انظر شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۳۹۶ و ۳۹۸) باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وفتح الملہم (ج ۳ ص۲۸۶) الجمع بین الظہر والعصر فی وقت الظہر بعرفۃ بأذان وإقامتین وھو نسک عند الحنفیۃ ـ وحجۃ الوداع (ص۱۱۲) اختلفوا فی الجمع بمزدلفۃ ھل ھو للسفر أو للنسک؟ ۱۲ مرتب

(حاشیہ صفحۂ ہٰذا)

[1] دیکھئے فتح الملہم (ج ۳ ص۲۸۵) باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، الجمع بین المغرب والعشاء بالمزدلفۃ۔ و"حجۃ الوداع" (ص۱۱۵) لو صلی المغرب قبل المزدلفۃ۔ ولباب المناسک مع شرحہ للقاری (ص۱۴۶) باب فی أحکام المزدلفۃ، فصل فی الجمع بین الصلوٰتین بہا ۱۲ مرتب

[2] چنانچہ اگر اس نے عصر پہلے پڑھ لی یا دونوں نمازیں بالترتیب پڑھیں لیکن بعد میں پتہ چلا کہ جس وقت ظہر کی نماز پڑھی تھی اس وقت ظہر کا وقت شروع نہ ہوا تھا تب بھی دونوں نمازوں کو لوٹائیگا۔

[3] یہ تفصیل معارف السنن (ج ۶ ص۴۵۱، باب ما جاء أن عرفۃ کلھا موقف) سے ماخوذ ہے ۱۲ م

ضروری نہیں[1]

صاحبینؒ اور ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کا استدلال حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اثر سے ہے جو بخاری[2] شریف میں تعلیقاً مروی ہے: "وکان ابن عمر إذا فاتته الصلاة مع الإمام جمع بینهما[3]"

جبکہ امام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ نصوص[4] قطعیہ سے محافظت علی الوقت کی فرضیت ثابت ہے، اس لئے اس کو "ماورد بہ الشرع" کے علاوہ کسی اور صورت میں ترک کرنا جائز نہیں، لہذا جمع کے لئے جماعت اور امام یا نائب کا ہونا ضروری ہوگا۔ امام ابوحنیفہؒ کا استدلال ابراہیم نخعیؒ کے ایک اثر سے بھی ہے جو امام محمدؒ کی کتاب الآثار میں مروی ہے[5]۔

---

[1] دیکھئے "المغنی" لابن قدامۃ (ج ۳ ص ۴۰۳) باب صفۃ الحج ۱۲ مرتب

[2] (ج ۱ ص ۲۲۵) کتاب المناسک، باب الجمع بین الصلاتین بعرفۃ ۱۲ مرتب

[3] واضح رہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جمع بین الصلاتین والی روایت کے بھی راوی ہیں، دیکھئے سنن أبی داود (ج ۱ ص ۲۶۵) باب الخروج إلی عرفۃ۔

یہاں حافظ ابن حجرؒ نے یہ اعتراض کیا ہے: "ومن قواعدهم (أی الحنفیة) أن الصحابی إذا خالف ما روی دلّ علی أن عنده علماً بأن مخالفه أرجح تحسيناً للظن به، فينبغي أن يقال هذا هنا" دیکھئے فتح الباری (ج ۳ ص ۴۱۵) باب الجمع بین الصلاتین بعرفة

علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اعلاء السنن میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: "وما أورد علیه الحافظ من أن الراوی إذا خالف ما رواه كان مخالفه أرجح عندهم فليس بوارد، فإن ذلك فيما إذا كان الراوی منفرداً بما رواه ثم خالفه، وجمع النبی صلی الله عليه وسلم بين الصلاتين بعرفة لم ينفرد ابن عمر بروايته، بل رواه جمع من الصحابة عظيم، فلا يقدح فيه مخالفة ابن عمر إياه لفعله - قال الشيخ: ويمكن أن يحمل فعل ابن عمر على الجمع بينهما صورة لا حقيقة، فإن الفعل يحتمل الوجوه، بخلاف جمع النبی صلی الله عليه وسلم بينهما، فقد تواترت الروايات بكونه في وقت الظهر بعد زوال الشمس معاً تواتراً بيّناً انتفى به احتمال كونه جمعاً صورة، ولم يتواتر عن ابن عمر جمعه بينهما في منزله مثل ذلك، فلا يترك العمل بالنص القطعی هناك اھ دیکھئے (ج ۱۰ ص ۱۰۱) باب التوجه إلى الموقف الخ ۱۲ مرتب عفی عنہ

[4] مثلاً: "إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا" سورہ نساء آیت ۱۰۳ پ ۵ - ۱۲ م

[5] چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں: "أخبرنا أبو حنيفة عن حماد عن إبراهيم قال: إذا صليت يوم عرفة في رحلك فصل كل واحد من الصلاتين لوقتها ولا ترتحل من منزلك حتى تفرغ من الصلاة" قال محمد: وبهذا كان يأخذ أبو حنيفة۔ کتاب الآثار (ص ۰) باب الصلوة بعرفة وجمع رقم ۴۲۳، طبع ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی - ۱۲ مرتب

مزدلفہ میں جمع تاخیر کی شرائط | مزدلفہ میں حنفیہ کے نزدیک جمع تاخیر کی درج ذیل شرائط ہیں

① احرامِ حج

② تقدیم الوقوف بعرفات۔

③ زمانِ مخصوص یعنی لیلۃ النحر۔

④ وقتِ مخصوص یعنی عشاء۔

⑤ مکانِ مخصوص یعنی مزدلفہ۔

مزدلفہ میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی امام یا نائب اور جماعت کی شرط نہیں[1]

عرفات اور مزدلفہ میں جمع بین الصلاتین کی صورت میں اذان اور اقامت کی تعداد | امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عرفات میں جمع بین الصلاتین ایک اذان اور دو اقامت کے ساتھ ہوگی، سفیانِ ثوریؒ، امام شافعیؒ اور ابو ثورؒ وغیرہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی بھی ایک ایک روایت اسی کے مطابق ہے۔

امام مالکؒ کے نزدیک عرفات کی جمع بین الصلاتین دو اذانوں اور دو اقامت کے ساتھ ہوگی۔ وروی ذلک عن ابن مسعود[2]

امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ عرفات کی جمع بین الصلاتین بغیر اذان کے دو اقامتوں کے ساتھ ہوگی۔ وروی ذلک عن ابن عمر[3]

گویا عرفات میں جمع بین الصلاتین کرنے کی صورت میں اذان واقامت کی تعداد کے بارے میں تین اقوال ہوئے۔ کما ذکرنا[4]

مزدلفہ میں جمع بین الصلاتین کی صورت میں اذان واقامت کی تعداد کے بارے میں چار اقوال مشہور ہیں۔

---

[1] چنانچہ علامہ ابن قدامہؒ مزدلفہ میں جمع بین الصلاتین کے بارے میں لکھتے ہیں: "یجمع منفرداً کما یجمع مع الامام، ولاخلاف فی ھذا"۔ المغنی (ج ۳ ص ۴۱۹) باب صفۃ الحج ۱۲ م

[2] دیکھئے صحیح بخاری (ج ۱ ص ۲۲۷) کتاب المناسک، باب من أذن وأقام لکل واحدۃ منھما ۱۲ م

[3] کذا فی معارف السنن (ج ۶ ص ۴۵۲) ۱۲ مرتب

[4] دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۴۵۲ و ۴۵۳) باب ماجاء أن عرفۃ کلھا موقف ۱۲ مرتب

① ایک اذان اور ایک اقامت۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کا مسلک یہی ہے امام شافعیؒ کا قولِ قدیم بھی یہی ہے، اور امام احمدؒ کی بھی ایک روایت اسی کے مطابق ہے مالکیہ میں سے ابن ماجشونؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

② ایک اذان اور دو اقامتیں۔ یہ امام شافعیؒ کا مسلک ہے، امام مالکؒ کا بھی ایک قول اس کے مطابق ہے، حنفیہ میں سے امام زفرؒ کا بھی یہی مسلک ہے، امام طحاویؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور شیخ ابن ہمامؒ نے بھی اسی کو راجح قرار دیا ہے۔

③ دو اذانیں اور دو اقامتیں۔ امام مالکؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

④ دو اقامتیں بغیر اذان کے۔ امام احمدؒ کا مسلکِ مشہور یہی ہے۔ امام شافعیؒ کی بھی ایک روایت اِسی کے مطابق ہے[۱]۔

دلائل عرفات میں جمع بین الصلاتین بأذان وإقامتین کے بارے میں حنفیہ کا استدلال حضرت جابرؓ کی حدیثِ طویل کے اس جملہ سے ہے "ثم أذن ثم أقام فصلّى الظهر ثم أقام فصلّى العصر[۲]"

مزدلفہ میں جمع بین الصلاتین بأذانٍ وإقامةٍ کے بارے میں حنفیہ کا استدلال سنن ابی داؤد[۳]

---

[۱] یہ تمام تفصیل معارف السنن سے ماخوذ ہے، دیکھئے (ج ۶ ص۲۵۲ و ۲۵۳) باب ماجاء أن عرفة کلها موقف۔

اس بارے میں دو مذاہب اور بھی ہیں:

(۱) صرف ایک اقامت وہ بھی پہلی نماز کے لئے۔ وهو إحدى الروايات عن ابن عمر وهو قول سفيان الثوري فيما حكاه الترمذي والخطابي وابن عبدالبر وغيرهم، وقال ابن حزم: هو قول سفيان وأحمد بن حنبل في أحد قوليهما، وبه أخذ أبو بكر بن داؤد۔

(۲) دونوں نمازوں میں نہ کوئی اذان ہے، نہ کوئی اقامت، حكاه المحب الطبري عن بعض السلف وهذا إحدى الروايات عن ابن عمر كما حكاه ابن حزم في المحلّى، تفصیل کے لئے دیکھئے اوجز المسالک (ج ۳ ص۲۸) صلاة المزدلفة، بحث الجمع بينهما بوحدة الإقامة وتكرارها ۱۲ مرتب

[۲] دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص۳۹۵) باب حجة النبي صلى الله عليه وسلم ۱۲ م

[۳] (ج ۱ ص۲۶۷) کتاب المناسك، باب الصلاة بجمع ۱۲ م

کی روایت سے ہے جس میں مروی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے مزدلفہ میں جمع بین الصلاتین باذان و اقامۃ پر عمل کیا، اسی روایت کے ایک طریق میں یہ بھی مروی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے آخر میں فرمایا: "صلیتُ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھکذا"[1]

دراصل اختلاف کی وجہ اس باب میں روایات و آثار کا اختلاف ہے بالخصوص مزدلفہ کی جمع بین الصلاتین کے بارے میں روایات بہت مختلف ہیں، فرجح کل فریق بما تحقق لدیہ[2]

اس باب میں ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ اس مسئلہ میں امام مالکؒ نے اہل مدینہ کی روایات

---

[1] یہاں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ حنفیہ نے عرفات کی جمع بین الصلوتین اور مزدلفہ کی جمع بین الصلوتین میں تفریق کس لئے کی؟ اگرچہ دونوں مقامات کی جمع بین الصلوتین کے بارے میں حنفیہ کے مسلک کی بنیاد روایات پر ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حنفیہ نے دونوں مقامات پر باذانٍ و اقامتین کا قول کیوں نہ کرلیا کما فی روایۃ جابر عند مسلم (ج ۱ ص۳۹۷ و ۳۹۸) باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ مسلم میں حضرت جابرؓ کی روایت کا دوسرا جزء حنفیہ کے مسلک کے مخالف ہے اور اس میں مزدلفہ کی جمع بین الصلاتین کے بارے میں اذان و اقامتین کا ذکر ہے لیکن مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت جابرؓ کی روایت حنفیہ کے مسلک کے مطابق مروی ہے "حدثنا حاتم بن اسمٰعیل عن جعفر بن محمد عن جابر بن عبد اللہ قال: صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المغرب والعشاء بجمع باذان واحد واقامۃ ولم یسبح بینھما" دیکھئے نصب الرایہ (ج ۳ ص۶۸) لیکن یہ روایت غریب ہے کما قال الزیلعی۔

صاحب ہدایہ نے ایک وجہ تفریق یہ ذکر کی ہے "لأن العشاء فی وقتہ فلا یفرد بالإقامۃ إعلامًا بخلاف العصر بعرفۃ لأنہ مقدم علی وقتہ فأفرد بہا لزیادۃ الإعلام" ہدایہ (ج ۱ ص۲۴۴) باب الإحرام

واضح رہے کہ امام زفرؒ مزدلفہ میں بھی جمع باذان واقامتین ہی کے قائل ہیں، صاحب ہدایہؒ نے ان کا یہی مسلک نقل کیا ہے (ہدایہ ج ۱ ص۲۴۴) گویا امام زفرؒ کا مسلک حضرت جابرؓ کی مسلم والی روایت کے مطابق ہے، جمع بمزدلفہ کو جمع بعرفہ پر قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے، امام طحاویؒ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ دیکھئے شرح معانی الآثار (ج ۱ ص۳۴۹) کتاب مناسک الحج، باب الجمع بین الصلاتین بجمع کیف ھو؟ شیخ ابن ہمامؒ کی رائے بھی یہی ہے، دیکھئے فتح القدیر (ج ۲ ص۱۷۱) باب الإحرام۔ علامہ عبدالحی لکھنویؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے دیکھئے حاشیہ ہدایہ (ج ۱ ص۲۴۴، رقم ۵) ۱۲ رشید اشرف عفی عنہ

[2] چنانچہ علامہ بنوریؒ فرماتے ہیں "وبالجملۃ الأحادیث الصحاح والآثار الصحاح متعارضۃ والقصۃ واحدۃ وتستفاد منہا صورۃ ستۃ و إلی کل ذھب ذاھب ورجح کل فریق ما تحقق لدیھم من

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کو چھوڑ کر حضرت ابن مسعودؓ[1] اور اہل کوفہ کی روایت پر عمل کیا ہے اور حنفیہ نے حضرت ابن مسعودؓ اور اہل کوفہ کی روایت کو چھوڑ کر اہل مدینہ (حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عمرؓ وغیرہ) کی روایات[2] پر عمل کیا ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرات ائمہ مجتہدین اپنے شہری تعامل سے متأثر ہونے کے بجائے شرعی دلائل پر غور وفکر کر کے اپنے فہم واجتہاد کے مطابق عمل فرماتے تھے خواہ ان کا اجتہاد اپنے اہل شہر کے تعامل کے خلاف ہو جائے۔

جہاں تک حضرت ابن مسعودؓ کے اثر کا تعلق ہے حنفیہ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ صحیح بخاری کی تصریح کے مطابق انہوں نے مغرب کی نماز پڑھ کر کھانا کھایا، بعد میں عشاء کی نماز پڑھی اور فصل کی صورت میں حنفیہ بھی اقامتین کے قائل ہیں، البتہ دو مرتبہ اذان کے قائل نہیں اور اذانین کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ ساتھی منتشر ہو گئے ہوں گے ان کو جمع کرنے کے لئے دوبارہ اذان دیدی[3]۔ واللہ اعلم

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

بحث دقیق وتفکیر عمیق حدیثاً وفقہاً، روایۃً ودرایۃً، ولکلٍّ وِجهةٌ هُوَ مُوَلِّيها، واللہ المستعان" دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص۲۵۳) باب ماجاء أن عرفة کلہا موقف۔ بالخصوص حضرت ابن عمرؓ کی روایات میں شدید اضطراب ہے کما ذکر العینی فی العمدۃ (ج ۱۰ ص۱۲) باب من جمع بینہما ولم یتطوع۔ روایات وآثارِ مختلفہ کے لئے دیکھئے شرح معانی الآثار (ج ۱ ص۳۴۷ تا ۳۴۹) باب الجمع بین الصلاتین بجمع کیف ھو۔ ومصنف ابن ابی شیبہ (ج ۴ ص ۲۹۳ و ۲۹۴) کتاب الحج، باب من قال لا یجزیہ الأذان بجمع وحدہٗ أو یؤذن أو یقیم ۱۲

[3] یعنی تعدادِ اذان واقامت للجمع بین الصلوٰتین بمزدلفۃ کا مسئلہ ۱۲م

(حاشیۂ صفحۂ ھٰذا)

[1] "حج عبد اللہ فأتینا المزدلفة حین الأذان بالعتمة أو قریبًا من ذلك فأمر رجلاً فأذّن وأقام ثم صلّی المغرب وصلّی بعدها رکعتین ثم دعا بعشائه فتعشّی ثم أمر فأذّن وأقام - قال عمرو: ولا أعلم الشك إلا من زهیر - ثم صلّی العشاء رکعتین الخ" صحیح بخاری (ج ۱ ص۲۲۷) کتاب المناسك، باب من أذّن وأقام لکل واحدة منهما ۱۲ مرتب

[2] حضرت ابن عمرؓ اور حضرت جابرؓ کی روایات اصل تقریر اور حاشیہ میں گذر چکی ہیں، نیز حافظ زیلعیؒ نے معجم طبرانی کے حوالہ سے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی روایت ذکر کی ہے "أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمع بین صلاۃ المغرب وصلاۃ العشاء بالمزدلفة بأذان واحد وإقامة واحدة" نصب الرایہ (ج ۳ ص۶۹) ۱۲م

[3] تفصیل کے لئے دیکھئے طحاوی (ج ۱ ص۳۴۸) باب الجمع بین الصلاتین بجمع کیف ھو؟ اور عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص۱۴ و ۱۵) باب من اذن و أقام لکل واحدة منهما۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

باب ما جاء من أدرك الإمام بجمع فقد أدرك الحجّ

عن عبد الرحمٰن بن يعمر أن ناسًا من أهل نجد أتوا رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو بعرفة فسألوه، فأمر مناديًا فنادى: الحج عرفة، من جاء ليلة جمع قبل طلوع الفجر فقد أدرك الحج" اس حدیث کی بنا پر امام ابو حنیفہؒ، سفیان ثوریؒ اور امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ وقوفِ عرفات کا وقت نو ذی الحجہ کے زوال سے دس ذی الحجہ کے طلوعِ فجر تک ہے[1]، اس دوران جس وقت بھی آدمی عرفات پہنچ جائے، البتہ رات کا کچھ حصہ عرفات میں گذارنا ضروری ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص غروبِ آفتاب سے پہلے عرفات سے روانہ ہو جائے تو اس پر دم واجب ہوگا اس کے برخلاف دن کا کچھ حصہ عرفات میں گذارنا اس درجہ میں ضروری نہیں چنانچہ اگر کوئی شخص غروبِ شمس کے بعد عرفات پہنچے تو اس پر دم نہیں

امام مالکؒ کے نزدیک نویں تاریخ کا دن لیلۃ النحر کے تابع ہے اور ان کے نزدیک لیلۃ النحر کے کسی حصہ میں وقوفِ عرفہ ضروری ہے لہٰذا اگر کسی شخص نے نویں تاریخ کے دن میں وقوفِ عرفہ کیا اور غروبِ آفتاب سے پہلے عرفات سے نکل گیا اور لوٹ کر نہ آیا تو اس کا حج فوت ہو گیا جس کی اس کے ذمہ میں قضا ضروری ہے، البتہ اگر کسی شخص نے نویں تاریخ کے

(بقیہ حاشیۂ صفحۂ گذشتہ)

علامہ عثمانیؒ مزدلفہ میں جمع بأذانین والی روایت کے بارے میں لکھتے ہیں: "وأما جمعُهُ بأذانين في صورة الفصل فلعل ذلك لم يثبت عنه وقد رواه زهير بالشك كما يدل عليه سياق البخاري، وأخرجه البيهقي من طريق عبد الرحمٰن بن عمرو عن زهير بالشك وقال فيه: ثم أمر قال زهير: أرى فأذن وأقام" دیکھئے اعلاء السنن (ج ۱۰ ص۱۲۴) باب إذا جمع بين المغرب والعشاء بمزدلفة بفصل ۱۲ مرتب عفی عنہ۔

(حاشیہ صفحۂ ھٰذا)

[1] الحديث أخرجه النسائي في سننه (ج ۲ ص۴۵) كتاب مناسك الحج، نهى الوقوف بعرفة۔ وأبوداؤد في سننه (ج ۱ ص۲۶۹) كتاب المناسك، باب من لم يدرك عرفة ۱۲ م

[2] ابتدائے وقت کا زوال سے ہونا حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے ثابت ہے "عن سعيد بن حسان عن ابن عمر قال: لما أن قتل الحجاج ابن الزبير أرسل إلى ابن عمر أية ساعة كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يروح في هٰذا اليوم قال إذا كان ذلك رحنا، فلما أراد ابن عمر أن يروح قال: قالوا: لم تزغ الشمس، قال: أزاغت؟ قالوا: لم تزغ، قال: فلما قالوا: قد زاغت ارتحل" سنن أبي داؤد (ج ۱ ص۲۶۵) باب الرواح إلى عرفة۔ اور لیلۃ النحر کا اس میں داخل ہونا حدیثِ باب سے ثابت ہے ۱۲ مرتب

دن میں وقوفِ عرفہ نہ کیا اور لیلۃ النحر کے کسی حصہ میں وقوفِ عرفہ کر لیا تو اس کا حج ہو گیا اگرچہ دن میں وقوفِ عرفہ کو ترک کرنے کی وجہ سے اس پر دَم واجب ہے[1]۔

امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک وقوفِ عرفہ کا وقت نویں تاریخ کی صبح صادق سے دسویں تاریخ کی صبح صادق ہے اور اس کے کسی بھی حصہ میں وقوفِ عرفہ کر لیا تو درست ہے[2]۔

باب[3] ماجاء فی تقدیم الضعفة من جمع بلیل

عن ابن عباس[4] قال : بعثنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ثقل[5] من جمع بلیل " ترجمۃ الباب میں " ضَعَفَۃ " سے مراد عورتیں، بچے، کمزور بوڑھے اور مریض ہیں[6] اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ضعفہ کے صبح صادق ہونے سے پہلے مزدلفہ سے منیٰ روانہ ہونے میں کوئی حرج نہیں۔

ترجمۃ الباب کے ساتھ حدیث کی مناسبت ظاہر ہے اس لئے کہ وہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر ان جملہ ضعفاء میں سے تھے[7] جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رات ہی کو مزدلفہ سے منیٰ روانہ کر دیا تھا۔

---

[1] حدیثِ باب سے امام مالکؒ کے مسلک پر بھی استدلال کیا جا سکتا ہے لیکن عروہ بن مضرس طائیؓ کی روایت ان کے خلاف حجت ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں "من أدرك معنا هٰذه الصلوٰة وأتى عرفات قبل ذلك ليلاً أو نهارًا فقد تم حجه وقضى تفثه" سنن أبی داود (ج ۱ ص۲۶۹) باب من لم یدرك عرفة ۱۲ مرتب

[2] مذاہب کی تفصیل کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص۳) باب الوقوف بعرفة ۱۲ م

[3] شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲

[4] الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحه (ج ۱ ص۲۲۷) باب من قدم ضعفة أهله بلیل الخ۔ ومسلم فی صحیحه (ج ۱ ص۴۱۸) باب استحباب تقدیم الضعفة من النساء وغیرهن الخ۔ والنسائی فی سننه (ج ۲ ص۴۲) تقدیم النساء والصبیان إلى منازلهم۔ وأبوداؤد فی سننه (ج ۱ ص۲۶۵) باب التعجیل من جمع۔ وابن ماجة فی سننه (ص۲۱۶) باب من تقدم من جمع لرمی الجمار ۱۲ م

[5] بفتحتین، متاع المسافر وما يحمله على دوابه۔ مجمع بحار الأنوار (ج ۱ ص۲۹۱) بحوالۂ نہایہ ۱۲ م

[6] کما قال العینی فی العمدة (ج ۱۰ ص۱۵) باب من قدم ضعفة أهله ۱۲ م

[7] اس لئے کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر حضرت ابن عباسؓ عمر کے اعتبار سے چھوٹے تھے اور اس وقت (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہاں دو چیزیں ہیں، (۱) مبیتِ مزدلفہ (یعنی مزدلفہ میں دس ذی الحجہ کی رات گزارنا) (۲) وقوفِ مزدلفہ (یعنی دس ذی الحجہ کی طلوعِ صبح صادق سے طلوعِ شمس کے درمیانی وقت میں مزدلفہ میں ٹھہرنا)۔

"وقوفِ مزدلفہ" جمہور کے ہاں رکنِ حج تو نہیں البتہ اس کے چھوڑنے پر دم واجب ہے، امام مجاہد، امام قتادہ، امام زہری، سفیان ثوری، امام احمد، امام اسحاق اور ابوثور رحمہم اللہ کا یہی قول ہے، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے کہ بلاعذر "وقوفِ مزدلفہ" چھوڑنے پر دم واجب ہوتا ہے جبکہ امام علقمہ اور ابراہیم نخعی رحمہما اللہ کے ہاں یہ رکنِ حج ہے اور اس کے چھوٹ جانے سے حج ہی فوت ہو جائے گا۔

اور "مبیتِ مزدلفہ" احناف کے ہاں "سنتِ مؤکدہ" ہے، اس کے ترک پر دم واجب نہیں اور امام شافعی، قتادہ، زہری اور عطاء رحمہم اللہ کے ہاں اس کے چھوڑنے سے دم لازم ہے، جبکہ علقمہ، شعبی اور نخعی رحمہم اللہ کے ہاں یہ رکن ہے اور اس کے چھوٹ جانے سے حج ہی فوت ہو جائے گا۔ (مسئلہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے: تکملہ فتح الملہم ۲/۱۵۸-۱۵۹، کتاب الحج، باب استحباب تقدیم الضعفة الخ مطبوعہ دارالقلم، دمشق)۔

امام مالک کے نزدیک مبیت مزدلفہ سنت ہے، امام شافعیؒ کی دوسری روایت بھی اسی کے مطابق ہے، امام مالکؒ سے یہ بھی منقول ہے کہ نزول بالمزدلفہ واجب ہے، اور مبیت بالمزدلفہ اور وقوف مع الامام بالمزدلفہ دونوں سنت ہیں۔

اہلِ ظاہر کا مذہب یہ ہے کہ من لم یدرک مع الامام صلاة الصبح بالمزدلفة بطل حجة بخلاف النساء والصبیان والضعفاء [1]. واللہ أعلم

باب [2] بلا ترجمہ [3]

عن جابر قال: كان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یرمی یوم النحر ضحیً [4]، یوم النحر میں جمرۂ عقبہ کی رمی کے تین اوقات ہیں:

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) ان کی عمر تقریباً تیرہ (۱۳) سال تھی، تفصیل کے لئے دیکھئے سیر اعلام النبلاء (ج:۳ص:۳۳۲ وما بعدہ) عبداللہ بن عباس البحر رقم ۵۱ من صغار الصحابة ۱۲ مرتب

(۱) راجع لتفصیل المذاهب ولفوائد اخرىٰ "العمدة" للعینی (ج:۱۰ص:۱۶، ۱۷) باب من قدم ضعفة أهله بلیل ۱۲ مرتب۔

(۲) شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲

(۳) ہندوپاک کے مطبوعہ نسخوں میں یہ باب اسی طرح بلا ترجمہ مذکور ہے، البتہ داراحیاء التراث العربی بیروت کے مطبوعہ نسخہ میں اس باب کے ساتھ یہ ترجمہ مذکور "باب ماجاء فی رمی یوم النحر ضحیً" دیکھئے (ج:۳ص:۲۴۱، رقم الباب ۵۹) بتحقیق الشیخ محمد فؤاد عبدالباقی۔ ۱۲ مرتب

(۴) الحدیث أخرجه أبوداؤد فی سننه (ج:۱ص:۲۷۱) باب فی رمی الجمار ۱۲م

(۱) وقتِ مسنون : طلوعِ شمس کے بعد زوالِ شمس سے پہلے[1]۔
(۲) وقتِ مباح : زوالِ شمس سے غروبِ شمس تک ۔
(۳) وقتِ مکروہ : یوم النحر گذرنے کے بعد گیارہ ذی الحجہ کی رات ۔

---

[1] واضح رہے کہ حنفیہ کے نزدیک یوم النحر میں طلوعِ شمس سے رمی کا وقتِ مسنون شروع ہوتا ہے (اس میں بھی افضل وقت ہے جب سورج اچھی طرح چمکنے لگے چنانچہ حدیثِ باب میں "ضحیٰ" کے الفاظ بھی اس پر دال ہیں) جبکہ رمی کا وقتِ جواز طلوعِ صبحِ صادق ہی سے شروع ہو جاتا ہے، شیخ ابن ہمامؒ لکھتے ہیں: "وفی النہایة نقلاً من مبسوط شیخ الإسلام أن ما بعد طلوع الفجر من یوم النحر وقت الجواز مع الإساءة، وما بعد طلوع الشمس إلی الزوال وقت مسنون، وما بعد الزوال إلی الغروب وقت الجواز بلا إساءة، واللیل وقت الجواز مع الإساءة" فتح القدیر (ج ۲ ص۱۸۶) تحت قول صاحب الہدایة "لما روی أن النبی علیه الصلاة والسلام رخص للرعاء أن یرموا لیلاً"

امام شافعیؒ کے نزدیک لیلۃ النحر کے نصفِ اخیر میں بھی رمی جائز ہے جبکہ حنفیہ کے نزدیک اگر فجر سے پہلے رمی کرلی تو اس کا اعادہ ضروری ہے۔ دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص۸۵ و ۸۶) باب رمی الجمار۔ فتح الباری (ج ۳ ص۴۲۲) باب من قدّم ضعفة أهله بلیل۔

پچھلے باب میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت "أن النبی صلی اللہ علیه وسلم قدّم ضعفة أهله وقال: لا ترموا الجمرة حتی تطلع الشمس" امام شافعیؒ کے خلاف حجت ہے۔

جہاں تک صبحِ صادق کے بعد جوازِ رمی کا تعلق ہے طحاوی میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ثابت ہے "أن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بعثه فی الثقل وقال: لا ترموا الجمار حتی تصبحوا" (ج ۱ ص۳۵) باب وقت رمی جمرة العقبة الخ گویا اس روایت سے وقتِ جواز کا پتہ چلتا ہے اور پچھلے باب والی روایت سے وقتِ مسنون کا، صاحبِ ہدایہ نے حنفیہ کے مسلک پر اسی طرح استدلال کیا ہے، دیکھئے ہدایہ (ج ۱ ص۲۵۲ و ۲۵۳)

امام شافعیؒ کا استدلال حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ہے، "أن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم رخص للرعاء أن یرموا لیلاً" "عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده" کی روایت سے بھی ان کا استدلال ہے "أن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم رخص للرعاء أن یرموا باللیل وأیّة ساعة شاء وا من النهار" حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بھی ان کا استدلال ہے "أن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پھر امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر کسی شخص نے یوم النحر میں جمرۂ عقبہ کی رمی نہیں کی یہانتک
کہ رات ہوگئی تو وقت کے مکروہ ہونے کے باوجود اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ رات ہی کو
رمی کرے اور اس پر دم نہیں۔ سفیان ثوریؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وہ رات کو رمی نہیں
کریگا اور اس کے اوپر دم ہے، اور اگر کسی شخص نے نہ یوم النحر میں رمی کی اور نہ ہی گیارہ تاریخ
کی رات کو، یہانتک کہ صبح ہوگئی تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایسے آدمی کے لئے ضروری ہے کہ وہ
رمی بھی کرے اور دم بھی دے، جبکہ امام ابو یوسفؒ اور سفیان ثوریؒ کے نزدیک جب رات کو
رمی کرنے کی اجازت نہیں تو دن میں بطریقِ اولیٰ رمی نہیں کریگا بلکہ دم ہی دیگا۔

و أما بعد ذلك فبعد زوال الشمس " یوم النحر کے بعد کے ایام کی رمی بالاتفاق
زوالِ شمس کے بعد ہے، البتہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ تیرھویں تاریخ کی رمی زوال سے پہلے بھی
استحساناً درست ہے، لہٰذا ان کے نزدیک اگر کسی شخص نے گیارھویں اور بارھویں تاریخ کی رمی زوال
سے پہلے کرلی تو اس کا اعادہ ضروری ہے[1]، البتہ تیرھویں تاریخ کو زوال سے پہلے رمی کرنے کی
صورت میں اعادہ نہیں۔

حضرت عطاءؒ اور طاؤسؒ کا مسلک یہ ہے کہ گیارہ، بارہ اور تیرہ تینوں تاریخوں میں رمی قبل
الزوال درست ہے اور کسی بھی دن اعادہ نہیں۔

پھر اس پر امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ، امام شافعیؒ اور ابو ثورؒ کا اتفاق ہے
کہ ایامِ تشریق کے ختم ہونے کے بعد رمی نہیں لہٰذا اگر کسی شخص نے ایامِ تشریق میں رمی نہیں کی اور

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

رخص لرعاء الإبل أن یرموا باللیل"۔

لیکن یہ تمام روایات ضعیف ہیں، ان کے حوالوں اور ان کے رواۃ پر بحث کے لئے دیکھئے نصب الرایۃ (ج ۳ ص۸۵-۸۶)، الدرایہ
(ج ۲ ص۲۹ و ۲۹) رقم ۴۷۲، اور مجمع الزوائد (ج ۳ ص۲۶۱) باب رمی الرعاء باللیل۔ اس کے علاوہ ان روایات
میں یہ بھی امکان ہے کہ یہ لیلۃ النحر سے متعلق نہ ہوں بلکہ اگلی آنے والی راتوں سے متعلق ہوں، کما قال صاحب الھدایۃ، اور اگر
بالفرض لیلۃ النحر ہی سے متعلق ہوں، تب بھی یہ حکم رعاء کے ساتھ خاص ہوگا، اور دوسروں کو ان پر قیاس کرنا درست
نہ ہوگا " لأن ثبوت الرمی بخلاف القیاس " دیکھئے ہدایہ و حاشیہ ہدایہ (ج ۱ ص۲۵۳) ۱۲ مرتب عفی عنہ

(حاشیہ صفحہ ھٰذا)

[1] البتہ امام ابو حنیفہؒ سے حسن بن زیاد کی ایک ضعیف روایت یہ ہے کہ زوال سے پہلے بھی رمی جائز ہے (کما فی
فتح القدیر و العنایۃ - ج ۲ ص۱۸۵ -) لیکن یہ ضعیف روایت مفتیٰ بہ نہیں، لہٰذا اس میں تساہل نہ برتنا چاہیئے
از استاذ محترم دام اقبالہم

تیرھویں تاریخ کا سورج بھی غروب ہوگیا تو رمی فوت ہوگئی اب اس کا اعادہ نہیں بلکہ دم دینا واجب ہے[1]۔

بَاب مَاجَاء أنّ الإفاضة مِن جمع قبل طلوع الشمس

عن أبي إسحٰق[2] قال: سمعت عمرو بن ميمون يحدّث يقول: كنّا وقوفاً بجمع فقال عمر بن الخطّاب: إن المشركين كانوا لا يفيضون حتى تطلع الشمس، وكانوا يقولون: أشرق ثبير[3]، وإنّ رسول الله صلى الله عليه وسلم خالفهم، فأفاض عمر قبل طلوع الشمس"، یعنی اہل جاہلیت طلوعِ شمس کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے اور چونکہ طلوعِ آفتاب کی علامت یہ تھی کہ ثبیر نامی پہاڑ چمکنے لگتا تھا اس لئے وہ کہتے تھے " أشرِق ثبیر" یعنی اے جبل ثبیر! چمک اٹھو، اور سنن ابن ماجہ[4] میں یہ الفاظ مروی ہیں " اشرق ثبیر، کیما نغیر" اے جبلِ ثبیر! چمک اٹھ تاکہ ہم یلغار کریں یعنی منٰی کو روانہ ہوجائیں۔

جمہور یعنی امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ امام احمدؒ کے نزدیک مزدلفہ سے اسفار کے بعد طلوعِ شمس سے پہلے روانہ ہونا چاہئے البتہ امام مالکؒ کے نزدیک اسفار سے بھی پہلے روانگی مستحب ہے[5]۔

طلوعِ شمس سے پہلے روانہ ہونا تو حدیثِ باب سے ثابت ہے اور اسفار حضرت جابرؓ کی حدیثِ طویل[6] کے اس جملہ سے "فلم یزل واقفاً حتی أسفر جدّاً" جو امام مالکؒ کے خلاف حجت ہے۔

واللہ اعلم

---

[1] اس باب سے متعلقہ تمام تفصیل عمدۃ القاری سے ماخوذ ہے، دیکھئے (ج ۱۰ ص۸۵ و۸۶) باب رمی الجمار ۱۲م

[2] الحديث أخرجه البخاری فی صحيحه (ج ۱ ص۲۲۸) باب متی يدفع من جمع ـ والنسائی فی سننه (ج ۲ ص۴۷) وقت الإفاضة من جمع ۱۲ م

[3] بفتح الثلثة وكسر الباء الموحّدة وسكون الياء آخر الحروف فی آخره راء، جبل بالمزدلفة على يسار الذاهب إلى منى، وقيل: هو أعظم جبال مكّة باسم رجل من هذيل اسمه ثبير، وهناك جبال أخر اسم كل منها ثبير" كذا فی معارف السّنن (ج ۶ ص۴۷۱) ۱۲م

[4] (ص۲۱۷) باب الوقوف بجمع ۱۲ م

[5] كذا فی المعارف (ج ۶ ص۴۷۱) ۱۲ م

[6] صحیح مسلم (ج ۱ ص۳۹۹) باب حجة النبی صلى الله عليه وسلم ۱۲ م

باب[1] کیف ترمی الجمار

عن[2] عبد الرحمٰن بن یزید قال: لما أتی عبد اللہ جمرۃ العقبۃ استبطن الوادی واستقبل القبلۃ وجعل یرمی الجمرۃ علی حاجبہ الأیمن، ثم رمی بسبع حصیات، یکبر مع کل حصاۃ، ثم قال: واللہ الذی لا إلٰہ إلا ھو! من ھٰھنا رمی الذی أنزلت علیہ سورۃ البقرۃ" اس پر اتفاق ہے کہ تمام جمرات کی رمی کسی بھی جانب سے کسی بھی کیفیت کے ساتھ کیجا سکتی ہے، پھر اس پر بھی اتفاق ہے کہ جمرۂ اولیٰ اور جمرۂ وسطیٰ کی رمی کے وقت استقبالِ قبلہ مستحب ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیثِ باب میں جمرۂ عقبہ کی رمی میں بھی استقبالِ قبلہ کا ذکر ہے، لیکن صحیحین[3] میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اسی واقعہ میں "جعل البیت عن یسارہ ومنیٰ عن یمینہ" کے الفاظ مذکور ہیں، چنانچہ جمہور کا مسلک صحیحین ہی کی روایت کے مطابق ہے کہ جمرۂ کبریٰ کی رمی کے وقت جمرہ کا استقبال کرتے ہوئے اس ہیئت سے کھڑا ہونا چاہئے کہ بیت اللہ بائیں جانب ہو اور منیٰ دائیں جانب۔

جہاں تک حدیثِ باب کا تعلق ہے سو اُسے اگرچہ امام ترمذیؒ نے "حسن صحیح" کہا ہے لیکن حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری[4] میں صحیحین ہی کی روایت کو صحیح قرار دیا ہے اور ترمذیؒ کی روایت کے بارے میں وہ فرماتے ہیں "وھذا شاذ، فی إسنادہ المسعودی[5] وقد اختلط"

واللہ أعلم[6]۔ شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ

---

[1] شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲

[2] الحدیث أخرجہ ابن ماجہ فی سننہ (ص۲۱۸و۲۱۹) باب من أین ترمی جمرۃ العقبۃ ۱۲ م

[3] دیکھئے صحیح بخاری (ج۱ ص۲۳۵) باب رمی الجمار بسبع حصیات، و باب من رمی جمرۃ العقبۃ وجعل البیت عن یسارہ۔ اور صحیح مسلم (ج۱ ص۴۱۹) باب من رمی جمرۃ العقبۃ من بطن الوادی وتکون مکۃ عن یسارہ ۱۲ م

[4] فتح الباری (ج ۳ ص۴۵۸) باب یکبر مع کل حصاۃ ۱۲ م

[5] ھو عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بن عتبۃ بن مسعود الکوفی، المسعودی، صدوق، اختلط قبل موتہ، وضابطہ أن من سمع منہ ببغداد فبعد الاختلاط، "من السابعۃ" تقریب التہذیب (ج۱ ص۴۸۷، رقم ۱۰۰۸) ۱۲ مرتب

[6] شرح باب متعلقہ تفصیل کے لئے دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص۴۷۶ و ۴۷۷) ۱۲ مرتب

باب ماجاء فی إشعار البدن

عن ابن عباس[1] أن النبی صلی الله علیه وسلم قلّد نعلین وأشعر الهدی فی الشق الأیمن بذی الحلیفة وأماط عنه الدم " تقلید بالاتفاق سنت ہے[2]، اور قلادہ ڈالنے سے مقصود یہ ہے کہ لوگ سمجھ جائیں کہ یہ ہدیِ حرم ہے اس کا دستور زمانۂ جاہلیت سے چلا آتا تھا، کیونکہ اہل عرب میں ویسے تو قتل وغارت گری کا بازار گرم رہتا تھا لیکن جس جانور کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ہدیِ حرم ہے اس کو ڈاکو بھی نہیں لوٹتے تھے[3]۔

اسی علامت کا دوسرا طریقہ اشعار تھا جس کی صورت یہ ہے کہ اونٹ کی داہنی کروٹ میں نیزے سے ایک زخم لگا دیا جاتا ہے[4]، یہ طریقہ حدیثِ باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

---

[1] الحدیث أخرجه مسلم فی صحیحه (ج ۱ ص ۴۰۷) باب إشعار البدن وتقلیده عند الإحرام وأبوداؤد فی سننه (ج ۱ ص ۲۴۳) باب الإشعار ۱۲ م

[2] علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: " وهو سنة بالإجماع وهو تعلیق نعل أو جلد لیکون علامة الهدی، وقال أصحابنا: لو قلّد بعروة مزادة أو لحی شجرة أو شبه ذلك جاز لحصول العلامة، وذهب الشافعی والثوری إلی أنها تقلد بنعلین، وهو قول ابن عمر، وقال الزهری ومالك: یجزئ واحدة، وعن الثوری: یجزئ فم القربة، ونعلان أفضل لمن وجدها " عمدة القاری (ج ۱۰ ص ۳۶) باب من أشعر وقلد بذی الحلیفة ثم أحرم ۱۲ مرتب

[3] تفصیل کے لئے دیکھئے حاشیۂ نصب الرایہ (ج ۳ ص ۱۱۸ باب التمتع) بحوالۂ شرح توربشتی علی المصابیح تقلید اور اشعار میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ بعض اوقات ہدی راستہ میں ہلاک ہونے لگتی ہے تو اس کو نحر کر دیا جاتا ہے، ایسی صورت میں اگر اس پر کوئی علامت ہوگی تو مساکین اس کو پہچان لیں گے اور اس کا گوشت استعمال کریں گے، اس کے علاوہ ایسے بدنہ وغیرہ کو پہچاننے کے بعد وہ اگر اس کا گوشت لینا چاہیں گے تو اس کے پیچھے پیچھے منحر تک آکر گوشت حاصل کر سکیں گے، تفصیل کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص ۳۶) باب من أشعر وقلد الخ ۱۲ م

[4] صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں: " قالوا: والأشبه هو الأیسر لأن النبی صلی الله علیه وسلم طعن فی جانب الیسار مقصودًا وفی جانب الأیمن اتفاقًا " تفصیل کے لئے دیکھئے فتح القدیر اور عنایہ (ج ۲ ص ۲۱۳) باب التمتع ۱۲ مرتب

ثابت ہے چنانچہ اِشعار جمہور کے نزدیک سنّت ہے[۱]۔

البتہ امام ابوحنیفہؒ کی طرف یہ منسوب ہے کہ انہوں نے اشعار کو مکروہ کہا ہے[۲]، اسی بنا پر اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ پر بہت تشنیع کی گئی ہے[۳]۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی طرف اس قول کی نسبت مشکوک ہے۔ چنانچہ امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ نہ اصلِ اشعار کو مکروہ کہتے ہیں اور نہ اس کے سنت ہونے کا انکار کرتے ہیں البتہ اس نسبت کی حقیقت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے زمانہ میں لوگ اشعار کرنے میں بہت زیادہ مبالغہ کرنے لگے تھے اور اشعار میں کھال کے ساتھ ساتھ گوشت بھی کاٹ ڈالتے تھے اور گہرے زخم لگا دیتے تھے جس سے جانوروں کو ناقابلِ برداشت تکلیف ہوتی تھی اور اس جانور کے مرنے کا خطرہ ہوتا تھا اس لئے انہوں نے سدّاً للباب اِشعار سے روکا، فإنّ الناس لا یراعون الحدّ فی ذلك، ورنہ ان کا مقصود نفسِ اشعار سے روکنا نہ تھا بلکہ مبالغہ فی الاشعار سے روکنا تھا[۴]۔

---

[۱] حاشیہ نصب الرایہ (ج ۳ ص۱۱۲)

پھر اشعار کے بارے میں بحث ہے کہ یہ ابل کے ساتھ مختص ہے یا نہیں؟ حضرت سعید بن جبیرؒ کے نزدیک یہ ابل کے ساتھ مخصوص ہے، چنانچہ ان کے نزدیک غنم و بقرہ کسی کا بھی اشعار نہیں، شعبیؒ اور ابوثورؒ کے نزدیک بقرہ کی جہاں تقلید درست ہے وہاں اشعار بھی درست ہے، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ کے بارے میں بھی منقول ہے کہ وہ بقرہ کے کوہان میں اشعار کرتے تھے، امام مالکؒ کے نزدیک وہ بقرہ جس کا کوہان ہو اس کا اشعار کیا جائے گا اور جس کا کوہان نہ ہو اس کا اشعار نہیں کیا جائے گا۔ مختصر یہ کہ، ابل کے اشعار اور غنم کے عدمِ اشعار پر اتفاق ہے جبکہ بقرہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص۳۳) باب من أشعر وقلّد الخ ۱۲ مرتب

[۲] چنانچہ صاحب ہدایہ مختصر القدوری کی اس عبارت "ولا یشعر عند أبی حنیفة" کے تحت لکھتے ہیں: "ویکرہ" ہدایہ (ج ۱ ص۲۶۲) باب التمتع ۱۲ مرتب

[۳] علامہ عینیؒ لکھتے ہیں: "وقال ابن حزم فی المحلی: قال أبوحنیفة: أکرہ الإشعار، وھو مثلة" وقال: (أی ابن حزم) ھذہ طامّة من طوامّ العالم أن یکون مثلة شئ فعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، أفّ لکل عقل یتعقب حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ویلزمہ أن تکون الحجامة وفتح العرق مثلة، فیمنع من ذلك، وھذہ قولة لا نعلم لأبی حنیفة فیھا متقدم من السلف ولا موافق من فقہاء عصرہ إلا من ابتلاہ اللہ تعالیٰ بتقلیدہ" عمدہ القاری (ج ۱۰ ص۳۵) باب من أشعر وقلّد الخ ۱۲ مرتب

[۴] تفصیل کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص۳۵) باب من أشعر وقلّد الخ۔ از فتح الباری (ج ۳ ص۴۳۵) باب إشعار البدن ۱۲ مرتب

حقیقت یہ ہے کہ امام طحاویؒ ہی کی بات راجح ہے اور وہ اعلم الناس بمذہبِ ابی حنیفہ ہیں[1]
اس کے علاوہ اگر امام ابوحنیفہؒ سے اس قسم کا کوئی قول مروی ہے تو اس کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اشعار کے مقابلہ میں تقلیدِ نعلین افضل ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے بدنوں کا سوق فرمایا ہے ان میں سے صرف ایک کا آپ نے اشعار فرمایا تھا باقی سب میں تقلید کی صورت پر عمل کیا تھا[2]

اور اگر بالفرض یہ ثابت بھی ہو جائے کہ امام صاحبؒ نفسِ اِشعار کو مکروہ سمجھتے تھے تب بھی یہ ان کا اجتہاد ہے جو رائے پر نہیں بلکہ احادیث النہی عن المثلۃ اور احادیث النہی عن تعذیب الحیوان پر مبنی ہے[3]، گویا وہ احادیثِ اِشعار کو ان سے منسوخ مانتے ہیں[4] اور اس قسم کے اجتہادات ہر مجتہد کے ہاں

---

[1] چنانچہ علامہ عینیؒ اس مقام پر امام طحاویؒ کے بارے میں لکھتے ہیں: "ھو أعلم الناس بمذاھب الفقہاء ولاسیّما بمذھب أبی حنیفۃ" عمدہ (ج ۱۰ ص۳۵) باب من أشعر و قلّد الخ۔

نیز حافظ ابن حجرؒ بھی لکھتے ہیں: "ویتعین الرجوع إلی ما قال الطحاوی، فإنہ أعلم من غیرہ بأقوال أصحابہ" فتح الباری (ج ۳ ص۴۲۵) باب إشعار البدن

علامہ عینی اور حافظ ابن حجر شافعی رحمہما اللہ کے امام طحاویؒ کی بات کو ترجیح دینے کے بعد صاحب تحفۃ الاحوذی کی اس بات میں کوئی وزن نہیں رہتا کہ "و أمّا العذر الذی ذکرہ الطحاوی وغیرہ فھو عندی بارد" دیکھئے (ج ۲ ص۱۰۰، باب ماجاء فی إشعار البدن) بالخصوص جبکہ ان کی بات بلا دلیل بھی ہے ۱۲ مرتب عفی عنہ

[2] کذا قال الحافظ الإمام فضل اللہ التوربشتی الحنفی فی شرحہ علی المصابیح۔ اُنظر للتفصیل حاشیۃ نصب الرایۃ (ج ۳ ص۱۱۱) باب التمتع ۱۲ مرتب

[3] دونوں قسم کی احادیث کے لئے دیکھئے صحیح بخاری (ج ۲ ص۸۲۸ و ۸۲۹) کتاب الذبائح والصید والتسمیۃ، باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ ــ اور سنن ابی داؤد (ج ۲ ص۳۹) کتاب الضحایا، باب فی المبالغۃ فی الذبح، اور نصب الرایہ (ج ۳ ص۱۱۸ تا ۱۲۰) باب التمتع ۱۲ مرتب

[4] لیکن علامہ سہیلیؒ "الروض الأنف" میں لکھتے ہیں: "النھی عن المثلۃ کان بإثر غزوۃ أحد، فحدیث الإشعار فی حجۃ الوداع، فکیف یکون الناسخ متقدما علی المنسوخ" لہذا راجح یہ ہے کہ احادیثِ اِشعار احادیث نہی عن المثلۃ کے ساتھ معارض ہیں، وإذا وقع التعارض فالترجیح للمحرم، علامہ زیلعیؒ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے نصب الرایہ (ج ۳ ص۱۱۱) ۱۲ مرتب عفی عنہ

ملتے ہیں اور محض ان کی وجہ سے کسی مجتہد کو موجبِ طعن نہیں بنایا جاسکتا۔

واضح رہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے ایسی روایات مروی ہیں جن سے تخییر بین الاشعار وترکہ کا پتہ چلتا ہے[1]، گویا ان دونوں حضرات کے نزدیک اشعار نہ سنت ہے اور نہ ہی مستحب بلکہ مباح ہے جس سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ان کے قریب قریب ہے۔

قال (أبو عيسى) سمعتُ يوسف بن عيسى يقول: سمعتُ وكيعاً يقول حين روى هذا الحديث فقال: لا تنظروا إلى قول أهل الرأى فى هذا، فإن الإشعار سنة وقولهم بدعة قال سمعت أبا السائب يقول: كنا عند وكيع، فقال لرجل عنده ممن ينظر فى الرأى: أشعر رسول الله صلى الله عليه وسلم، ويقول أبو حنيفة: هو مثلة، قال الرجل: فإنه قد رُوِىَ عن إبراهيم النخعى أنه قال: الإشعار مثلة، قال: فرأيت وكيعاً غضب غضباً شديداً وقال: أقول لك: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم، وتقول: قال إبراهيم! ما أحقك بأن تُحبس ثم لا تخرج حتى تنزع عن قولك هذا" یہاں امام ترمذیؒ یہ نقل کر رہے ہیں کہ حضرت وکیعؒ نے اصحاب الرأی میں سے ایک آدمی کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشعار کرنے کا ذکر کیا، اور "يقول ابو حنيفة هو مثلة" کہہ کر امام ابوحنیفہ کے قول پر حیرت کا اظہار فرمایا اس پر اس آدمی نے کہا کہ ابراہیم نخعیؒ سے بھی ایسا ہی منقول ہے، حضرت وکیعؒ نے یہ سنا تو سخت غیض وغضب اور ناراضگی کا اظہار فرمایا، واضح رہے کہ سنن ترمذی میں یہ واحد مقام ہے جہاں امام ابوحنیفہؒ کا صراحۃً تذکرہ آیا ہے۔

صاحبِ تحفۃ الاحوذی نے مذکورہ واقعہ کو بنیاد بنا کر کہا ہے کہ حضرت وکیعؒ امام ابوحنیفہؒ کے مقلد نہیں تھے بلکہ ان سے شدید اختلاف رکھتے تھے[2]۔

---

[1] حضرت عائشہؓ کی روایت اس طرح ہے "عن الأسود عن عائشة أنها أرسل إليها أتشعر؟ - يعنى البدنة - فقالت: إن شئت، إنما تشعر لتعلم أنها بدنة"

اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت اس طرح ہے "عن عطاء عن ابن عباس قال: إن شئت فأشعر الهدى وإن شئت فلا تشعر"

دونوں روایات کے لئے دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ (ج ۴ ص ۱۶۱ و ۱۶۲) فى الإشعار أواجب هو أم لا؟ رقم الحدیث ۱۲۶۴ و ۱۲۶۹ (طبع: ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی ۵)

مذکورہ دونوں روایات کی سند جید ہے، کما قال العینی فی العمدۃ (ج ۱۰ ص ۳۵) باب من أشعر وقلد ۱۲ مرتب عفی عنہ

[2] چنانچہ وہ لکھتے ہیں: فأنكر وكيع بهذين القولين عليه وعلى أصحابه إنكاراً شديداً ورد عليه رداً بليغاً، وظهر من هذين القولين أن وكيعاً لم يكن حنفياً مقلداً للإمام أبى حنيفة فإنه لو كان حنفياً لم ينكر عليه هذا الانكار البتة، فبطل قول صاحب العرف الشذى أن وكيعاً كان حنفياً" تحفۃ الاحوذی (ج ۲ ص ۱۰۱) باب ما جاء فى إشعار البدن ۱۲ م

اس کا جواب یہ ہے کہ حافظ ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ[1] میں، حافظ مزیؒ نے تہذیب الکمال[2] میں اور حافظ زبیدیؒ نے عقود الجواہر المنیفہ[3] میں نقل کیا ہے کہ حضرت وکیعؒ امام ابوحنیفہؒ کے قول پر فتویٰ دیا کرتے تھے[4] اور ان کے شاگرد تھے[5] لہٰذا جن حضرات نے ان کو حنفی قرار دیا ہے ان کا قول

---

[1] کما نقل الشیخ البنوری فی معارف السنن (ج ۶ ص ۲۹۳) ۱۲ م

[2] (ج ۳ ص ۱۴۶۵) من اسمہ وکیع، ترجمۃ وکیع بن الجراح (نسخۃ مصورۃ عن النسخۃ الخطیۃ المحفوظۃ بدار الکتب المصریۃ) ۱۲ مرتب

[3] دیکھئے (ج ۱ ص ۵) فی مقدمۃ المؤلف ۱۲ م

[4] نیز دیکھئے سیر أعلام النبلاء للذہبی (ج ۹ ص ۱۴۴) ترجمۃ وکیع بن الجراح رقم ۴۸ـ اور تہذیب التہذیب (ج ۱۱ ص ۱۲۶) ترجمۃ وکیع بن الجراح ۱۲ مرتب

[5] دیکھئے تاریخ بغداد (ج ۱۳ ص ۳۲۴) ترجمۃ النعمان بن ثابت رقم ۷۲۹۷ـ اور سیر أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۳۹۴) ترجمۃ أبی حنیفۃ، رقم ۱۶۳

واضح رہے کہ صاحب تحفۃ الاحوذی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ حافظ ذہبیؒ نے یحیی بن معینؒ کا وکیعؒ بن الجراح کے بارے میں یہ قول نقل کیا ہے: "ما رأیت أفضل منہ۔ یعنی من وکیع۔ یقوم اللیل ویسرد الصوم ویفتی بقول أبی حنیفۃ" لیکن وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ "ویفتی بقول أبی حنیفۃ" کا قول اپنے عموم پر نہیں ہے بلکہ یہ خصوص پر محمول ہے، اور اس سے مراد یہ ہے کہ وکیع نبیذ تمر کے مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے چنانچہ وہ نبیذ تمر کے جواز کے قائل تھے اور خود بھی پیتے تھے۔ اس سلسلہ میں علامہ مبارکپوریؒ کا استدلال حافظ ذہبیؒ کے اس قول سے ہے "ما فیہ (أی فی وکیع) إلا شربہ نبیذ الکوفیین" گویا صرف اسی بات کی وجہ سے ان کے بارے میں "یفتی بقول أبی حنیفۃ" کہا گیا۔ دیکھئے تحفۃ الاحوذی (ج ۲ ص ۱۰۰)

اس کا جواب یہ ہے کہ علامہ مبارک پوری کی یہ تاویل بارد اور تکلف محض ہے، ورنہ یحیی بن معینؒ کے کلام کا سیاق صاف بتلا رہا ہے کہ "یفتی بقول أبی حنیفۃ" اپنے عموم پر ہے، جہاں تک حافظ ذہبیؒ کے کلام سے استدلال کا تعلق ہے وہ بھی درست نہیں اس لئے کہ حافظ ذہبیؒ کا مقصود یحیی بن معین کے کلام کی تفسیر کرنا نہیں ہے بلکہ صرف یہ بتلانا ہے کہ حضرت وکیعؒ میں دینی اعتبار سے کسی قسم کی کمزوری نہیں پائی جاتی تھی بجز اس کے کہ وہ شرب نبیذ تمر کے قائل تھے (اور یہ کمزوری بھی حافظ ذہبیؒ کے مسلک کے مطابق ہے نہ کہ حضرت وکیعؒ کے) اس کے علاوہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وکیع بن الجراحؒ تو خود کوفی ہیں اور کوفیین سب جواز نبیذ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بے بنیاد نہیں ہے، البتہ ایک عام آدمی کی تقلید میں اور ایک متبحر عالم کی تقلید میں فرق ہوتا ہے وہ یہ کہ متبحر عالم بعض اوقات اپنے دلائل کی بنا پر امام سے اختلاف بھی کرتا ہے لیکن یہ اختلاف اس امام سے اس کے منتسب ہونے پر اثر انداز نہیں ہوتا جیسا کہ امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ اور امام زفرؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے بہت سے مسائل میں اختلاف کیا ہے، اس کے باوجود سب انہیں حنفی کہتے ہیں[۱]

رہا حضرت وکیعؒ کا اس مسئلہ میں غضبناک ہونا سو وہ غیظ امام ابوحنیفہؒ پر نہ تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس شخص نے حدیث نبوی کے مقابلہ میں ابراہیم نخعیؒ کا قول اس طرح پیش کیا تھا کہ صورت حدیث کے ساتھ معارضہ کی پیدا ہو گئی تھی، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کہ امام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کے قائل ہیں، اب اگر "یفتی بقول أبي حنیفة" میں علامہ مبارک پوریؒ کی خصوص کی تاویل اختیار کی جائے تو امام ابوحنیفہؒ کی کیا خصوصیت باقی رہ جائے گی؟ معلوم ہوا کہ "یفتی بقول أبي حنیفة" میں عموم مراد ہے نہ کہ خصوص۔ ماخوذ از معارف السنن (ج ۶ ص ۹۱۳ و ۹۲۳) بزیادۃ وایضاح۔

علامہ مبارکپوریؒ لکھتے ہیں کہ "یفتی بقول أبي حنیفة" میں اگر عموم بھی مراد لیا جائے تب بھی یحیی بن معینؒ کا مقصود یہ ہے کہ وکیعؒ ہر اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رحؒ کے مسلک کے مطابق فتویٰ دیتے تھے جو حدیث کے مخالف نہیں ہوتا تھا والدلیل علی ذلك قولاه المذکوران فی الباب۔ تحفہ (ج ۲ ص ۱۰۶)

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کلام سے اگر مقصود یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک بیشتر مسائل میں احادیث کے خلاف ہوتا ہے سو یہ دعویٰ بدیہی البطلان ہے اور اس کی مدلل تردید حنفیہ نے ہر ہر مسئلہ کے تحت علیحدہ کردی ہے اور ہم بھی اس بحث کو مقدمہ درس ترمذی میں اصولی طور پر ذکر کر چکے ہیں۔

اور اگر مقصود یہ ہے کہ بعض مسائل میں حنفیہ کا مسلک احادیث کے خلاف ہے سو یہ دعویٰ بھی غلط اور محل نظر ہے۔ بہر حال حضرت وکیع بن الجراحؒ کا حنفی المسلک ہونا قوی دلائل سے ثابت ہے، جہاں تک بعض مسائل میں ان کے امام ابوحنیفہؒ سے اختلاف کا تعلق ہے سو یہ ان کے حنفی ہونے کے منافی نہیں کما سیاتی فی تقریر الأستاذ المحترم حفظہ اللہ ۱۲ مرتب عفی عنہ

(حاشیہ صفحہ ھذا)

[۱] دیکھئے مزید تفصیل کے لئے معارف السنن (ج ۶ ص ۹۱ و ۹۲۳) ۱۲ م

ابو یوسفؒ کے سامنے ایک شخص نے حدیثِ دباء[1] سنکر یہ کہا کہ مجھے تو دباء پسند نہیں، اس وقت امام ابو یوسفؒ نے اس آدمی پر شدید غصہ اور ناراضگی کا اظہار فرمایا حالانکہ یہ فی نفسہ کوئی جرم نہیں تھا، لیکن چونکہ یہ بات اس نے حدیث سنکر کہی تھی اس لئے صورت معارضہ کی پیدا ہو گئی تھی اس لئے امام ابو یوسفؒ نے اس پر سختی کے ساتھ تنبیہ فرمائی[2]، اس قسم کے معارضۂ صوریہ کے موقعہ پر سلف کی شدید ناراضگی کے کتب احادیث میں اور بھی متعدد واقعات موجود ہیں[3]، بہرحال واقعۂ مذکورہ فی الباب میں حضرت وکیعؒ کی ناراضگی سے ان کے غیر حنفی ہونے پر استدلال درست نہیں اور نہ ہی اس سے امام ابو حنیفہؒ کی کوئی تنقیص لازم آتی ہے۔ واللہ اعلم

---

[1] روایت اس طرح ہے "عن أنس بن مالك قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يعجبه الدباء، فأتي بطعام أو دعي له، فجعلت أتتبعه فأضعه بين يديه لما أعلم أنه يحبه" شمائل ترمذی (ص ۱۳) باب ماجاء فی صفة إدام رسول الله صلى الله عليه وسلم۔

اسی باب میں دباء سے متعلق حضرت انسؓ کی ایک اور روایت بھی مروی ہے۔ نیز سنن ترمذی میں بھی حضرت انسؓ ہی کی ایک اور روایت دباء سے متعلق مروی ہے، دیکھئے (ج ۲ ص ۱۵) أبواب الأطعمة، باب ما جاء في أكل الدباء ۱۲ مرتب

[2] چنانچہ ملا علی قاری لکھتے ہیں: "ونظيره ما وقع لأبي يوسف حين روى أنه عليه السلام كان يحب الدباء، فقال رجل: أنا ما أحبه، فسل السيف أبو يوسف وقال: جدد الإيمان وإلا لأقتلنك" مرقاة المفاتيح (ج ۳ ص ۶۱) باب الجماعة وفضلها، الفصل الثالث ۱۲ مرتب

[3] مثلاً سنن ترمذی میں حضرت ابن عمرؓ اور ان کے صاحبزادے کا واقعہ "عن مجاهد قال: كنا عند ابن عمر، فقال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ائذنوا للنساء بالليل إلى المساجد، فقال ابنه: والله لا نأذن لهن، يتخذنه دغلاً (حيلة للفساد) فقال: فعل الله بك وفعل، أقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم، وتقول: لا نأذن" (ج ۱ ص ۱۰۱) باب في خروج النساء إلى المساجد۔ اور مسلم کی روایت میں اسی واقعہ میں یہ الفاظ مروی ہیں "فأقبل عليه عبد الله فسبه سبا سيئا، ما سمعته سبه مثله قط، وقال: أخبرك عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وتقول: والله لنمنعهن" (ج ۱ ص ۱۸۳) باب خروج النساء إلى المساجد۔ اور امام احمدؒ مجاہدؒ سے نقل کرتے ہیں "فما كلمه عبد الله حتى مات" كما نقل الحافظ في الفتح (ج ۲ ص ۲۸۹) باب خروج النساء إلى المساجد بالليل والغلس۔

اس قسم کے مزید واقعات کے لئے دیکھئے معارف السنن (ج ۱ ص ۱۳۰ و ۱۳۱) باب ما جاء فی کراهية البول فی المغتسل ۱۲ مرتب عفی عنہ

باب ماجاء فی تقلید الغنم

عن عائشۃؓ قالت: کنت أفتل قلائد ھدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلھا غنماً[1] شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک اونٹوں کی طرح بکریوں میں تقلید مشروع ہے لیکن حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک تقلید ابل وبقر کے ساتھ مخصوص ہے اور غنم میں مشروع نہیں[2]

شافعیہ اور حنابلہ کا استدلال حدیثِ باب سے ہے جس میں غنم کے لئے فتلِ قلائد کا ذکر ہے۔

حنفیہ ومالکیہ اوّل تو اس کے جواب[3] میں یہ کہتے ہیں کہ اس روایت میں غنم کا ذکر اسود بن یزیدؒ کا

---

[1] الحدیث أخرجہ البخاری فی صحیحہ (ج ۲ ص ۳۰) کتاب المناسک، باب تقلید الغنم۔ ومسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص ۴۲۵) باب استحباب بعث الھدی إلی الحرم۔ والنسائی (ج ۲ ص ۱۷) تقلید الغنم۔ وأبو داؤد فی سننہ (ج ۱ ص ۲۴۴) باب فی الإشعار۔ وابن ماجۃ فی سننہ (ص ۲۲۵) باب تقلید الغنم ۱۲ م

[2] اس روایت میں لفظ "کلھا" کو منصوب اور مجرور دونوں طریقے سے پڑھ سکتے ہیں، منصوب پڑھنے کی صورت میں یہ لفظ "قلائد" کی تاکید بنے گا اور مجرور پڑھنے کی صورت میں لفظِ "ھدی" کی۔ پھر لفظ "غنماً" "ھدی" سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے لیکن اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ مضاف الیہ سے حال واقع ہونا جب درست ہوتا ہے جبکہ مضاف الیہ کو مضاف کے مقام پر رکھنا درست ہو وھو ھھنا مفقود۔

علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے معارف السنن (ج ۶ ص ۵۰) میں اس کو تصرفِ رواۃ قرار دیا ہے اور ترمذی کی روایت کے مقابلہ میں روایاتِ بخاری کو ترجیح دی ہے جن میں یہی مضمون دوسرے طرز کے ساتھ بیان کیا گیا، مثلاً ایک روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں "کنت أفتل القلائد للنبي صلی اللہ علیہ وسلم فیقلد الغنم" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "کنت أفتل قلائد الغنم للنبي صلی اللہ علیہ وسلم" دونوں روایات کے لئے دیکھئے صحیح بخاری (ج ۱ ص ۲۳۰) باب تقلید الغنم۔

واضح رہے کہ بعض حضرات کے نزدیک اگر مضاف الیہ کو مضاف کی جگہ پر نہ بھی رکھا جا سکتا ہو تب بھی اگر مضاف مضاف الیہ کے جزء کی طرح ہو تو مضاف الیہ سے حال بنانا درست ہے اور "قلائد" چونکہ "ھدی" کے ساتھ متصل ہوتے ہیں اس اعتبار سے وہ ہدی کے جزء کی طرح ہیں لہذا حدیثِ باب میں "غنماً" کو "ھدی" سے حال بنانا درست ہے۔

پھر بعض حضرات کے نزدیک مضاف الیہ سے بغیر کسی شرط کے حال بنانا درست ہے، ان حضرات کے مسلک پر تو کوئی اشکال ہی نہیں۔ کذا فی حاشیۃ جامع الاصول (ج ۳ ص ۳۴۱) فی الإشعار والتقلید تحت رقم الحدیث ۱۴۵۶

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تفرد ہے[1]، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حج میں بکریاں لے جانا ثابت نہیں بلکہ اونٹ لے جانا ثابت ہے[2]۔

دوسرے حضرت شاہ صاحبؒ یہ فرماتے ہیں[3] کہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ قلادے بکریوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

نقلاً عن شرح الترمذی لأبی الطیب ۱۲ مرتب عفی عنہ

[3] تفصیلِ مذاہب کے لئے دیکھئے "المغنی" لابن قدامۃ (ج ۳ ص۵۴۹) فصل ویسن تقلید الهدی۔ وشرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۲۵) باب استحباب بعث الهدی إلی الحرم ۱۲ مرتب

[4] جواب کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص۳۸) باب تقلید الغنم ۱۲ م

(حاشیہ صفحۂ ھٰذا)

[1] جس کی توضیح یہ ہے کہ اس روایت کو حضرت عائشہؓ سے نقل کرنے والے متعدد حضرات تابعین ہیں، عروۃ بن الزبیر، عمرہ بنت عبدالرحمٰن، قاسم ابوقلابہ، مسروق اور اسود۔ رحمہم اللہ۔ ان تمام حضرات میں سے صرف اسود ہی غنم کا ذکر کرتے ہیں اور کسی بھی روایت میں غنم کا ذکر نہیں بلکہ "کنتُ أفتل قلائد هدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" یا اس جیسے الفاظ مروی ہیں، تمام روایات کے لئے دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۲۵) باب استحباب بعث الهدی إلی الحرم ۱۲ مرتب

[2] علامہ عینیؒ نے عدمِ تقلیدِ غنم کی دلیل یہ ذکر کی ہے "لأنها تضعف عن التقلید" یعنی بکری ایک کمزور جانور ہے وہ قلادہ کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ عمدہ (ج ۱۰ ص۳۸) باب تقلید الغنم۔

ابن المنذرؒ فرماتے ہیں: "ولم نجد لهم (أی للحنفیة والمالکیة) حجة إلا قول بعضهم أنها تضعف عن التقلید وهی حجة ضعیفة، لأن المقصود من التقلید العلامة، وقد اتفقوا علی أنها لا تشعر لأنها تضعف عنه، فتقلد بما لا یضعفها" کذا نقل الحافظ فی الفتح (ج ۳ ص۴۳۷) باب تقلید الغنم۔

اس کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ غنم میں علامت کے لئے نفسِ تقلید کافی ہے، خواہ صوف کے چھوٹے سے ٹکڑے کے ذریعہ ہو، البتہ غنم چونکہ ایک کمزور جانور ہے، اس لئے اس کے حق میں تقلیدِ نعلین پر عمل نہیں کیا جائے گا، اور حنفیہ کے نزدیک بھی راجح یہی ہے کہ غنم میں نفسِ تقلید تو درست ہے تقلیدِ نعلین نہیں کما سیأتی فی التقریر۔

صاحبِ بدائعؒ نے عدمِ تقلیدِ غنم پر ایک اور طریقہ سے استدلال کیا ہے وہ فرماتے ہیں: "والدلیل علی أن الغنم لا تقلد قولہ تعالیٰ: وَلَا الْهَدْیَ وَلَا الْقَلَائِدَ، عطف القلائد علی الهدی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے لئے تیار ہو رہے تھے تب بھی اس حدیث میں یہ تصریح نہیں ہے کہ تقلید سے مراد تقلیدِ نعلین ہے بلکہ ظاہر یہ ہے کہ نعلین کے بغیر محض اون کے قلادے ڈالنا ہی پیش نظر تھا اور عند الحنفیہ اس میں کوئی حرج نہیں[1]۔

"ثم لا یحرم" حدیثِ باب کے یہ الفاظ اس پر دال ہیں کہ صرف تقلیدِ غنم سے آدمی محرم

(بقیہ حاشیۂ صفحۂ گذشتہ)

والعطف یقتضی المغایرۃ فی الأصل، واسم الھدی یقع علی الغنم والإبل والبقر جمیعًا، فھذا یدل علی أن الھدی نوعان: ما یقلد وما لا یقلد، ثم الإبل والبقر یقلدان بالإجماع، فتعین أن الغنم لا تقلد لیکون عطف القلائد علی الھدی عطف الشیٔ علی غیرہ فیصح" بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (ج ۲ ص۱۶۳) فصل وأما بیان ما یصیر بہ محرمًا ۱۲ مرتب

[3] معارف السنن (ج ۶ ص۵) ۱۲ م

(حاشیۂ صفحۂ ھٰذا)

[1] پھر ابن المنذر فرماتے ہیں: "والحنفیۃ فی الأصل یقولون: لیست الغنم من الھدی، فالحدیث حجۃ علیھم من جھۃ أخرٰی" کذا نقل الحافظ فی الفتح (ج ۳ ص۴۳۴) باب تقلید الغنم۔

مطلب یہ کہ حنفیہ چونکہ غنم کو "ھدی" میں شمار نہیں کرتے جبکہ دوسرے حضرات کے نزدیک غنم ہدی میں شامل ہے، اس دوسرے مسئلہ میں بھی حدیثِ باب حنفیہ کے خلاف حجت ہے، اس لئے کہ حدیثِ باب میں "کنت أفتل قلائد ھدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلھا غنمًا" کہکر "غنم" پر "ہدی" کا اطلاق کیا گیا ہے۔

لیکن حنفیہ پر ابن المنذرؒ کا یہ اعتراض درست نہیں، چنانچہ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: "ھٰذا افتراء علی الحنفیۃ ففی أی موضع قالت الحنفیۃ: إن الغنم لیست من الھدی، بل کتبھم مشحونۃ بأن الھدی اسم لما یھدی من النعم إلی الحرم لیتقرب بہ، قالوا: وأدناہ شاۃ لقول ابن عباس رضی اللہ تعالی عنھما: "ما استیسر من الھدی شاۃ" وعن ھذا قالوا: الھدی إبل وبقر وغنم ذکورھا وإناثھا، حتی قالوا ھٰذا بالإجماع، وإنما مذھبھم أن التقلید فی البدنۃ، والغنم لیست من البدنۃ، فلا تقلد لعدم التعارف بتقلیدھا، إذ لو کان تقلیدھا سنۃ لما ترکوھا" عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص۴۲) باب تقلید الغنم ۱۲ مرتب عفی عنہ

نہیں ہوتا چنانچہ جمہور کا مسلک یہی ہے کہ صرف تقلیدِ ہدی سے آدمی محرم نہیں ہوتا[1] جب تک کہ تلبیہ نہ کہہ لے یا سوق نہ کر لے، اسی طرح ہدی کو بھیجنے سے محرم نہیں ہوتا، پھر سوق کی صورت میں اگرچہ تلبیہ نہ پڑھے محرم ہو جاتا ہے اس لئے کہ ہدی کا سوق تلبیہ پڑھنے کے درجہ میں ہے[2]۔ تفصیل کے لئے اعلاء السنن کی طرف مراجعت کریں[3]۔ واللہ اعلم

---

[1] "وعن جماعة من الصحابة رضي الله عنهم منهم علي وابن مسعود وابن عمر وجابر رضي الله عنهم أنهم قالوا: إذا قلّد فقد أحرم، وكذا روي عن ابن عباس رضي الله عنهما أنه قال: إذا قلّد وهو يريد الحج أو العمرة فقد أحرم" بدائع الصنائع (ج ۲ ص ۱۶۱) فصل وأما بيان ما يصير به محرمًا۔ ابن المنذرؒ نے سفیان ثوریؒ، امام احمدؒ اور امام اسحٰقؒ کا بھی یہی مسلک نقل کیا ہے، كذا نقل الحافظ في الفتح (ج ۳ ص ۴۳۵) باب من قلّد القلائد بيده) لیکن علامہ عینیؒ نے ان تینوں حضرات کا مسلک جمہورؒ کے مطابق نقل کیا ہے۔ عمدہ (ج ۱۰ ص ۳۵، باب من أشعر وقلّد)۔ علامہ خطابیؒ نے اصحاب رای کا مسلک حضرت ابن عباسؓ کے مطابق نقل کیا ہے لیکن حافظ ابن حجرؒ ان کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں "وهو خطأ عليهم، فالطحاوي أعلم بهم منه" فتح الباری (ج ۳ ص ۴۳۵)

مذکورہ صحابہ کرامؓ میں سے حضرت علیؓ کا اثر مصنف ابن ابی شیبہ میں مروی ہے "أن عمر وعليا وابن عباس كانوا يقولون في الرجل يرسل ببدنة أنه يمسك عما يمسك عنه المحرم ليس إلا يلبي قال جعفر: يواعدهم يومًا فإذا كان ذلك اليوم الذي يواعدهم أن يشعر أمسك عما يمسك عنه المحرم (ج ۴ ص ۸۵، رقم ۵۶۶) من كان يمسك عما يمسك عنه المحرم اول تو تقلید کے بارے میں یہ روایت صریح نہیں دوسرے اس کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

"وهذا منقطع" فتح الباری (ج ۳ ص ۴۳۵)

حضرت ابن مسعودؓ کا اثر احقر کو نہ مل سکا، بلکہ حافظ ابن حجرؒ نے تو ان کا مسلک جمہورِ صحابہؓ یعنی حضرت عائشہؓ، حضرت انسؓ اور حضرت ابن الزبیرؓ وغیرہم کے مطابق نقل کیا ہے، يعني لا يصير بذلك محرمًا

حضرت ابن عمرؓ کا اثر مصنف ابن ابی شیبہ میں مروی ہے "من قلّد فقد أحرم" (ج ۴ ص ۸۵، رقم ۵۶۸، في الرجل يقلد أو يجلل أو يشعر وهو يريد الإحرام) حضرت ابن عباسؓ کا اثر بھی مصنف ابن ابی شیبہ ہی میں مروی ہے "من جلّل أو قلد أو أشعر فقد أحرم" (ج ۴ ص ۸۵، رقم ۵۶۵) جہاں تک ان دونوں آثار کا تعلق ہے سو اول تو انہیں استحباب تشبہ بالمحرمین پر محمول کیا جا سکتا ہے دوسرے حافظ ابن حجرؒ نے امام زہریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ لوگوں کو جب حضرت عائشہؓ کی مرفوع روایت کا علم ہوا تو انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کے فتویٰ کو چھوڑ دیا (فتح الباری ج ۳ ص ۴۳۶ و ۴۳۷) لامحالہ حضرت ابن عمرؓ کے اثر کا بھی یہی حکم ہوگا۔ (باقی حاشیہ صـــ پر)

باب ماجاء إذا عطب الهدي ما يصنع به[۱]

عن ناجية[۲] الخزاعي ـ صاحب بدن رسول الله صلى الله عليه وسلم ـ

قال : قلت : يا رسول الله ! كيف أصنع بما عطب[۳] من البدن؟ قال : انحرها ثم اغمس نعلها في دمها، ثم خل بين الناس و بينها فيأكلوها " اگر ہدی ہلاک ہونے لگے تو اگر وہ نفلی ہدی ہے تو اس کو ذبح کردے اور اس کے نعل کو خون میں بھگو کر کوہان پر مل

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

جہاں تک حضرت جابرؓ کا تعلق ہے ان سے ایک مرفوع روایت مسند احمدؒ اور بزار میں مذکور ہے اس روایت کے بارے میں علامہ ہیثمیؒ لکھتے ہیں " ورجال أحمد ثقات " اور اسی روایت کے ایک دوسرے طریق کے بارے میں وہ لکھتے ہیں : " و رجاله رجال الصحيح " مجمع الزوائد (ج ۳ ص۲۲۷) باب فیمن بعث هديا وهو مقيم۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ ہیثمیؒ کا اس روایت کو صحیح قرار دینا درست نہیں اور متعدد محدثین نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں : " و هذا لا حجة فيه لضعف إسناده " فتح الباری (ج ۳ ص۴۳۶) باب من قلد القلائد بيده " ـ مزید کلام کے لئے دیکھئے اعلاء السنن (ج ۱۰ ص۲۳۱) باب من قلد بدنته وساقها ۱۲ مرتب عفی عنہ۔

[۲] چنانچہ صاحب ہدایہؒ فرماتے ہیں " لأن سوق الهدي في معنى التلبية في إظهار الإجابة لأنه لا يفعله إلا من يريد الحج أو العمرة ، و إظهار الإجابة قد يكون بالقول، فيصير به محرما لاتصال النية بفعل هو من خصائص الإحرام ـ ہدایہ (ج ۱ ص۲۵۰) قبيل باب القران ۱۲ مرتب

[۳] دیکھئے (ج ۱۰ ص۲۲۸ تا ۲۳۵) باب من قلد بدنته وساقها فقد أحرم ۱۲ مرتب

(حاشیہ صفحہ هذا)

[۱] الحديث أخرجه أبوداؤد في سننه (ج ۱ ص۲۴۵) باب الهدي إذا عطب قبل أن يبلغ. وابن ماجۃ في سننه (ص۲۲۳) باب في الهدي إذا عطب ۱۲ م

[۲] هو ابن كعب بن جندب أو جندب بن كعب ، شروع میں ان کا نام ذکوان تھا، بعد میں جب انہوں نے قریش کے پنجۂ ظلم سے نجات پائی اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام ناجیہ رکھ دیا، صحاح ستہ میں ان سے سوائے اس ایک حدیث باب کے کوئی روایت مروی نہیں۔ کذا فی معارف السنن (ج ۶ ص۵۰۱)

[۳] عطب ـ بالكسر ـ أي هلك وعجز عن السير ـ مجمع بحار الانوار (ج ۳ ص۶۱۱) مادۂ عطب " ۱۲ م

دے تاکہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ یہ ہدی ہے ۔

پھر ایسے جانور کے بارے میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ ایسے جانور میں سے خود کھانا یا اغنیاء کو کھلانا جائز نہیں بلکہ اُسے صرف فقراء کھاسکتے ہیں البتہ اگر وہ ہدی واجب تھی تو اس کے ذمہ ضروری ہے کہ اس کی جگہ دوسری ہدی قربان کرے اور یہ ہدی اس کی ملکیت ہوگئی، چنانچہ اُسے خود کھانے، اغنیاء وفقراء کو کھلانے اور ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہے، حنفیہ کے علاوہ امام احمدؒ اور مالکیہ میں سے ابن القاسمؒ کا بھی یہی مسلک ہے ۔

امام شافعیؒ کے نزدیک اس کے برعکس حکم یہ ہے کہ اگر وہ نفلی ہدی ہے تو اس کو اس میں ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہے اور اگر وہ نذر کی ہدی ہے تو اس کی ملکیت اس سے زائل ہوگئی اب وہ صرف مسکینوں کا حق ہے لہذا اس کو بیچنا جائز ہے اور نہ ہی دوسرے جانور کے ساتھ تبدیل کرنا۔

حنفیہ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ نفلی جانور خریدنے سے وہ ذبح کے لئے متعین ہوجاتا ہے لہذا اس کو قربت ہی میں خرچ کرنا ضروری ہے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ فقراء کو کھلایا جائے اغنیاء کو کھلانے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا بخلاف ہدیِ واجب کے کہ وہ خریدنے سے متعین نہیں ہوتی بلکہ اس کی جگہ دوسرا جانور بھی قربان کیا جاسکتا ہے، لہذا وہ جانور متعین طور سے قربت کے لئے خاص نہ رہا۔

جہاں تک حدیثِ باب کا تعلق ہے سو چونکہ اس میں نفلی اور نذر کی کوئی وضاحت نہیں اور نہ ہی غنی وفقیر کا کوئی ذکر ہے اس لئے یہ کسی کے مذہب پر بھی صریح نہیں بلکہ اس میں دونوں مذاہب کی گنجائش ہے ۔

اور ظاہر یہ ہے کہ یہ ہدی واجب تھی اور غنی وفقیر ہر ایک کے لئے اس کا کھانا درست تھا کما ہو مذہب الجمہور، چنانچہ حدیثِ باب میں "خل بین الناس وبینها فیأکلوها" کے عام الفاظ اس پر دال ہیں ۔

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ مسلم کی روایت میں تو یہ الفاظ آئے ہیں "لا تأکل منها أنت ولا أحد من أهل رفقتك[1]"۔

شارحِ مسلم ابوعبداللہ اُبّی مالکیؒ نے "إکمال إکمال المعلم" میں اس کا یہ جواب دیا ہے کہ

[1] (ج ۱ ص۴۲۸) باب ما یفعل بالهدی إذا عطب فی الطریق ۱۲ م

آپؐ نے یہ حکم سداً للذرائع دیا تھا کہ کہیں لوگ اُسے (کھانے کی طمع میں) اندیشۂ ہلاکت سے پہلے ہی ذبح نہ کر دیں[1]۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم[2]۔

باب ماجاء فی رکوب البدنة

عن[3] انس بن مالک ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم رأی رجلاً یسوق بدنة فقال له: ارکبها، فقال: یارسول اللہ! إنها بدنة فقال له فی الثالثة أو فی الرابعة: ارکبها ویحك أو ویلك " امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام اسحٰقؒ کے نزدیک رکوبِ بدنہ عند الحاجۃ درست ہے جبکہ حنفیہ کے نزدیک رکوب درست نہیں الّا یہ کہ اضطرار ہو، سفیان ثوری، شعبی، حسن بصریؒ اور عطاءؒ وغیرہ کا بھی یہی مسلک ہے[4]۔

---

[1] کذا فی معارف السنن (ج ۶ ص ۵۰۰) — وفی فتح الملهم: " قال الطیبی: سواء کان فقیرا أو غنیاً، و إنما منعوا ذلك قطعاً لإطماعهم لئلا ینحرها أحد و یتعلل بالعطب اھ - قال المازری: نهاه عن ذلك حمایة أن یتساهل فینحره قبل أوانه، قال القرطبی: لأنه لو لم یمنعهم أمكن أن یبادر فینحره قبل أوانه، وهو من المواضع التی وقعت فی الشرع وحملت مالکاً علی القول بسد الذرائع وهو أصل عظیم لم یظفر به إلا مالك رحمه الله لدقة نظره اھ قلتُ (القائل هو الشیخ العثمانی صاحب فتح الملهمؒ): وقد استعمله أصحابنا أیضاً کثیراً فی مسائلهم. والله أعلم (ج ۳ ص ۳۵۶) باب ما یفعل بالهدی إذا عطب فی الطریق ۱۲ مرتب

[2] مسئلۃ الباب سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۵۰۰ تا ۵۰۵) اور اعلاء السنن (ج ۱۰ ص ۲۴۳ تا ۲۴۹) باب ما یفعل بالهدی إذا خاف علیه العطب ۱۲ مرتب

[3] الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحه (ج ۱ ص ۲۲۹) باب رکوب البدن - و مسلم فی صحیحه (ج ۱ ص ۴۲۵) باب جواز رکوب البدنة المهداة لمن احتاج إلیها ۱۲ م

[4] رکوبِ بدنہ کے بارے میں فقہاء کے تقریباً سات مذاہب ہیں:-

(۱) مطلقاً جواز عروۃ بن الزبیرؓ اور ظاہریہ کا یہی مسلک ہے، و نسبه ابن المنذر إلی أحمد و إسحٰق۔

(۲) رکوب مطلقاً تو نہیں البتہ عند الحاجۃ درست ہے (اس مسلک سے متعلق تفصیل اصل تقریر میں آگئی)

(۳) شدتِ حاجت یعنی اضطرار کے وقت رکوب درست ہے (اس مسلک سے متعلق تفصیل بھی اصل تقریر میں آچکی ہے)

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حنفیہ کا استدلال صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ کی روایت کے الفاظ سے ہے: "ارکبھا بالمعروف إذا ألجئت إليها حتى تجد ظهرًا"[1] واللہ تعالیٰ اعلم۔[2]

باب[3] ماجاء بأى جانب الرأس يبدأ في الحلق

عن[4] انس بن مالك قال: لما رمى رسول الله صلى الله عليه وسلم الجمرة نحر نسكه ثم ناول الحالق شقه الأيمن فحلقه فأعطاه أبا طلحة، ثم ناوله شقه الأيسر فحلقه، فقال: اقسمه بين الناس" بعض نے کہا کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بال تراش

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

(۴) بغیر حاجت کے بھی جواز، البتہ مع الکراہۃ، نسبہ ابن عبدالبر الی الشافعی ومالک

(۵) بقدرِ حاجت رکوب کا جواز، چنانچہ جب تھک جائے تو سوار ہو سکتا ہے اور کسی قدر آرام حاصل کر لینے کے بعد سواری سے اترنا ضروری ہے، یہ ابراہیم نخعی کا مسلک ہے، یہ مذہب اور تیسرا مذہب قریب قریب ایک ہیں۔

(۶) رکوب کی مطلقاً ممانعت، نقلہ ابن العربی عن ابی حنیفۃ وشنّع علیہ، لیکن علامہ عینیؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تردید کی ہے۔

(۷) رکوب واجب ہے۔ نقلہ ابن عبدالبر عن اہل الظاہر۔

تفصیل کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج۱۰ ص۲۹ و۳۰) باب رکوب البدن ۱۲ مرتب عفی عنہ

(حاشیہ صفحۂ ھذا)

[1] (ج ۱ ص۴۲۶) باب جواز رکوب البدنۃ المهداة لمن احتاج إليها ۱۲ م

[2] پھر قائلین جوازِ رکوب کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس پر سامان لادسکتا ہے یا نہیں؟ امام مالکؒ کے نزدیک سامان لادنا جائز نہیں اور جمہور کے نزدیک جائز ہے۔ اسی طرح اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ اس پر دوسرے کو سوار کرسکتا ہے یا نہیں؟ جمہور کے نزدیک یہاں بھی گنجائش ہے اور امام مالکؒ کے نزدیک اس کی بھی اجازت نہیں۔ عمدہ (ج۱۰ ص۳۰)

پھر قاضی عیاضؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ اس کو کرائے پر نہیں دے سکتا۔ فتح الباری (ج۳ ص۴۳۰) باب رکوب البدن ۱۲ مرتب

[3] شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲

[4] الحديث أخرجه البخاري في صحيحه (ج۱ ص۲۹) كتاب الوضوء، باب الماء الذى يغسل به شعر الإنسان۔ ومسلم في صحيحه (ج۱ ص۴۲۱) باب بيان ان السنة يوم النحر أن يرمى ثم ينحر ثم يحلق والابتداء في الحلق بالجانب الأيمن من رأس المحلوق ۱۲ م

بن امیہؓ نے کاٹے تھے بعض نے کہا کہ معمر بن عبداللہؓ آپ کے حالق تھے اور یہ دوسرا قول ہی صحیح ہے، دراصل خراش بن امیہؓ حدیبیہ کے موقع پر آپ کے حالق تھے [۱]۔

حلق کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ حدیثِ باب سے معلوم ہوا کہ حلق میں محلوق کے سر کی دائیں جانب سے ابتداء مستحب ہے گویا حلق میں حالق کی دائیں جانب کا نہیں محلوق کی دائیں جانب کا اعتبار ہے۔

علامہ نوویؒ لکھتے ہیں: "وهذا مذهبنا ومذهب الجمهور وقال أبو حنيفة: يبدأ بجانبه الأيسر [۲]" جس کا مطلب یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک محلوق کی بائیں جانب سے ابتداء کیجائیگی گویا ان کے نزدیک حالق کی دائیں جانب کا اعتبار ہے نہ کہ محلوق کی دائیں جانب کا، اور یہ مسلک حدیثِ باب کے بالکل خلاف ہے اس لئے کہ اس میں تصریح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر کے دائیں جانب کے بال پہلے کٹوائے، اسی لئے شیخ ابن ہمامؒ اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "وهذا يفيد أن السنة في الحلق البداءة بيمين المحلوق رأسه وهو خلاف ما ذكر في المذهب وهذا هو الصواب [۳]"۔

لیکن راجح یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا اس قول سے رجوع ثابت ہے اور ان کا مسلک بھی جمہور کے مطابق ہے کما نقل الشيخ العلامہ ابن عابدين في ردّ المحتار [۴]۔

اختلاف کو ختم کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حالق محلوق کی پشت پر کھڑے ہو کر بال کاٹے، اس صورت میں ابتداء بیمین الحالق اور ابتداء بیمین المحلوق دونوں پر عمل ہوجائیگا۔ واللہ اعلم

---

[۱] عمدة القاري (ج ۳ ص ۳۸) کتاب الوضوء باب الماء الذي يغسل به شعر الإنسان ۱۲ مرتب

[۲] دیکھئے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۲۱) باب بيان أن السنة يوم النحر أن يرمي ثم ينحر ثم يحلق ۱۲ م

[۳] دیکھئے فتح القدیر (ج ۲ ص ۱۷۱) باب الإحرام ۱۲ م

[۴] چنانچہ وہ شیخ ابن ہمامؒ کے قول "وهذا هو الصواب" نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "وأقول: يوافقه ما في الملتقط عن الإمام: حلقت رأسي فخطأني الحلاق في ثلاثة أشياء، لما أن جلست قال: استقبل القبلة، وناولته الجانب الأيسر فقال: إبدأ بالأيمن، فلما أردت أن أذهب قال: ادفن شعرك، فرجعت فدفنته اه نهر أي فهذا يفيد رجوع الإمام إلى قول الحجام، ولذا قال في اللباب: هو المختار" وراجعه للتفصيل (ج ۲ ص ۲۴۱) تنبيه تحت قوله: "وحلقه أكل أفضل ولو أزاله بنحو نورة جاز" ۱۲ مرتب

موئے مبارک کی تقسیم واعطاء کے بارے میں روایات کا اختلاف

حدیثِ باب سے متبادر یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شقِ ایمن اور شقِ ایسر دونوں جانبوں کے بال حضرت ابو طلحہ[1] انصاریؓ کو دیدیئے تھے، مسلم کی روایت میں بھی اسی کی تصریح ہے[2]، ابو عوانہ کی روایت[3] سے بھی متبادر یہی ہے، لیکن ابوبکر بن ابی شیبہؒ حفص بن غیاثؒ سے جو روایت نقل کرتے ہیں اس میں یہ الفاظ ہیں: "قال للحلاق: ھا، وأشار بیدہ إلی جانب الأیمن ھکذا فقسم شعرہ بین من یلیہ، قال: ثم أشار إلی الحلاق وإلی جانب الأیسر فحلقہ فأعطاہ أم سلیمؓ" اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دائیں جانب کے بال آپؐ نے خود تقسیم کر دیئے تھے اور بائیں جانب کے بال حضرت ام سلیمؓ کو دیدیئے تھے، اس طرح یہ دونوں روایات متعارض ہو جاتی ہیں اسی طرح ابو کریبؒ عن حفص بن غیاث کے طریق میں یہ الفاظ مروی ہیں: "فبدأ بالشق الأیمن، فوزعہ الشعرۃ والشعرتین بین الناس، ثم قال بالأیسر فصنع مثل ذلک، ثم قال: ھاھنا أبو طلحۃ، فدفعہ إلی أبی طلحۃ[4]" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دائیں جانب کے بال آپؐ نے ایک ایک دو دو کر کے تقسیم کر دیئے تھے اور بائیں جانب کے بال حضرت ابو طلحہؓ کو دیدیئے تھے۔ اس طرح تمام روایات میں ایک طرح کا تعارض ہو جاتا ہے، لیکن علامہ عینیؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ دراصل دونوں جانبوں کے بال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو طلحہؓ کو دیدیئے تھے پس دائیں جانب کے بال تو حضرت ابو طلحہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حکم سے (ایک ایک دو دو کر کے) لوگوں میں تقسیم کر دیئے اور بائیں جانب کے آپؐ ہی کے حکم سے اپنی اہلیہ حضرت ام سلیمؓ

---

[1] یہ حضرت انس بن مالک کی والدہ حضرت ام سلیمؓ کے شوہر ہیں، کما فی المعارف (ج ۶ ص ۵۱۳) ۱۲ م

[2] چنانچہ مسلم کی روایت اس طرح ہے "عن انس بن مالک قال: لما رمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الجمرۃ ونحر نسکہ وحلق ناول الحالق شقہ الأیمن فحلقہ ثم دعا أبا طلحۃ الأنصاری فأعطاہ إیاہ ثم ناولہ الشق الأیسر فقال: احلق، فحلقہ فأعطاہ أبا طلحۃ فقال: اقسمہ بین الناس" (ج ۱ ص ۴۲۱) باب بیان أن السنۃ یوم النحر أن یرمی الخ ۱۲ مرتب

[3] ولفظہ: "أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أمر الحلاق فحلق رأسہ ودفع إلی أبی طلحۃ الشق الأیمن، ثم حلق الشعر الآخر فأمرہ أن یقسمہ بین الناس" کذا فی العمدۃ (ج ۳ ص ۳۸) کتاب الوضوء، باب الماء الذی یغسل بہ شعر الإنسان ۱۲ م

[4] صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۲۱) باب بیان أن السنۃ یوم النحر أن یرمی الخ ۱۲ م

[5] حوالہ بالا ۱۲ م

کو دیدئے۔

لیکن ایک اشکال یہ باقی رہتا ہے کہ مسلم میں ایک روایت ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:
"ناول الحالق شقہ الأیمن فحلقہ، ثم دعا أبا طلحۃ الأنصاری فأعطاہ إیاہ ثم ناولہ الشق الأیسر، فقال: احلق، فحلقہ، فأعطاہ أبا طلحۃ، فقال: اقسمہ بین الناس" اس روایت سے متبادر یہ ہے کہ بائیں جانب کے بال تقسیم کئے گئے جبکہ پچھلی روایات کا ظاہر یہ تھا کہ دائیں جانب کے بال تقسیم کئے گئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تطبیق کے لئے لفظ "اقسمہ" کی ضمیرِ منصوب کو شقِ ایمن کی طرف لوٹایا جائیگا، اگرچہ اس صورت میں مرجع بعید اور خلافِ ظاہر ہے[۱]۔

فائدہ حدیثِ باب اور اس جیسی دوسری روایات سلفِ صالحین کے تبرکات کے بارے میں اصل کی حیثیت رکھتی ہیں، بخاری[۳] میں ابن سیرینؒ سے مروی ہے: "قال: قلتُ لعبیدۃ[۴]: عندنا من شعر النبی صلی اللہ علیہ وسلم أصبناہ من قبل أنس أو من قبل أھل أنس، فقال: لأن تکون عندی شعرۃ منہ أحبّ إلیّ من الدنیا وما فیھا"۔
نیز حضرت خالد بن الولیدؓ کے بارے میں منقول ہے کہ جب حضرت ابوطلحہؓ موئے مبارکہ تقسیم فرما رہے تھے اس وقت انھوں نے ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی کے چند بال لے لئے تھے جو انہوں نے اپنی ٹوپی سے لگا لئے تھے، اور اس ٹوپی کو پہن کر جنگوں میں شریک ہوتے اور فتحیاب ہوتے[۵]

---

[۱] عمدۃ القاری (ج ۳ ص ۳۸) باب الماء الذی یغسل بہ شعر الإنسان

مذکورہ تطبیق کی روشنی میں یہ نسبت کرنا بھی درست ہے، کہ موئے مبارک حضرت ابوطلحہؓ نے تقسیم کئے، اور یہ نسبت بھی درست ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم فرمائے (اس لئے کہ تقسیم کا حکم آپ ہی نے دیا تھا) یہ نسبت بھی درست ہے کہ بائیں جانب کے بال آپ نے حضرت ابوطلحہؓ کو دیئے (اس لئے کہ براہِ راست ان ہی کو دئے) یہ نسبت بھی درست ہے کہ بائیں جانب کے بال حضرت ام سلیمؓ کو دئے تھے (اس لئے کہ ان ہی کو دینا مقصود تھا اگرچہ بیچ میں حضرت ابوطلحہؓ کا واسطہ استعمال کیا گیا تھا) ۱۲ م

[۲] دیکھئے فتح الملہم (ج ۳ ص ۳۲۰) باب بیان أن السنۃ یوم النحر أن یرمی الخ ۱۲ م

[۳] (ج ۱ ص ۲۹) کتاب الوضوء، باب الماء الذی یغسل بہ شعر الإنسان ۱۲ م

[۴] علی وزن کریمۃ "ایک جلیل القدر مخضرم تابعی" دیکھئے تقریب التہذیب (ج ۱ ص ۵۴۷، رقم ۱۵۹۸) ذکر من اسمہ عَبیدۃ بفتح اولہ ۱۲ م

[۵] دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۱۱۵) ۱۲ م

جنگِ یمامہ میں وہ ٹوپی گر گئی تو حضرت خالدؓ نے اس کو حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر نہایت زوردار حملہ کیا، اپنی جان کو اس طرح خطرہ میں ڈالنے پر صحابہ کرامؓ نے ان پر اعتراض کیا تو انہوں نے جواب دیا "انی لم أفعل ذلك لقيمة القلنسوة، لكن كرهت أن تقع بأيدی المشركين وفيها من شعر النبی عليه الصلوٰة والسلام"[1] واللہ اعلم

باب[2] ماجاء فی الحلق والتقصير

عن[3] ابن عمر قال: حلق رسول الله صلى الله عليه وسلم وحلق طائفة من أصحابه وقصر بعضهم" اس پر اتفاق ہے کہ حلق قصر سے افضل ہے پھر اس پر بھی امام شافعیؒ سمیت جمہور کا اتفاق ہے کہ حلق اور قصر ارکانِ حج وعمرہ اور ان کے مناسک میں سے ہیں، اور ان کے بغیر حج وعمرہ میں سے کوئی بھی مکمل نہیں ہوتا البتہ امام شافعیؒ کی ایک شاذ روایت یہ ہے کہ یہ دونوں محض محظورات کو حلال کرنے والی چیزیں ہیں عبادت اور نسک نہیں۔ کما فی شرح[4] النووی علی صحیح مسلم

پھر حلق اور قصر کی مقدارِ واجب کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی ایک ایک روایت یہ ہے کہ پورے سر کا واجب ہے، امام مالکؒ کی مشہور روایت یہ ہے کہ اکثر رأس کا واجب ہے، امام احمدؒ کی دوسری روایت بھی اسی کے مطابق ہے، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک نصف رأس کا واجب ہے جبکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ربع رأس کا واجب ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک تین بالوں کا حلق یا قصر کافی ہے جبکہ امام شافعیؒ کے بعض اصحاب کے نزدیک مسحِ راس کی طرح صرف ایک بال کا حلق یا قصر کافی ہے۔[5]

---

[1] عمدة القاری (ج ۳ ص ۳۷) باب الماء الذی يغسل به شعر الإنسان ۱۲ م

[2] شرحِ باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲

[3] الحديث أخرجه البخاری فی صحيحه (ج ۱ ص ۲۳۳) باب الحلق والتقصير عند الإحلال - و مسلم فی صحيحه (ج ۱ ص ۴۲۰) باب تفضيل الحلق على التقصير وجواز التقصير ۱۲ م

[4] (ج ۱ ص ۴۲۰) باب تفضيل الحلق على التقصير وجواز التقصير ۱۲ م

[5] تفصیل کے لئے دیکھئے عمدہ (ج ۱۰ ص ۶۱) باب الحلق والتقصير عند الإحلال - فتح الباری (ج ۳ ص ۴۵۰) باب الحلق والتقصير عند الإحلال - اور شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۲۰) باب تفضيل الحلق على التقصير وجواز التقصير ۱۲ مرتب

اس اختلاف کی بنیاد دراصل ایک اور اصولی اختلاف پر ہے وہ یہ کہ شارع جب کسی ایسے فعل کا حکم دیں جو کسی محل سے متعلق ہو تو کتنی مقدار سے وہ امتثالِ امر کی ذمہ داری سے بری ہو جائیگا، امام مالکؒ کے نزدیک اس صورت میں پورے محل کا استیعاب ضروری ہے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قدرِ معتدبہ یعنی ربع کافی ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک بعضِ مطلق کافی ہے[1]۔

پھر شوافع اور احناف کا اس پر اتفاق ہے کہ حلق اور قصر دونوں صورتوں میں استیعابِ راس افضل ہے[2]۔

پھر قصر کی صورت میں حنفیہ کے نزدیک (گہرائی کے اعتبار سے) ایک پورے کے برابر یا اس سے کسی قدر زائد بالوں کا کاٹنا ضروری ہے جبکہ شافعیہ کے نزدیک ایک پورے کے برابر بال کاٹنا افضل و مستحب ہے اگر اس سے کم کاٹے تو بھی کافی ہے[3]۔

پھر حلق (اور اسی طرح قصر) کا زمانہ ایام النحر ہیں اور مکان حرم ہے یہ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے گویا ان کے نزدیک حلق زمانِ معین اور مکانِ معین کے ساتھ خاص ہے، امام ابویوسفؒ کے نزدیک نہ کسی زمانہ کے ساتھ خاص ہے نہ کسی مکان کے ساتھ، امام محمدؒ کے نزدیک مکان کیساتھ تو خاص ہے زمانہ کے ساتھ نہیں اور امام زفرؒ کے نزدیک زمانہ کے ساتھ تو خاص ہے مکان کے ساتھ نہیں۔

ثمرۂ اختلاف اُس صورت میں ظاہر ہوگا جبکہ کسی شخص نے اگر ایام النحر کے بعد یا خارج حرم حلق کرایا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دونوں صورتوں میں دم واجب ہوگا جبکہ امام ابویوسفؒ کے نزدیک کسی بھی صورت میں دم نہ ہوگا، امام محمدؒ کے نزدیک خارجِ حرم کی صورت میں تو دم ہوگا حلق کو ایام النحر سے مؤخر کرنے کی وجہ سے دم نہ ہوگا۔ اور امام زفرؒ کے نزدیک ایام النحر کے بعد حلق کرانے کی صورت میں تو دم

---

[1] واضح رہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اعتبار ربع ایک اصولی قاعدہ کی حیثیت رکھتا ہے اور متعدد مسائل میں ان کے نزدیک اس کا اعتبار ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے اصول کی تائید حدیثِ وصیت سے ہوتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ثلثِ مال کی وصیت کی اجازت دی لیکن ساتھ ہی "والثلث کثیر" فرمایا (دیکھئے صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۸۳۔ کتاب الوصایا، باب أن یترك ورثته أغنیاء خیر من أن یتکففوا الناس) معلوم ہوا کہ ثلث کثیر ہے اور مقدارِ معتدبہ مادون الثلث ہے جو ربع ہے۔ ۱۲ م

[2] شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۲۱) باب تفضیل الحلق علی التقصیر ۱۲ م

[3] دیکھئے البحر الرائق (ج ۲ ص ۳۴۶) أواخر باب الإحرام۔ وشرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۲۱) باب تفضیل الحلق علی التقصیر ۱۲ مرتب

ہوگا، خارجِ حرم حلق کرانے سے دَم نہ ہوگا۔[1]

پھر اگر کسی شخص کے سر پر بال نہ ہوں تو اس کو چاہئے اپنے سر پر استرا پھروالے[2] اس لئے کہ بقدرِ استطاعت حکم کی تعمیل واجب ہے۔

پھر عورتوں کے حق میں حلق نہیں بلکہ صرف قصر مشروع ہے اور حلق ان کے حق میں مکروہ تحریمی ہے اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حلق سے منع فرمایا چنانچہ اگلے باب میں حضرت علیؓ سے مروی ہے "قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن تحلق المرأة رأسها" اگلے باب ہی میں حضرت عائشہ رضی سے بھی اسی مضمون کی ایک روایت مروی ہے، اس کے علاوہ عورت کے حق میں حلق ایک طرح کا مثلہ ہے، اس لئے اس کے حق میں مشروع یہی ہے کہ ایک پورے کے برابر بال کٹوالے[3]۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فى الطيب عند الإحلال قبل الزيارة

"وعن[4] عائشة قالت: طيّبت رسول الله صلى الله عليه وسلم قبل أن يحرم"

جمہور کے نزدیک احرام سے متصل پہلے ہر قسم کی خوشبو کا استعمال بلا کراہت جائز ہے[5] حدیثِ باب جمہور کی دلیل ہے۔

---

[1] مذاہب و دلائل کی تفصیل کے لئے دیکھئے بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (ج ۲ ص ۱۴۱) فصل وأما بيان زمانه ومكانه ۱۲ مرتب

[2] لما روى عن ابن عمر أنه قال: من جاء يوم النحر ولم يكن على رأسه شعر، أجرى الموسى على رأسه والقدوري رواه مرفوعًا إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، ولأنه إذا عجز عن تحقيق الحلق فلم يعجز عن التشبه بالحالقين وقد قال النبي صلى الله عليه وسلم: "من تشبه بقوم فهو منهم" بدائع الصنائع (ج ۲ ص ۱۴۱) فصل وأما الحلق أو التقصير ۱۲ مرتب

[3] تفصیل کے لئے دیکھئے بدائع (ج ۲ ص ۱۴۱) ۱۲ مرتب

[4] الحديث أخرجه البخاري فى صحيحه (ج ۱ ص ۲۰۸) باب الطيب عند الإحرام ـ ومسلم فى صحيحه (ج ۱ ص ۳۷۸) باب استحباب الطيب قبيل الإحرام فى البدن الخ ۱۲ م

[5] خواہ وہ خوشبو احرام کے بعد باقی رہے جیسے مشک یا اس کا اثر باقی رہے جیسے عود اور عرقِ گلاب وغیرہ، اور خواہ باقی نہ رہے کما فی العمدہ (ج ۹ ص ۱۵۱) باب الطیب عند الإحرام ۱۲ مرتب

امام مالکؒ کے نزدیک محرم کے لئے احرام سے پہلے ایسی خوشبو لگانا مکروہ ہے جس کا اثر احرام کے بعد بھی باقی رہے، امام محمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے، امام طحاویؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے حضرات صحابہ کرام میں سے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابن عمرؓ وغیرہم کا بھی یہی مسلک ہے[1]۔

" ویوم النحر قبل أن یطوف بالبیت بطیب فیه مسك " جمہور کے نزدیک حلق کے بعد طوافِ زیارت سے پہلے ہر قسم کی خوشبو کا استعمال بلا کراہت جائز ہے۔

جبکہ امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ جس طرح طواف زیارت سے پہلے صحبت جائز نہیں اسی طرح خوشبو کا استعمال بھی جائز نہیں، امام احمدؒ کی بھی ایک روایت اسی کے مطابق ہے[2]۔ ان حضرات کا استدلال اُس روایت سے ہے جو امام طحاویؒ نے نقل کی ہے "عن امّ قیس بنت محصن قالت : دخل علیّ عکاشة بن محصن وآخر فی منی مساء یوم الأضحیٰ فنزعا ثیابهما وترکا الطیب، فقلت : مالکما، فقالا : إن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال لنا: من لم یفض إلی البیت من عشیة هذه فلیدع الثیاب والطیب[3]"

جمہور کا استدلال حضرت عائشہؓ کی حدیثِ باب کے مذکورہ جملہ سے ہے[4] جہاں تک ام قیس بنت محصن کی روایت کا تعلق ہے وہ ابن لہیعہ کی وجہ سے حضرت عائشہؓ کی حدیثِ باب کا مقابلہ نہیں

---

[1] کذا فی معارف السنن (ج ۶ ص ۵۲۵)۔ نیز دیکھئے عمدہ (ج ۹ ص ۱۵۶) ان حضرات کے دلائل کے لئے دیکھئے شرح معانی الآثار (ج ۱ ص ۳۰۸ تا ص ۳۱۳) باب التطیب عند الإحرام ۱۲ مرتب

[2] تفصیلِ مذاہب کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص ۹۱) باب الطیب بعد رمی الجمار والحلق قبل الإفاضة ۱۲م

[3] شرح معانی الآثار (ج ۱ ص ۳۵۶) باب اللباس والطیب متی یحلان للمحرم ۱۲م

[4] نیز حضرت عائشہؓ ہی کی ایک اور روایت سے بھی ان کا استدلال ہے "عن عائشة قالت : قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم : إذا رمیتم وحلقتم فقد أحلّ لکم الطیب والثیاب وکل شیٔ إلا النساء" شرح معانی الآثار (ج ۱ ص ۳۵۶) باب اللباس والطیب متی یحلان للمحرم اس روایت میں اگرچہ ایک راوی حجاج بن ارطاۃ ہیں جو متکلم فیہ ہیں لیکن چونکہ اکثر حضرات کے نزدیک وہ قابلِ قبول ہیں اس لئے کوئی حرج نہیں۔ دیکھئے عمدہ (ج ۱۰ ص ۹۱) باب الطیب بعد رمی الجمار۔

نیز حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بھی جمہور کا استدلال ہے جو فرماتے ہیں "إذا رمیتم الجمرة فقد حل لکم کل شیٔ إلا النساء، فقال له رجل : والطیب، فقال : أما أنا فقد رأیت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یضمخ رأسه بالمسك أفطیب هو" اس روایت سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے عمدہ (ج ۱۰ ص ۹۲) ۱۲ مرتب

کرسکتی[1]۔

وقد روی عن عمر بن الخطاب أنه قال: حل له کل شئ إلا النساء والطیب[2]

وقد ذهب بعض أهل العلم إلی هذا من أصحاب النبی صلی الله علیه وسلم وغیرهم "وهو قول أهل الکوفة" امام ترمذیؒ کی روایت میں اہل الکوفہ سے مراد امام ابوحنیفہ اوران کے اصحاب نہیں بلکہ دوسرے اہل کوفہ ہیں[3] اس لئے کہ اس باب میں احناف کا مسلک جمہور کے مطابق ہے یعنی "حل له کل شئ إلا النساء"

طیب بعد الحلق کے عدمِ جواز کے بارے میں امام مالکؒ کی ایک قوی دلیل مستدرکِ[4] حاکم میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی حدیث ہے جو فرماتے ہیں: "من سنة الحج أن یصلی الإمام الظهر والعصر

---

[1] کما قال العینی فی العمدة (ج ۱۰ ص۹۱) ۔ والطحاوی فی شرح معانی الآثار (ج ۱ ص۳۵۶) باب اللباس والطیب الخ ۱۲ مرتب

[2] حضرت عمرؓ کا یہ اثر مؤطا امام محمدؒ میں اس طرح مروی ہے "أخبرنا مالك أخبرنا نافع وعبد الله بن دینار عن عبد الله بن عمر أن عمر بن الخطاب خطب الناس بعرفة فعلمهم أمر الحج وقال لهم فیما قال: ثم جئتم منی فمن رمی الجمرة التی عند العقبة فقد حل له ما حرم علیه إلا النساء والطیب، لایمس أحد نساء ولا طیبا حتی یطوف بالبیت" دیکھئے (ص۲۲۳، ۲۲۴) باب ما یحرم علی الحاج بعد رمی جمرة العقبة یوم النحر ۱۲ مرتب

[3] ان دوسرے اہل کوفہ کا مصداق احقر کو تحقیق کے باوجود معلوم نہ ہوسکا

علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے اہل کوفہ کا مصداق امام محمد بن الحسن شیبانیؒ کو قرار دیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں: "وما ذکره الترمذی من عدم الجواز قول أهل الکوفة فلیس هو مذهب أهل الکوفة من الإمام أبی حنیفة وأصحابه بل هو مذهب محمد بن الحسن الشیبانی من أصحابه کما صرح به فی المؤطا بعد روایة أثر عمر الفاروق فقال "وبهذا نأخذ ..... قال: وأما أبو حنیفة فإنه کان لا یری به بأسا" اهـ

آگے علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "هکذا عبارة الإمام محمد فی مؤطئه وما ذکره الشیخ المبارکفوری فی تحفته (ج ۲ ص۱۱۵ - مرتب) معزوا إلی المؤطأ فقد غلط وأخطأ فی نقل عبارته ولا أدری ما ذا حدث له، والله أعلم" معارف السنن (ج ۶ ص۵۲۶ ۔ وفی طبعة البنوریة ج ۶ ص۲۹۱)۔

لیکن بظاہر یہاں حضرت بنوری قدس سرہ سے تسامح ہوا ہے اور صحیح یہ ہے کہ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

والمغرب العشاء الآخرة والصبح بمنى، ثم يغدو إلى عرفة" آگے فرماتے ہیں: "فإذا رمى الجمرة الكبرى حل له كل شئ حرم عليه إلا النساء والطيب حتى يزور البيت" امام حاکمؒ اس روایت کے بعد فرماتے ہیں: "هذا حديث على شرط الشيخين ولم يخرجاه" حافظ ذہبیؒ نے

بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ

"أهل الكوفة" کا مصداق امام محمدؒ نہیں ہیں بلکہ وہ اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ اور جمہور کے ساتھ ہیں۔

دراصل یہاں دو مسئلے ہیں (جیسا کہ اصل تقریر میں بھی اس کی تفصیل آگئی ہے):-

ایک "طیب قبل الاحرام" کا مسئلہ، امام ابوحنیفہؒ اور جمہور اس کے جواز کے قائل ہیں، جبکہ امام محمدؒ امام مالکؒ کے ساتھ ہیں اور اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں (لیکن یہ مکروہ قرار دینا بھی صرف اس صورت میں ہے جبکہ خوشبو کا اثر بعد الاحرام بھی باقی رہے)

دوسرا مسئلہ "طیب بعد الحلق قبل طواف الزيارة" کا ہے اس مسئلہ میں بھی امام ابوحنیفہؒ اور جمہور جواز کے قائل ہیں بلکہ امام محمدؒ بھی جمہور کے ساتھ ہیں، البتہ امام مالکؒ اس مسئلہ میں بھی جواز کے قائل نہیں۔

پھر اس باب میں امام ترمذیؒ کی یہ عبارت: "وقد روي عن عمر بن الخطاب أنه قال: حل له كل شئ إلا النساء والطيب، وقد ذهب بعض أهل العلم إلى هذا من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم وغيرهم وهو قول أهل الكوفة" ظاہر ہے کہ دوسرے مسئلہ یعنی "طیب بعد الحلق قبل طواف الزيارة" سے متعلق ہے، اور امام محمدؒ چونکہ اس مسئلہ میں جمہور کے ساتھ ہیں اس لئے ان کے "اہل الکوفہ" کا مصداق بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لئے کہ یہ جمہور کے مقابلہ میں بعض کے مسلک کا بیان ہے اور جمہور کا مسلک امام ترمذیؒ "والعمل على هذا عند أكثر أهل العلم من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم وغيرهم يرون أن المحرم إذا رمى جمرة العقبة يوم النحر وذبح وحلق أو قصر فقد حل له كل شئ حرم عليه إلا النساء. وهو قول الشافعي وأحمد وإسحاق" سے بیان کرچکے ہیں، یہی مسلک امام محمدؒ کا بھی ہے

معارف السنن (ج ۶ ص ۵۲۶ وفي طبعة البنورية ج ۶ ص ۲۹۱) میں مؤطا امام محمد کے حوالہ سے امام محمدؒ کی جو عبارت ذکر کی گئی ہے اس کا یہاں ذکر کرنا درست نہیں اس لئے کہ بحث چل رہی ہے "طیب بعد الحلق قبل طواف الزيارة" کے بارے میں، امام ترمذیؒ کا قول "وهو قول أهل الكوفة" بھی اسی مسئلہ سے متعلق ہے، جبکہ حضرت بنوری قدس سرہ نے مؤطا امام محمد کی وہ عبارت نقل کی ہے جو "طیب قبل الاحرام" سے متعلق ہے۔

دراصل امام محمدؒ نے اپنی مؤطا میں "طیب قبل الاحرام" اور "طیب بعد الحلق قبل طواف الزيارة" دونوں مسئلوں پر

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بھی تلخیص المستدرک میں اس حدیث پر سکوت کیا ہے اسی بنا پر بعض حنفیہ نے امام مالکؒ کے قول کی تصحیح کی ہے[۱]۔ واللہ اعلم   تم شرح الباب بتغیر وزیادة من المرتب۔

باب[۲] ماجاء متی تقطع التلبیة فی الحج

عن[۳] ابن عباس عن الفضل بن عباس قال: أردفني رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من جمع إلی منی فلم یزل یلبي حتی رمی جمرة العقبة» حدیث باب اس پر دال ہے کہ حج میں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

علیحدہ علیحدہ دو مستقل باب قائم کئے ہیں، پہلے مسئلہ پر «باب من تطیب قبل أن یحرم» (ص۲۰۳ و ۲۰۴)۔ اس باب میں امام محمدؒ کے الفاظ یہ ہیں: «قال محمد: وبهذا نأخذ، لا أری أن یتطیب المحرم حین یرید الإحرام إلا أن یتطیب ثم یغتسل بعد ذلك، وأما أبو حنیفة فإنه کان لا یری به بأساً» اور دوسرے مسئلہ پر امام محمدؒ نے یہ باب قائم کیا ہے «باب ما یحرم علی الحاج بعد رمی جمرة العقبة یوم النحر (ص۲۲۳ و ۲۲۴) اس باب میں امام محمدؒ کے الفاظ یہ ہیں «قال محمد: وبهذا نأخذ في الطیب قبل زیارة البیت وندع ما روی عمر وابن عمر رضي الله عنهما، وهو قول أبي حنیفة والعامة من فقهائنا»

امام ترمذیؒ کے قول «وهو قول أهل الکوفة» کا تعلق دوسرے مسئلہ سے ہے جبکہ اس کے تحت معارف السنن میں امام محمدؒ کی پہلے مسئلہ سے متعلقہ عبارت نقل کی گئی ہے۔

غالباً حضرت بنوری قدس سرہٗ کی نظر سے مؤطا امام محمدؒ کا دوسرے مسئلہ سے متعلقہ باب اور اس کا «قال محمد» نہیں گذرا ورنہ وہ «وهو قول أهل الکوفة» کا مصداق امام محمدؒ کو نہ قرار دیتے۔ فتنبه والله أعلم وعلمه أتم وأحکم ۱۲ رشید اشرف عفی عنہ

[۳] (ج۱ ص۵۷) فضیلة الحج ماشیاً ۱۲ م

(حاشیہ صفحہ هذا)

[۱] چنانچہ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: «وذکر ابن فرشته في "شرح المجمع" عن "الخانیة": الصحیح أن الطیب لا یحل له، لأنه من دواعي الجماع وهو مذهب مالك، ویمکن حمل قول الترمذي (یعني قوله: «وهو قول أهل الکوفة») علی هذا القول» معارف السنن (ج۶ ص۵۲) ۱۲ مرتب

[۲] شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ

[۳] الحدیث أخرجه البخاري في صحیحه (ج۱ ص۲۰۹) باب الرکوب والارتداف في الحج۔ ومسلم في صحیحه (ج۱ ص۴۱۵) باب استحباب إدامة الحاج التلبیة حتی یشرع في رمی جمرة العقبة یوم النحر ۱۲ م

تلبیہ وقتِ احرام سے جمرۂ عقبہ کی رمی تک رہتا ہے۔ چنانچہ جمہور کا مسلک یہی ہے بلکہ امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ اس پر صحابہؓ و تابعینؒ کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ جمرۂ عقبہ کی رمی تک حج میں تلبیہ جاری رہتا ہے[۱]۔

البتہ امام مالکؒ، حضرت سعید بن المسیبؒ اور حضرت حسن بصریؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ حاجی جب عرفات روانہ ہو تو تلبیہ ختم کر دے[۲]۔ اور بعض سے منقول ہے کہ جب وقوف عرفہ کرے تو تلبیہ بند کر دے[۳]۔

ان حضرات کا استدلال طحاوی میں حضرت اسامہؓ بن زید کی روایت سے ہے " أنہ قال: کنت ردف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشیۃ عرفۃ فکان لا یزید علی التکبیر والتہلیل الخ[۴]"

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت تلبیہ کی نفی اور اس کے وقت کے ختم ہونے پر دلالت نہیں کرتی[۵]۔

بہرحال جمہور امت کے نزدیک حج میں جمرۂ عقبہ کی رمی تک تلبیہ مشروع ہے، پھر ان میں اختلاف ہے، امام ابو حنیفہؒ، سفیان ثوریؒ، امام شافعیؒ اور ابو ثورؒ کے نزدیک جمرۂ عقبہ پر پہلی کنکری

---

[۱] دیکھئے شرح معانی الآثار (ج ۱ ص ۳۵۵) باب التلبیۃ متی یقطعہا الحاج۔

علامہ عینیؒ لکھتے ہیں: "ودلیل الإجماع أن عمر بن الخطاب کان یلبی غداۃ المزدلفۃ بحضور ملأ من الصحابۃ وغیرہم فلم ینکر علیہ أحد منہم بذلک، وکذلک فعل عبد اللہ بن الزبیر ولم ینکر علیہ أحد ممن کانوا ہناک من أہل الآفاق من الشام والعراق والیمن ومصر وغیرہا، فصار ذلک إجماعاً لا یخالَفُ فیہ" عمدہ (ج ۱۰ ص ۲۵۲-۲۵۳) باب التلبیۃ والتکبیر غداۃ النحر ۱۲ مرتب

[۲] کذا فی العمدۃ (ج ۹ ص ۱۶۵) باب الرکوب والارتداف فی الحج، وفیہ: وروی نحو ذلک من عثمان وعائشۃ وروی عنہما خلاف ذلک، فقال الزہری والسائب بن یزید وسلیمان بن یسار وابن المسیب فی روایۃ: " یقطعہا حین یقف بعرفات" وروی ذلک عن علی بن أبی طالب وسعد بن أبی وقاص ۱۲ م

[۳] حوالہ بالا ۱۲ م

[۴] شرح معانی الآثار (ج ۱ ص ۳۵۳) باب التلبیۃ متی یقطعہا الحاج ۱۲ مرتب

[۵] جواب کی تفصیل کے لئے دیکھئے شرح معانی الآثار (ج ۱ ص ۳۵۴)۔

اس کے علاوہ امام طحاویؒ اس قسم کی روایات کا ایک اصولی جواب یہ دیتے ہیں کہ جو وہ صحابی جن سے یوم عرفہ میں ترکِ تلبیہ مروی ہے ان کی روایات سے زیادہ سے زیادہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انہوں نے دوسرے اذکار میں مشغول ہونے کی وجہ سے تلبیہ چھوڑ دیا اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس وقت تلبیہ کی مشروعیت کے قائل نہیں تھے اس لئے کہ تلبیہ کی مشروعیت کے باوجود دوسرے اذکار پڑھنے کی گنجائش موجود ہے۔ دیکھئے طحاوی (ج ۱ ص ۳۵۵) باب التلبیۃ متی یقطعہا الحاج ۱۲ مرتب

مارنے کے ساتھ ہی تلبیہ ختم ہو جائے گا، جبکہ امام احمدؒ، امام اسحاق اور بعض دوسرے حضرات کے نزدیک جمرۂ عقبہ کی رمی مکمل کرنے تک تلبیہ جاری رہے گا۔[1]

حدیثِ باب اپنے ظاہر کے اعتبار سے امام احمدؒ وغیرہ کی دلیل ہے[2]، حنفیہؒ شافعیہ وغیرہ کی دلیل بیہقی کی روایت ہے "عن ابی وائل عن عبد اللہ رمقت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلم یزل یلبی حتی رمی جمرۃ العقبۃ باوّل حصاۃ[3]" ان حضرات کے نزدیک حدیثِ باب بھی اسی پر محمول ہے۔

معتمر کے تلبیہ کا حکم | جہاں تک معتمر کے تلبیہ کا تعلق ہے سو بعض کے نزدیک معتمر جب حدودِ حرم میں داخل ہو جائے تو تلبیہ بند کر دے، بعض کے نزدیک جب مکہ کے مکانات نظر آنے لگیں تو اس وقت تلبیہ ختم کر دے، بعض کے نزدیک جب ان مکانات میں داخل ہو جائے اسوقت تلبیہ روک دے، لیثؒ کے نزدیک بیت اللہ کے پاس پہنچنے تک تلبیہ جاری رہیگا۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک معتمر حجرِ اسود کے استلام تک تلبیہ پڑھتا رہے گا، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ افتتاحِ طواف تک تلبیہ جاری رکھے گا، گویا امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا مسلک ایک ہی ہے اس لئے کہ استلامِ حجر ہی سے افتتاحِ طواف ہوگا۔ امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر اس نے میقات یا اس سے پہلے احرام باندھا ہے تو حدودِ حرم میں داخل ہوتے وقت تلبیہ بند کر دے گا اور اگر اس نے جعرانہ یا تنعیم سے احرام باندھا ہے تو بیوتِ مکہ میں داخل ہونے کے وقت یا مسجدِ حرام میں داخل ہونے کے وقت تلبیہ ختم کر دیگا اور ابن حزمؒ کے نزدیک عمرہ ختم ہونے تک تلبیہ جاری رہے گا۔[4]

امام ابوحنیفہؒ کا استدلال اگلے باب کی روایت سے ہے "عن ابن عباس قال۔ یرفع الحدیث۔ أنه کان یمسك عن التلبیة فی العمرة اذا استلم الحجر" واللہ اعلم (از مرتب عفا اللہ عنہ)

---

[1] دیکھئے عمدہ (ج ۹ ص۱۶۵) باب الرکوب والارتداف فی الحج ۱۲ م

[2] اس لئے کہ اس میں "فلم یزل یلبی حتی رمی جمرۃ العقبۃ" فرمایا گیا ہے نہ کہ "حتی بدأ الرمی" یا "حتی رمی بعضها" ۱۲ م

[3] عمدہ (ج ۹ ص۱۶۶) باب الرکوب الخ ۱۲ مرتب

[4] تفصیلِ مذاہب کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص۲۳-۲۴) باب صلاۃ الفجر بالمزدلفۃ ۱۲ مرتب

باب ماجاء فی طواف الزیارۃ باللیل

"عن ابن عباس وعائشۃ أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أخر طواف الزیارۃ إلی اللیل" لہٰذا یہ حدیثِ باب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے طوافِ زیارت رات کے وقت کیا لیکن دوسری تمام صحیح روایات[2] اس پر متفق ہیں کہ آپ نے طوافِ زیارت دن میں فرمایا تھا اس لئے حدیثِ باب میں شراح نے مختلف تاویلات کی ہیں۔

---

[1] الحدیث أخرجہ أبو داؤد فی سننہ (ج ۱ ص۲۷۴) باب الإفاضۃ فی الحج۔ وابن ماجۃ فی سننہ (ص۲۱۹) باب زیارۃ البیت ۱۲ م

[2] مثلاً :۔

(۱) صحیح مسلم میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت "عن ابن عمر أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أفاض یوم النحر ثم رجع فصلی الظہر بمنی، قال نافع: فکان ابن عمر یفیض یوم النحر ثم یرجع فیصلی الظہر بمنی ویذکر أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فعلہ" (ج ۱ ص۴۲۲) باب استحباب طواف الإفاضۃ یوم النحر۔

وفی صحیح البخاری: "وقال لنا أبو نعیم: ثنا سفیان عن عبید اللہ عن نافع عن ابن عمر أنہ طاف طوافاً واحداً ثم یقیل ثم یأتی منیً یعنی یوم النحر، ورفعہ عبد الرزاق، قال: حدثنا عبید اللہ" (ج ۱ ص۲۳۳) باب الزیارۃ یوم النحر۔

وفی سنن أبی داؤد: "عن ابن عمر أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أفاض یوم النحر ثم صلی الظہر بمنی یعنی راجعاً" (ج ۱ ص۲۷۴) باب الإفاضۃ فی الحج۔

(۲) صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ کی حدیثِ طویل کا یہ جملہ "ثم رکب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فأفاض إلی البیت فصلی بمکۃ الظہر" (ج ۱ ص۳۹۹ و ۴۰۰) باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

نیز سنن ابی داؤد میں حضرت جابرؓ کی حدیثِ طویل کا یہ جملہ "ثم رکب ثم أفاض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إلی البیت فصلی بمکۃ الظہر" (ج ۱ ص۲۶۶) باب صفۃ حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۳) سنن ابی داؤد میں حضرت عائشہؓ کی روایت: "قالت: أفاض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من آخر یومہ حین صلی الظہر ثم رجع إلی منیً" (ج ۱ ص۲۷۱) باب فی رمی الجمار

امام حاکمؒ نے مستدرک میں بھی یہ روایت ذکر کی ہے اور کہا ہے: "ھذا حدیث صحیح علی شرط مسلم"

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بعض نے کہا کہ لیل سے مراد "بعد الزوال" ہے[1] لیکن اس تاویل کا بُعد ظاہر ہے۔

بعض نے کہا کہ "طوافِ زیارت" سے مراد نفلی طواف ہے[2] اور ابن حبانؒ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دس تاریخ کو دن میں طوافِ زیارت فرمانے کے بعد اُسی رات میں نفلی طواف بھی کیا تھا[3] اور بھی متعدد روایات سے ثابت ہے کہ آپؐ منیٰ کی راتوں میں بیت اللہ شریف تشریف لیجاتے اور نفلی طواف کرتے تھے[4]

لیکن اس توجیہ پر یہ اشکال ہے کہ نفلی طواف کو طوافِ زیارت سے تعبیر کرنا بعید معلوم ہوتا ہے[5]

احقر کی رائے میں بہتر توجیہ یہ ہے کہ یہاں "أخّر" کے معنی "أذِن بالتاخیر" کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ آپؐ نے طوافِ زیارت رات کے وقت کرنے کی اجازت دی، یہ مطلب نہیں ہے

ولم یخرجاہ " حافظ ذہبیؒ نے بھی اس پر سکوت کیا ہے (ج ۱ ص۴۷۵) طواف الإفاضة ورمی الجمار۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ہے "حججنا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فأفضنا یوم النحر" (ج ۱ ص۲۳۳) باب الزیارۃ یوم النحر۔ اس روایت سے بھی متبادر یہی ہے کہ نہار مراد ہے ۱۲ مرتب عفی عنہ

(حاشیہ صفحۂ ھٰذا)

[1] گویا "لیل" سے "عشی" مراد ہے اور مطلب یہ ہے "أخر طواف الزیارۃ إلی العشی" اور عشی کا اطلاق اگرچہ راجح قول کے مطابق زوالِ شمس سے غروبِ شمس تک کے وقت پر ہوتا ہے لیکن ایک قول کے مطابق زوالِ شمس سے صبح تک کے وقت کو عشی کہا جاتا ہے، (لسان العرب ج ۱۵ ص۶۰) گویا "لیل" "عشی" کے مفہوم کا جزء ہے اور "لیل" بول کر ما بعد الزوال مراد لینا جزء بول کر کل مراد لینے کے قبیل سے ہے واللہ أعلم ۱۲ مرتب

[2] گویا زیارت سے زیارتِ محض یعنی لغوی زیارت مراد ہے ۱۲ م

[3] چنانچہ علامہ عینیؒ لکھتے ہیں: "الوجہ الثالث ماذکرہ ابن حبان من أنہ صلی اللہ علیہ وسلم رمی جمرۃ العقبۃ ونحر ثم تطیب للزیارۃ ثم أفاض فطاف بالبیت طواف الزیارۃ ثم رجع إلی منی فصلی الظہر بہا والعصر والمغرب والعشاء ورقد رقدۃ ثم رکب إلی البیت ثانیاً وطاف بہ طوافاً آخر باللیل" عمدہ (ج ۱۰ ص۶۱) باب الزیارۃ یوم النحر ۱۲ مرتب

[4] چنانچہ بیہقی میں روایت ہے "أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یزور البیت کل لیلۃ من لیالی منیٰ" کذا نقل العینی فی العمدۃ (ج ۱۰ ص۶۱) باب الزیارۃ یوم النحر ۱۲ مرتب

[5] مذکورہ توجیہات اور ان سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے عمدہ (ج ۱۰ ص۶۱) اور معارف السنن (ج ۶ ص۵۳۲ و ص۵۳۳) ۱۲ م

کہ آپ نے خود رات کے وقت طوافِ زیارت کیا[1]، اس کی دلیل یہ ہے کہ حدیثِ باب حضرت عائشہؓ سے مروی ہے اور سنن ابو داؤدؒ میں خود حضرت عائشہؓ ہی کی ایک دوسری روایت[2] سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے طوافِ زیارت دن کے وقت فرمایا اور ظہر کی نماز مکہ مکرمہ میں ادا فرمائی[3]، ظاہر ہے کہ اس دوسری روایت کی موجودگی میں حدیثِ باب کا ظاہری مطلب مراد نہیں ہو سکتا کہ آپ نے طوافِ زیارت رات کو کیا ورنہ ایک ہی صحابی کی دو صحیح روایات میں تعارض لازم آئے گا۔ واللہ اعلم

بابُ ماجاء فی نزول الأبطح

عن ابن[4] عمر قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم وأبو بكر وعمر وعثمان ينزلون الأبطح[5]. حدیثِ باب اس بات پر دال ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ سے واپسی کے موقعہ پر

---

[1] علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی توجیہ کی ہے فرماتے ہیں: "معناه جوّز تاخير الزيارة مطلقاً إلى الليل" فتح الملہم (ج ۳ ص ۱۹۷) باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ مرتب

[2] یعنی "حججنا مع النبي صلى الله عليه وسلم فأفضنا يوم النحر" سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۲۷۵) باب فی رمی الجمار ۱۲ م

[3] یوم النحر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز مکہ میں ادا فرمائی یا منیٰ میں؟ اس بارے میں روایات مختلف اور متعارض ہیں بعض نے ان میں تطبیق کی کوشش کی ہے، بعض نے ترجیح کی صورت اختیار کی ہے اور بعض نے توقف کیا ہے، پھر جن حضرات نے ترجیح دی ہے ان میں سے بعض نے صلوٰۃ بمنیٰ کو راجح کہا ہے اور بعض نے صلوٰۃ بمکہ کو۔ مسئلہ کی تفصیل کے لئے دیکھئے عمدہ (ج ۱۰ ص ۵۹) باب الزیارۃ یوم النحر۔ اور معارف السنن (ج ۶ ص ۵۳۴ تا ص ۵۳۶) ۱۲ م

[4] الحدیث أخرجه مسلم فی صحیحه (ج ۱ ص ۴۲۲) باب استحباب نزول المحصب یوم النفر الخ

[4] شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ

[5] الحدیث أخرجه مسلم فی صحیحه (ج ۱ ص ۴۲۲) باب استحباب نزول المحصب یوم النفر الخ۔ و ابن ماجۃ فی سننه (ص ۲۲۱) باب نزول المحصب ۱۲ م

[6] الأبطح وكذا البطحاء والبطيحة: يقال لمسيل واسع فيه دقاق الحصا۔ كذا فى معاجم اللغة۔ وأصبح كالعلم لبطحاء مكة، وهو مسيل واديها وهو المحصب، والتحصيب: النزول بالمحصب" معارف السنن (ج ۶ ص ۵۳۹)

ثم إن المحصب هذا بين منى ومكة، وأقرب إلى منى، ويقول عياض: وإلى منى يضاف. معارف السنن (ج ۶ ص ۵۴۲)

آج کل مکہ مکرمہ کے پھیلنے اور وسیع ہونے کے بعد نہ خیف بنی کنانہ باقی ہے نہ اس کی وادی، البتہ وہاں "مسجد الاجابہ" کے نام سے ایک مسجد ہے جس سے اس جگہ کی پہچان ہو سکتی ہے۔ معارف (ج ۶ ص ۵۴۳) ۱۲ مرتب

بطحاء مکہ یعنی محصّب میں نزول فرماتے تھے، حضراتِ شیخین اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کا بھی یہی عمل تھا اور بخاریؒ میں حضرت انس بن مالکؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بیان فرماتے ہیں: "أنه صلی الظهر والعصر والمغرب والعشاء ورقد رقدة بالمحصّب، ثم ركب إلى البيت فطاف به"

اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ "تحصیب" یعنی محصّب میں اترنا اور وہاں سونا یا رات گذارنا مناسکِ حج میں سے نہیں ہے، اسی باب میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت "ليس التحصيب بشيء إنما هو منزل نزله رسول الله صلی الله علیه وسلم" کا یہی مطلب ہے۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں اترنا اتفاقاً اور استراحت کے لئے تھا کسی منسکِ حج کو بجالانے کے لئے نہ تھا، نیز اگلے باب میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے "قالت: إنما نزل رسول الله صلی الله علیه وسلم الأبطح لأنه كان أسمح لخروجه" یعنی ابطح یا محصّب میں آپؐ کا ٹھہرنا اتفاقاً تو اگرچہ نہ تھا لیکن اس کا مقصود محض سفرِ مدینہ میں آسانی پیدا کرنا تھا اس لئے کہ وہ ایسی جگہ تھی کہ وہاں آرام بھی کیا جاسکتا تھا اور وہاں سے مدینہ روانہ ہونا بھی آسان تھا۔

پھر تحصیب اگرچہ منسکِ حج نہیں لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات شیخین وغیرہ رضی اللہ عنہم کے عمل کی وجہ سے بیشتر حضرات کے نزدیک وہ بہر حال مستحب ہے اگرچہ بعض حضرات استحباب کے بھی قائل نہیں مثلاً حضرت عائشہؓ، حضرت اسماءؓ، عروۃ بن الزبیرؓ اور سعید بن جبیرؒ۔

حنفیہ کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں اُترنا قصداً تھا لیکن مقصود سفرِ مدینہ میں صرف آسانی پیدا کرنا ہی نہ تھا بلکہ اللہ لطیف وخبیر کی قدرت کا اظہار مقصود تھا کہ جس وادی میں کفر پر قسمیں کھائی گئی تھیں اور مؤمنین سے مقاطعہ کیا گیا تھا (یعنی شعب ابی طالب میں) آج ان سب علاقوں میں اللہ جل شانہ نے مؤمنین کو فاتح بنا کر مشرکین کو مغلوب کر دیا، گویا آپؐ کا وہاں اترنے سے مقصود تذکیرِ نعمت اور تحدیثِ نعمت تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت اسامہ بن زیدؓ کی روایات[1] میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "نحن نازلون غداً بخيف بني كنانة" سے

---

[1] (ج (ص۲۳۷) باب من صلی العصر یوم النفر بالأبطح ۱۲ م

[2] حضرت ابوہریرہؓ کی روایت اس طرح ہے "قال رسول الله صلی الله علیه وسلم حين أراد قدوم مكة (بعد رجوعه من منى): منزلنا غداً إن شاء الله بخيف بني كنانة" انہی کی دوسری روایت اس طرح ہے

(باقی حاشیہ صـــ پر)

بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وادیٔ محصّب (یعنی خیف بنی کنانہ) میں اترنا قصدًا تھا جس کا تقاضا یہ ہے کہ تحصیب کو سنّتِ مقصودہ قرار دیا جائے، فلو ترکہ أحد بلا عذر یصیر بہ مسیئاً ، چنانچہ احناف کے نزدیک وہاں اترنا مسنون ہے، اگرچہ کچھ ہی دیر کے لئے ہو، یا کم از کم کچھ دیر کے لئے وہاں اپنی سواری ہی روک لے[۱]۔ واللہ أعلم (از مرتب عفا اللہ عنہ)

باب[۲] ماجاء فی حجّ الصبیّ

«عن[۳] جابر بن عبد اللہ قال: "رفعت امرأۃ صبیاً لہا إلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالت: یا رسول اللہ، ألہذا حج؟ قال: نعم، ولك أجر» اس پر ائمہ کا اتفاق ہے کہ بچہ پر حج فرض نہیں پھر اس پر بھی اتفاق ہے کہ بچہ اگر حج کرے تو درست ہوجاتا ہے، البتہ علامہ نووی نے امام ابوحنیفہؒ کا یہ مسلک لکھا ہے کہ ان کے نزدیک بچہ کا حج درست نہیں اور اس کا حج کرنا صرف ایک طرح کی مشق ہے اس کے بعد علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: "وھذا الحدیث

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

فرماتے ہیں: "قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الغد یوم النحر وھو بمنی، نحن نازلون غداً بخیف بنی کنانۃ حیث تقاسموا علی الکفر یعنی بذلك المحصّب" صحیح بخاری (ج ۱ ص۲۱۶) — کتاب المناسك باب نزول النبی صلی اللہ علیہ وسلم مکۃ۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ کی روایت اس طرح ہے، فرماتے ہیں: "قلت: یا رسول اللہ، أین تنزل غداً فی حجتہ، قال: وھل ترك لنا عقیل منزلاً ثم قال: نحن نازلون غداً بخیف بنی کنانۃ المحصّب حیث قاسمت قریش علی الکفر" صحیح بخاری (ج ۱ ص۴۳۲) کتاب الجہاد، باب إذا أسلم قوم فی دار الحرب ولہم مال وأرضون فہی لہم ۱۲ مرتب

(حاشیہ صفحہ ھٰذا)

[۱] مسئلۃ الباب کی تفصیل کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص۱۰۰ و ۱۰۱) باب المحصب - معارف السنن (ج ۶ ص۵۳۸ تا ص۵۴۵) نیز دیکھئے ہدایہ مع فتح القدیر (ج ۲ ص۱۸۶ و ۱۸۷) ۱۲ مرتب

[۲] شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲

[۳] الحدیث أخرجہ ابن ماجۃ فی سننہ (ص۲۰۹) باب حج الصبی ۱۲ م

یرد علیھم[1]"۔

لیکن صحیح یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی طرف عدمِ صحتِ حج کی نسبت درست نہیں[2] اور ان کا مذہب بھی یہی ہے کہ صبی کا حج صحیح ہے اور اس کا احرام منعقد ہو جاتا ہے، البتہ اگر وہ محظوراتِ احرام میں سے کسی چیز کا ارتکاب کرے تو صبی یا ولی کسی پر بھی دم یا فدیہ وغیرہ واجب نہیں۔

پھر اگر صبی ممیّز ہے تو وہ خود مناسکِ حج ادا کرے گا اور اگر غیر ممیز ہے تو ولی نیت، تلبیہ اور دوسرے افعال میں اس کی نیابت کرے گا اور احرام کی ابتدا میں اس کے سِلے ہوئے کپڑے اُتار کر ازار و ردار پہنائیگا۔

پھر اس پر بھی اتفاق ہے کہ بچّہ کا یہ حج نفلی ہوگا جس کا ثواب اس کے ولی کو ملیگا اور بالغ ہونے کے بعد اس کو فریضۂ حج مستقلاً ادا کرنا ہوگا، البتہ داؤد ظاہریؒ کے نزدیک اسی حج سے اس کا فریضہ ادا ہو جائیگا اور بلوغ کے بعد مستقلاً اس کے ذمہ میں واجب نہ ہوگا[3]۔

پھر اگر صبی نے قبل البلوغ احرام باندھا، پھر طواف کرنے سے پہلے وقوفِ عرفہ سے پہلے وہ بالغ ہوگیا اور اس نے حج مکمل کر لیا تب بھی حنفیہ کے نزدیک اس کو فریضۂ حج مستقلاً ادا کرنا ہوگا جبکہ امام شافعیؒ کے نزدیک اُسی حج سے وہ فریضہ سے سبکدوش ہو جائیگا، پھر اگر وہ پچھلا احرام ختم کردے اور نئے سرے سے دوبارہ احرام باندھ کر وقوفِ عرفہ کرلے تو حنفیہ کے نزدیک بھی اس کا فریضۂ حج ادا ہو جائیگا[4]۔ (از مرتّب عفا اللہ عنہ)

بابٌ[5] (بلا ترجمہ)

عن[6] جابر قال: کنا إذا حججنا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فکنا نلبی عن النساء،

[1] دیکھئے شرح نووی علی الصحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۳۲) باب صحۃ حج الصبی وأجر من حج بہ ۱۲ م

[2] علامہ بنوریؒ لکھتے ہیں: "وھذہ النسبۃ غیر صحیحۃ فقد اتفقت کلمات المشائخ للحنفیۃ کلھم بل کلام الأئمۃ من محمد بن الحسن إلی الشرنبلالی و ابن عابدین إلی أن حجۃ صحیح وإحرامہ منعقد" معارف السنن (ج ۶ ص ۵۴۶) ۱۲ مرتب

[3] تفصیل کے لئے دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۵۴۶ تا ص ۵۴۸) اور عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص ۲۱۶ و ص ۲۱۷) باب حجۃ الصبیان ۱۲ مرتب

[4] دیکھئے مبسوط سرخسی (ج ۴ ص ۱۷۳ و ۱۷۴) باب المواقیت، قبیل باب الذی یفوتہ الحج ۱۲ مرتب

[5] شرح باب از مرتب ۱۲

[6] ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت احقر کو صحاحِ ستہ میں سے کسی کتاب میں نہ مل سکی البتہ سنن ابن ماجہ میں یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے "عن جابر قال: حججنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومعنا النساء والصبیان فلبینا عن الصبیان ورمینا عنھم" (ص ۲۱۷) باب الرمی عن الصبیان ۱۲ مرتب

وترمی عن الصبیان" بظاہر حدیثِ باب سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد عورتوں کی جانب سے تلبیہ پڑھ سکتے ہیں حالانکہ اس پر اتفاق ہے کہ مردوں کا عورتوں کی جانب سے تلبیہ پڑھنا درست نہیں اور عورتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود تلبیہ پڑھیں۔ البتہ ان کے لئے رفعِ صوت مکروہ ہے۔

اس لئے حدیث باب کا جواب یہ ہے کہ اول تو وہ اشعث[1] بن سوار کی وجہ سے ضعیف ہے، دوسرے اگر یہ حدیث ثابت بھی ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں تلبیہ میں رفع صوت نہ کریں گی اس لئے کہ فتنہ کا خطرہ ہے، جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "أفضل الحج العج والثج"[2] (یعنی افضل ترین حج وہ ہے جس میں زور زور سے تلبیہ پڑھا جائے اور خون بہایا جائے یعنی بکثرت قربانی کی جائے) کا تعلق ہے سو رفعِ صوت بالتلبیہ کی فضیلت ان کو مردوں کے رفعِ صوت بالتلبیہ سے حاصل ہو جائے گی واللہ اعلم (از مرتب عفا اللہ عنہ)[3]

باب[4] ماجاء في الحج عن الشيخ الكبير والميّت

عن[4] عبد الله بن عباس عن الفضل بن عباس أن امرأة من خثعم قالت: يارسول الله! إن أبي أدركته فريضة الله في الحج وهو شيخ كبير لا يستطيع أن يستوي على ظهر البعير قال: حجي عنه" اس باب کے تحت مسئلۃ النیابۃ فی العبادۃ زیرِ بحث آتا ہے جس سے متعلق اصولی بحث پہلے گذر چکی ہے[5] کہ حنفیہ کے نزدیک جو عبادات محض مالی ہیں ان میں نیابت درست ہے جو محض بدنی ہیں ان میں نیابت درست نہیں اور جو عبادات مالی بھی ہوں اور بدنی بھی، جیسے حج، ان میں عند العجز[6] نیابت درست ہے۔

---

[1] حافظ ابن حجرؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "ضعیف، من السادسة" تقریب التہذیب (ج ۱ ص ۸۰، رقم ۱۰) ۱۲ م

[2] سنن ترمذیؒ (ج ۱ ص ۱۳۲) باب ماجاء في فضل التلبية والنحر۔ سنن ابن ماجہ (ص ۲۱۰) باب رفع الصوت بالتلبية ۱۲ م

[3] شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲

[4] الحديث أخرجه البخاري في صحيحه (ج ۱ ص ۲۵۰) أبواب العمرة، باب الحج عمن لا يستطيع الثبوت على الراحلة ومسلم في صحيحه (ج ۱ ص ۴۳۱) باب الحج عن العاجز لزمانة وهرم ونحوهما وللموت ۱۲ م

[5] دیکھئے درس ترمذی (ج ۲ ص ۱۹۱ تا ۱۹۳) مسئلۃ النیابۃ فی العبادۃ ۱۲ م

[6] عجز سے دائمی مستمر الی وقت الموت مراد ہے کما فی الہدایہ (ج ۱ ص ۲۹۶) باب الحج عن الغیر ۱۲ م

لیکن حضرت ابن عمرؓ، قاسمؒ اور ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں "لا یحج عن أحد" یعنی حج میں نیابت درست نہیں۔

امام مالکؒ اور لیثؒ فرماتے ہیں کہ حج میں نیابت درست نہیں البتہ اگر کسی میت پر حج فرض تھا اور وہ اپنی زندگی میں اس فریضہ کو ادا نہ کرسکا تو اس کی طرف سے حج کرنا درست ہے لیکن وہ حج اس کے فریضہ کے قائم مقام نہ ہوگا، پھر امام مالکؒ کے نزدیک اگر میت نے اپنی جانب سے حج کرنے کی وصیت کی تھی تو اس کی وہ وصیت ثلثِ مال میں نافذ ہوگی[1]۔

امام شافعیؒ کے نزدیک عند العجز نیابت فی الحج درست ہے، اور اگر میت کے ذمہ میں حج فرض تھا یا نذر کی وجہ سے اس کے ذمہ میں لازم تھا اب اس کی حیثیت دَین کی سی ہے جس کی اس کی جانب سے ادائیگی ضروری ہے لہٰذا وہ وصیت کرے یا نہ کرے بہرصورت اس کی جانب سے حج کرانا ورثہ کے ذمہ لازم ہے خواہ اس حج کرانے میں کلِ مال خرچ ہو جائے[2]۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بھی عند العجز نیابت فی الحج درست ہے جب کہ اس کے بارے میں ہم اصولی قاعدہ بیان کر چکے ہیں۔

پھر اس میں ان کے نزدیک تفصیل یہ ہے کہ اگر میت کے ذمہ میں حج لازم تھا اور اس نے اپنی جانب سے حج کرانے کی وصیت نہیں کی تو ورثہ کے ذمہ اس کی جانب سے حج کرانا لازم نہ ہوگا اور میت تفویتِ فرض اور ترکِ وصیت کی وجہ سے گنہگار ہوگا، البتہ اگر وصیت کے بغیر ہی کسی وارث یا اجنبی آدمی نے اس کی جانب سے حج کر دیا اس کے بارے میں وہ فرماتے ہیں:۔ "وأرجو أن یجزیه ذلك إن شاء الله تعالیٰ"۔

اور اگر میت نے اپنی جانب سے حج کرانے کی وصیت کی تھی تو اس کی وہ وصیت ثلثِ مال میں نافذ ہوگی، اگر ثلثِ مال میں سے اس کی جانب سے حج کرانا ممکن ہو تو ورثہ کے ذمہ میں اس وصیت کو پورا کرنا لازم ہوگا جس کی صورت یہ ہوگی کہ میت کے وطن سے حج بدل کرنے کے لئے کسی کو بھیجا جائیگا، اگر ثلث مال میں وطن سے حج کرانا ممکن نہ ہو تو قیاس کے مطابق تو وصیت باطل ہو کر اس ثلث میں بھی میراث جاری ہوگی لیکن استحساناً میت کو اس فریضہ سے سبکدوش کرنے کے لئے اس علاقہ سے کسی کو حج بدل کیلئے

---

[1] دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص ۲۱۳) باب الحج والنذور عن المیت والرجل یحج عن المرأۃ ۱۲ مرتبہ

[2] دیکھئے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۳۱) باب الحج عن العاجز الخ ۱۲ م

بھیجا جائے گا جہاں سے ثلث مال حج کے لئے کافی ہو جائے[1] ۔ واللہ أعلم

(شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ)[2]

باب ما جاء فی العمرة أواجبة هی أم لا؟

• عن[3] جابر أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سُئل عن العمرة[4] أواجبة هی؟

قال: لا، و أن یعتمروا هو أفضل» امام شافعیؒ، امام احمدؒ، ابو ثورؒ، ابو عبیدؒ، سفیان ثوریؒ اور اوزاعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ عمرہ واجب ہے، صحابہؓ میں سے حضرت ابن عباسؓ اور تابعین کی ایک جماعت کا یہی مسلک ہے۔

زرقانیؒ نے امام مالکؒ کا مسلک یہ نقل کیا ہے کہ وہ سنتِ مؤکدہ ہے[5]۔

جہاں تک احناف کا تعلق ہے سو ان میں سے بعض کے نزدیک تو وہ فرضِ کفایہ ہے چنانچہ محمد بن الفضلؒ جو مشائخ بخارا میں سے ہیں ان کا یہی مسلک ہے[6]۔

صاحبِ بدائعؒ فرماتے ہیں کہ عمرہ ہمارے اصحاب کے نزدیک واجب ہے جیسے صدقۃ الفطر، اضحیہ اور وتر[7]۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (ج ۲ ص۲۲۱ و ص۲۲۲) فصل: وأما بیان حکم فوات الحج ۱۲ مرتب

[2] شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲

[3] الحدیث لم یخرجه أحد من أصحاب الکتب الستة غیر الترمذی ۔ قاله الشیخ محمد فؤاد عبد الباقی ۔ سنن ترمذی (ج ۳ ص۲۷۱، رقم الحدیث ۹۳۱) ۱۲ م

[4] والعمرة فی اللغة: الزیارة، یقال: اعتمر، أی: زار و قصد، وقیل: مشتقة من عمارة المسجد الحرام وشرعًا: زیارة البیت الحرام بشروط مخصوصة مذکورة فی الفقه، قاله البدر والشهاب ۔

والعمرة: بضم العین والمیم، وبضم العین وسکون المیم، و بفتح العین وسکون المیم، کما فی شرح المهذب (۷ ـ ۹) کذا فی معارف السنن (ج ۶ ص۵۵۷) ۱۲ مرتب

[5] قال مالك: العمرة سنة لا أعلم أحدًا من المسلمین أرخص فی ترکها، وحمل قوله عامة المالکیة علی التأکد دون الوجوب کما سیأتی فی محله، کذا فی أوجز المسالك (ج ۳ ص۳۹۰) جامع ما جاء فی العمرة ۱۲ م

[6] کذا فی الأوجز (ج ۳ ص۳۹۰) ۱۲ م

[7] بدائع الصنائع (ج ۲ ص۲۲۶) فصل: وأما العمرة ۱۲ م

لیکن راجح یہ ہے کہ عمرہ واجب نہیں بلکہ سنتِ مؤکدہ ہے[1]، مسئلہ کی تفصیل کے لئے اوجز المسالک کی طرف مراجعت کریں۔

پھر حنفیہ کے نزدیک عمرہ زندگی میں ایک مرتبہ سنتِ مؤکدہ ہے[2]، اور تکثیرِ عمرہ مکروہ نہیں بلکہ مستحب ہے[3]، البتہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک پانچ دنوں میں عمرہ مکروہ ہے، یوم عرفہ، یوم النحر اور ایام تشریق کے تین دن یعنی گیارہویں، بارہویں اور تیرھویں تاریخ میں۔ جبکہ امام ابویوسفؒ کے نزدیک ان پانچ میں سے یوم النحر میں تو مکروہ نہیں البتہ بقیہ چار میں مکروہ ہے[5]۔

امام مالکؒ، حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ وغیرہ کے نزدیک سال میں ایک سے زائد عمرہ مکروہ ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک ایک سال میں تکثیرِ عمرہ میں کوئی حرج نہیں بلکہ مستحب ہے، امام احمدؒ کا مسلک بھی یہی ہے، البتہ اثرمؒ نے ان کی یہ روایت نقل کی ہے: "إن شاء اعتمر في كل شهر[6]" واللہ أعلم

باب منه

عن[1] ابن عباس عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "دخلت العمرة في الحج إلى يوم القيامة" جمہور کے نزدیک حدیثِ باب کا مطلب یہ ہے کہ اشہرِ حج میں عمرہ درست ہے، گویا اہلِ

---

[1] قال ابن عابدين نقلاً عن البحر: "والظاهر من الرواية السنية، فإن محمداً نص على أن العمرة تطوع" رد المحتار على الدر المختار (ج ۲ ص۱۵۱) مطلب في أحكام العمرة ۱۲ م

[2] (ج ۳ ص۳۸۹ و ۳۹۰) جامع ما جاء في العمرة۔

صاحب اوجزؒ نے اس بحث کے تحت لکھا ہے: "واختلفت نقلة المذاهب في بيان مسالك الأئمة في ذلك، ولعل ذلك لاختلاف الروايات عنهم" ۱۲ مرتب

[3] چنانچہ علامہ شامی درمختار کی عبارت "والعمرة في العمر سنة مؤكدة" کے تحت لکھتے ہیں: "أي إذا أتى بها مرة فقد أقام السنة غير مقيد بوقت غير ما ثبت النهي عنها فيه" ردّ المحتار (ج ۲ ص۱۵۱) مطلب في أحكام العمرة ۱۲ مرتب

[4] حوالۂ بالا ۱۲ م

[5] كذا في العمدة (ج ۱۰ ص۱۰۸) أبواب العمرة، وجوب العمرة وفضلها ۱۲ م (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جاہلیت کے عقیدہ کی تردید مقصود ہے جو یہ کہتے تھے کہ اشہر حج میں عمرہ جائز نہیں۔

اس کا دوسرا مطلب جوازِ قران بیان کیا گیا ہے، گویا تقدیر کلام یہ ہے "دخلت أفعال العمرة في أفعال الحج إلی یوم القیامة" یعنی عمرہ کے افعال کو حج کے افعال کے ساتھ ملا کر اس طرح ادا کیا جائے کہ حجِ قران کی صورت پیدا ہو جائے[1]۔

بعض حضرات نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے "سقوط العمرة ودخولها في الحج" یعنی عمرہ واجب نہیں ہے، لیکن علامہ نوویؒ نے اس تاویل کو ضعیف کہا ہے[2]۔

حدیثِ باب کا ایک مطلب جواز فسخ الحج الی العمرة[3] بیان کیا گیا ہے علامہ نوویؒ نے اس تاویل کو بھی ضعیف کہا ہے[4] واللہ أعلم۔[5] از مرتب عفا اللہ عنہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

[۱] دیکھئے المغنی لابن قدامہ (ج ۳ ص۲۲۶) فصل: ولا بأس أن یعتمر في السنة مراراً۔ اور عمدة القاری (ج ۱۰ ص۱۰۸) وجوب العمرة وفضلها ۱۲ مرتب

[۲] شرحِ باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲

[۳] الحدیث أخرجه أبو داود في سننه (ج ۱ ص۲۴۹) باب في إفراد الحج ۱۲ م

(حاشیہ صفحہ ھذا)

[1] علامہ بنوریؒ فرماتے ہیں: "قال شیخنا: المراد به (أي الحدیث) دخول العمرة في الحج، یعني: أداءها مع الحج بصورة التمتع أو القران" معارف السنن (ج ۶ ص۵۶۱) ۱۲ مرتب

[2] شرح نوویؒ علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۳۹۳) باب بیان وجوه الإحرام الخ (قبیل باب حجة النبي صلی اللہ علیہ وسلم) صاحبِ فتح الملہم علامہ نوویؒ کے قول "وهذا ضعیف" کے تحت بطور دلیل لکھتے ہیں: "لأنه یقتضي النسخ بغیر دلیل" دیکھئے (ج ۳ ص۲۷۲) ۱۲ مرتب

[3] فسخ الحج الی العمرة سے متعلق کسی قدر بحث پیچھے "باب ما جاء في التمتع" کے تحت گذر چکی ہے فلیراجع ۱۲ م

[4] شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۳۹۳)

صاحب فتح الملہم اس مقام پر علامہ نوویؒ کے قول "وهذا أیضاً ضعیف" کے تحت لکھتے ہیں: "وتعقب بأن سیاق السؤال یقوي هذا التأویل، بل الظاهر أن السؤال وقع عن الفسخ والجواب وقع عما هو أعم من ذلك حتی یتناول التأویلات المذکورة إلا الثالث والله أعلم۔ کذا في فتح الباری۔ دیکھئے فتح الملہم (ج ۳ ص۲۷۲) ۱۲ مرتب

[5] اس باب سے متعلقہ تمام تفصیل شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۳۹۳، باب بیان وجوه الإحرام) سے ماخوذ ہے ۱۲ م

باب[1] ماجاء فی العمرة من التنعیم

عن عبد الرحمٰن[2] بن أبی بکر أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أمر عبد الرحمٰن بن أبی بکر أن یعمر عائشة من التنعیم[3] " اس حدیث سے استدلال کر کے ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ جو شخص مکہ میں ہو عمرہ کے لئے اس کی میقات تنعیم ہے۔ یعنی مکہ سے تنعیم آکر احرام باندھنا چاہیئے۔

جبکہ ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ اہلِ مکہ کے لئے عمرہ کی میقات حل ہے خواہ وہ تنعیم ہو یا حل کا کوئی اور حصہ۔ ائمہ اربعہؒ کا یہی مذہب ہے،

جہاں تک حدیثِ باب کا تعلق ہے سو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حضرت عبد الرحمٰن بن ابی بکرؓ کو یہ حکم دیا تھا کہ حضرت عائشہؓ کو تنعیم سے عمرہ کرا دے اس میں تنعیم کو مقرر کرنا اس لئے نہیں تھا کہ اہلِ مکہ کے لئے میقاتِ عمرہ تنعیم ہی متعین تھی بلکہ اصل مقصود تو حل ہی تھا لیکن چونکہ تنعیم دوسری حدودِ حل کے مقابلہ میں قریب تھی اس لئے آپؐ نے تنعیم سے عمرہ کرانے کے لئے کہا[4]، اس کی تائید خود حضرت عائشہؓ کی روایت سے ہوتی ہے " قالت:

---

[1] شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲

[2] الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحه (ج ۱ ص ۲۳۹) أبواب العمرة، باب عمرة التنعیم ـ ومسلم فی صحیحه (ج ۱ ص ۳۹۱) باب بیان وجوه الإحرام الخ ۱۲ م

[3] التنعیم: بفتح المثناة وسکون النون وکسر المهملة: مکان معروف خارج مکة وهو علی أربعة أمیال من مکة الی جهة المدینة، کما نقله الفاکهی ..... وروی الفاکهی من طریق عبید بن عمیر قال: إنما سمی التنعیم لأن الجبل الذی عن یمین الداخل یقال له: ناعم، والذی عن الیسار یقال له: منعم، والوادی: نعمان " فتح الباری (ج ۳ ص ۴۸۳ و ۴۸۴) باب عمرة التنعیم ۱۲ مرتب

[4] لیکن اس توجیہ پر اشکال ہو سکتا ہے کہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: قال المحب الطبری: التنعیم أبعد من أدنی الحل إلی مکة بقلیل ولیس بطرف الحل، بل بینهما نحو من میل، ومن أطلق علیه أدنی الحل فقد تجوز " (فتح الباری ج ۳ ص ۴۸۳ و ۴۸۴، باب عمرة التنعیم) جس سے معلوم ہوا کہ تنعیم " ادنی الحل " نہیں بلکہ حدودِ حرم سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر ہے لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادنی الحل کو چھوڑ کر تنعیم سے عمرہ کرانے کے لئے کہنا بظاہر اس بات کی دلیل ہے کہ مقصود تنعیم سے عمرہ کرانا ہے نہ کہ حل سے۔ جیسا کہ پہلی جماعت کا مسلک یہی ہے۔

لیکن اس کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ ادنی الحل کے قریب معروف جگہ تنعیم ہی تھی اس لیے آپ نے تنعیم کا ذکر فرمایا، اس کے علاوہ احوط بھی یہی تھا، اس لئے کہ تنعیم پہنچ کر حدودِ حرم سے باہر نکل آنے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ بہرحال راجح یہی ہے کہ اہلِ مکہ کے لئے میقاتِ عمرہ حل ہی ہے اور تنعیم کو قرب کی وجہ سے اختیار کیا گیا، پھر تنعیم بھی اگرچہ ادنی الحل کے مقابلہ میں دور ہے لیکن بقیہ جہاتِ حل کی نسبت سے وہ بہرحال قریب ہے۔ چنانچہ حافظؒ نے بھی کہا ہے کہ تنعیم کو ادنی الحل قرار دینا یا تجوزاً ہے یا دوسری جہاتِ حل کی نسبت سے اس کو ادنی الحل کہا گیا ہے (دیکھئے فتح ج ۳ ص ۴۸۳) واللہ أعلم ۱۲ مرتب عفی عنہ

دخل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسرف وأنا أبکی، فقال: ما ذاك؟ قلت: حضت، قال: فلا تبکی، اصنعی ما یصنع الحاج، فقدمنا مكة ثم أتینا منیً، ثم غدونا إلی عرفة، ثم رمینا الجمرة تلك الأیام، فلما كان یوم النفر ارتحل فنزل الحصبة، قالت: واللہ ما نزلها إلا من أجلی، فأمر عبد الرحمن بن أبی بكر فقال: احمل أختك، فأخرجها من الحرم، قالت: واللہ ما ذكر الجعرانة ولا التنعیم فلتهل بعمرة، فكان أدنانا من الحرم التنعیم، فأهللت بعمرة الخ[1]" اس روایت میں "فكان أدنانا من الحرم التنعیم" کے الفاظ اس پر دال ہیں کہ تنعیم کو عمرہ کی خاص میقات ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے اختیار کیا گیا تھا کہ دوسری حدودِ حل کے مقابلہ میں حل کی یہ قریب ترین جگہ تھی[2]۔

امام بخاریؒ کے صنیع سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ مکی جس طرح حج کا احرام مکہ ہی سے باندھتا ہے وہ عمرہ کا احرام بھی مکہ ہی سے باندھیگا[3]۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مسلک جمہور امت کے خلاف اور امام بخاری کا تفرد[4] ہے، اور جمہور امت

---

[1] شرح معانی الآثار (ج ۱ ص۳۶۲) باب المکی یرید العمرة من أین ینبغی له أن یحرم بها ۱۲ م

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے المغنی لابن قدامہ (ج ۳ ص۲۵۸ تا ۲۶۰) باب ذكر المواقیت، مسألة: قال: وأهل مكة إذا أرادوا العمرة فمن الحل الخ — اور طحاوی (ج ۱ ص۳۶۱ و ۳۶۲) باب المکی یرید العمرة الخ - اور معارف السنن (ج ۶ ص۵۶۶ تا ۵۶۹) ۱۲ م

[3] اس لئے کہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایک باب قائم کیا ہے "باب مهل أهل مكة للحج والعمرة" اور اس کے تحت حضرت ابن عباسؓ کی روایت ذکر کی ہے "قال: إن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقت لأهل المدینة ذا الحلیفة ولأهل الشام الجحفة ولأهل نجد قرن المنازل ولأهل الیمن یلملم هن لهن ولمن أتی علیهن من غیرهن ممن أراد الحج والعمرة ومن كان دون ذلك فمن حیث أنشأ حتی أهل مكة من مكة" (ج ۱ ص۲۰۶)

علامہ عینیؒ اس کے تحت لکھتے ہیں: "إنما غرضه بیان مهل أهل مكة، ولهذا ترجم بقوله باب مهل أهل مكة للحج والعمرة ومحل الشاهد هو قوله "حتی أهل مكة من مكة" كما ذكرنا، وهذا بظاهره یدل علی أن مهلهم هو مكة سواء كان للحج أو العمرة، ولكن مهل أهل مكة للعمرة الحل كما سیجیء بیانه" عمدة القاری (ج ۹ ص۱۴۱) ۱۲ مرتب

[4] چنانچہ علامہ بنوریؒ لکھتے ہیں: "وبالجملة اتفقت الأئمة والأمة علی میقات إحرام المعتمر من أهل مكة الحل دون الحرم، وقد أفاض ابن قدامة فی التدلیل علیه فقهاً وروایةً، فإذن البخاری تفرد به فی الأمة بجواز إحرام أهل مكة من مكة ومن جملة ما استدل علی الخروج إلی الحل بأن یتحقق نوع سفر فی الخروج - واللہ أعلم" معارف السنن (ج ۶ ص۵۶۸ و ۵۶۹) ۱۲ مرتب

کا یہی مسلک ہے کہ مکی حج کا احرام اگرچہ مکہ سے باندھیگا لیکن عمرہ کا احرام اس کے لئے حل سے باندھنا ضروری ہے[1]۔ واللہ اعلم (از مرتب عفا اللہ عنہ)

باب ماجاء[2] فی عمرۃ رجب

عن[3] عروۃ قال: سئل ابن عمر فی أی شھر اعتمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟

فقال: فی رجب، فقالت عائشۃ: ما اعتمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إلا وھو معہ - تعنی ابن عمر - وما اعتمر فی شھر رجب[4] قط" اس روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رجب میں عمرہ کرنے سے متعلق حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عمرؓ کے بیان متعارض ہیں، حضرت عائشہؓ کی جانب سے عمرۂ رجب کا انکار ہے اور حضرت ابن عمرؓ کی جانب سے عمرۂ رجب کا اثبات، اسی باب میں حضرت ابن عمرؓ ہی کی اگلی روایت سے بھی عمرۂ رجب کا اثبات ہو رہا ہے " عن مجاھد عن ابن عمر أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اعتمر أربعا إحداھن فی رجب"۔

لیکن یہ تعارض بخاری کی روایت سے دور ہوجاتا ہے " عن مجاھد قال: دخلت أنا وعروۃ بن الزبیر المسجد فإذا عبداللہ بن عمر جالس إلی حجرۃ عائشۃ و إذا أناس یصلون فی المسجد صلوٰۃ الضحی، قال: فسألناہ عن صلوٰتھم، فقال: بدعۃ[5]، ثم قال لہ: کم اعتمر النبی صلی اللہ

[1] کما فی المغنی لابن قدامۃ (ج ۳ ص۲۵۸ و ۲۵۹) باب ذکر المواقیت ۱۲ م

[2] شرح باب از مرتب ۱۲

[3] الحدیث أخرجہ البخاری فی صحیحہ (ج ۱ ص۲۳۸ و ۲۳۹) أبواب العمرۃ، باب کم اعتمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم و مسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص۴۰۹) باب بیان عدد عمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم و زمانھن۔

[4] لفظ "رجب" کے منصرف اور غیر منصرف ہونے میں اختلاف ہے، دونوں ہی قول ہیں، خواہ کسی بھی قول کو ترجیح حاصل ہو، اس مقام پر بہرحال لفظ "رجب" منصرف ہے، اس لئے کہ اگر غیر منصرف ہونے کے قول کو ترجیح دیجائے تب بھی "إذا نکر صرف" کے قاعدہ سے یہاں منصرف ہوگا، البتہ ترجمۃ الباب میں غیر منصرف پڑھنے کی گنجائش ہے۔ دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص۵۰۲ و ۵۰۳) ۱۲ مرتب

[5] الظاھر أنھا لم تثبت عندہ، فلذلک أطلق علیھا البدعۃ، وقیل: أراد أنھا من البدع المستحسنۃ کما قال عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فی صلاۃ التراویح: "نعمت البدعۃ ھذہ" وقیل: أراد أن إظھارھا فی المسجد والاجتماع لھا ھو البدعۃ لا أن نفس تلک الصلاۃ بدعۃ وھذا ھو الأوجہ" کذا فی العمدۃ (ج ۱۰ ص۱۱۱) باب کم اعتمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ مرتب

عليه وسلم ؟ قال : أربع، إحداهن فی رجب، فكرهنا أن نرد عليه، قال : وسمعنا استنان عائشة أم المؤمنين في الحجرة فقال عروة : يا أماه يا أم المؤمنين، ألا تسمعين ما يقول أبو عبد الرحمٰن؟ قالت : ما يقول ؟ قال : يقول : إن رسول الله صلى الله عليه وسلم اعتمر أربع عمرات إحداهن في رجب، قالت : يرحم الله أبا عبد الرحمٰن، ما اعتمر عمرة إلا وهو شاهده، وما اعتمر في رجب قط[2]" اور مسلم کی روایت میں اس قصہ میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں : "وابن عمر يسمع فما قال لا ولا نعم، سكت[3]" اس کے تحت شرح میں علامہ نووی لکھتے ہیں : "قال العلماء : هذا يدل على أنه اشتبه عليه أو نسي أو شك ولهذا سكت عن الإنكار على عائشة ومراجعتها بالكلام" لہٰذا یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ اس بارے میں حضرت عائشہؓ ہی کا بیان صحیح ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں کوئی عمرہ نہیں کیا۔ واللہ أعلم

(از مرتب عفا اللہ عنہ)

باب[4] ما جاء في عمرة رمضان

عن[5] أم معقل عن النبي صلى الله عليه وسلم قال : عمرة في رمضان تعدل حجة[6]" حدیث باب سے یہ وہم نہ کیا جائے کہ آدمی جب رمضان میں عمرہ کرلے تو چونکہ وہ عمرہ

---

[1] أی ابن عمر رضی اللہ عنہ ۱۲ م

[2] صحیح بخاری (ج ۱ ص۲۳۸) أبواب العمرة، باب کم اعتمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ م

[3] صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۰۹) باب بیان عدد عمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم وزمانهن ۱۲ م

[4] شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲

[5] الحدیث أخرجه أبو داؤد فی سننه (ج ۱ ص۲۷۲، ۲۷۳) باب العمرة

سنن ابی داؤد ہی میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں "أنها تعدل حجة معي يعني عمرة في رمضان" (ج ۱ ص۲۷۳) اور مسلم میں حضرت ابن عباسؓ ہی کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں "فعمرة في رمضان تقضي حجة أو حجة معي" (ج ۱ ص۴۰۹) باب فضل العمرة في رمضان۔ نیز معجم طبرانی کبیر میں حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے "أنه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول، عمرة في رمضان كحجة معي (قال الهيثمي) رواه الطبراني في الكبير وفيه هلال مولى أنس وهو ضعيف" مجمع الزوائد (ج ۳ ص۲۸۰) باب العمرة في رمضان ۱۲ مرتب

[6] بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عمرۂ رمضان سے متعلقہ فرمان حضرت ام معقلؓ کے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حج کے برابر ہوگا اس لئے اس پر حج فرض نہ ہوگا اور وہ اس فریضہ سے سبکدوش ہو جائے گا کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ وہ عمرہ اس کے حجۃ الاسلام کے قائم مقام نہ ہوگا اگرچہ اسے حج کی فضیلت حاصل ہو جائیگی[1]

واللہ أعلم

(از مرتب عفا اللہ عنہ)

باب ماجاء فی الذی یھل بالحج فیکسر أو یعرج

یہ اور اگلا باب دونوں مسئلۂ احصار سے متعلق ہیں۔

احصار حنفیہ کے نزدیک ہر اس حابس سے متحقق ہو جاتا ہے جو مفضی الی بیت اللہ سے مانع ہو، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابن عباسؓ، عطاء بن ابی رباح، ابراہیم نخعیؒ اور سفیان ثوریؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ بہرحال مرض وغیرہ سے حنفیہ کے نزدیک احصار متحقق ہو جاتا ہے، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام اسحٰقؒ کے نزدیک احصار صرف عدو سے متحقق ہوتا ہے مرض سے نہیں، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور لیث بن سعدؒ وغیرہ کا بھی یہی مسلک ہے[2]۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا، بعض سے معلوم ہوتا ہے ام سُلیمؓ کے سوال کے جواب میں، بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ ام ہیثم یا ام طلق یا ام سنان انصاریہ کے جواب میں ارشاد فرمایا، بعض میں امرأۃ مبہمہ کا ذکر ہے بہرحال یہ کم سے کم چار مستقل واقعات ہیں جن کے جواب میں آپ نے یہ ارشاد فرمایا کما حققہ المحب الطبری۔ دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۵۷۷) ۱۲ مرتب

(حاشیہ صفحۂ ھٰذا)

[1] چنانچہ علامہ عینیؒ لکھتے ہیں: "الإجماع علی عدم قیامھا مقامھا. وقال ابن خزیمة: إن الشئ یشبه بالشئ ویجعل عدله إذا أشبهه فی بعض المعانی لا جمیعها لأن العمرة لا یقضی بها فرض الحج ولا النذر. وقال ابن الجوزی: فیه أن ثواب العمل یزید بزیادة شرف الوقت کما یزید بحضور القلب وبخلوص القصد"

واضح رہے کہ بعض حضرات نے اس فضیلت کو ان عورتوں کے ساتھ مخصوص قرار دیا۔ دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص ۱۱۱) باب عمرة فی رمضان ۱۲ مرتب

[2] تفصیلِ مذاہب کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص ۱۴۰) أبواب المحصر وجزاء الصید ۱۲ مرتب

مالکیہ و شافعیہ وغیرہ کا استدلال ﴿وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾[1] سے ہے کہ یہ آیت سنہ ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے موقعہ پر نازل ہوئی تھی جس وقت کہ احصار بالعدو پیش آیا تھا، معلوم ہوا کہ احصار عدو کے ساتھ خاص ہے۔

جہاں تک حنفیہ کے مذہب کا تعلق ہے وہ لغۃً، روایۃً اور درایۃً ہر اعتبار سے راجح ہے۔

لغۃً اس لئے کہ بیشتر علمائے لغت کے نزدیک لفظ "احصار" حقیقۃً حبس بالمرض کیلئے استعمال ہوتا ہے اور حبس بالعدو کے لئے "حصر" کا لفظ استعمال ہوتا ہے، چنانچہ علمائے لغت میں سے ابوعبیدہ، ابن قتیبہ اور ثعلب و زجاج وغیرہ نے اسکی تصریح کی ہے[3]۔

---

[1] اور (جب حج وعمرہ کرنا ہو تو اس) حج وعمرہ کو اللہ کے واسطے پورا پورا ادا کرو، پھر اگر (کسی دشمن یا مرض کی وجہ سے) روک دئے جاؤ تو قربانی کا جانور جو کچھ میسر ہو (ذبح کرو) سورۂ بقرہ آیت ۱۹۶ پ ۲ — ۱۲ مرتب

[2] دیکھئے تفسیر ابن کثیر (ج ۱ ص ۲۳۱) الأمر بالحج والعمرة تحت قوله تعالیٰ: فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۱۲ م

[3] امام رازیؒ نے لفظ "احصار" پر تفصیر کلام کیا ہے وہ فرماتے ہیں: "أما لفظ الإحصار فقد اختلفوا فيه على ثلاثة أقوال: الأول: وهو اختيار أبي عبيدة وابن السكيت والزجاج وابن قتيبة وأكثر أهل اللغة أنه مختص بالمرض قال ابن السكيت، يقال: أحصره المرض إذا منعه من السفر، وقال ثعلب في فصيح الكلام: أحصر بالمرض وحصر بالعدو.

والقول الثاني: أن لفظ الإحصار يفيد الحبس والمنع، سواء كان بسبب العدو أو بسبب المرض، وهو قول الفراء.

والقول الثالث: أنه مختص بالمنع الحاصل من جهة العدو، وهو قول الشافعي رضي الله عنه وهو المروي عن ابن عباس وابن عمر فإنهما قالا: لا حصر إلا حصر العدو، وأكثر أهل اللغة يردون هذا القول على الشافعي رضي الله عنه، وفائدة هذا البحث تظهر في مسئلة فقهية، وهي أنهم اتفقوا على أن حكم الإحصار عند حبس العدو ثابت وهل يثبت بسبب المرض وسائر الموانع؟ قال أبو حنيفة رضي الله عنه: يثبت، وقال الشافعي لا يثبت، وحجة أبي حنيفة ظاهرة على مذهب أهل اللغة، وذلك لأن أهل اللغة رجلان، أحدهما: الذين قالوا: الإحصار مختص بالحبس الحاصل بسبب المرض فقط، وعلى هذا المذهب تكون هذه الآية نصًّا صريحًا في أن إحصار المرض يفيد هذا الحكم. والثاني: الذين قالوا: الإحصار لمطلق الحبس سواء كان حاصلًا بسبب المرض أو بسبب العدو، وعلى هذا القول حجة أبي حنيفة تكون ظاهرة أيضا، لأن الله تعالى علق الحكم على مسمى الإحصار فوجب أن يكون الحكم ثابتًا عند حصول الإحصار، سواء حصل بالعدو أو بالمرض. وأما على القول الثالث: وهو أن الإحصار اسم للمنع الحاصل بالعدو، فهذا القول باطل باتفاق أهل اللغة، وبتقدير ثبوته فنحن نقيس المرض على العدو بجامع دفع الحرج، وهذا قياس جلي ظاهر، فهذا تقرير قول أبي حنيفة رضي الله عنه وهو ظاهر قوي".

دیکھئے التفسیر الکبیر للرازی (ج ۵ ص ۱۵۹ و ص ۱۶۰) تحت قوله تعالیٰ: فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ ۱۲ مرتب عافاہ اللہ

روایۃً حدیثِ باب کی وجہ سے راجح ہے "عن عکرمۃ قال: حدثنی الحجاج بن عمرو قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من کسر أو عرج فقد حل، وعلیہ حجۃ أخری فذکرت ذلک لأبی ھریرۃ وابن عباس، فقالا صدق[1]" یہ روایت صراحۃً اس پر دلالت کر رہی ہے کہ اِحصار عدو کے ساتھ خاص نہیں اور کسر وعرج (اسی طرح مرض سے) بھی ثابت ہوجاتا ہے۔

اور درایۃً اس لئے راجح ہے کہ جو علّت اِحصار بالعدو میں پائی جاتی ہے وہی احصار بالمرض میں بھی پائی جاتی ہے اس لئے کہ دونوں ہی مانع عن الحج ہیں، فینبغی أن یکون حکمھما سواء۔

جہاں تک آیت " فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ "کا تعلق ہے سو وہ اگرچہ غزوۂ حدیبیہ ہی کے موقع پر نازل ہوئی تھی لیکن اوّل تو " العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص السبب "کے قاعدہ سے اس کے حکم کو عدو کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جاسکتا، دوسرے باری تعالیٰ نے یہاں لفظ "احصار" استعمال کرکے اس طرف اشارہ فرمادیا ہے کہ آیت کا سببِ نزول اگرچہ احصار بالعدو کا واقعہ ہے لیکن احصار بالمرض کا بھی یہی حکم ہے۔

پھر حنفیہ کے نزدیک احصار کا حکم یہ ہے کہ محصر ایک ہدی حرم بھیجے اور ایک وقت طے کرلے کہ اس وقت وہ ہدی حرم میں ذبح کردی جائے پھر جب وہ وقت آجائے تو حلال ہوجائے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بھی یہی مسلک ہے۔ اگر وہ حرم میں ہدی کے ذبح کرانے کا انتظام نہ کرسکے تو اب اس کے لئے حلال ہونا نہیں۔ پھر حلال ہونے کی صورت میں اس پر حلق وغیرہ نہیں لأنہ قد ذھب عنہ النسک کلّہ، البتہ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں وہ حلق کرائیگا۔ اور اگر نہ کرائے تو اس پر کچھ واجب نہیں۔ پھر چونکہ حنفیہ کے نزدیک محصر کا مفہوم عام ہے خواہ محصر بالعدو ہو یا بالمرض اس لئے ہدی کے حرم میں ذبح کئے جانے کی صورت میں حلال ہونے کی رخصت دونوں ہی کے لئے ہوگی۔

لیکن مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک چونکہ صرف حصر بالعدو کا اعتبار ہے اس لئے حلال ہونے کی رخصت صرف اسی کو حاصل ہوگی، محصَر بالمرض کو حاصل نہ ہوگی اور حلال ہونے کی صورت میں ان حضرات کے نزدیک ہدی کو حرم بھیجنا ضروری نہیں بلکہ ہدی کا اُسی جگہ ذبح کیا جانا کافی ہے جہاں احصار متحقق ہوا ہے، پھر ان حضرات کے نزدیک حلال ہونے کی صورت میں حلق یا قصر بھی کرائیگا[2]۔

---

[1] یہ روایت امام ترمذیؒ کے علاوہ امام ابوداودؒ اور امام ابن ماجہؒ نے بھی ذکر کی ہے، دیکھئے سنن ابی داود (ج ۱ ص۲۵۵) باب الإحصار اور سنن ابن ماجہ (ص۲۲۲) باب المحصر ۱۲ م

[2] حلق یا قصر کے بارے میں امام شافعیؒ کے دو قول ہیں، ایک مالکیہ و حنابلہ کے مطابق کما ذکرنا، دوسرا امام ابوحنیفہؒ کے مطابق، یعنی حلق یا قصر ضروری نہیں۔ کذا فی الجامع لأحکام القرآن المعروف بالقرطبی (ج ۲ ص۳۷۸) المسئلۃ الثالثۃ تحت قولہ تعالیٰ: وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ ۱۲ مرتب

جہاں تک محصر بالمرض کا تعلق ہے سو وہ ان حضرات کے نزدیک طوافِ بیت اللہ کے بغیر حلال نہیں ہو سکتا البتہ شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک وہ اشتراط کی صورت میں حلال ہو سکتا ہے[۲]، اشتراط کی تفصیل اگلے باب کے تحت آرہی ہے۔

قولہ "وعلیہ حجۃ أخریٰ" محصر کے حق میں اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ اس کے ذمہ اس حج اور عمرہ کی قضا واجب ہے یا نہیں[۱]؟

حنفیہ کے نزدیک محصر اگر دم ذبح کرا کے حلال ہو جائے تو اس پر اس کی قضا واجب ہے[۳]، امام احمدؒ کی ایک روایت بھی یہی ہے[۴]۔

لیکن شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک قضا واجب نہیں، امام احمدؒ کی دوسری روایت اسی کے مطابق ہے[۵]۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ قرآن کریم نے وجوبِ قضا کا ذکر نہیں فرمایا[۶]۔

ہماری دلیل حدیثِ باب کا مذکورہ جملہ ہے "وعلیہ حجۃ أخریٰ" اس کے علاوہ حنفیہ کی ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ آپؐ نے حدیبیہ والے عمرہ کی قضا آئندہ سال فرمائی تھی[۷]۔

جہاں تک قرآن کریم میں عدمِ ذکرِ قضاء کا تعلق ہے سو عدمِ ذکر عدمِ وجوب کو مستلزم نہیں کما ہو ظاہر
واللہ اعلم

---

[۱] احصار کے حکم سے متعلقہ مذکورہ تمام تفصیل معارف السنن (ج ۶ ص ۵۸۳) سے ماخوذ ہے ۱۲ مرتب

[۲] تفصیل کے لئے دیکھئے الجامع لأحکام القرآن للقرطبي (ج ۲ ص ۳۷۶) المسئلۃ السابعۃ تحت قولہ تعالیٰ: فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۱۲ م

[۳] ابراہیم نخعیؒ، مجاہدؒ، شعبیؒ اور عکرمہؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ معالم السنن للخطابي في ذیل المختصر للمنذري (ج ۲ ص ۴۳۳) باب الإحصار ۱۲ م

[۴] چنانچہ مرداویؒ "الإنصاف" میں لکھتے ہیں: "وعنہ: علیہ القضاء کالفرض وهو المذهب، قال في الفروع: والمذهب لزوم قضاء النفل، وجزم به الخرقي وصاحب الوجیز، وقال الزرکشي: هذه الروایة أصحها عند الأصحاب" ـ (ج ۴ ص ۷۱) باب الفوات والإحصار إن کان فرضًا وجب علیه القضاء ۱۲ مرتب

[۵] حوالۂ بالا۔ واضح رہے کہ مذکورہ اختلاف نفلی حج یا عمرہ کے بارے میں ہے جہاں تک حج فرض کا تعلق ہے احصار کی وجہ سے وہ کسی کے نزدیک ساقط نہیں ہوگا، چنانچہ اسی مقام پر علامہ مرداویؒ لکھتے ہیں "إن کان فرضًا وجب علیه القضاء بلا نزاع" ۱۲ م

[۶] بلکہ مطلقًا ارشاد ہے "فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ" ۱۲ م

[۷] تفسیر قرطبي (ج ۲ ص ۳۷۶) ۱۲ م

باب ماجاء فی الاشتراط فی الحج

عن[1] ابن عباس أن ضباعة بنت الزبیر أتت النبی صلی الله علیه وسلم فقالت: یا رسول الله! إنی أرید الحج أفأشترط؟ قال: نعم، قالت: کیف أقول؟ قال: قولی: لبیك اللّٰھم لبیك، لبیك محلّی من الأرض حیث تحبسنی" جیسا کہ ہم پچھلے باب میں ذکر کر چکے ہیں کہ شافعیہ مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک محصر بالمرض طوافِ بیت اللہ کے بغیر حلال نہیں ہو سکتا۔

پھر ان حضرات میں سے شافعیہ، حنابلہ اور امام اسحٰقؒ کے نزدیک اگر اس آدمی نے تلبیہ عند الاحرام کے وقت اشتراط کر لیا تھا تو وہ حلال ہو سکتا ہے[2]، اشتراط کا مطلب یہ ہے کہ تلبیہ کے ساتھ یوں کہے "لبیك اللّٰھم لبیك، محلی من الأرض تحبسنی" یعنی جس مقام پر مجھے کوئی مرض یا عذر پیش آجائے تو احرام سے نکلنے کا مجھے اختیار ہوگا[3]۔

امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ کے نزدیک اشتراط کا اعتبار نہیں[4]، امام شافعیؒ کا قولِ جدید بھی یہی ہے[5]۔

پھر چونکہ امام مالکؒ کے نزدیک نہ تو اشتراط معتبر ہے اور نہ احصار بالمرض کا اعتبار ہے اس لئے حلال ہونے کی صورت صرف طوافِ بیت اللہ ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک چونکہ احصار بالمرض کا اعتبار

---

[1] الحدیث أخرجه مسلم فی صحیحه (ج ۱ ص۳۸۵) باب جواز اشتراط المحرم التحلل بعذر المرض ونحوه — والنسائی فی سننه (ج ۲ ص۱۹) باب الاشتراط فی الحج، وباب کیف یقول إذا اشترط — وأبو داؤد فی سننه (ج ۱ ص۲۴۴) باب الاشتراط فی الحج — وابن ماجة فی سننه (ص۲۱۱) باب الشرط فی الحج ۱۲ م

[2] دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص۱۴۲) باب الاحصار فی الحج، وفیه: "قیل هو قول جمهور الصحابة والتابعین ومن بعدهم قال به عمر بن الخطاب وعلی بن أبی طالب وعبد الله بن مسعود وعمار بن یاسر وعائشة وأم سلمة وجماعة من التابعین" ۱۲

مرتب عفا اللہ عنہ

[3] پھر یہ اشتراط ظاہریہ کے نزدیک واجب، امام احمدؒ اور شافعیہ کے نزدیک جائز ہے۔ حوالۂ بالا ۱۲ مرتب

[4] دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۲۰ ص۸۵) کتاب النکاح، باب الأکفاء فی الدین۔ وفیه: "روی ذلك عن ابن عمر وعائشة وهو قول النخعی والحکم وطاؤس وسعید بن جبیر" — علامہ ابن قدامہؒ نے امام زہریؒ کا بھی یہی مسلک نقل کیا ہے۔ دیکھئے المغنی (ج ۳ ص۲۸۵) مسألة: قال: ویشترط فیقول: إن حبسنی حابس فمحلی حیث حبستنی الخ ۱۲ مرتب

[5] چنانچہ علامہ بنوریؒ معارف السنن (ج ۶ ص۵۸۵) میں لکھتے ہیں:

"ویذکر النووی فی شرح المهذب (۸: ۳۱۰) مایظهر منه أن الشافعی فی کتاب المناسك نصه الجدید عدم القول بصحة الاشتراط وأنه لا یتحلل، ولکن البیهقی ومن بعده یلزمون إمامهم قولهم بالاشتراط" ۱۲ مرتب

نہ ہے اور اگر کوئی شخص راستہ میں بیمار ہو جائے تو بھی ہدی بھیج کر حلال ہو سکتا ہے، اس لئے ان کے نزدیک اشتراط بلا فائدہ ہے غیر معتبر ہے۔

قائلین اشتراط کا استدلال حضرت ضباعہ بنت الزبیرؓ کی حدیثِ باب سے ہے جبکہ حنفیہ وغیرہ کا استدلال اگلے باب میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے ہے "أنه کان ینکر الاشتراط فی الحج، و یقول: ألیس حسبکم سنة نبیکم صلی اللہ علیه وسلم" اور بخاری میں یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے "کان ابن عمر یقول: ألیس حسبکم سنة رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم إن حبس أحدکم عن الحج فطاف بالبیت وبالصفا والمروة ثم حل من کل شیء حتی یحج عاماً قابلاً فیهدی أو یصوم إن لم یجد هدیاً"[1]

جہاں تک حضرت ضباعہؓ بنت الزبیرؓ کی حدیثِ باب کا تعلق ہے سو اس کا جواب حنفیہ کی جانب سے یہ دیا جاتا ہے کہ یہ ان کی خصوصیت تھی[2]، یا نبی کریم صلی اللہ علیہ کا مقصود اشتراط کو معتبر قرار دینا نہ تھا بلکہ حضرت ضباعہؓ کا اطمینانِ خاطر مقصود تھا۔ یعنی حضرت ضباعہؓ کو یہ وہم ہو رہا تھا کہ بیماری کی صورت میں میرے لئے حلال ہونا کیسے جائز ہوگا[3]، آپؐ نے ان کی تشفی خاطر کے لئے طریقہ بتا دیا، حنفیہ کے نزدیک بھی اطمینانِ قلب کے لئے اشتراط کی گنجائش ہے اور وہ بالکل بلا فائدہ اور عبث نہیں اگرچہ

---

[1] صحیح بخاری (ج ۱ ص ۲۴۳) باب الإحصار فی الحج۔ سنن دار قطنی میں بھی حضرت ابن عمرؓ کی یہ روایت مروی ہے جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں "حسبکم سنة نبیکم صلی اللہ علیه وسلم أنه لم یکن یشترط" (ج ۲ ص ۲۳۴) ۔ کتاب الحج رقم الحدیث ۱۸۔ ۱۲ مرتب

[2] چنانچہ علامہ عینی لکھتے ہیں: "وذهب بعض التابعین ومالك وأبو حنیفة إلی أنه لا یصح الاشتراط وحملوا الحدیث علی أنه قضیة عین وأن ذلك مخصوص بضباعة ..... قلت: حکی الخطابی ثم الرویانی من الشافعیة الخصوص بضباعة" عمدہ (ج ۱۰ ص ۱۴۶) باب الإحصار فی الحج ۱۲ مرتب

[3] حضرت ضباعہ بنت الزبیرؓ کی بیماری کا ذکر اگرچہ ترمذی کی حدیثِ باب میں نہیں ہے لیکن اسی واقعہ کے دوسرے طرق میں ان کے بیمار ہونے کا ذکر ہے مثلاً صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ ہی کی روایت میں حضرت ضباعہؓ کا یہ جملہ مذکور ہے "إنی امرأة ثقیلة" (ج ۱ ص ۳۸۵، باب جواز اشتراط المحرم التحلل بعذر المرض ونحوه) اور صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ کی روایت میں حضرت ضباعہؓ کے یہ الفاظ مروی ہیں "واللہ لا أجدنی إلا وجعة" (ج ۲ ص ۷۶۲، کتاب النکاح، باب الأکفاء فی الدین) ۱۲ مرتب

اصولی طور پر وہ اس لئے غیر معتبر ہے کہ اس سے کوئی فائدہ مستقلہ حاصل نہیں ہوتا[۱]۔ اگرچہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اشتراط سے ایک فائدہ جدیدہ بھی حاصل ہوجاتا ہے وہ یہ کہ عدمِ اشتراط کی صورت میں اگر بیمار ہوجائے تو حلال ہونے کے لئے ہدی بھیجنا لازم ہے اور اشتراط کی صورت میں ہدی ذبح کئے بغیر بھی حلال ہوسکتا ہے[۲]۔

فائدہ حضرت ضباعہؓ کی حدیثِ باب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں کتاب الحج کے بجائے کتاب النکاح "باب الأکفاء فی الدین" میں ذکر کی ہے اس مناسبت سے کہ وہاں حدیث کے آخر میں یہ جملہ بھی ہے "وکانت تحت المقداد بن الأسود[۳]" اس بنا پر بعض حضرات کو اس روایت کے صحیح بخاری میں ہونے کا علم نہیں

---

[۱] علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فتح الملہم (ج ۳ ص ۲۴۶، باب جواز اشتراط المحرم التحلل بعذر المرض ونحوہ) میں لکھتے ہیں:

"وقال شیخنا المحمود قدس اللہ روحہ: معنی إنکار الاشتراط عند الحنفیة أنہ لا تأثیر لہ فی جواز التحلل، فإن الإحصار عندھم یتحقق بالمرض أیضاً، ولو لم یشترط، ومع ذلک لا نسلّم أن الاشتراط عبث، فإن العبث مالا فائدۃ فیہ أصلاً، والفائدۃ لا تنحصر فی تغیر الأحکام، فیحتمل أن یکون الإرشاد إلی الاشتراط لتسلیة نفسہا وتسکین قلبہا وإزالة ما کان یختلج فی صدرہا من عروض أحوال تمنعہا عن إتمام ما أحرمت بہ، فإن المؤمن المنیب إذا عزم علی عمل من الأعمال الحسنة عزماً جازماً متحتماً وشرع فیہ من غیر تردد وتلعثم، ثم یعرض لہ فی خلالہ من الموانع التی تعوقہ عن إکمالہ شق علیہ فسخہ والخروج منہ بالغایة ولو لعذر بل لأمر شرعی کما لا یخفی علی من تأمل فی قصة الحدیبیة وأحادیث فسخ الحج إلی العمرۃ بخلاف ما إذا شرع الإنسان فی عمل وصرّح بتعلیق إتمامہ علی شرط واستحضر من الابتداء أنہ فی خیرۃ من فعلہ وترکہ حسب ما یتفق لہ فکأنہ لم یلتزمہ، فھذا لا شبھة أنہ لا یتضیق لترکہ ولا یتحرج لرفضہ إن ألجئ إلیہ لعارض یمنعہ من إتمامہ، فالاشتراط فی الإحرام من أول الأمر یھوّن علیہ شأنہ ویسہّل علیہ أمرہ، وھذہ فائدۃ عظیمة للاشتراط لاسیما فی حق من یتوقع لحوق العوائق وحصول الإحصار فکیف یصح القول بکون الاشتراط باطلاً لا فائدۃ فیہ علی تقدیر جواز التحلل من الإحرام من غیر اشتراط؟ واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم بالصواب وھو الموفق لإصابة الحق فی کل باب" ۱۲ مرتب

[۲] چنانچہ علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں: "وعن أبی حنیفة أن الاشتراط یفید سقوط الدم، فأما التحلل فھو ثابت عندہ بکل إحصار" المغنی (ج ۳ ص ۲۸۳) مسألة: قال: ویشترط الخ۔

علامہ بنوریؒ لکھتے ہیں: "وعلی ھذہ الروایة: الاشتراط نافع عند أبی حنیفة، ولم یکن لغواً مع ما فیہ من تطییب خاطرھا الخ" معارف السنن (ج ۶ ص ۵۸۶) ۱۲ مرتب

[۳] دیکھئے صحیح بخاری (ج ۲ ص ۷۶۲) ۱۲ م

ہوسکا، حضرت مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے معارف السنن میں لکھا ہے کہ علامہ عثمانیؒ صاحبِ اعلاء السنن کو بھی یہ حدیث صحیح بخاری میں نہیں ملی[۱]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں حضرت مولانا بنوری قدس سرہٗ سے تسامح ہوا ہے درحقیقت علامہ عثمانیؒ نے اعلاء السنن میں صراحۃً لکھا ہے "أخرجها البخاری فی کتاب النکاح لا فی الحج[۲]" غالبًا حضرت مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی نظر سے ان کا یہ جملہ نہیں گذر سکا۔ واللہ أعلم

باب ماجاء فی المرأۃ تحیض بعد الإفاضۃ

عن عائشۃ[۳] أنها قالت ذکرتُ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن صفیۃ بنت حُیَیّ حاضت فی أیام منیً. فقال: أحابستنا هی؟ قالوا: إنها قد أفاضت. فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا إذًا " اس پر اتفاق ہے کہ اگر عورت کو حیض آنے لگے تو اس سے طوافِ وداع ساقط ہوجاتا ہے، البتہ صحابۂ کرامؓ میں سے حضرت عمرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابن عمرؓ کا مسلک یہ تھا کہ اگر عورت حائضہ ہوجائے تو جسطرح اس سے طوافِ زیارت ساقط نہیں ہوتا اسی طرح طوافِ وداع بھی ساقط نہیں ہوتا، لیکن حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابن عمرؓ کا اس مسلک سے رجوع ثابت ہے، گویا حائضہ عورت سے طوافِ وداع کا ساقط نہ ہونا صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مسلک ہے اور ان کے نزدیک حائضہ جس طرح طوافِ زیارت کے لئے پاک ہونے کا انتظار کرے گی، اسی طرح طوافِ وداع کے لئے بھی انتظار کرے گی[۴]

---

[۱] چنانچہ علامہ بنوریؒ لکھتے ہیں: "وقد خفی علی کثیر محلّہ فی الصحیح لإخراجه فی غیر محلّه المعروف عند القوم، فأنکروه وادعوا أنه لیس متفقًا علیه کالشیخ أحمد شاکر والشیخ العثمانی صاحب إعلاء السنن وغیرهما" دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۵۸۳) ۱۲ مرتب

[۲] إعلاء السنن (ج ۱۰ ص ۳۳۴) باب الاشتراط فی الحج والعمرۃ ۱۲ م

[۳] الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحه (ج ۱ ص ۲۳۷) باب إذا حاضت المرأۃ بعد ما أفاضت۔ و مسلم فی صحیحه (ج ۱ ص ۳۹۰) باب بیان وجوہ الإحرام الخ و (ج ۱ ص ۴۲۶) باب وجوب طواف الوداع وسقوطه عن الحائض ۱۲ م

[۴] مذکورہ تفصیل کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص ۹۹) باب إذا حاضت المرأۃ بعد ما أفاضت ۱۲ مرتب

سنن ابی داؤد میں حارث بن عبداللہ بن اوسؓ کی روایت سے حضرت عمرؓ کا مسلک ثابت ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں: "أتيتُ عمر بن الخطاب فسألته عن المرأة تطوف بالبيت يوم النحر ثم تحيض قال: ليكن آخر عهدها بالبيت، قال: فقال الحارث: كذلك أفتاني رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: فقال عمر: أربت عن يديك سألتني عن شيء سألت عنه رسول الله صلى الله عليه وسلم لكيما أخالف[1]"

لیکن امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت عائشہؓ کی حدیثِ باب سے منسوخ ہے[2]۔

علامہ خطابیؒ نے حضرت عمرؓ کے مسلک کا یہ محمل بیان کیا ہے کہ ان کے نزدیک حائضہ سے طوافِ وداع اس وقت ساقط نہیں ہوتا جب وقت میں وسعت اور گنجائش ہو، یعنی اگر اس کے لئے ٹھہرنا ممکن ہوگا تو ٹھہرنا ضروری ہوگا لیکن اگر وقت میں تنگی اور سفر کی جلدی ہو تو اس صورت میں ان کے نزدیک بھی حضرت عائشہؓ کی روایت کے مطابق عمل ہوگا[3]۔

بہرحال حضرت عائشہؓ کی حدیثِ باب اس پر دال ہے کہ حائضہ کے ذمہ سے طوافِ وداع ساقط ہوجاتا ہے اگرچہ طوافِ زیارت ساقط نہیں ہوتا اس لئے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت صفیہؓ کے حائضہ ہونے کا علم ہوا تو آپؐ نے فرمایا: "أحابستنا هي؟[4]" لیکن جب آپؐ کو بتلایا گیا کہ وہ حیض آنے سے قبل طوافِ افاضہ کرچکی ہیں تو آپؐ نے فرمایا "فلا إذًا" یعنی "فلا تحبسنا حينئذ لأنها أدت الفرض الذي هو ركن الحج" اگر طوافِ وداع حائضہ کے ذمہ سے ساقط نہ ہوتا تو آپؐ "فلا إذًا" نہ فرماتے۔

واللہ أعلم

حدیثِ باب سے جہاں حائضہ سے طوافِ وداع کا سقوط معلوم ہوتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوافِ زیارت اس سے ساقط نہ ہوگا، چنانچہ اگر کسی عورت کو طوافِ زیارت کرنے سے پہلے حیض آنے لگا تو

---

[1] سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۲۷۵) باب الحائض تخرج بعد الإفاضة ۱۲ م

[2] شرح معانی الآثار (ج ۱ ص ۳۵۹) باب المرأة تحيض بعد ما طافت للزيارة قبل أن تطوف للصدر۔ امام طحاویؒ نے اس مقام پر حضرت عائشہؓ کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ام سلیمؓ وغیرہ کی روایات کو بھی ناسخ قرار دیا ہے ۱۲ م

[3] معالم السنن للخطابی فی ذیل المختصر للمنذری (ج ۲ ص ۴۲۹) باب الحائض تخرج بعد الإفاضة ۱۲ مرتب

[4] الهمزة فيه للاستفهام، أي: أمانعتنا من التوجه من مكة في الوقت الذي أردنا التوجه فيه ظنًا منه صلى الله عليه وسلم أنها ما طافت طواف الإفاضة" عمدہ (ج ۱۰ ص ۹۸) باب إذا حاضت المرأة بعد ما أفاضت ۱۲ مرتب

اب اس کو رک کر اپنے پاک ہونے کا انتظار کرنا ہوگا اور پاکی کے بعد طوافِ زیارت لازم ہوگا، اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے[1]

ایک مشکل اور اس کا حل ہمارے زمانہ میں جبکہ حجاج کے آنے جانے، ٹھہرنے کی تاریخیں اور اوقات مقرر ہوتے ہیں اور ویزے کی محدود تاریخیں ہوتی ہیں، کسی حاجی کو ان تاریخوں اور اوقات کے بدلنے کا اختیار نہیں ہوتا، ان حالات میں حیض و نفاس والی عورتیں اپنے زمانۂ طہر میں طوافِ زیارت نہ کر سکی ہوں اور قانونی لحاظ سے ان کے لئے انتظار بھی ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں وہ کیا کریں گی؟ یہ مشکل عورتوں کو بسا اوقات پیش آتی ہے۔

کتبِ حنفیہ میں اس اشکال کا کوئی صریح حل احقر کی نظر سے نہیں گزرا، البتہ علامہ ابن تیمیہؒ نے اس کا یہ حل بیان کیا ہے کہ ایسی عورت ناپاکی ہی کی حالت میں طواف کرلے اور امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کے مطابق دم دیکر اس کی تلافی کرے[2]۔

---

[1] دیکھئے المغنی (ج ۳ ص۴۴۲) مسألة: قال: ثم یزور البیت فیطوف به سبعاً الخ ۱۲ م

[2] دیکھئے فتاوی ابن تیمیہؒ (ج ۲۶ ص۲۲۴ تا ۲۴۲) سئل عن امرأة حاضت قبل طواف الإفاضة ولم یمکنها المقام بعد الحاج هل تطوف أو یلزمها دم الخ

چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"الحمد لله، العلماء لهم فی الطهارة هل هی شرط فی صحة الطواف؟ قولان مشهوران:

أحدهما: أنها شرط وهو مذهب مالك والشافعی وأحمد فی إحدی الروایتین.

والثانی: لیست بشرط وهو مذهب أبی حنیفة وأحمد فی الروایة الأخری.

فعند هؤلاء لو طاف جنباً أو محدثاً أو حاملاً للنجاسة أجزأه الطواف وعلیه دم، لکن اختلف أصحاب أحمد هل هذا مطلق فی حق المعذور والذی نسی الجنابة؟ وأبو حنیفة یجعل الدم بدنة إذا کانت حائضاً أو جنباً،

فهذه التی لم یمکنها أن تطوف إلا حائضاً أولی بالعذر، فإن الحج واجب علیها، ولم یقل أحد من العلماء: إن الحائض یسقط عنها الحج، ولیس من أقوال الشریعة ان تسقط الفرائض للعجز عن بعض ما یجب فیها کما لو عجز عن الطهارة فی الصلاة.

فلو أمکنها أن تقیم بمکة حتی تطهر وتطوف وجب ذلك بلا ریب، فأما إذا لم یمکن فإن أوجب علیها الرجوع مرة ثانیة کان أوجب علیها سفرین للحج بلا ذنب لها وهذا بخلاف الشریعة.

ثم هی أیضاً لا یمکنها أن تذهب إلا مع الرکب، وحیضها فی الشهر کالعادة، فهذه لا یمکنها أن تطوف طاهراً البتة۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

باب من حج أو اعتمر فليكن آخر عهده بالبيت

عن[1] الحارث بن عبد الله بن أوس قال: سمعتُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: من حج هذا البیت أو اعتمر فلیکن آخر عهده بالبیت " طوافِ وداع امام مالکؒ، داوٗدِ ظاہریؒ اور ابن المنذرؒ کے نزدیک سنت ہے اور اس کے ترک پر کچھ واجب نہیں، شوافع کے نزدیک طوافِ وداع واجب ہے جس کے ترک پر دم لازم ہوتا ہے[2] احناف کے نزدیک وہ آفاقی پر واجب ہے، مکّی اور میقاتی وغیرہ پر نہیں، البتہ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں " أحب إلیّ أن یطوف المکی لأنه یختم المناسک[3] "

قولہ: أو اعتمر " معتمر پر طوافِ وداع واجب نہیں[4]، لیکن حدیثِ باب میں " من حجّ هذا البیت أو اعتمر " کے الفاظ بظاہر اس پر دال ہیں کہ طوافِ وداع معتمر پر بھی واجب ہے لیکن واقعہ یہ

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

وأصول الشریعة مبنیة علی أنّ ما عجز عنه العبد من شروط العبادات یسقط عنه کما لو عجز المصلی عن ستر العورة واستقبال القبلة أو تجنب النجاسة وکما لو عجز الطائف أن یطوف بنفسه راکبا أو راجلا فإنه یحمل ویطاف به.

ومن قال: إنه یجزیها الطواف بلا طهارة إن کانت غیر معذورة مع الدم کما یقوله من یقوله من أصحاب أبي حنیفةؒ وأحمدؒ، فقولهم لذلك مع العذر أولی وأحری، وأما الاغتسال فإن فعلته فحسن کما تغتسل الحائض والنفساء للإحرام. والله أعلم". ۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ

(حاشیہ صفحۂ ہٰذا)

[1] الحدیث أخرجه أبوداود في سننه (ج ۱ ص ۲۷۵) باب الحائض تخرج بعد الإفاضة ۱۲ م

[2] کذا نقل النووی مذهب الشافعیة، أنظر شرحه علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۲۶) باب وجوب طواف الوداع وسقوطه عن الحائض، وقال ابن قدامة في المغني (ج ۳ ص ۴۵۹، مسألة: قال: فإذا أتی مکة لم یخرج حتی یودع البیت): وقال الشافعي في قولٍ له: لا یجب بترکه شئ لأنه یسقط عن الحائض فلم یکن واجبا کطواف القدوم ولأنه کتحیة البیت أشبه طواف القدوم" ۱۲ مرتب

[3] مذاہب کے لئے دیکھئے عمدہ (ج ۱۰ ص ۹۵) باب طواف الوداع ۱۲ مرتب

[4] چنانچہ مؤطا امام محمدؒ میں حضرت عمر فاروقؓ کے اثر " لا یصدرنّ أحد من الحاج حتی یطوف بالبیت، فإن آخر النسك الطواف بالبیت" (ص ۲۳۹، باب الصدر) سے معلوم ہوتا ہے کہ طوافِ صدر یعنی طوافِ وداع صرف حاجی پر واجب ہے، چنانچہ صاحبِ اعلاء السنن لکھتے ہیں " قلتُ: قوله: " لا یصدرنّ أحد من الحاج" دلیل علی اختصاصه بهذا الطواف ولا یجب علی المعتمر" اعلاء السنن (ج ۱۰ ص ۱۶۱) باب وجوب طواف الوداع علی أهل الآفاق ۱۲ مرتب

ہے کہ حدیثِ باب میں "أو اعتمر" کے الفاظ کی زیادتی حجاج بن ارطاہ کا تفرد ہے، ورنہ سنن ابی داؤد میں بھی یہ روایت آئی ہے اور اس میں عمرہ کا کوئی ذکر نہیں۔[2]

قوله: فليكن آخر عهده بالبيت " اس سے امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے اس پر استدلال کیا ہے کہ طوافِ وداع کے لئے ضروری ہے کہ وہ سفر کے بالکل آخری مرحلہ پر ہو، لہٰذا اگر کسی نے وداع کی نیت سے طواف کیا پھر وہ مکہ میں ٹھہر گیا یا تجارت اور دوسرے کاموں میں مشغول ہوگیا تو اس کے ذمہ میں لازم ہے کہ طوافِ وداع کا اعادہ کرے[3] جبکہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ اس پر اعادہ واجب نہیں[4] البتہ مستحب ہے[5]۔ واللہ اعلم۔

---

[1] حجاج بن ارطاة ـ بفتح الهمزه ـ ابن ثور بن هبيرة النخعي أبو أرطاة الكوفي القاضي أحد الفقهاء، صدوق كثير الخطأ والتدليس، من السابعة » تقريب التهذيب (ج ۱ ص۱۵۲ رقم ۱۲۵) ۱۲ مرتب

[2] دیکھئے سنن ابی داؤد (ج ۱ ص۲۷۲) باب الحائض تخرج بعد الإفاضة ۱۲ م

[3] دیکھئے المغنی (ج ۳ ص۴۵۹) مسألة قال: فإن ودع واشتغل في تجارة عاد فودع

علامہ عینیؒ لکھتے ہیں: " واختلفوا فيمن ودع ثم بدا له في شراء حوائجه، فقال عطاءؒ: يعيد حتى يكون آخر عهده الطواف بالبيت وبنحوه قال الثوري والشافعي وأحمد وأبو ثور، وقال مالك لا بأس أن يشتري بعض حوائجه وطعامه في السوق ولا شئ عليه وإن أقام يوماً أو نحوه أعاد، وقال أبو حنيفة: لو ودع وأقام شهراً أو أكثر أجزأه ولا إعادة عليه » عمدة القاری (ج ۱۰ ص۹۵) باب طواف الوداع ۱۲ مرتب

[4] چنانچہ شیخ ابن ہمامؒ فتح القدیر (ج ۲ ص۱۸۸، وهذه فروع تتعلق بالطواف) میں لکھتے ہیں: " نعم روى عن أبي حنيفة رضي الله عنه إذا طاف للصدر ثم أقام إلى العشاء قال: أحب إلي أن يطوف طوافاً آخر كي لا يكون بين طوافه ونفره حائل، لكن هذا على وجه الاستحباب تحصيلاً لمفهوم الاسم عقيب ما أضيف إليه، وليس ذلك بحتم، إذ لا يستغرب في العرف تأخير السفر عن الوداع بل قد يكون ذلك، والحاصل أن المستحب فيه أن يوقع عند إرادة السفر » ۱۲ مرتب

[5] علامہ عینیؒ عمدۃ القاری (ج ۱۰ ص۹۵، باب طواف الوداع) میں لکھتے ہیں:

" قال (مالك) ومن أخر طواف الوداع وخرج ولم يطف، إن كان قريباً رجع فطاف، وإن لم يرجع فلا شئ عليه، وقال عطاء والثوري وأبو حنيفة والشافعي في أظهر قوليه وأحمد وإسحٰق وأبو ثور: إن كان قريباً رجع فطاف وإن تباعد مضى وأهراق دماً۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فقال له عمر: خررتَ[1] من يديك، سمعت هذا من رسول الله صلى الله عليه وسلم ولم تخبرنا به» «خررت من يديك» کا مطلب ہے «سقطت بسبب فعل يديك» یعنی تو اپنے فعل کی وجہ سے ہلاک ہو جائے اور گر جائے۔ یا متکلم کے صیغہ کے ساتھ یہ مطلب ہے کہ میں تو تیری حرکت کی وجہ سے ہلاک وشرمسار ہی ہو جاتا۔ یہ روایت یہاں مختصراً آئی ہے۔ اس کی تفصیل سنن ابی داؤد کی اس روایت میں ہے جو ہم پیچھے بھی ذکر کر چکے ہیں یعنی «عن الحارث بن عبد الله بن أوس قال: أتيت عمر بن الخطاب فسألته عن المرأة تطوف بالبيت يوم النحر ثم تحيض، قال: ليكن آخر عهدها بالبيت، قال: فقال الحارث: كذلك أفتاني رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: فقال عمر: أربت عن يديك، سألتني عن شئ سألت عنه رسول الله صلى الله عليه وسلم لكيما أخالف[2]».

حضرت عمر فاروقؓ حضرت حارث بن عبد اللہ بن اوسؓ پر اس لئے ناراض ہوئے کہ انہوں نے حضرت عمرؓ سے پہلے مسئلہ دریافت کیا پھر اسی مسئلہ کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ ذکر کر دیا، اس میں اس بات کا امکان تھا کہ حضرت عمرؓ کا بیان کردہ مسئلہ حدیث کے خلاف ہو جاتا جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی مخالفت لازم آتی، اس لئے حضرت عمرؓ کا منشا یہ تھا کہ جب تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مسئلہ دریافت کر چکے تو اب میرے سے فتویٰ پوچھنے کے بجائے روایت میرے سامنے ذکر کر دینی چاہئے تھی تاکہ حدیث کی مخالفت کا ادنیٰ امکان باقی نہ رہتا۔ واللہ أعلم

باب ماجاء أنّ القارن يطوف طوافا واحدًا

عن جابر[3] أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قرن الحج والعمرة، فطاف لهما طوافًا واحدًا» یہ

گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ

واختلفوا في حد القرب فروي أن عمر رضي الله عنه رد رجلاً من مرّ الظهران لم يكن ودع وبين مرّ الظهران ومكة ثمانية عشر ميلاً، وعند أبي حنيفة يرجع ما لم يبلغ المواقيت، وعند الشافعي يرجع من مسافة لا تقصر فيها الصلاة، وعند الثوري يرجع ما لم يخرج من الحرم» ۱۲ مرتب

(حاشیہ صفحہ ہٰذا)

[1] قوله: «خررت من يديك» أي سقطت من أجل مكروه يصيب يديك من قطع أو وجع. وقيل: كناية عن الخجل، يقال: خررتُ عن يدي: أي خجلتُ، وسياق الحديث يدل عليه، وقيل: أي سقطت إلى الأرض من سبب يديك، أي من جنايتهما» كذا في مجمع بحار الأنوار (ج ۲ ص ۲۶-۲۷) مادة «خرر» ۱۲ مرتب

[2] سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۲۷۴) باب الحائض تخرج بعد الإفاضة ۱۲ م

[3] الحديث أخرجه النسائي في سننه (ج ۲ ص ۳۶) طواف القارن ۱۲ م

مسئلہ بھی معرکۃ الآراء مسائل میں سے ہے کہ قارن کے ذمہ کتنے طواف ہیں؟

حنفیہ کے نزدیک قارن پر چار طواف ہوتے ہیں[۱]، سب سے پہلے طوافِ عمرہ جس کے بعد سعی بھی ہوتی ہے[۲]، دوسرے طوافِ قدوم جو سنت ہے[۳]، تیسرے طوافِ افاضہ یا طوافِ زیارت جو رکنِ حج ہے اس کے بعد حج کی سعی بھی ہوتی ہے بشرطیکہ طوافِ قدوم کے ساتھ نہ کی ہو[۴]، چوتھے طوافِ وداع جو واجب ہے[۵] البتہ حائضہ وغیرہ سے ساقط ہو سکتا ہے کما بیناً[۶]۔

ان چار طوافوں میں سے حنفیہ کے نزدیک ایک طواف کم کرنے کی گنجائش ہے اور وہ اس طرح کہ طوافِ عمرہ ہی میں طوافِ قدوم کی نیت کرلے تو الگ طوافِ قدوم کرنے کی ضرورت نہ ہوگی[۷] اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ مسجد میں داخل ہونے کے بعد سنتوں یا فرائض میں تحیۃ المسجد کی نیت کرلیجائے[۸]۔

اس کے برخلاف ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک قارن پر کل تین طواف واجب ہیں طوافِ قدوم، طوافِ زیارت اور طوافِ وداع، طوافِ عمرہ قارن کو مستقلاً نہیں کرنا پڑتا بلکہ طوافِ افاضہ میں اس کا تداخل ہو جاتا ہے[۹]۔

---

[۱] ان چاروں طوافوں کی تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب المبسوط لشمس الدین السرخسی (ج ۴ ص ۳۴ و ۳۵) باب الطواف ۱۲ م

[۲] کما فی الہدایہ (ج ۱ ص ۲۵۸) باب القران ۱۲ م

[۳] کما فی المبسوط للسرخسی (ج ۴ ص ۳۴) وفیہ: وقال مالک رحمہ اللہ تعالیٰ: ھو واجب" وراجعہ للدلائل ۱۲ م

[۴] کما فی الہدایہ (ج ۱ ص ۲۵۱) باب الإحرام ۱۲ م

[۵] اس سے متعلقہ تفصیل ہم پچھلے باب میں ذکر کرچکے ہیں ۱۲ م

[۶] فی شرح " باب ما جاء فی المرأۃ تحیض بعد الإفاضۃ" ۱۲ م

[۷] چنانچہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ اپنی تفسیرِ مظہری میں لکھتے ہیں " قلت: وذلک الطواف والسعی کان لعمرتہ وکفاہ عن طواف القدوم لحجتہ" دیکھئے (ج ۱ ص ۲۳۰) بعد تمام آیۃ " وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ الخ"
امام طحاویؒ کے کلام سے بھی اس طرف اشارہ ملتا ہے دیکھئے شرح معانی الآثار (ج ۱ ص ۳۴۲) باب القارن کم علیہ من الطواف لعمرتہ ولحجتہ ۱۲ مرتب

[۸] جیسا کہ یہ مسئلہ مختلف کتبِ فقہ میں بیان کیا گیا ہے مثلاً دیکھئے ردّ المحتار علی الدر المختار (ج ۱ ص ۴۵۶) مطلب فی تحیۃ المسجد ۱۲ مرتب

[۹] دیکھئے معارف السنن (ج ۶ ص ۶۰۳)، المغنی (ج ۳ ص ۴۶۵ و ۴۶۶) مسألۃ قال: ولیس فی عمل القارن زیادۃ علی عمل المفرد الخ۔ نیز دیکھئے ہدایہ (ج ۱ ص ۲۵۸) باب القران ۱۲ مرتب

فقہاء کے اس اختلاف کو ان الفاظ میں تعبیر کیا جاتا ہے " عند الأئمة الثلاثة يطوف القارن طوافاً واحداً يعني طواف الزيارة فقط ويجزئ ذلك الطواف عن طواف العمرة[1] وعند الحنفية يطوف طوافين يعني طوافاً واحداً للعمرة وآخر للحج وهو طواف الزيارة "

حنفیہ کا مسلک حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، امام شعبیؒ، ابن شبرمہؒ اور ابن ابی لیلیٰؒ سے منقول ہے[2]۔

دلائل احناف حنفیہ کے دلائل درج ذیل ہیں :

① مسند ابی حنیفہ میں حضرت صُبَیّ بن معبدؒ کے بارے میں مروی ہے کہ ان سے حضرت عمرؓ نے پوچھا "فصنعتَ ماذا؟" اس پر انہوں نے جواب دیا: "مضيتُ فطفتُ طوافاً لعمرتي وسعيتُ سعياً لعمرتي، ثم عدتُ مثل ذلك ثم بقيتُ حراماً أصنع كما يصنع الحاج حتى إذا قضيتُ آخر نسكي" اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: "هُدِيتَ لسنة نبيك محمد صلى الله عليه وسلم" وبمثله أخرج ابن حزم في المحلّى[3]

---

[1] علامہ ابن قدامہؒ المغنی (ج ۳ ص ۶۵ و ۴۶۶) میں لکھتے ہیں : " المشهور عن أحمد أن القارن بين الحج والعمرة لا يلزمه من العمل إلا ما يلزم المفرد، وأنه يجزئه طواف واحد وسعي واحد لحجته وعمرته، نص عليه في رواية جماعة من أصحابه، وهذا قول ابن عمر وجابر بن عبد الله، وبه قال عطاء وطاؤس ومجاهد ومالك والشافعي وإسحاق وأبو ثور وابن المنذر۔

علامہ عینیؒ نے حضرت حسن بصریؒ کا مسلک بھی یہی نقل کیا ہے، عمدہ (ج ۹ ص ۱۸۱) باب کیف تهل الحائض والنفساء۔

معارف السنن (ج ۶ ص ۲۰۲) میں حضرت عائشہؓ کا بھی یہی مسلک نقل کیا گیا ہے ۱۲ مرتب

[2] چنانچہ علامہ عینیؒ لکھتے ہیں: " وقال مجاهد (مجاہدؒ کا مسلک بعض حضرات نے ائمہ ثلاثہؒ کے مطابق اور بعض نے حنفیہ کے مطابق لکھا ہے) وجابر بن زيد وشريح القاضي والشعبي ومحمد بن علي بن حسين والنخعي والاوزاعي والثوري والاسود بن يزيد والحسن بن حي وحماد بن سلمة وحماد بن سليمان والحكم بن عيينة وزياد بن مالك وابن شبرمة وابن أبي ليلى وأبو حنيفة وأصحابه : لابد للقارن من طوافين وسعيين وحكى ذلك عن عمر وعلي وابنيه الحسن والحسين وابن مسعود رضي الله تعالى عنهم، وهو رواية عن أحمد " عمدة القاري (ج ۹ ص ۱۸۱) باب كيف تهل الحائض والنفساء ۱۲ مرتب عفی عنہ

[3] دیکھئے مسند ابی حنیفہ مع شرحہ لعلی القاری (ص ۱۱۱ و ۱۱۲، طبع دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۰۵ھ) حدیث الحج۔

حضرت صُبَیؒ ہی کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں " صنعت ماذا يا صبي؟ قال : هللت (لعل الصحيح : أهللت) يا أمير المؤمنين بالحج والعمرة فلما قدمت مكة وطفت بالبيت وطفت بين الصفا والمروة لعمرتي ثم رجعت حراماً ثم طفت بالبيت وبين الصفا والمروة لحجتي، ثم أقمت حراماً حتى كان يوم النحر فأهرقت دماً لمتعتي ثم أحللت، قال : فضرب عمر على ظهري وقال : هُدِيتَ لسنة نبيك صلى الله عليه وسلم "

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس حدیث کی اصل نسائی میں بھی موجود ہے[1] البتہ اس میں دو طوافوں اور دو سعی کا ذکر نہیں ہے۔

اس پر زیادہ سے زیادہ یہی اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ ابراہیم نخعیؒ کا صُبی بن معبدؓ اور حضرت عمرؓ کسی سے بھی سماع ثابت نہیں[2] لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ ابراہیم نخعیؒ کے مراسیل محدثین کے نزدیک مقبول ہیں، چنانچہ حافظ ابن عبدالبرؒ "تمہید"[3] میں امام اعمشؒ سے نقل کرتے ہیں: "قال: قلت لإبراهيم: إذا حدثتني حديثاً فأسنده، فقال: إذا قلت عن عبد الله يعني ابن مسعود فاعلم أنه عن غير واحد وإذا سميت لك أحداً فهو الذي سميت" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم نخعیؒ کی مراسیل ان کی مسانید سے بھی زیادہ قوی ہیں، چنانچہ خود حافظ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں "في هذا الخبر ما يدل أن مراسيل إبراهيم النخعي أقوى من مسانيده"[4] بلکہ انہوں نے ایک ضابطہ بھی بیان فرمایا ہے "کل

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "ثم صنعت ماذا؟ قال: لما قدمت مكة طفت طوافاً لعمرتي، ثم سعيت بين الصفا والمروة لعمرتي، ثم عدت فطفت بالبيت لحجتي ثم سعيت بين الصفا والمروة لحجتي، قال: ثم صنعت ماذا؟ قال: أقمت حراماً لم يحل لي شيء حرم علي من محظورات حتى إذا كان يوم النحر ذبحت ما استيسر من الهدي شاة، قال: فضرب عمر على كتفه ثم قال: هديت لسنة نبيك صلى الله عليه وسلم" دیکھئے مسند ابی حنیفہ (ص۱۱۵ تا ۱۱۸) ۱۲ مرتب

[3] (ج ۲، ص۱۷۵) الدليل على أن القارن بين الحج والعمرة يجزيه طواف واحد الخ۔ طبع مصر ۱۳۹۴ھ ۱۲ مرتب

(حاشیہ صفحۂ ہذا)

[1] دیکھئے (ج ۲ ص۲۱ و ۲۲) القران۔ بلکہ سنن ابی داؤد میں بھی موجود ہے (ج ۱ ص۲۵۰) باب في الإقران۔ نیز دیکھئے سنن ابن ماجہ (ص۲۱۳) باب من قرن الحج والعمرة ۱۲ مرتب

[2] چنانچہ ابن ابی حاتمؒ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں "لم يلق إبراهيم النخعي أحداً من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم إلا عائشة ولم يسمع منها شيئاً، فإنه دخل عليها وهو صغير، وأدرك أنساً ولم يسمع منه" كتاب المراسيل لابن أبي حاتم (ص۵) باب الألف ۱۲ مرتب

[3] (ج ۱ ص۳۷ و ۳۸) باب بيان التدليس الخ ۱۲ م

[4] حوالۂ بالا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ یحییٰ بن معینؒ فرماتے ہیں "مراسيل إبراهيم أحب إلي من مراسيل الشعبي، وهكذا عن يحيى بن معين أيضاً: أعجب إلي من مرسلات سالم بن عبد الله والقاسم وسعيد بن المسيب" اور امام احمدؒ، ابراہیم نخعیؒ کی مراسیل کے بارے میں فرماتے ہیں "لا بأس بها" دیکھئے تدریب الراوی (ج ۱ ص۲۰۴ و ص۲۰۵) النوع التاسع المرسل ۱۲ مرتب

من عُرِف أنه لا يأخذ إلا عن ثقة فتدليسه ومرسله مقبول، فمراسيل سعيد بن المسيب ومحمد بن سيرين وإبراهيم النخعي عندهم صحاح[1]"

(۲) امام نسائیؒ نے اپنی سنن کبریٰ میں مسند علیؓ کے تحت روایت ذکر کی ہے "عن حماد بن عبد الرحمٰن الأنصاري عن إبراهيم بن محمد ابن الحنفية قال: طفت مع أبي۔ وقد جمع بين الحج والعمرة۔ فطاف لهما طوافين وسعى لهما سعيين، وحدثني أن عليًّا فعل ذلك وقد حدثه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم فعل ذلك[2]"

اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس میں ایک راوی حماد بن عبد الرحمٰن انصاری ہیں جو ضعیف ہیں[3]۔
اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مختلف فیہ راوی ہیں اور بہت سے محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، چنانچہ ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے[4]، اور حافظ ابن حجرؒ درایہ[5] میں اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں "أخرجه النسائي في مسند علي، ورواته موثقون" لہٰذا ان کی روایت درجۂ حسن سے کم نہیں، اس کے علاوہ حضرت علیؓ کی اس روایت میں یہ متفرد بھی نہیں چنانچہ امام دارقطنیؒ نے اس کے اور بھی طرق ذکر کیے ہیں[6] جو اس کے لئے مؤید ہیں۔

(۳) حنفیہ کی تیسری دلیل سنن دارقطنیؒ میں حضرت علیؓ ہی کی ایک اور روایت ہے "حدثنا يوسف بن يعقوب بن إسحٰق بن بهلول حدثنا جدي حدثنا إسحاق الأزرق عن الحسن بن عمارة عن الحكم عن ابن أبي ليلى عن علي عليه السلام أنه طاف لهما طوافين وسعى لهما سعيين وقال هكذا رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم صنع"

---

[1] التمهيد لما في الموطأ من المعاني والأسانيد (ج ۱ ص ۳۰) باب بيان التدليس الخ ۱۲ مرتب

[2] نصب الرایہ (ج ۳ ص ۱۱۰) باب القران ۱۲ م

[3] قال صاحب التنقيح: وحماد هذا ضعفه الأزدي ..... قال بعض الحفاظ: هو مجهول، والحديث من أجله لا يصح" نصب الرایہ (ج ۳ ص ۱۱۰) ۱۲ مرتب

[4] نصب الرایہ (ج ۳ ص ۱۱۰) ۱۲ م

[5] (ج ۲ ص ۳۵ رقم ۴۹۰) باب وجوه الإحرام ۱۲ م

[6] دیکھئے سنن دارقطنی (ج ۲ ص ۲۶۳، رقم ۱۳۰ و ۱۳۱) باب المواقيت ۱۲ مرتب

[7] دارقطنی (ج ۲ ص ۲۶۳، رقم ۱۳۰) باب المواقيت ۱۲ م

لیکن اس روایت پر حسن بن عمارہؒ کے ضعف کا اعتراض کیا گیا ہے[1]۔
لیکن حقیقت یہ ہے کہ حسن بن عمارہؒ ایک مختلف فیہ راوی ہیں[2]، ان کی روایت مقبول ورنہ کم از کم متابعت کے لئے تو ضرور ہی پیش کی جاسکتی ہے۔

(۴) حنفیہ کی چوتھی دلیل سنن دارقطنی میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے "قال: طاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعمرته وحجته طوافین، وسعی سعیین، وأبوبکر وعمر وعلی وابن مسعود"[3]

---

[1] چنانچہ امام دارقطنی اسی روایت کے تحت لکھتے ہیں "الحسن بن عمارة متروك الحدیث" حوالۂ بالا ۱۲ م

[2] چنانچہ جہاں ان کی تضعیف کی گئی ہے وہاں علامہ ذہبیؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں "وکان من کبار الفقهاء فی زمانه وولی قضاء بغداد" نیز وہ ان کے بارے میں ابن عیینہؒ کا قول نقل کرتے ہیں "کان له فضل، وغیره أحفظ منه"

میزان الاعتدال فی نقد الرجال (ج ۱ ص ۵۱۳ و ص ۵۱۵، رقم ۱۹۱۸)۔

"محمد بن داود حُدّانیؒ فرماتے ہیں "سمعت عیسی بن یونس ۔ وسئل عن الحسن بن عمارة ۔ فقال: شیخ صالح"

تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۲۶۹) بتحقیق الدکتور بشار عواد معروف۔

نیز ایوب بن سویدؒ فرماتے ہیں "کنت عند سفیان الثوری فذکر الحسن بن عمارة فغمزه، فقلت له: یا أبا عبداللہ هو عندی خیر منك، قال: وکیف ذاك؟ قلت: جلست معه غیر مرّة، فیجری ذکرك، فما یذکرك إلا بخیر، قال أیوب: فما سمعت سفیان ذاکرًا الحسن بن عمارة بعد ذلك إلا بخیر حتی فارقته"

تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۲۶۹ و ۲۷۰)

نیز حافظ مزیؒ نقل کرتے ہیں "وکان مسعر والحسن یجلسان فی موضع واحد، فکان مسعر إذا سئل عن الحدیث ۔ والحسن ابن عمارة حاضر ۔ لم یحدث، ویقول: سل أبا محمد" (أی سل الحسن بن عمارة)۔

تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۲۷۳)

"عن معمر قال: لما ولی الحسن بن عمارة مظالم الکوفة بلغ الأعمش، فقال: ظالم ولی مظالمنا، فبلغ الحسن فبعث إلیه بأثواب ونفقة، فقال الأعمش: مثل هذا یولی علینا، یرحم صغیرنا، ویوقر کبیرنا، ویعود علی فقیرنا، فقال رجل: یا أبا محمد، ما هذا قولك فیه أمس! فقال: حدثنی خیثمة عن ابن مسعود قال: "جُبلت القلوب علی حب من أحسن إلیها وبغض من أساء إلیها" تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۲۷۵) رقم ۱۲۵۲۔

نیز قاضی ابو محمد حسن بن عبدالرحمن رامہرمزیؒ نے "المحدث الفاصل بین الراوی والواعی" میں حسن بن عمارہ کے بارے میں مفصل اور محققانہ کلام کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا میلان بھی ان کی توثیق کی طرف ہے۔ دیکھئے (ص ۳۲۰ تا ص ۳۲۲) طبع دار الفکر بیروت ۱۳۹۱ھ بتحقیق الدکتور محمد عجاج الخطیب ۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ

[3] سنن دارقطنی (ج ۲ ص ۲۶۳) باب المواقیت رقم ۱۳۲ ۔ ۱۲ م

اس روایت میں ابو بردہ ہیں جو بقولِ امام دارقطنیؒ ضعیف ہیں[1]۔ لیکن ابن عدیؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں "ھو ممن یکتب حدیثه من الضعفاء[2]" نیز ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے[3]۔

(۵) حنفیہ کی پانچویں دلیل سنن دارقطنی[4] میں حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت ہے: "أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم طاف طوافین وسعی سعیین"

اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس روایت میں محمد بن یحییٰ ازدیؒ کو وہم ہوا ہے ورنہ اصل روایت اس طرح تھی "أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قرن الحج والعمرۃ[5]"

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ محمد بن یحییٰ ازدیؒ ایک ثقہ راوی ہیں[6] اور ان کی طرف وہم کی نسبت بلا کسی قوی دلیل کے درست نہیں۔ چنانچہ حافظ ماردینیؒ نے امام دارقطنیؒ کے اعتراض کا مدلل رد کیا ہے، فلیراجع[7]۔

(٦) چھٹی دلیل سنن دارقطنی ہی میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے۔ چنانچہ مجاہدؒ ان کے بارے

---

[1] چنانچہ وہ فرماتے ہیں "وأبو بردة هذا هو عمرو بن يزيد، ضعيف" سنن دارقطنی (ج ۲ ص ۲٦۱) باب المواقیت ۱۲ م

[2] الكامل فى ضعفاء الرجال (ج ۵ ص ۱۷۵۱) عمرو بن يزيد، أبو بردة كوفى تميمى ۱۲ م

[3] كما فى معارف السنن (ج ٦ ص ۸۱) ۱۲ م

[4] (ج ۲ ص ۲٦۳) رقم ۱۳۱ - ۱۲ م

[5] چنانچہ امام دارقطنی لکھتے ہیں "قال الشيخ أبو الحسن (أى الدارقطنى): يقال: إن محمد بن يحيى الأزدى حدث بهذا من حفظه، فوهم فى متنه والصواب بهذا الإسناد: "أن النبى صلى الله عليه وسلم قرن الحج والعمرة" وليس فيه ذكر الطواف ولا السعى، وقد حدث به محمد بن يحيى الأزدى على الصواب مرارًا، ويقال: إنه رجع عن ذكر الطواف والسعى إلى الصواب، والله أعلم" سنن دارقطنی (ج ۲ ص ۲٦۳، رقم ۱۳۲) ۱۲ مرتب

[6] چنانچہ حافظ ابن حجرؒ ان کے بارے میں "تقریب التہذیب" میں لکھتے ہیں "محمد بن يحيى بن عبد الكريم بن نافع الأزدى البصرى، نزيل بغداد، ثقة، من كبار الحادية عشرة، مات سنة اثنتين وخمسين، أخرج له أبو داؤد فى القدر، والترمذى وابن ماجه فى سننهما" (ج ۲ ص ۲۱٦، رقم ۸۰) ۱۲ مرتب

[7] چنانچہ وہ الجوهر النقى فى ذيل السنن الكبرى للبيهقى (ج ۵ ص ۱۰۸، باب المفرد والقارن يكفيهما طواف واحد وسعى واحد الخ) میں لکھتے ہیں: "قلت: قوله (أى الدارقطنى): "حدث به من حفظه فوهم" لم ينسبه إلى أحد ممن يعتمد عليه، وكذا قوله (أى الدارقطنى): "ويقال: إنه قد رجع عنه" والظاهر أن المراد أنه سكت عنه وإذا ذكر هذه الزيادة مرة وسكت عنها مرة أخرى، لا تترك الزيادة، ولو كان فى الحديث علة أخرى غير هذا الذكره الدارقطنى ظاهرًا" ۱۲ مرتب

[8] (ج ۲ ص ۲۵۸) رقم ۹۹، باب المواقیت ۱۲ م

میں نقل کرتے ہیں "أنه جمع بین حجته وعمرته معًا، وقال، سبیلهما واحد، قال: فطاف لهما طوافین وسعی لهما سعیین، وقال: هكذا رأيتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم صنع كما صنعت"

اس روایت میں حسن بن عمارہؒ کے سوا کوئی راوی متہم نہیں [1] اور ان کے بارے میں بھی ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں کہ ان کی روایت کو کم از کم متابعت اور تائید کے لئے تو ضرور ہی پیش کیا جا سکتا ہے۔

ان روایات کے علاوہ حنفیہ کا استدلال صحابۂ کرام کے متعدد آثار سے بھی ہے:۔

(۱) کتاب الآثار میں امام محمدؒ نے روایت ذکر کی ہے "أخبرنا أبو حنيفة قال: حدثنا منصور بن المعتمر عن إبراهيم النخعي عن أبي نصر السلمي عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه قال: إذا أهللت بالحج والعمرة فطف لهما طوافين واسع لهما سعيين بالصفا والمروة، قال منصور: فلقيتُ مجاهدًا وهو يفتي بطواف واحد لمن قرن، فحدثته بهذا الحديث، فقال لو كنت سمعت لم أفت إلا بطوافين، وأما بعد اليوم فلا أفتي إلا بهما" [2]

اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ حافظ ابن حجرؒ اس کے بارے فرماتے ہیں "وفي إسناده راوٍ مجهول" [3]

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ راوی مجہول سے ان کی مراد ابو نصر سلمیؒ ہیں [4]، لیکن خود حافظ ابن حجرؒ نے تعجیل المنفعۃ اور علامہ ہیثمیؒ نے کشف الاستار میں نقل کیا ہے کہ ابن خلفونؒ نے ابو نصر سلمیؒ کو ثقات میں ذکر کیا ہے، نیز ان سے ابراہیم نخعیؒ، مالک بن الحارثؒ اور خود ان کے بیٹے روایت کرتے ہیں، لہٰذا ان کو مجہول کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے جبکہ ان سے تین افراد روایت کر رہے ہیں، نیز

---

[1] چنانچہ علامہ بنوریؒ اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں "وليس فيه من يتهم غير الحسن بن عمارة عندهم ولم يمكن للدارقطني الكلام فيه بغير جرحه بالحسن بن عمارة وغير إثبات معارضته بحديث الحسن بن عمارة نفسه من حديث ابن عباس مرفوعًا، ولا ريب أن المحدث يروي روايتين عن صحابيين متعارضتين، والفقيه يختار منهما اجتهادًا وفقهًا واحدًا منهما" معارف السنن (ج ٦ ص ٦٠) ۱۲ م

[2] کتاب الآثار (ص ٦٦ و ٦٧) رقم ۳۲۵ کتاب المناسك، باب القران وفضل الإحرام ۱۲ م

[3] الدرایۃ (ج ۲ ص ۳۵، تحت رقم ۴۹۰) باب وجوه الإحرام ۱۲ م

[4] اس لئے کہ ان کے علاوہ تمام رُوات بلاشبہ معروف ہیں ۱۲ م

ابن خلفونؒ کا ان کی توثیق کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مجہول نہیں، اس کے علاوہ منصور بن المعتمرؒ کا ان کی حدیث سے استدلال کرنا اور مجاہدؒ کا ان کی روایت کی وجہ سے اپنے مسلک کو ترک کردینا اس کی دلیل ہے کہ یہ مجہول ہیں نہ ضعیف[1]، پھر عبدالرحمٰن بن اُذینہؒ نے ان کی متابعت بھی کی ہے اور اس کی سند بھی جید ہے کما مرّ فی شرح معانی الآثار[2]۔

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ میں مروی ہے "حدثنا ھشیم بن بشیر عن منصور بن زاذان عن الحکم عن زیاد بن مالك أن علیًا وابن مسعود قالا فی القارن: یطوف طوافین[3]"۔

(۳) مصنف ابن ابی شیبہؒ ہی میں حضرت حسن بن علیؓ کا اثر مروی ہے "قال: إذا قرنت بین الحج والعمرۃ فطف طوافین واسع سعیین[4]"

(۴) محلّی میں ابن حزمؒ نے حضرت حسین بن علیؓ کا اثر بھی ذکر کیا ہے "قال: إذا قرنت بین الحج و

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے اعلاء السنن (ج ۱۰ ص۲۷۵ و ۲۷۶) باب یطوف القارن طوافین ویسعٰی سعیین ۱۲ م

[2] (ج ۱ ص۳۲۵) باب القارن کم علیہ من الطواف لعمرتہ ولحجتہ۔ نیز دیکھئے "التمہید لما فی المؤطا من المعانی والأسانید"، (ج ۸ ص۲۳۳) ۱۲ مرتب

[3] (ج ۴ ص۳۳۴ و ۳۳۵) فی القارن من قال یطوف طوافین۔ رقم ۲۱۸۷

علامہ ماردینیؒ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں "ورجال ھذا السند ثقات، وزیاد بن مالك ذکرہ ابن حبان فی الثقات"، الجوہر النقی فی ذیل السنن الکبریٰ للبیہقی (ج ۵ ص۱۰۸) باب المفرد والقارن یکفیہما طواف واحد وسعی واحد۔

واضح رہے کہ نصب الرایہ میں یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ ہی کے حوالہ سے "ویسعی سعیین" کے الفاظ کی زیادتی کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔ دیکھئے (ج ۳ ص۱۱۲) قبیل باب التمتع

حافظ ابن حجرؒ کی "درایہ" میں بھی یہ روایت "ویسعٰی سعیین" کی زیادتی کے ساتھ منقول ہے، حافظؒ نے اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد سکوت کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ روایت ان کے نزدیک کم از کم حسن ہے۔ دیکھئے (ج ۲ ص۳۵) باب وجوہ الإحرام، تحت رقم ۴۹۰۔ ۱۲ مرتب عفی عنہ

[4] (ج ۴ ص۳۳۵، رقم ۲۱۸۸) فی القارن من قال: یطوف طوافین۔

حافظؒ نے درایہ میں اس اثر کو بھی ذکر کرنے کے بعد سکوت کیا ہے، دیکھئے (ج ۲ ص۳۵) ۱۲ م

العمرة فطف طوافين واسعي سعيين [1]»

جہاں تک حضرت جابرؓ کی حدیثِ باب کا تعلق ہے سو یہ مضمون حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی مروی ہے [2] لیکن ظاہر ہے کہ اس مضمون کی تمام احادیث مؤوّل ہیں اور ان کا ظاہری مفہوم کسی کے نزدیک بھی مراد نہیں، کیونکہ اس پر اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک طواف نہیں کیا بلکہ تین طواف کئے، اب ائمۂ ثلاثہ تو حدیثِ باب اور اس جیسے مضمون والی روایات کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ طوافِ واحد سے مراد طوافِ زیارت ہے جس میں طوافِ عمرہ کا تداخل ہوگیا ہے۔

جبکہ حنفیہ اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ اس قسم کی احادیث میں طوافِ واحد سے مراد طوافِ عمرہ ہے جس میں طوافِ قدوم کا تداخل ہوگیا ہے حنفیہ کی توجیہ اس لئے راجح ہے کہ اس سے روایات میں تطبیق ہوجاتی ہے۔

حدیثِ باب کی ایک توجیہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے وہ یہ کہ یہاں طواف سے مراد طوافِ تحلّل ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایسا طواف آپؐ نے ایک ہی کیا جو تحلّل کا سبب بنا ہو اور وہ طوافِ زیارت تھا کیونکہ طوافِ عمرہ کے بعد آپؐ قارن ہونے کی وجہ سے

---

[1] محلّی میں یہ اثر «حجاج بن أرطاة عن الحکم بن عمرو بن الأسود عن الحسین بن علی» کے طریق سے ذکر کیا گیا ہے۔ دیکھئے (ج ۷، ص ۱۷۵) الدلیل علی أن القارن بین الحج والعمرة یجزیه طواف واحد۔

علامہ ابن حزمؒ نے حسین بن علیؓ سے یہ مضمون مرفوعاً بھی نقل کیا ہے، لیکن اس میں بعض رواۃ متکلم فیہ ہیں جبکہ اثر کی سند بھی قابلِ تحقیق ہے ۱۲ مرتب

[2] چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ کی ایک طویل حدیث میں یہ جملہ بھی مروی ہے «وأما الذین جمعوا بین الحج والعمرة فإنما طافوا طوافا واحدا» دیکھئے (ج ۱ ص ۲۲۱) باب طواف القارن، کتاب المناسک۔ نیز دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۸۵) باب بیان وجوہ الإحرام۔

نیز حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں بخاری میں یہ الفاظ آئے ہیں «فطاف لهما طوافا واحدا» اور بخاری ہی کی ایک روایت کے دوسرے طریق میں حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول بھی مروی ہے «کذلک فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم» (ج ۱ ص ۲۲۲) باب طواف القارن۔ مسلم کی روایت میں بھی اسی قسم کے الفاظ آئے ہیں، دیکھئے (ج ۱ ص ۴۰۷) باب جواز التحلل بالإحصار الخ ۱۲ مرتب

حلال نہیں ہوئے[1] کما یدل علیہ سیاق بعض روایات عائشۃ وابن عمر رضی اللہ عنہما۔

پھر سعی کے بارے میں بھی اختلاف ہے حنفیہؒ کے نزدیک طواف کی طرح حج اور عمرہ کے لئے سعی بھی علیحدہ کرنی ہوگی، جبکہ ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک طواف کی طرح ایک ہی سعی حج اور عمرہ دونوں کے لئے کافی ہے[2]۔

---

[1] حدیثِ باب اور اس جیسی روایات کا جواب دیتے ہوئے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ نے بڑی نفیس بحث فرمائی ہے چنانچہ ان کے شاگردِ رشید علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فتح الملہم (ج ۳ ص۲۵۱و۲۵۲)، باب بیان وجوہ الإحرام، اختلاف العلماء فی أن القارن یکفیہ طواف واحد وسعی واحد أو یلزمہ طوافان وسعیان الخ) میں نقل فرماتے ہیں: "وقال شیخنا المحمود قدس اللہ روحہ: اعلم أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ومن معہ قد طافوا بالبیت فی حجۃ الوداع ثلاثۃ أطوفۃ، الأول یوم دخول مکۃ لرابع من ذی الحجۃ، والثانی طواف الإفاضۃ لعاشر ذی الحجۃ، والثالث طواف الوداع للرابع عشر من ذی الحجۃ، فہذا قد ثبت ثبوتاً لا مرد لہ ولا مریۃ فیہ، ولا یستطیع أحد ممن لہ أدنی مساس بالعلم أن ینکرہ أو یشک فیہ فلو ذھبنا إلی ظاہر حدیث عائشۃ۔ أی من قولہا: إنما طافوا طوافاً واحداً۔ للزمنا القول بأنہم لم یطوفوا من الابتداء إلی الانتہاء إلا طوافاً واحداً، وھذا صریح البطلان عند الکل، لکونہ خلاف الواقع، فلا بد لکل فریق من العدول عن ظاہرہ وتأویلہ بما یطابق الواقع، ولہذا أوّلہ الجمہور بأن معناہ إنما طافوا طوافاً واحداً، أی طواف الرکن للحج والعمرۃ، فلما اضطروا إلی التأویل وتقدیر القیود ولم یبق فی أیدیہم ظاہر الحدیث، فأی مزیۃ لہم؟ وأی لوم وتعییر علی الحنفیۃ إن أوّلوہ بما لا یعارض الأحادیث الدالۃ علی تعدد الطواف للقارن، بل یلائم سیاق بعض روایات عائشۃ وابن عمر رضی اللہ عنہم، قال شیخنا: وظنی أن مقصود عائشۃ بہذا الحدیث لیس بیان وحدۃ الطواف وتعددہ بل الغرض الأصلی إثبات الفصل بین الطوافین للمتمتعین ونفیہ عن القارنین، فمعنی قولہا: "فإنما طافوا طوافاً واحداً" أی إنما طافوا للإحلال منہما طوافاً واحداً، وھو طواف الإفاضۃ، بخلاف المتمتعین، فإنہم حلوا أولاً من العمرۃ بالطواف الأول ثم حلوا من الحج بالطواف الثانی، ویؤید ما ذکرناہ قولہا فی طریق أبی الأسود عن عروۃ عنہا: "فأما من أہل بعمرۃ فحل، وأما من أہل بحج، أو جمع الحج والعمرۃ فلم یحلوا حتی کان یوم النحر" وکذا ما فی حدیث ابن عمر القولی من طریق الدراوردی عن عبید اللہ عند الترمذی وغیرہ "من أحرم بالحج والعمرۃ أجزأہ طواف واحد وسعی واحد منہما حتی یحل منہما جمیعاً" یشعر بما قلناہ إن ثبت صحتہ، ولکن قد أعلہ الطحاوی بأن الدراوردی أخطأ فیہ، وأن الصواب موقوف" ۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ

[2] مذاہب کی تفصیل کے لئے دیکھئے المغنی (ج ۳ ص۳۶۵و۳۶۶) مسألۃ: ولیس فی عمل القارن زیادۃ علی عمل المفرد، اور عمدۃ القاری (ج ۹ ص۱۸۳) باب کیف تہل الحائض والنفساء ۱۲ مرتب

ائمہ ثلاثہؒ کا استدلال ان روایات سے ہے جن میں طوافِ واحد کے ساتھ سعیِ واحد کا بھی ذکر ہے[1]
حنفیہ کا استدلال ان دلائل سے بھی ہے جو پیچھے گذرچکی ہیں[2]۔ نیز ان کی ایک قوی دلیل قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ احادیثِ صحیحہ اس کے بارے میں متعارض ہیں کہ آپؐ نے سعی پیدل کی یا سوار ہوکر، بعض روایات میں ماشیاً اور بعض میں راکباً وارد ہوا ہے[3]۔ اس تعارض کو رفع کرنے کی کوئی معقول توجیہ بجز اس کے نہیں کہ آپؐ نے دو مرتبہ سعی فرمائی ایک ماشیاً اور ایک راکباً[4]۔

---

[1] مثلاً اسی باب میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی مرفوع روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں «من أحرم بالحج والعمرة أجزأه طواف واحد وسعي واحد عنهما، حتى يحل منهما جميعاً» ترمذی (ج ۱ ص۱۷۱)

اور مسلم میں حضرت جابرؓ کی روایت مروی ہے "لم يطف النبي صلى الله عليه وسلم ولا أصحابه بين الصفا والمروة إلا طوافاً واحداً" (ج ۱ ص۴۱۳) باب بيان أن السعي لا يتكرر ۱۲ مرتب

[2] چنانچہ حنفیہ کے دلائل کے تحت پیچھے جتنی روایات ہم نے ذکر کی ہیں تقریباً سب ہی میں سعیین کا ذکر ہے ۱۲ م

[3] سعی ماشیاً کے لئے دیکھئے صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ کی حدیثِ طویل کے یہ الفاظ «ثم نزل إلى المروة حتى انصبت قدماه في بطن الوادي، حتى إذا صعدتا مشى حتى أتى المروة» الحديث (ج ۱ ص۳۹۶) باب حجة النبي صلى الله عليه وسلم

اور سنن نسائی میں دیکھئے کثیر بن جمہانؒ کی روایت «قال: رأيت ابن عمر يمشي بين الصفا والمروة، فقال: إن أمش فقد رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يمشي، وإن أسع فقد رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يسعى» (ج ۲ ص۴۲) المشي بينهما۔ نیز مجمع الزوائد میں دیکھئے حبیبہ بنت ابی تجراۃؓ کی روایت «قالت: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يطوف بين الصفا والمروة، والناس بين يديه وهو وراءهم وهو يسعى حتى أرى ركبتيه من شدة السعي يدور به إزاره» (ج ۳ ص۲۴۸) باب ما جاء في السعي۔

سعی راکباً کے لئے دیکھئے سنن نسائی میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت، فرماتے ہیں «طاف النبي صلى الله عليه وسلم في حجة الوداع على راحلته بالبيت وبين الصفا والمروة ليراه الناس» الخ (ج ۲ ص۴۲) الطواف بين الصفا والمروة على الراحلة۔

نیز سعیین اور سعی ماشیاً و راکباً سے متعلق مزید بحث کے لئے دیکھئے البداية والنهاية (ج ۵ ص۱۵۹ تا ۱۶۵) ذكر طوافه عليه السلام بين الصفا والمروة۔ ۱۲ مرتب عفی عنہ

[4] دیکھئے التفسير المظهری (ج ۱ ص۲۳۰) صح أنه صلى الله عليه وسلم طاف القدوم والزيارة وسعى سعيين ۱۲ مرتب عفی عنہ

جہاں تک ان روایات کا تعلق ہے جن میں ایک سعی کا ذکر ہے سو ان کا مجموعی جواب یہ ہے کہ تعارض کے وقت مثبتِ زیادت کو ترجیح ہوتی ہے۔

نیز سعی والی روایات میں سے ایک روایت حضرت ابن عمرؓ کی بھی ہے کما أخرجها الترمذی فی الباب مرفوعًا۔ اس کا تفصیلی جواب یہ بھی ہے کہ یہ روایت مرفوعًا صرف عبد العزیز دراوردیؒ کے طریق سے آئی ہے، وھو سیئ الحفظ کما صرح به المحدثون[1]، لہٰذا صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے جو مرفوع کے مقابلہ میں حجت نہیں، اور اگر بالفرض مرفوع بھی ہو تب بھی اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک طواف اور ایک سعی عمرہ اور حج دونوں کے احرام سے حلال ہونے کے لئے کافی ہے اور حلال ہونے کے لئے مزید کسی طواف اور سعی کی ضرورت نہیں، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ عمرہ کے لئے نہ کوئی طواف ہے نہ کوئی سعی[2]۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] چنانچہ ابو زرعہؒ ان کے بارے میں کہتے ہیں "سیئ الحفظ" ابو حاتمؒ کہتے ہیں "لا یحتج به" امام احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں "إذا حدث من حفظه جاء ببواطیل"۔ علامہ ذہبیؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "صدوق من علماء المدینة" تفصیل کے لئے دیکھئے میزان الاعتدال (ج ۲ ص۶۳۳ و ۶۳۴، رقم ۵۱۲۵)۔

حافظ ابن حجرؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں "صدوق کان یحدث من کتب غیره فیخطئ، قال النسائی: حدیثه عن عبید اللہ العمری منکر" تقریب التہذیب (ج ۱ ص۵۱۲، رقم ۱۲۲۸)

واضح رہے کہ عبد العزیز دراوردی کی حدیثِ باب عبید اللہ عمری ہی سے مروی ہے ۱۲ مرتب

[2] جہاں تک حضرت جابرؓ کی روایت کا تعلق ہے سو اس کے متعدد طرق ہیں:-

پہلا طریق مسلم میں اس طرح مروی ہے "لم یطف النبی صلی اللہ علیه وسلم ولا أصحابه بین الصفا والمروة إلا طوافًا واحدًا" (ج ۱ ص۴۱۲) باب بیان أن السعی لا یتکرر۔

مسلم کے دوسرے طریق میں اس روایت کے آخر باب یہ الفاظ آئے ہیں "إلا طوافًا واحدًا طوافه الأول" (ج ۱ ص۴۱۲) سنن ابی داؤد کے ایک طریق میں بھی یہ روایت اسی طرح آئی ہے، دیکھئے (ج ۱ ص۲۶۱) باب طواف القارن۔

حضرت جابرؓ کی روایت کا ایک اور طریق سنن ابی داؤد میں اس طرح مروی ہے "حدثنا موسی بن إسماعیل ثنا حماد، عن قیس بن سعد، عن عطاء بن أبی رباح، عن جابر قال: قدم رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وأصحابه لأربع لیال خلون من ذی الحجة، فلما طافوا بالبیت وبالصفا والمروة: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اجعلوها عمرة إلا من کان معه الهدی، فلما کان یوم الترویة: أهلوا بالحج، فلما کان یوم النحر: قدموا فطافوا بالبیت، ولم یطوفوا بین الصفا والمروة"۔

صاحبِ فتح الملہم علامہ عثمانی قدس اللہ سرہٗ نے ان طرق میں سے مسلم کی "ابو الزبیر عن جابر" والی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

روایت یعنی «لم یطف النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولا أصحابہ بین الصفا والمروۃ إلا طوافًا واحدًا طوافہ الأول» کو ترجیح دی ہے دیکھئے فتح الملہم (ج ۳ ص۲۵۳) الدلیل علی تعدد السعی علی القارن ۔

لیکن مسلم کی مذکورہ روایت پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ یہ بخاری شریف میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے معارض ہے جس میں وہ فرماتے ہیں: «أھل المھاجرون والأنصار وأزواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی حجۃ الوداع وأھللنا، فلما قدمنا مکۃ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اجعلوا إھلالکم بالحج عمرۃ إلا من قلد الھدی، طفنا بالبیت وبین الصفا والمروۃ وأتینا النساء، ولبسنا الثیاب، وقال: من قلد الھدی فإنہ لا یحل لہ حتی یبلغ الھدی محلہ، ثم أمرنا عشیۃ الترویۃ أن نھل بالحج، فإذا فرغنا من المناسک جئنا فطفنا بالبیت وبالصفا والمروۃ، فقد تم حجنا وعلینا الھدی الخ» (ج ۱ ص۲۱۳ و ص۲۱۴) باب قول اللہ عزوجل: ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۔

دونوں روایتوں میں تعارض اس طرح ہے کہ حضرت جابرؓ کی روایت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ نے صرف ایک سعی کی، اور صحابہ کرامؓ میں سے بیشتر حضرات متمتع تھے، جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ متمتعین نے بھی صرف ایک مرتبہ سعی کی، جبکہ حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر صحابہؓ نے دو مرتبہ طواف اور دو مرتبہ سعی کی، جیسا کہ ائمہ اربعہ کا یہی مسلک ہے إلا عند أحمد فی روایۃ (فتح الملہم ج ۳ ص۲۵۳) اس طرح دونوں روایات میں تعارض ہو جاتا ہے، اور حضرت جابرؓ کی روایت سب ہی کے مسلک کے خلاف ہے اس لئے اس کے تسلی بخش جواب کی ضرورت ہے ۔

علامہ عثمانیؒ نے فتح الملہم (ج ۳ ص۲۵۳ و ۲۵۴) میں اس کی یہ توجیہ کی ہے:

أما روایۃ أبی الزبیر فمقصودھا عندی بیان وحدۃ السعی حین قدوم مکۃ أولًا وأن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وأصحابہ کلھم فیھا سواء، ولعل الغرض من ھذا الکلام دفع ما عسی أن یتوھم من سیاق حدیثہ الطویل: "إن الذین فسخوا الحج بعد ما طافوا وسعوا بإحرام الحج وتلبیتہ ونیتہ خالصًا لا یخالطہ شئ کیف جعلوہ عمرۃ؟ وھل کانوا مأمورین فی ذلک بالطواف والسعی بنیۃ العمرۃ ثانیًا؟" فأخبر رضی اللہ عنہ بأنہ ما احتاج أحد من أصحابہ صلی اللہ علیہ وسلم إلی تکرار السعی إذ ذاک بل کلھم طافوا بین الصفا والمروۃ طوافًا واحدًا حتی الفاسخین المذکورین، فسعیھم وطوافھم بنیۃ الحج قد عدہ الشارع من قبیل العمرۃ مع فقدان نیتھا علی خلاف القیاس، وھذا کلہ کان مختصًا بذلک العام کما دل علیہ أحادیث أبی ذر وعثمان وبلال بن الحارث رضی اللہ عنھم۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت جابرؓ کا مقصود متمتع یا قارن کے لئے ایک طواف یا ایک سعی کو ثابت کرنا نہیں ہے بلکہ وہ ایک وہم کو دور کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو جب فسخ الحج إلی العمرۃ کا حکم دیا تو کسی کو یہ وہم ہو سکتا تھا کہ پہلا طواف اور پہلی سعی تو حج کی نیت سے تھی، اب عمرہ کے لئے مستقل طواف اور مستقل سعی کی گئی ہوگی، حضرت جابرؓ نے اپنی روایت سے یہ وہم دور کر دیا اور بتلا دیا کہ وہ پہلا والا طواف اور سعی عمرہ کے لئے کافی ہوگئی اور کسی کو بھی یہ دونوں کام عمرہ کے لئے دوبارہ نہیں کرنے پڑے، اگرچہ حج کے لئے بعد میں مستقل طواف اور سعی کی گئی۔ واللہ أعلم ۱۲ رشید اشرف

باب ماجاء فی المحرم یموت فی إحرامہ

عن[1] ابن عباس قال: کنا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی سفر فرأی رجلاً سقط من بعیرہ، فوُقِصَ[2] فمات وھو محرم، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اغسلوہ بماء وسدر، وکفنوہ فی ثوبیہ، ولا تخمروا رأسہ، فإنہ یبعث یوم القیامۃ یھل او یلبی " اس حدیث کی بناء پر امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام اسحاقؒ اور ظاہریہؒ اس بات کے قائل ہیں کہ مرنے کے بعد بھی محرِم کا احرام باقی رہتا ہے، چنانچہ جو شخص حالتِ احرام میں مرجائے تو اس کا سر ڈھکنا اور اس کو خوشبو لگانا جائز نہیں[3]، کیونکہ حدیثِ باب میں آپؐ نے سر ڈھکنے سے منع فرمایا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ وغیرہ کے نزدیک موت سے احرام منقطع ہوجاتا ہے لہٰذا محرم اگر حالتِ احرام میں مرجائے تو اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائیگا جو حلال کے ساتھ کیا جاتا ہے، چنانچہ اُسے خوشبو لگانا اور اس کا سر ڈھکنا جائز ہیں[4]۔

---

[1] الحدیث أخرجہ البخاری فی صحیحہ (ج ۱ ص۱۶۹) کتاب الجنائز، باب الکفن فی ثوبین، وباب الحنوط للمیت، وباب کیف یکفن المحرم۔ و(ج ۱ ص۲۴۹) أبواب العمرۃ، باب المحرم یموت بعرفۃ، وباب سنۃ المحرم إذا مات۔ ومسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص۳۸۴) کتاب الحج، باب ما یفعل بالمحرم إذا مات۔ والنسائی فی سننہ (ج ۱ ص۲۶۹) کتاب الجنائز، باب کیف یکفن المحرم إذا مات، و(ج ۲ ص۲۷) کتاب الحج، «غسل المحرم بالسدر إذا مات» و «فی کم یکفن المحرم إذا مات» و «النھی عن أن یحنط المحرم إذا مات» و «النھی أن یخمر وجہ المحرم ورأسہ إذا مات» و «النھی عن تخمیر رأس المحرم إذا مات» ۔ وابن ماجۃ فی سننہ (ص۲۲۳) کتاب المناسک، باب المحرم یموت۔ ۱۲ مرتب

[2] وُقِصَ الرجلُ: آدمی کی گردن کا ٹوٹ جانا۔ ۱۲ م

[3] وھو قول عثمان وعلی وابن عباس وعطاء والثوری۔ کما فی العمدۃ (ج ۸ ص۵۱) کتاب الجنائز باب الکفن فی ثوبین۔ ۱۲ م

[4] وھو مروی عن عائشۃ وابن عمر وطاؤس۔ عمدہ (ج ۸ ص۵۱) ۱۲ م

ان حضرات کا استدلال حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ہے: "أنّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: إذا مات الإنسان انقطع عملہ إلّا من ثلاثۃ إلّا من صدقۃ جاریۃ أو علم ینتفع بہ، أو ولد صالح یدعو لہ[1]"

نیز ان کا استدلال مؤطا امام مالکؒ میں نافعؒ کی روایت سے ہے "أن عبد اللہ بن عمر کفن ابنہ واقد بن عبد اللہ و مات بالجحفۃ محرمًا، وقال: لولا أنا حرم لطیبناہ، وخمر رأسہ ووجہہ[2]"

ان حضرات کا ایک اور استدلال حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ہے "قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: خمروا وجوہ موتاکم ولا تشبہوا بالیہود" أخرجہ الدارقطنی فی سننہ[3] بسندٍ صالح[4]۔ اس روایت میں "وجوہ موتاکم" کے الفاظ عام ہیں جو محرمِ

---

[1] دیکھئے صحیح مسلم (ج ۲ ص ۴۱) کتاب الوصیۃ، باب ما یلحق الإنسان من الثواب بعد وفاتہ ۔۔۔ سنن أبی داؤد (ج ۲ ص ۳۹) کتاب الوصایا، باب ما جاء فی الصدقۃ عن المیت۔ سنن نسائی (ج ۲ ص ۱۳۲) کتاب الوصایا، فضل الصدقۃ عن المیت ۔۔ اور سنن ترمذی (ج ۱ ص ۱۶۵) أبواب الأحکام، باب ما جاء فی الوقف ۔ ۱۲ م

[2] مؤطا امام مالکؒ (ص ۳۳۳) کتاب الحج، باب تخمیر المحرم وجہہ ۔ مؤطا امام محمدؒ میں یہ روایت اس طرح مروی ہے: "أخبرنا مالک، أخبرنا نافع أن ابن عمر کفن ابنہ واقد بن عبد اللہ وقد مات محرمًا بالجحفۃ، وخمر رأسہ" (ص ۲۳۷) کتاب الحج، باب تکفین المحرم ۱۲ مرتب

[3] دیکھئے (ج ۲ ص ۲۹۷، رقم ۲۷۳) کتاب الحج، باب المواقیت ۱۲ م

[4] چنانچہ اس روایت کی سند اس طرح ہے "حدثنا عبد اللہ بن محمد نا عبد الرحمن بن صالح الأزدی نا حفص بن غیاث عن ابن جریج عن عطاء عن ابن عباس" اس میں عبد الرحمن بن صالح ازدی صدوق ہیں، کما فی التقریب (ج ۱ ص ۴۸۲، رقم ۹۷۸) وبقیۃ الإسناد لا یسأل عنہ کما نقل عن ابن القطان۔ انظر التعلیق المغنی علی الدارقطنی (ج ۲ ص ۲۹۶)۔

زیر بحث روایت سنن دارقطنی (ج ۲ ص ۲۹۶، رقم ۲۷۱ و ۲۷۲) میں دو مزید طرق سے مروی ہے، دونوں میں محرم کی تصریح ہے چنانچہ متن کے الفاظ یہ ہیں: "عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المحرم یموت قال: خمروہم ولا تشبہوا بالیہود" لیکن یہ دونوں طریق علی بن عاصم کی وجہ سے ضعیف ہیں، لیکن تائید کے لئے ان کو بہرحال پیش کیا جاسکتا ہے ۱۲ مرتب

وغیر محرم سب کو شامل ہیں۔

جہاں تک حدیثِ باب کا تعلق ہے، سو اس کی توجیہ حنفیہ و مالکیہ نے یہ کی ہے کہ یہ اس شخص کی خصوصیت تھی، اس کا قرینہ یہ ہے کہ آپؐ نے حدیثِ باب میں فرمایا " فإنه يبعث يوم القيامة يهل أو يلبي " واللہ أعلم

باب ما جاء فی المحرم یحلق رأسه فی إحرامه، ما علیه؟

عن کعب بن عجرة أن النبی صلی الله علیه وسلم مرّ به وهو بالحدیبیة قبل أن یدخل مکة، وهو محرم، وهو یوقد تحت قدر، والقمل یتهافت علی وجهه، فقال: أتؤذیك هوامك هذه؟ فقال: نعم فقال: احلق " اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر حضرت کعب بن عجرہؓ پر ہوا اور ان کی یہ حالت دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مشکل آسان فرمائی۔ لیکن صحیح بخاری کی ایک روایت میں حضرت کعب بن عجرہؓ سے مروی ہے " حُملت إلی رسول الله صلی الله علیه وسلم الخ " جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت

---

[1] حنفیہ نے خصوصیتِ " رجل " کی ایک دلیل یہ بھی بیان کی ہے کہ حدیثِ باب میں " غسل بماءٍ وسدرٍ " کا ذکر ہے باوجودیکہ محرم حق غسل بالماء والسدر نہیں کرتا کما فی معارف السنن (ج ۶ ص۳۳۸) ۱۲ مرتب

[2] الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحه (ج ۱ ص۲۴۳) أبواب العمرة، باب قول الله تعالی: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ، وباب قول الله: أَوْ صَدَقَةٍ وهی إطعام ستة مساكين، باب الإطعام فی الفدیة نصف صاع، وباب النسك شاة، و(ج ۲ ص۵۹۸ و ص۵۹۹ و ص۶۰۲) کتاب المغازی باب غزوة الحدیبیة، و(ج ۲ ص۶۴۸) کتاب التفسیر، باب قوله فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ ـ و(ج ۲ ص۸۴۶) کتاب المرضی، باب قول المریض: إنی وجع، أو وارأساه أو اشتد بی الوجع الخ ـ و(ج ۲ ص۸۵۰) کتاب الطب باب الحلق من الأذی ـ و(ج ۲ ص۹۹۴) کتاب الأیمان والنذور، باب کفارات الأیمان وقول الله تعالی: فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ ـ ومسلم فی صحیحه (ج ۱ ص۳۸۲) کتاب الحج، باب جواز حلق الرأس للمحرم إذا کان به أذی الخ ـ والنسائی فی سننه (ج ۲ ص۲۷) کتاب مناسك الحج، باب فی المحرم یؤذیه القمل ـ وأبوداؤد فی سننه (ج ۱ ص۲۵۶ و ۲۵۷) کتاب المناسك، باب فی الفدیة ـ وابن ماجه فی سننه (ص۲۲۲ و ۲۲۳) أبواب المناسك، باب فدیة المحصر ۱۲ م

[3] صحیح بخاری (ج ۱ ص۲۴۴) کتاب الحج، باب الإطعام فی الفدیة صاع ۱۲ م

کعب بن عجرہؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس حال میں پیش کیا گیا تھا کہ جوئیں ان پر رینگ رہی تھیں جس سے بظاہر ایک طرح کا تعارض ہو جاتا ہے :

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کے جزئی اختلافات معمولی حیثیت رکھتے ہیں، وہ اصل واقعہ کی حیثیت پر اثر انداز نہیں ہوتے، اس قسم کے غیر مقصود جزئی واقعات میں بعض اوقات ثقات کو بھی وہم ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بعض اوقات ثقات کی توجہ اصلِ مضمون کی طرف ہوتی ہے چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "وجمهور الرواة كانوا يعتنون برؤس المعانى لا بحواشيها"[1] بہر حال اس قسم کی جزئیات میں تعددِ واقعات پر حمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم شرح الباب بزيادة وتوضيح من المرتب۔

باب ماجاء فى الرخصة للرعاة أن يرموا يوما ويدعوا يوما

عن[2] أبى البداح بن عدى عن أبيه أن النبى صلى الله عليه وسلم ارخص للرعاء أن يرموا يوما ويدعوا يوما۔ یہاں دو مسئلے زیرِ بحث آتے ہیں "مسئلة المبيت بمنى فى ليالى منى" اور "مسئلة تاخير رمى الجمار عن وقته المسنون"

المبيت بمنى فى ليالى منى | لیالی منیٰ میں رات گذارنا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سنت موکدہ ہے امام احمدؒ کی اصح روایت بھی یہی ہے جبکہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک مبیت واجب ہے۔

پھر اگر حاجی مبیت کو ترک کر دے تو حنفیہ کے نزدیک مکروہ ہے اور اس پر کوئی کفارہ نہیں[3]۔ امام مالکؒ کے نزدیک اگر ایک رات بھی مبیت کو ترک کر دیا تو دم واجب ہے جبکہ امام شافعیؒ کے نزدیک "ليلة واحدة" کے مبیت کے ترک کی صورت میں ایک درہم واجب ہے اور دو راتوں کے مبیت کے ترک کی صورت میں دو درہم واجب ہیں۔ البتہ تینوں راتوں کے مبیت کے ترک کی صورت میں امام مالکؒ کی طرح ان کے نزدیک بھی

---

[1] حجة الله البالغة (ج ۱ ص ۱۶۵) المبحث السابع مبحث استنباط الشرائع من حديث النبى صلى الله عليه وسلم، باب القضاء فى الأحاديث المختلفة ۱۲ م

[2] الحديث أخرجه النسائى فى سننه (ج ۲ ص ۵۷) كتاب مناسك الحج، رمى الرعاة۔ وأبو داؤد فى سننه (ج ۱ ص ۲۷۱) كتاب المناسك، باب فى رمى الجمار۔ وابن ماجة فى سننه (ص ۲۱۸) باب تاخير رمى الجمار من عذر ۱۲ م

[3] دیکھئے موطا امام محمد (ص ۲۳۲) باب البيتوتة وراء عقبة منى وما يكره من ذلك ۱۲ م

دم واجب ہے[1] واللہ اعلم

تاخیر رمی الجمار عن وقتہ المسنون

اس مسئلہ سے پہلے چند باتیں سمجھنا ضروری ہیں

(۱) ایامِ رمی چار ہیں، دس ذی الحجہ سے لیکر تیرہ ذی الحجہ تک

(۲) دس تاریخ کو صرف جمرہ عقبہ کی رمی ہے، گیارہ اور بارہ کو جمرات ثلاثہ کی ہے اور ضروری ہے، تیرہ تاریخ کو جمرات ثلاثہ کی رمی ہے لیکن اختیاری ہے۔

(۳) دس تاریخ کو یوم النحر، گیارہ کو یوم القر، بارہ کو یوم النفر الاول اور تیرہ کو یوم النفر الثانی کہا جاتا ہے۔

امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور صاحبینؒ کے نزدیک رُعاۃ کو اس کی اجازت ہے کہ وہ دو دن کی رمی کو اکٹھا کر کے ایک دن کر لیں، اس صورت میں ان حضراتؒ کے نزدیک کسی قسم کی جزاء اور فدیہ بھی واجب نہیں جبکہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تاخیر کی صورت میں جزاء واجب ہے۔

حدیثِ باب بظاہر امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کے خلاف ہے اس لئے کہ اس سے تاخیر کا جواز معلوم ہوتا ہے جبکہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کی گنجائش نہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ کتبِ حنفیہ میں اس مسئلہ میں انتشار پایا جاتا ہے اور امام صاحبؒ کا واضح مسلک سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جزاء واجب ہوگی اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ ہوگی، پھر فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ جن کتابوں میں امام صاحبؒ کا یہ مسلک نقل کیا گیا ہے کہ رعاء کو جمع کا حق نہیں ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ رخصت کا مدار صرف رعیِ ابل پر نہیں مطلب یہ ہے کہ صرف رعی کی بناء پر ان کو جمع کی اجازت نہیں البتہ اگر ضیاعِ مال کا بھی خطرہ ہو تو اجازت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اجازت دی تھی وہ صرف رعی کی بناء پر نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ ضیاعِ مال کے اندیشہ کی بناء پر بھی اور ضیاعِ مال کا اندیشہ ہونے کی صورت میں امام صاحبؒ کے نزدیک بھی جمع کی اجازت ہے اس لئے حدیثِ باب ان کے مسلک کے خلاف نہیں[2]۔

---

[1] دیکھئے معالم السنن للخطابی بہامش مختصر أبی داؤد للمنذری (ج ۲ ص۴۲۱) باب بیت بمکۃ لیالی منیٰ۔ والمغنی لابن قدامۃ (ج ۳ ص۴۳۹ و ۴۵۰) ومعارف السنن (ج ۶ ص۴۳۳) ۱۲ مرتب

[2] مذکورہ بالا تمام تفصیل کے لئے دیکھئے العرف الشذی بہامش الجامع للترمذی (ج ۱ ص۱۸۹، طبع ایچ ایم سعید کراچی) ومعارف السنن (ج ۶ ص۴۳۶)، واعلاء السنن (ج ۱۰ ص۱۱۸) باب أن المبیت بمنیٰ فی لیالی أیام التشریق سنۃ ۱۲ م

امام ابو حنیفہؒ کی جانب سے اس کا جواب یہ ہے کہ حدیثِ باب جمع تاخیر صوری پر محمول ہے جس کی صورت یہ ہے کہ یوم النحر میں جمرۂ عقبہ کی رمی کر کے وہ چلا جائے اور یوم القرّ میں رات کے آخری حصہ میں آئے، طلوعِ صبح سے پہلے یوم القرّ کی رمی کرلے، اور طلوعِ صبح کے بعد بارہویں تاریخ یعنی یوم النفر الاول کی رمی کرلے امام ابو حنیفہؒ کی حسنؒ بن زیاد والی روایت[1] کے مطابق اس کا وقت شروع ہو چکا اور یوم النفر الثانی کی رمی چونکہ اختیاری ہے اس لئے اسے ترک کر سکتا ہے۔ جمع رمیین فی یوم واحد کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ گیارہویں تاریخ کی رمی یوم القرّ گذرنے کے بعد رات کے آخر حصہ میں کرے اور بارہویں تاریخ یعنی یوم النفر الاول کی رمی زوال کے بعد کرے، اس طرح گیارہویں اور بارہویں کی رمی اس اعتبار سے تو جمع ہو جائیں گی کہ دونوں رمی گیارہویں تاریخ کے غروبِ آفتاب کے بعد اور بارہویں تاریخ کے غروبِ آفتاب سے پہلے ہیں، یہ صورت بھی ایک طرح سے جمع صوری ہی ہے لأن اللیلۃ تابعۃ للنھار فی أیام الحج[2]۔ بہرحال امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ روایت جمع صوری پر محمول ہو سکتی ہے جبکہ جمہور کے نزدیک جمع تاخیر حقیقی پر محمول ہے کیونکہ اس سے ان کے نزدیک کوئی فدیہ یا دم وغیرہ واجب نہیں ہوتا، لہٰذا رُعی یوم النفر الاول میں آکر زوال کے بعد دونوں دن کی رمی کر سکتا ہے۔

پھر ایک دن میں دوسرے ایام کی رمی جمع کرنے کی صورت میں جمہور کے نزدیک جمع تاخیر کو اختیار کیا جائیگا نہ کہ جمع تقدیم کو[3]۔

حدیثِ باب امام ترمذیؒ نے دو طرق سے ذکر کی ہے، ایک سفیان بن عیینہؒ کے طریق سے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں "أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم رخص للرعاء أن یرموا یوماً ویدعوا یوماً" اس روایت میں اس قسم کی کوئی تصریح نہیں کہ پہلے دن میں جمع کرے یا دوسرے دن میں، بلکہ جمع ہی کا ذکر نہیں ہے دوسرے امام مالک بن انسؒ کے طریق سے جس کے الفاظ یہ ہیں "رخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] کما فی فتح القدیر والعنایۃ (ج ۲ ص۱۸۵) باب الإحرام ۱۲ م

[2] مذکورہ جواب کے لئے دیکھئے "المسک الذکی" تقریر ترمذی حضرت تھانوی قدس سرہ مخطوطہ (ج ۱ ص۲۵۳) ۱۲

[3] معارف السنن (ج ۶ ص۴۴۲)

البتہ بعض حضرات کے نزدیک رعاء کو جمع تقدیم اور جمع تاخیر دونوں کا اختیار ہے چنانچہ علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں "وقال بعضھم: ھم بالخیار إن شاءوا قدموا وإن شاءوا أخروا" معالم السنن للخطابی فی ذیل مختصر ابی داؤد للمنذری (ج ۲ ص۴۲۴) باب فی رمی الجمار ۱۲ مرتب

لرعاء الإبل فی البیتوتة أن یرموا یوم النحر ثم یجمعوا رمی یومین بعد النحر فیرمونه فی أحدهما"
اس روایت میں دو دن کی رمی کو لاعلی التعیین کسی ایک دن میں جمع کرنے کا ذکر ہے جس سے جمع تقدیم یا جمع تاخیر کوئی ایک متعین نہیں ہوتی بلکہ دونوں کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس دوسرے طریق کو ذکر کرنے کے بعد امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: "قال مالک: ظننت أنه قال[1]: "فی الأول منهما[2]" ثم یرمون یوم النفر[3]" اور یوم النحر کے بعد پہلا دن یوم القر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع تقدیم بھی جائز ہے حالانکہ یہ کسی کا مسلک نہیں۔

اس کے جواب میں حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں[4] کہ امام ترمذیؒ نے جو امام مالکؒ کا مقولہ "ظننت أنه قال: "فی الأول منهما" نقل کیا ہے اس میں کسی راوی سے سہو ہوا ہے، ورنہ اصل الفاظ یہ ہیں "ظننت أنه (أی الرمی) فی الآخر منهما[5]" کما فی روایة مسند أحمد[6]

---

[1] "قال" اور "أنه" کی ضمیر کا مرجع عبداللہ بن ابی بکرؒ ہیں جو امام مالکؒ کے شیخ ہیں ۱۲ م

[2] قوله: "فی الأول منهما" ای فی الیوم الأول من الیومین، یعنی الیوم الحادی عشر من ذی الحجة ۱۲ م

[3] أی فی یوم النفر الثانی وهو الیوم الثالث عشر من ذی الحجة ۱۲ م

[4] معارف السنن (ج ۶ ص۳۶۵) ۱۲ م

[5] اس صورت میں روایت کا مطلب یہ ہوگا کہ رُعاۃ پہلے یوم النحر میں رمی کریں پھر یوم النحر کے بعد دو دن کی رمی کو جمع کریں پس ان دونوں میں سے آخری دن رمی کریں یعنی بارہویں تاریخ کو گیارہویں کی بھی اور بارہویں کی بھی، پھر اگر منیٰ میں قیام کریں تو یوم النفر الثانی یعنی تیرہ تاریخ کو بھی رمی کریں۔

اس جواب کی تائید مؤطا امام مالک میں خود امام مالکؒ کی توضیح سے ہوتی ہے: "قال مالک، وتفسیر الحدیث الذی أرخص فیه رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لرعاء الابل فی رمی الجمار فیما نُریٰ۔ واللہ أعلم۔ أنهم یرمون یوم النحر، فإذا مضی الیوم الذی یلی یوم النحر رموا من الغد، وذلک یوم النفر الأول، یرمون للیوم الذی مضیٰ، ثم یرمون لیومهم ذلک، لأنه لا یقضی أحد شیئا حتی یجب علیه فإذا وجب علیه و مضیٰ کان القضاء بعد ذلک، فإن بدا لهم النفر فقد فرغوا، وإن أقاموا إلی الغد رموا مع الناس یوم النفر الآخر ونفروا" دیکھیے (ص۳۵۲) الرخصة فی رمی الجمار ۱۲ مرتب

[6] انظر الفتح الربانی لترتیب مسند الإمام أحمد بن حنبل الشیبانی (ج ۱۲ ص۲۲۲) باب الرخصة لرعاء الإبل الخ، رقم الحدیث ۲۲۲ ـــ ۱۲ م

اس کے علاوہ ترمذی کی روایت میں تاویل بھی ممکن ہے فلیراجع إلی کتب الحدیث المطولۃ[1]۔

وھذا حدیث حسن صحیح وھو أصح من حدیث ابن عیینۃ " جیسا کہ پیچھے ہم نے ذکر کیا کہ امام ترمذیؒ نے حدیثِ باب دو طرق سے ذکر کی ہے ایک سفیان بن عیینہؒ کے طریق سے جس کی سند یہ ہے "حدثنا ابن أبی عمر، نا سفیان، عن عبد اللہ بن أبی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم عن أبیہ عن أبی البداح بن عدی عن أبیہ " دوسرے " حدثنا الحسن بن علی الخلال، نا عبد الرزاق، نا مالک بن أنس، قال: حدثنی عبد اللہ بن أبی بکر عن أبیہ عن أبی البداح بن عاصم بن عدی عن أبیہ "

یہاں امام ترمذیؒ دونوں طرق میں سے امام مالک بن انسؒ کے طریق کو راجح قرار دے رہے ہیں، پیچھے بھی وہ ذکر کر چکے ہیں " ورواية مالك أصح "

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مالک بن انسؒ والے طریق کی وجہ ترجیح کیا ہے؟

ایک وجہِ ترجیح یہ بیان کی جاتی ہے کہ امام مالکؒ والے طریق میں ابو البداح کے والد عاصم بن عدی کا بھی ذکر ہے، لہٰذا " عن أبی البداح بن عدی عن أبیہ " کہنا مناسب نہیں، اس لئے کہ اس سے ایک تو یہ ایہام پیدا ہوتا ہے کہ " عدی " " ابو البداح " کے والد ہیں حالانکہ ایسا نہیں بلکہ وہ

---

[1] حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے " فی الأول منھما " کی دو توجیہیں بیان کی ہیں، ایک یہ کہ اس میں " الأول " اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور " من " تبعیضیہ نہیں بلکہ اس کا صلہ ہے لہٰذا اس روایت میں " الأول " سے مراد یوم النحر ہے اور " ثم یومون یوم النفر " سے " یوم النفر الأول " یعنی بارہویں تاریخ مراد ہے، لہٰذا روایت کا مطلب یہ ہے کہ رعاء کے لئے اس کی گنجائش ہے کہ وہ سب سے پہلے یوم النحر میں رمی کریں، پھر بارہویں تاریخ کو جمع تاخیر کرتے ہوئے گیارہویں اور بارہویں تاریخ کی رمی کو جمع کریں۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ " فی الأول منھما " میں " من " کو تبعیضیہ مانا جائے، اس صورت میں " الأول " میں معنیٔ تفضیل کا اعتبار نہ ہوگا، اور " الأول " سے یوم القر یعنی گیارہویں تاریخ مراد ہوگی اور " ثم یرمون یوم النفر " میں " یوم النفر الثانی " یعنی تیرھویں تاریخ مراد ہوگی، گویا اس روایت میں یوم النحر کی رمی کا کوئی ذکر نہیں اس لئے کہ وہ تو لامحالہ اپنے وقت پر ہی ہوگی۔ لہٰذا روایت کا مطلب یہ ہوگا کہ رعاء دسویں تاریخ کی رمی یوم النحر میں کرنے کے بعد گیارہویں تاریخ کی رمی گیارہویں ہی تاریخ کو کرلیں، پھر یوم النفر الثانی یعنی تیرھویں تاریخ کو بارہویں اور تیرھویں تاریخ کی رمی کو جمع کرلیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے الکوکب الدری علی جامع الترمذی (ج ۲ ص ۱۵۷) طبع إدارۃ القرآن والعلوم الإسلامیۃ ۱۲ مرتب عفی عنہ

ان کے دادا ہیں، دوسرے یہ ایہام ہوتا ہے کہ ابو البداح یہ روایت عدی سے نقل کر رہے ہیں جبکہ ایسا نہیں، اس لئے کہ ابو البداح اس روایت کو اپنے والد عاصم سے نقل کر رہے ہیں۔ اس طریق کے مقابلہ میں امام مالکؒ کے طریق میں کوئی ایہام نہیں۔

دوسری وجہ ترجیح یہ بیان کی جاتی ہے کہ سفیانؒ کے طریق میں اختلاف ہے، اس طریق کی ابن ماجہ[1] والی روایت میں عبداللہ بن ابی بکر اور ابو البداح کے درمیان عبدالملک بن ابی بکر کا واسطہ موجود ہے، جبکہ اسی طریق کی ترمذی، ابوداؤد[2] اور نسائی[3] والی روایت میں یہ واسطہ مذکور نہیں، سفیان ابن عیینہؒ والے طریق کے مقابلہ میں امام مالکؒ کے طریق میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ ان کا طریق بغیر کسی اختلاف کے عبدالملک کے واسطہ کے بغیر مروی ہے۔ نیز سفیان بن عیینہؒ کی روایت ابوداؤد میں اس طرح آئی ہے کہ اس میں ابوبکرؒ سے روایت کرنے والے عبداللہ اور محمدؒ دو راوی ہیں ترمذی کے بعض نسخوں میں بھی ایسا ہی ہے جبکہ نسائی میں ابوبکرؒ سے روایت کرنے والے صرف عبداللہ ہیں۔ امام مالکؒ کی روایت اس قسم کے اختلافات سے بھی خالی ہے۔ واللہ أعلم[4]۔ تم شرح الباب بإیضاح وزیادات من المرتب۔

باب[5] (بلا ترجمة[6])

عن[7] أنس بن مالك أن عليًا قدم على رسول الله صلى الله عليه وسلم من اليمن، فقال: بم أهللت؟ قال، أهللت بما أهل به رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ نیت مبہمہ کے ساتھ

---

[1] (ص۲۱۸) باب تأخير رمي الجمار من عذر ۱۲ م

[2] (ج ۱ ص۲۷۱) باب في رمي الجمار ۱۲ م

[3] (ج ۲ ص۴۹) باب رمي الرعاء ۱۲ م

[4] مذکورہ دو وجوہ ترجیح سے متعلق مزید تفصیل کے لئے دیکھئے الکوکب الدری (ج ۲ ص۱۵۵) ۔ اور معارف السنن (ج ۶ ص۶۴۵ تا ص۶۴۶) ۱۲ مرتب۔

[5] شرح باب از مرتب۔

[6] بعد ما جاء في الرخصة للرعاء الخ ۱۲ م

[7] الحديث أخرجه البخاري في صحيحه (ج ۱ ص۲۱۱) باب من أهل في زمن النبي صلى الله عليه وسلم كإهلال النبي صلى الله عليه وسلم۔ ومسلم في صحيحه (ج ۱ ص۴۰۴) باب جواز التمتع في الحج والقران ۱۲ م

احرام باندھنا ائمۂ اربعہ کے نزدیک جائز ہے[۱]، پھر حنفیہ کے نزدیک نیت مبہم کی صورت میں افعالِ حج یا افعالِ عمرہ کی ادائیگی سے قبل تعیین ضروری ہوگی، اگر اس نے تعیین نہ کی اور طواف کرلیا خواہ ابھی ایک ہی چکر کیا ہو تو اس کا احرام عمرہ کے لئے متعین ہوجائیگا، اسی طرح اگر اس نے طواف سے قبل وقوف عرفہ کرلیا تو اس کا احرام حج کے لئے متعین ہوجائیگا اگرچہ پہلی صورت میں اس نے عمرہ کی اور دوسری صورت میں حج کی نیت نہ کی ہو[۲]۔ واللہ أعلم (از مرتب عفا اللہ عنہ)

---

[۱] واضح رہے کہ علامہ نوویؒ نے لکھا ہے کہ نیتِ مبہم کے ساتھ جوازِ احرام صرف شافعیہ اور ان کے موافقین کے نزدیک ہے ولا یجوز عند سائر العلماء والأئمۃ، کما نقل الشیخ البنوری فی معارف السنن (ج ۶ ص ۴۹) حافظ ابن حجرؒ نے بھی نیت مبہم کی صورت میں مالکیہ اور کوفیین کا مسلک عدمِ صحتِ احرام نقل کیا ہے کما فی فتح الباری (ج ۳ ص ۴۲۲) باب من أھلّ فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کإھلال النبی صلی اللہ علیہ وسلم، نیز علامہ عینیؒ کے کلام سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ شافعیہ کے علاوہ حنفیہ سمیت دوسرے ائمہ اور علماء کا یہی مسلک ہے کہ نیتِ مبہم کے ساتھ احرام درست نہیں، دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۹ ص ۱۸۵) باب من أھلّ فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الخ۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ نیتِ مبہم کے ساتھ جس طرح امام شافعیؒ کے نزدیک احرام درست ہے امام ابوحنیفہؒ سمیت بقیہ ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک بھی احرام درست ہے، اور علامہ نوویؒ، حافظ ابن حجرؒ اور علامہ عینیؒ سے اس مسئلہ میں نقلِ مذاہب کے سلسلہ میں تسامح ہوا ہے۔

چنانچہ فتح القدیر میں حنفیہ کا مسلک جوازِ احرام ذکر کیا گیا ہے، دیکھئے (ج ۲ ص ۳۴۴) باب الإحرام، نیز دیکھئے بدائع الصنائع (ج ۲ ص ۱۶۳) فصل وأما بیان ما یصیر به محرمًا۔ اور البحر الرائق (ج ۲ ص ۳۲۱) باب الإحرام۔ اور رد المحتار علی الدر المختار (ج ۲ ص ۱۶۱) مطلب فیما یصیر به محرمًا۔

أقرب المسالک میں امام مالکؒ کا مسلک بھی یہی نقل کیا گیا۔ دیکھئے الشرح الصغیر علی أقرب المسالک إلی مذہب الإمام مالک (ج ۲ ص ۲۵ و ۲۶)۔

حنابلہ کے مسلک کے لئے دیکھئے المغنی لابن قدامہ (ج ۳ ص ۲۸۵) فصل ویصح إبہام الإحرام الخ

یہی وجہ ہے کہ علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے معارف السنن (ج ۶ ص ۴۹ و ۵۰) میں علامہ نوویؒ اور حافظ ابن حجرؒ پر اس مسئلہ میں رد کیا ہے۔ واللہ أعلم ۱۲ مرتب

[۲] دیکھئے بدائع الصنائع (ج ۲ ص ۱۶۳) فصل وأما بیان ما یصیر به محرمًا۔ اور معارف السنن (ج ۶ ص ۴۹ و ۵۰) ۱۲م

باب ماجاء فی یوم الحج الأکبر

عن علیؓ قال: سألت رسول الله صلی الله علیه وسلم عن یوم الحج الاکبر، فقال: یوم النحر.[1]

حج اکبر کی تفسیر میں اختلاف ہے، بیشتر علماء کے نزدیک "حج اکبر" سے مراد مطلق حج ہے اس لئے کہ عمرہ کو حج اصغر یعنی چھوٹا حج کہا جاتا ہے اُس سے ممتاز کرنے کے لئے حج کو "حج اکبر" کہا گیا ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ "حج اکبر" صرف وہی تھا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس شرکت فرمائی تھی[2]۔

یوم الحج الاکبر کے بارے میں بھی علماء کے کئی اقوال ہیں، ایک یہ کہ اس کا مصداق یوم النحر ہے[3]، حضرت

---

[1] حدیثِ باب امام ترمذیؒ نے مرفوعاً و موقوفاً دونوں طرح ذکر کی ہے اور طریقِ موقوف کو طریقِ مرفوع کے مقابلے میں اصح قرار دیا ہے، طریقِ مرفوع میں دو اعتبار سے ضعف ہے، ایک یہ کہ یہ محمد بن اسحاقؒ کے عنعنہ کے ساتھ مروی ہے "وعنعنته غیر مقبولة لأنه کثیر التدلیس"۔ دوسرے یہ کہ اس میں ایک راوی حارث اعورؒ ہے: "وفی حدیثه ضعف" کما فی التقریب (ج ۱ ص ۱۴۱، رقم ۷۰)۔

روایتِ موقوفہ سفیان بن عیینہؒ کے طریق سے مروی ہے، حارث اعورؒ تو اگرچہ اس میں بھی ہے لیکن اس کی سند میں محمد بن اسحٰق نہیں، اسی لئے امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: "وهٰذا أصح من الحدیث الأول، ورواية ابن عیینة موقوفاً أصح من رواية محمد بن اسحٰق مرفوعاً"

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ حدیثِ باب کے بارے میں فرماتے ہیں: "والحدیث هٰذا انفرد به الإمام الترمذی من بین أرباب الأمهات الست" معارف السنن (ج ۶ ص ۶۵)۔

البتہ اس مضمون کی دو مستقل روایتیں صحیح بخاری میں مذکور ہیں:

(۱) عن ابن عمر قال: وقف النبی صلی الله علیه وسلم یوم النحر بین الجمرات فی الحجة التی حج۔ بهذا۔ (أی بالحدیث الذی تقدم) وقال: هٰذا یوم الحج الأکبر الخ۔ (ج ۱ ص ۲۳۵) باب الخطبة أیام منیٰ، کتاب المناسک۔

(۲) عن حمید بن عبد الرحمٰن أن أبا هريرة قال: بعثنی أبو بکر فیمن یؤذن یوم النحر بمنیٰ: لا یحج بعد العام مشرك، ولا یطوف بالبیت عریان، ویوم الحج الأکبر یوم النحر۔ (ج ۱ ص ۴۵۱) باب کیف ینبذ إلی أهل العهد، کتاب الجهاد ۱۲ مرتب

[2] مجاہدؒ کہتے ہیں: "حج اکبر حج قران ہے اور حج اصغر حج افراد ہے۔ عمدہ (ج ۱۰ ص ۸۳) باب الخطبة أیام منیٰ ۱۲ مرتب

[3] یوم النحر کو یوم الحج الاکبر کا مصداق قرار دینا اس اعتبار سے ہے کہ حج کے اکثر افعال مثلاً طلوعِ صبح صادق کے بعد وقوفِ مزدلفہ جمرۂ عقبہ کی رمی، ذبح، حلق اور طوافِ زیارت اسی دن ادا کئے جاتے ہیں۔ دیکھئے الکوکب الدری (ج ۲ ص ۱۵۹) ۱۲ مرتب

علی بن ابی طالبؓ، حضرت عبداللہ ابن ابی اوفیؓ، شعبیؒ اور مجاہدؒ کا یہی قول ہے، حدیث باب سے بھی اسی قول کی تائید ہوتی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا مصداق یوم عرفہ ہے، حضرت فاروق اعظمؓ اور عبادلہ ثلاثہ یعنی عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ سے یہی مروی ہے۔ "الحج عرفة"[1] یا "الحج یوم عرفة"[2] والی روایت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ حج کے پانچوں دن "یوم الحج الاکبر" کا مصداق ہیں جن میں عرفہ اور یوم النحر دونوں داخل ہیں۔ جہاں تک لفظ یوم کو مفرد لانے کا تعلق ہے سو وہ محاورہ کے مطابق ہے اس لئے کہ بسا اوقات لفظ "یوم" بول کر مطلق زمانہ یا چند ایام مراد ہوتے ہیں جیسے غزوۂ بدر کے چند ایام کو قرآن کریم نے "یوم الفرقان"[3] کے مفرد نام سے تعبیر کیا ہے اسی طرح عرب کی دوسری جنگوں کو بھی "یوم" ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے اگرچہ ان میں کتنے ہی ایام صرف ہوئے ہوں، جیسے "یوم بعاث"، "یوم احد"، "یوم الجمل"، "یوم صفین" وغیرہ۔

یہ تیسرا قول پچھلے دونوں قولوں کو جامع ہے[4]۔

بہرحال عامۃ الناس میں جو یہ مشہور ہے کہ جس سال عرفہ کے دن جمعہ ہو صرف وہی حج اکبر ہے قرآن وسنت کی اصطلاح میں اس کی کوئی اصل نہیں، بلکہ ہر سال کا حج حج اکبر ہی ہے، یہ اور بات

---

[1] سنن ترمذی (ج ۱ ص ۱۳۹) باب ما جاء من أدرك الإمام بجمع فقد أدرك الحج ۱۲ م

[2] سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۲۶۹) باب من لم یدرك عرفة ۱۲ م

[3] دیکھئے سورۂ انفال آیت ۴۱ پ ۱۰ ۔ ۱۲ م

[4] ایک قول یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ "یوم الحج الاکبر" سے مراد یوم حج ابی بکرؓ ہے یعنی ۹ھ کا حج جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضہ کو امیر حج مقرر فرمایا، اس حج میں مسلمین و مشرکین اور یہود و نصاریٰ سب نے شرکت کی تھی "ولم یجتمع منذ خلق الله السماوات والأرض كذلك قبل العام ولا تجتمع بعد العام، حتى تقوم الساعة"۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ یوم العرفہ یوم الحج الاصغر ہے اور یوم النحر یوم الحج الاکبر۔ لأن فيه تتكمل بقية المناسك دیکھئے بذل المجہود (ج ۹ ص ۲۵۳ و ص ۲۵۴) باب یوم الحج الأكبر ۱۲ مرتب

ہے کہ حسنِ اتفاق سے جس سال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج فرمایا اس میں یوم عرفہ کو جمعہ تھا، یہ اپنی جگہ ایک فضیلت ضرور ہے مگر یوم الحج الاکبر کے مفہوم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

جمعہ کے حج کی فضیلت پر رزین نے ایک روایت تجرید الصحاح میں مؤطا کے حوالہ سے ذکر کی ہے

"عن طلحة بن عبيد الله بن كريز أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: أفضل الأيام يوم عرفة وافق يوم الجمعة، وهو أفضل من سبعين حجة في غير جمعة"[1] والله أعلم[2]

تم شرح الباب بزيادات من المرتب[3]

باب ما جاء في استلام الركنين

عن[4] ابن عبيد بن عمير، عن أبيه، أن ابن عمر كان يزاحم على الركنين زحاماً[5]، ما رأيت أحداً من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم يفعله، فقلت يا أبا عبد الرحمن إنك تزاحم على الركنين زحاماً ما رأيت أحداً من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم يزاحم عليه فقال، إن أفعل فإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إن مسحهما كفارة للخطايا" ایذارسانی کے ساتھ استلام حجر جائز نہیں ہے، چنانچہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: يا عمر إنك رجل قوي، لا تزاحم على الحجر

---

[1] قال الحافظ المحب الطبري في "القرى" (ص ۳۷۲): ولم أره في موطأ يحيى بن يحيى الليثي الأندلسي فلعله في غيره من الموطآت" كذا في معارف السنن (ج ۶ ص ۱۵۲) ۱۲ م

[2] باب سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے عمدة القاري (ج ۱۰ ص ۸۲ و ۸۳) باب الخطبة أيام منى - بذل المجهود (ج ۹ ص ۲۵۳ و ص ۲۵۴) باب يوم الحج الأكبر - معارف القرآن (ج ۴ ص ۳۱۴ و ۳۱۵) ۱۲ مرتب

[3] شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲ م

[4] الحديث أخرجه النسائي في سننه (ج ۲ ص ۳۵) باب ذكر الفضل في الطواف بالبيت ۱۲ م

[5] قال الطيبي رحمه الله: "أي زحاماً عظيماً، وهو يحتمل أن يكون في جميع الأشواط أو في أوله وآخره فإنها آكد أحوالها، وقد قال الشافعي في الأم: ولا أحب الزحام في الاستلام إلا في بدء الطواف وآخره، لكن المراد إزدحام لا يحصل فيه أذى للأنام" مرقاة المفاتيح (ج ۵ ص ۳۲۰) باب دخول مكة والطواف، الفصل الثاني ۱۲ مرتب

فتوذی الضعیف، إن وجدت خلوۃ فاستلمه وإلا فاستقبله وهلّل وکبّر[1]"

حدیثِ باب میں حضرت ابن عمرؓ کا زحام بھی اسی پر محمول ہے کہ وہ بغیر ایذاء کے ہوتا تھا، اگرچہ استلامِ حجر کی سنت پوری کرنے کا وہ نہایت اہتمام فرماتے تھے۔ نافعؒ بیان کرتے ہیں "أن ابن عمر کان لا یدعهما (ای الرکن الأسود والرکن الیمانی) فی کل طواف طاف بهما حتی یستلمهما لقد زاحم علی الرکن مرۃ فی شدۃ الزحام حتی رعف، فخرج فغسل عنه ثم رجع فعاد یزاحم، فلم یصل إلیه حتی رعف الثانیة، فخرج فغسل عنه ثم رجع فما ترکه حتی استلمه[2]"۔

پھر استلام صرف رکنینِ یمانیین کا ہوگا یا رکنین شامیین کا بھی؟ اس بارے میں دو مذہب ہیں:

حضرت معاویہؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت جابر بن یزیدؒ، حضرت عروہ بن زبیرؒ اور حضرت سوید بن غفلہؒ کا مسلک یہ ہے کہ استلام تمام ارکان کا ہوگا؛ ابن المنذرؒ فرماتے ہیں کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت انس بن مالکؓ اور حضرات حسنینؓ کا بھی یہی مسلک ہے۔

حضرت عمر بن الخطابؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک استلام صرف رکنِ اسود اور رکن یمانی کا ہوگا، عطاءؒ نے حضرت جابرؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبیدؒ بن عمیر کا عمل اسی کے مطابق نقل کیا ہے، حضرات احنافؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔ ابن المنذرؒ فرماتے ہیں اکثر اہلِ علم کا یہی مسلک ہے۔

قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ استلام صرف رکنین یمانیین کا ہو اس لئے کہ یہی دونوں رکن بناءِ ابراہیمی کی بنیادوں پر ہیں اور رکنِ اسود کو مزید یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس میں حجرِ اسود بھی ہے۔ ان دونوں کے مقابلہ میں رکنین شامیین میں نہ حجرِ اسود ہے اور نہ وہ قواعدِ ابراہیمی پر ہیں اگر یہ قواعدِ ابراہیمی پر ہوتے تو چاروں ارکان کا استلام ہوتا[3]۔

واضح رہے کہ رکن یمانی کا استلام دونوں ہاتھوں سے یا دائیں ہاتھ سے ہوگا، صرف بائیں ہاتھ سے نہیں ہوگا کما یفعله بعض الجهلة والمتکبرۃ،

پھر رکنِ یمانی کی تقبیل نہیں ہوگی بلکہ صرف لمس ہوگا، اور ہجوم وغیرہ کی وجہ سے اگر لمس ممکن نہ رہے تو حجرِ اسود کی طرح وہاں اشارہ نہ ہوگا، البتہ امام محمدؒ کی ایک روایت یہ ہے کہ رکنِ یمانی استلام اور تقبیل میں حجرِ اسود کی طرح ہے۔

---

[1] رواه أحمد وفیه راوٍ لم یسمّ۔ مجمع الزوائد (ج ۳ ص۲۴۱) باب فی الطواف والرمل والاستلام۔ نیز دیکھئے "اخبار مکہ للأزرقی (ج ۱ ص۳۳۳ و ص۳۳۴) الزحام علی استلام الرکن الأسود والرکن الیمانی ۱۲ مرتب

[2] اخبار مکہ (ج ۱ ص۳۳۴) الزحام علی الرکن الأسود والرکن الیمانی ۱۲ م

[3] تفصیل کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۹ ص۲۵۴ و ۲۵۵) باب من لم یستلم إلا الرکنین الیمانیین ۱۲ م

پھر رکنین شامیین کے استلام کے بارے میں تو اختلاف ہے لیکن اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ ان کی طرف اشارہ نہیں کیا جائیگا بلکہ وہ بدعت ہے[1]۔ واللہ اعلم (از مرتب عفا اللہ عنہ)

باب بلا ترجمہ[2]

عن[3] ابن عمر أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یدھن بالزیت وھو محرم غیر المقتت "

مقتت، مطیب کے معنی میں ہے[4] اس لئے کہ یہ "قت" سے نکلا ہے جس کے معنی خوشبو کے ہیں۔

حالتِ احرام میں ایسا تیل جو خود طیب ہو یا اس میں خوشبو ملی ہو اس کا استعمال بالاتفاق جائز نہیں، البتہ وہ تیل جس میں خوشبو ملی ہو اس کا استعمال تداوی کے طور پر درست ہے۔

جہاں تک دہنِ غیر مطیب کا تعلق ہے امام شافعیؒ کے نزدیک سر اور ڈاڑھی کے علاوہ جمیع بدن پر اس کا استعمال حالتِ احرام میں درست ہے اور سر یا ڈاڑھی میں لگانے کی صورت میں دم واجب ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دہنِ غیر مطیب کا استعمال حالتِ احرام میں موجبِ دم ہے خواہ اس کو جسم کے کسی حصہ پر استعمال کیا گیا ہو۔

صاحبینؒ کے نزدیک دہنِ غیر مطیب کا لگانا موجبِ دم تو نہیں البتہ موجبِ صدقہ ہے۔

حدیثِ باب حنفیہ کے مسلک کے خلاف ہے، البتہ شافعیہ اسے غیر رأس اور غیر لحیہ پر محمول کرسکتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل وہ روایت ہے جس میں ذکر ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: "یا رسول اللہ، فما الحج؟" تو آپ نے جواب میں فرمایا "الشعث التفل[5]" یعنی اصل حاجی وہ ہے جو پراگندہ بال اور میلا کچیلا ہو اور تیل لگانا "شعث" کے منافی ہے۔

---

[1] مذکورہ تفصیل کے لئے مناسکِ ملا علی قاریؒ متنِ ارشاد الساری (ص۱۳۰) باب دخول مکۃ، فصل فی صفۃ الشروع فی الطواف ۱۲ م

[2] ابواب الحج کا آخر سے تیسرا باب ۱۲ م

[3] قال الشیخ محمد فؤاد عبدالباقی: "الحدیث لم یخرجہ من أصحاب الکتب الستۃ سوی الترمذی" — سنن الترمذی (ج ۳ ص۲۹۵) رقم الحدیث ۹۶۲ — ۱۲ م

[4] قال ابن الأثیر: "وھو الذی یطبخ فیہ الریاحین، حتی تطیب ریحہ" النہایۃ (ج ۴ ص۱۱) ۱۲ م

[5] دیکھئے سنن ابن ماجہ (ص۲۰۸) باب ما یوجب الحج ۱۲ م

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ تیل کا تعلق اصلاً اطعمہ سے ہے اس اعتبار سے تو جنایت ہونی ہی نہیں چاہئے لیکن چونکہ اس سے جوئیں مرتی ہیں اور یہ "شعث" ہونے کے منافی ہے اس لئے جنایتِ قاصرہ ہونے کی وجہ سے صدقہ واجب ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ یہ اصلِ طیب ہے اور ایک قسم کی خوشبو سے خالی نہیں اور یہ جوؤں کو بھی مارتا ہے اور بالوں کو نرم کرتا ہے، میل کچیل کو زائل کرتا ہے اور شعث ہونے کے منافی ہے اس لئے جنایت کامل ہے، لہٰذا دم واجب ہے[۱]۔

جہاں تک حدیثِ باب کا تعلق ہے سو اس کا مدار فرقد السبخیؒ پر ہے جو ضعیف ہیں[۲]۔ امام ترمذیؒ نے بھی اس کو "غریب" قرار دیا ہے اور امام ترمذیؒ کی عادت یہ ہے کہ جب وہ صرف لفظ "غریب" کہتے ہیں اس سے ضعیف مراد لیتے ہیں اگرچہ اصولِ حدیث کی اصطلاح میں "غریب"، "صحیح" اور "حسن" کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے[۳] اور اگر حدیث صحیح ہو تو تب بھی اس کا امکان ہے کہ آپؐ نے احرام سے پہلے تیل لگایا ہو جس کے اثرات باقی رہ گئے ہوں، اس کو "کان یدھن الخ" کے ساتھ تعبیر کر دیا گیا جیسا کہ حضرت عائشہؓ خوشبو کے بارے میں فرماتی ہیں: "کأنی أنظر إلی وبیص المسك فی مفرق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو محرم[۴]" ظاہر ہے کہ حالتِ احرام میں خوشبو لگانا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں، لامحالہ اسے احرام سے قبل خوشبو لگانے پر محمول کیا جائیگا[۵] اگرچہ خوشبو اور اس کے اثرات بعد الاحرام بھی باقی رہے ہوں۔ واللہ أعلم

---

[۱] مذکورہ تفصیل کے لئے دیکھئے ہدایہ مع شرحہ فتح القدیر (ج ۲ ص ۲۴۱ و ۲۴۲) باب الجنایات ۱۲ م

[۲] حافظؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "فرقد بن یعقوب السبخی بفتح المھملة والموحدة وبخاء معجمة، أبو یعقوب البصری صدوق عابد لکنه لین الحدیث، کثیر الخطأ، من الخامسة، مات سنة إحدی وثلاثین (بعد المائة) أخرجه له الترمذی وابن ماجة۔ تقریب التھذیب (ج ۲ ص ۱۰۸) رقم ۱۱ - ۱۲ م ت

[۳] معارف السنن (۶ ص ۶۵۹) ۱۲ م

[۴] صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۷۸) باب استحباب الطیب قبیل الإحرام الخ ۱۲ م

[۵] اس کی تائید حضرت عائشہؓ کی ایک دوسری روایت سے ہوتی ہے: "قالت: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إذا أراد أن یحرم یتطیب بأطیب ما أجد، ثم أری وبیص الدھن فی رأسه ولحیته بعد ذلك"۔ مسلم (ج ۱ ص ۳۷۸) ۱۲ م

بابٌ (بلا ترجمۃ)[1]

عن عائشۃ[2]، أنها کانت تحمل من ماء زمزم وتخبر: أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یحملہ» اس روایت سے ماء زمزم کو دوسرے علاقوں میں لے جانے کا جواز بلکہ اس کا سنت مطلوبہ ہونا معلوم ہوا۔

زمزم کے معنی | بعض حضرات نے زمزم کے معنی کثرت کے بیان کئے ہیں، اس مبارک کنویں کے بے حد وحساب پانی کی وجہ سے اس کا یہ نام رکھ دیا گیا، ایک قول یہ ہے کہ یہ «زمّ» سے ماخوذ ہے جس کے معنی باندھنے اور روکنے کے آتے ہیں چونکہ جب چشمہ پھوٹا اس وقت ہاجرہ علیہا السلام نے پانی کو جمع رکھنے اور بہہ جانے سے محفوظ کرنے کے لئے مٹی کے ڈھیر سے روک قائم کردی تھی اس لئے اس کو زمزم کہا جاتا ہے[3]

ماءِ زمزم اور اس کی فضیلت | زمزم کی فضیلت متعدد روایات سے ثابت ہے، معجم طبرانی کبیر میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: «خیر ماء علی وجہ الارض ماء زمزم، فیہ طعام الطعم وشفاء السقم[4] الخ» نیز سنن ابن ماجہ[5] میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے فرماتے ہیں: «سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ماء زمزم لما شرب لہ[6]»

---

[1] شرح باب از مرتب ۱۲ م

[2] قال الشیخ محمد فؤاد عبد الباقی: «لم یخرجہ من أصحاب الکتب الستۃ سوی الترمذی۔ سنن ترمذی (ج ۳ ص ۲۹۵) رقم ۹۶۳۔ البتہ مستدرک حاکم (ج ۱ ص ۴۸۵، حمل ماء زمزم) اور سنن کبریٰ بیہقی (ج ۵ ص ۲۰۲، باب الرخصۃ فی الخروج بماء زمزم) میں یہ روایت آئی ہے ۱۲ مرتب

[3] زمزم کی وجہ تسمیہ سے متعلق اقوال کی تفصیل کے لئے دیکھئے معجم البلدان للحموی (ج ۳ ص ۱۴۷-۱۴۸)

[4] علامہ ہیثمیؒ اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں: «رواہ الطبرانی فی الکبیر ورجالہ ثقات» مجمع الزوائد (ج ۳ ص ۲۸۶) باب فی زمزم ۱۲ م

[5] (ص ۲۲۰) باب الشرب من زمزم ۱۲ م

[6] شیخ محمد فؤاد عبد الباقی «سنن ابن ماجہ» پر اپنی تعلیقات میں نقل کرتے ہیں: (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

زمزم پینے کے آداب زمزم پینے کے آداب میں سے یہ ہے کہ بیت اللہ کی طرف منہ کرکے دائیں ہاتھ سے تین سانس میں پیئے اور ہر دفعہ کے شروع میں بسم اللہ کہے اور سانس لینے پر الحمد للہ کہے اور زمزم خوب پیٹ بھر کر پیئے چنانچہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں : « إذا شربت منها فاستقبل القبلة واذكر اسم الله وتنفس ثلاثاً وتضلّع منها فإذا فرغت منها فاحمد الله فإن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: آية بيننا وبين المنافقين أنهم لا يتضلّعون من زمزم»[۲]

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

« قال السیوطی فی حاشیة الکتاب: هٰذا الحدیث مشهور علی الألسنة کثیرا واختلف الحفاظ فیه، فمنهم من صححه ومنهم من حسّنه ومنهم من ضعّفه، والمعتمد الأوّل۔

وفی الزوائد: هٰذا إسناده ضعیف لضعف عبد الله بن المؤمل وقد أخرجه الحاکم فی المستدرک من طریق ابن عباس، وقال: هٰذا حدیث صحیح الإسناد۔

قال السندی: قلت: وقد ذکر العلماء أنّهم جرّبوه فوجدوه کذلک، دیکھئے (ج ۲ ص۲۲۰، رقم ۳۰۶۲) باب الشرب من زمزم۔

چنانچہ شیخ ابن ہمامؒ نے نقل کیا ہے کہ عبد اللہ بن مبارکؒ نے قیامت کے دن کی پیاس سے بچنے کی نیت سے ماء زمزم پیا تھا اور امام شافعیؒ نے اس لئے پیا تھا کہ تیر اندازی میں ان کا نشانہ صحیح ہو جائے فکان یصیب فی کل عشرة تسعة، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: «ولا یحصی کم شربه من الأئمة لأمور نالوها» اور خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں: « وأنا شربته فی بدایة طلب الحدیث، أن یرزقنی الله حالة الذهبی فی حفظ الحدیث، ثم حججت بعد مدة تقرب من عشرین سنة وأنا أجد فی نفسی المزید علی تلک الرتبة فسألت رتبة أعلیٰ منها، وأرجو الله أن أنال ذلک منه »۔

خود شیخ ابن ہمامؒ اپنے بارے میں لکھتے ہیں: «والعبد الضعیف یرجو الله سبحانه شربه للاستقامة والوفاة علی حقیقة الإسلام معها» تفصیل کے لئے دیکھئے فتح القدیر (ج ۲ ص۱۶۰) قبیل فصل فان لم یدخل المحرم مکة وتوجه إلی عرفات۔ ۱۲ مرتب

(حاشیہ صفحۂ ہٰذا)

[۱] سیراب ہونا ۱۲ م

[۲] دیکھئے مستدرک حاکم (ج ۱ ص۴۷۲) الشرب من زمزم وآدابه ۔ سنن بیہقی (ج ۵ ص۱۴۷) باب سقایة الحاج والشرب منها ومن ماء زمزم ۱۲ م

جہاں تک کھڑے ہو کر زمزم پینے کا تعلق ہے سو شرب قائماً کی ممانعت سے متعلقہ مطلق روایات[1] کا تقاضا تو یہ ہے کہ قیاساً شربِ زمزم بھی ممنوع یا مکروہ ہو چنانچہ اس کی کراہت یا عدمِ کراہت محلِ کلام ہے لیکن راجح یہ ہے کہ شربِ زمزم قائماً بلا کراہت جائز ہے مگر مستحب نہیں[2] اور بخاری[3] میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت " شرب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قائماً من زمزم " بیانِ جواز[4] یا ہجوم وغیرہ کے عذر پر محمول ہے[5]۔

زمزم پینے کے بعد یہ دعا پڑھے " اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَرِزْقًا وَاسِعًا وَشِفَاءً مِنْ كُلِّ دَاءٍ[6] "

ایک اہم مسئلہ زمزم کے پانی سے وضو یا غسل کرنا بہتر نہیں البتہ اگر پاک بدن والا برکت حاصل کرنے کی نیت سے غسل کرے یا وضو کرے تو جائز ہے، محققین نے لکھا ہے کہ بے وضو کو اس سے وضو کرنا بلا کراہت جائز ہے البتہ جنبی کو اس سے غسل نہ کرنا چاہیے۔ نیز زمزم سے

---

[1] ان روایات اور ان سے متعلقہ بحث کے لئے دیکھئے فتح الباری (ج ۱۰ ص۸۲) باب الشرب قائماً، کتاب الأشربة ۱۲م

[2] چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں ، " والحاصل أن انتفاء الکراھة فی الشرب قائماً فی ھذین الموضعین محل کلام فضلاً عن استحباب القیام فیھما ولعل الأوجه عدم الکراھة إن لم نقل بالاستحباب کما فی ردّ المحتار (ج ۱ ص۹۹، مطلب فی مباحث الشرب قائماً، کتاب الطھارة) ۱۲مرتب

[3] (ج ۲ ص۸۴۰) کتاب الأشربة، باب الشرب قائماً ۱۲م

[4] فإنه کان یفعل الشیء للبیان مرة أو مرّات ویواظب علی الأفضل کما فی فتح الباری (ج ۱۰ ص۸۳) ۱۲م

[5] کما فی خصائلِ نبوی (ص۱۵۶) ۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ نے یہاں شرب زمزم قائماً کو افضل قرار دیا ہے فرماتے ہیں : حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کھڑے ہو کر پانی پینے کی ممانعت بھی آئی ہے اس بناء پر بعض علماء نے زمزم پینے کو بھی اس ممانعت میں داخل فرما کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نوش فرمانے کو (جس کا ذکر حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں آیا ہے) ازدحام کے عذر یا بیانِ جواز پر محمل بیان فرمایا ہے، لیکن علماء کا مشہور قول یہ ہے کہ زمزم اس نہی میں داخل نہیں اس کا کھڑے ہو کر پینا افضل ہے۔ خصائل نبوی شرح شمائلِ ترمذی (ص۱۵۵، ۱۵۶) باب ماجاء فی صفة شرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲

مرتب عفی عنہ

[6] مستدرک حاکم (ج ۱ ص۴۷۳) ماء زمزم لما شرب له ۱۲م

استنجا کرنا یا بدن یا کپڑے سے نجاستِ حقیقیہ دور کرنا حرام و مکروہ[1] ہے۔ واللہ أعلم وعلمہ أتم و أحکم (از مرتب عفا اللہ عنہ)

هٰذا آخر ما أردنا إيراده من شرح أبواب الحج فلله الحمد وله المنة، وذلك بيوم الخميس ٢٤ من شعبان المعظم سنة ١٤٠٧ھ الموافق ٢٥ من أبريل سنة ١٩٨٧م، بعد ما طرأت عوارض وفترات طويلة أثناء شرح هٰذه الأبواب، والله الموفق لإكمال شرح بقية الكتاب، والحمد لله الذي بنعمته تتم الصالحات، وعلى رسوله أفضل الصلوات والتسليمات وعلى آله وأصحابه الطيبين وأزواجه الطاهرات.

---

[1] زبدۃ المناسک (ص۱۳۸) بحوالہ غنیۃ المناسک، نیز دیکھئے رد المحتار (ج۲ ص۲۴۸) مطلب فی کراھۃ الاستنجاء بماء زمزم۔ کتاب الحج ۱۲ مرتب عفی عنہ

أبواب الجنائز[1]

عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

باب ماجاء في النهي عن التمنّي للموت

عن[2] حارثة بن مضرب قال: دخلت على خبّاب وقد اكتوى[3] في بطنه

علاج بالکیّ کی شرعی حیثیت

حدیثِ باب میں "قد اکتوىٰ" کے الفاظ علاج بالکیّ کے جواز پر دال ہیں حالانکہ متعدد روایات میں اس سے روکا گیا ہے[4]۔

حضرت گنگوہی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ نہی عن الکیّ کی روایات منسوخ ہیں اور یہ نہی شروعِ اسلام میں تھی جبکہ لوگ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ شفاء صرف داغنے میں ہے یا اس کو سببِ شفا کے بجائے

---

[1] جنائز "جنازة" کی جمع ہے جو "جَنَزَ يَجْنِزُ" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں چھپانا۔ لفظ "جنازہ" جیم کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ "میت" کو کہتے ہیں والکسر أفصح، ایک قول یہ ہے کہ جنازہ فتحہ کے ساتھ میت کو کہتے ہیں، کسرہ کے ساتھ اس تخت کو جس پر میت ہو، اور ایک قول اس کے برعکس ہے یعنی فتحہ کے ساتھ وہ تخت جس پر میت موجود ہو اور کسرہ کے ساتھ میت۔ جیم کا فتحہ اور کسرہ صرف مفرد میں ہے، جمع کے صیغہ میں جیم کا فتحہ متعین ہے۔ دیکھئے المجموع (ج ۵ ص ۱۱۳) - الکوکب الدری (ج ۲ ص ۱۱۳) - لسان العرب (ج ۵ ص ۳۲۴) ۱۲ مرتب

[2] الحديث أخرجه البخاري في صحيحه (ج ۲ ص ۸۴۶) كتاب المرضى، باب نهي تمنّي المريض الموت - ومسلم في صحيحه (ج ۲ ص ۳۴۲) كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب كراهة تمنّي الموت لضر نزل به ۱۲ مرتب

[3] اكتوى اكتواءً: داغنا ۱۲ م

[4] مثلاً:

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے: "عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الشفاء في ثلاثة: شربة عسل، وشرطة محجم، وكيّة نار، وأنهى أمّتي عن الكيّ" امام بخاری نے یہ روایت دو طریقوں سے نقل کی ہے، دیکھئے (ج ۲ ص ۸۴۸) کتاب الطب، باب الشفاء في ثلاث -

"عن عمران بن حصين قال: نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن الكيّ، فاكتوينا، فما أفلحن ولا أنجحن (بإسقاط الف المتكلم في الموضعين)" سنن ابی داؤد (ج ۲ ص ۵۴۱) كتاب الطب، باب في الكيّ - نیز دیکھئے سنن ابن ماجہ (ص ۲۴۹) باب الكيّ - نیز دیکھئے سنن ترمذی (ج ۲ ص ۲۳) أبواب الطب، باب ما جاء في كراهية الكيّ ۱۲ مرتب

منفسر شافی مانتے تھے پھر جب لوگوں کے قلوب واذہان میں عقائدِ اسلام راسخ ہوگئے تو اس کی اجازت دیدی گئی۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ احادیثِ نہی "کی لسوء الاعتقاد" پر محمول ہیں۔ ورنہ صحتِ عقیدہ کے ساتھ علاج بالکی میں نہ پہلے کوئی حرج تھا، نہ اب ہے۔

بعض نے کہا کہ احادیثِ نہی تحریم پر نہیں بلکہ ارشاد پر محمول ہیں[1] جبکہ احادیثِ اباحت[2] رخصت پر[3]

احقر کے والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ شریعت کی نظر میں علاج بالکی پسندیدہ نہیں اس لئے کہ یہ تعمق فی العلاج ہے اور توکل کے مناسب یہ ہے کہ

---

[1] اس کی تائید صحیح بخاریؒ میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت سے ہوتی ہے: "عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: إن کان فی شیئ من أدعیتکم شفاء ففی شرطة محجم أو لذعة بنار، وما أحب أن أکتوی" (ج ۲ ص۸۴۹) کتاب الطب، باب من اکتوی أو کوی غیرہ وفضل من لم یکتو۔ ۱۲ مرتب

[2] مثلاً چند احادیثِ اباحت یہ ہیں:

(۱) حارثہ بن مضرب کی حدیثِ باب۔

(۲) سنن ابی داؤد میں حضرت جابرؓ کی روایت: "أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کوی سعد بن معاذ من رمیته" (ج ۲ ص۵۴۲) کتاب الطب، باب فی الکی۔

(۳) سنن ترمذی میں حضرت انسؓ کی روایت: "أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کوی سعد بن زرارة من الشوکة (داء حمرة تعلو الجسد) (ج ۲ ص۲۴)۔ أبواب الطب، باب ماجاء فی الرخصة فی ذلک۔ اور سنن ابن ماجہ کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: "أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوی سعد بن معاذ فی أکحله" (ص۲۴۹) باب من اکتوی۔

(۴) "عن جابر قال، مرض أبی بن کعب مرضاً، فأرسل إلیه النبی صلی اللہ علیہ وسلم طبیباً فکواہ علی أکحله" سنن ابن ماجہ (ص۲۴۹) باب من اکتوی ۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ

[3] مذکورہ تفصیل کے لئے دیکھئے الکوکب الدری (ج ۲ ص۱۶۱)۔

ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ احادیثِ نہی اس صورت پر محمول ہیں جبکہ کی ضروری نہ ہو۔ قاله أبو الطیب۔ دیکھئے کوکب (ج ۲ ص۱۶۲) ۱۲ م

علاج تو اختیار کیا جائے لیکن اس میں تعمّق نہ ہو بلکہ طلب میں "اجمال" سے کام لیتے ہوئے اللہ پر بھروسہ ہونا چاہئے جبکہ اہل عرب "کی" پر حد سے زیادہ اعتماد کرتے تھے اور کہتے تھے "آخر الدواء الکی" اس لئے شریعت میں علاج بالکی سے احتراز کو پسندیدہ قرار دیا گیا[1] اس کے علاوہ "کی" میں مریض کیلئے الم شدید یقینی ہے اور شفا موہوم ہے، علاج بالکی کے شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ نہ ہونے کی یہی وجہ ہے، جہاں تک علاج بالکی کے نفس جواز کا تعلق ہے اُس میں شبہ نہیں، اگرچہ اولیٰ نہیں چنانچہ جن روایات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ کا "کی" سے علاج کرنے یا کروانے کا ذکر ہے وہ سب جواز ہی پر محمول ہیں۔ ممکن ہے کہ دوسرے علاجوں سے فائدہ نہ ہونے کی وجہ سے وہاں بدرجہ مجبوری "کی" کو اختیار کیا گیا ہو۔ بہرحال علاج بالکی سے حتی الامکان احتراز بہتر ہے۔

ہمارے زمانہ میں آپریشن علاج بالکی ہی کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا اس کو بھی بغیر ضرورت شدیدہ کے اختیار نہ کرنا چاہیے

لولا أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہانا ۔ أو نہی ۔ أن نتمنّی الموت لتمنّیتُہ"

اس سے معلوم ہوا کہ موت کی تمنّا کرنا جائز نہیں، کتبِ حدیث میں اس مضمون کی اور بھی روایات آئی ہیں، مثلاً: بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع روایت "ولا یتمنّی[2] أحدکم الموت إمّا محسناً فلعلّہ أن یزداد خیراً و إمّا مسیئاً فلعلّہ أن یستعتب[3]" اور مسلم کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: "لا یتمنّیٰ أحدکم الموت ولا یدع بہ من قبل أن یأتیہ، إنہ إذا مات أحدکم انقطع عملہ، وانہ لا یزید المؤمن عمرہٗ إلّا خیراً[4]"

---

[1] حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بات کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم امتِ محمدیہ کے ان ستر ہزار آدمیوں کے اوصاف ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں جو بغیر حساب کے جنت میں داخل کئے جائیں گے: "ھم الذین لا یسترقون ولا یتطیّرون، ولا یکتوون، وعلی ربھم یتوکّلون" دیکھئے صحیح بخاری (ج ۲ ص۸۵۰) باب من اکتوی أو کوی غیرہ وفضل من لم یکتو، کتاب الطب ۱۲ مرتب

[2] نفی بمعنی النھی ۱۲ م

[3] دیکھئے (ج ۲ ص۸۴۷) کتاب المرضیٰ، باب نھی تمنّی المریض الموت ۱۲ م

[4] دیکھئے (ج ۲ ص۳۴۲) کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب کراھۃ تمنّی الموت لضرّ نزل بہ ۱۲ م

لیکن اس پر اشکال ہوتا ہے کہ حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے تو تمنی موت کا پسندیدہ ہونا معلوم ہوتا ہے وہ نقل کرتے ہیں: "أن نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: من أحبّ لقاء اللہ أحبّ اللہ لقاءہ، ومن کرہ لقاء اللہ کرہ اللہ لقاءہ[1]"

اس کا جواب یہ ہے کہ تمنی اگر دنیوی ضرر کی وجہ سے ہو تو وہ جائز نہیں اگر اخروی ضرر کی وجہ سے ہو مثلاً اس کو اپنے ایمان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو تمنیِ موت میں کوئی حرج نہیں۔

اس کی دلیل حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یتمنّین أحدکم الموت لضرّ نزل بہ[2]" معلوم ہوا کہ نہی عن تمنی الموت اپنے اطلاق پر نہیں بلکہ وہ ضررِ دنیوی کے ساتھ مخصوص ہے، اگر دین کی حفاظت کے خیال سے موت کی تمنا کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں[3] بلکہ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ وہ مندوب ہے[4]

باب[5] ماجاء فی الحثّ علی الوصیّۃ[6]

عن ابن عمر أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ماحقّ امرئ مسلم یبیت لیلتین ولہ شئ یوصی فیہ إلا ووصیتہ مکتوبۃ عندہ" حدیث کا مطلب جمہور کے

---

[1] صحیح مسلم (ج ۲ ص۳۴۳) کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب من احبّ لقاء اللہ أحبّ اللہ لقاءہ ۱۲ م

[2] صحیح مسلم (ج ۲ ص۳۴۲) باب کراھۃ تمنی الموت لضرّ نزل بہ۔

اس روایت میں آگے یہ الفاظ ہیں: "فإن کان لابدّ متمنّیاً فلیقل: اَللّٰھم أحینی ما کانت الحیاۃ خیراً لی وتوفّنی إذا کانت الوفاۃ خیراً لی" ۱۲ م

[3] مذکورہ تفصیل کے لئے دیکھئے مرقاۃ المفاتیح (ج ۴ ص۲) باب تمنی الموت، الفصل الأوّل ۱۲ م

[4] شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲ م

[5] "وصیت" وصی: الشئُ بہ یَصِی وصیاً: متصل ہونا، وصی الشئَ بآخر: ملانا۔ وصیت کی جمع "وصایا" آتی ہے اور اصطلاح میں "تملیك مضاف إلی ما بعد الموت" کما فی "قواعد الفقہ" (ص۵۴۳) علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: "وسمیت وصیۃ لأنہ وصل ما کان فی حیاتہ بما بعدہ" شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۲ ص۳۸) کتاب الوصیۃ ۱۲ مرتب

[6] الحدیث أخرجہ البخاری فی صحیحہ (ج ۱ ص۳۸۲) فاتحۃ کتاب الوصایا۔ ومسلم فی صحیحہ (ج ۲ ص۳۸، ۳۹) اوّل کتاب الوصیۃ ۱۲ م

نزدیک یہ ہے کہ جس شخص کے پاس کوئی ودیعت ہو یا اس کے ذمہ کوئی دین ہو یا حق واجب ہو خواہ حق اللہ ہو یا حق العبد، حقِ وارث ہو یا حقِ غیر اس کے لئے واجب ہے کہ وہ اس کے بارے میں وصیت کرے[1]، اگر کسی قسم کا کوئی حق اس کے ذمہ نہ ہو تو وصیت واجب نہیں۔

پھر داؤد ظاہریؒ کے نزدیک وہ اقرباء جو اس کی میراث کے حقدار نہیں ان کے لئے بہر صورت وصیت واجب ہے، مسروقؒ، طاؤسؒ، ایاسؒ، قتادہؒ اور ابن جریرؒ کا بھی یہی قول ہے، ان حضرات کا استدلال باری تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہے "كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۨالْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ[2]" نیز حدیثِ باب سے بھی ان کا استدلال ہے۔

جمہور کے نزدیک اقرباء کے لئے بغیرِ حقِ واجب کے وصیت واجب نہیں۔ ائمہ اربعہؒ، سفیانِ ثوریؒ، شعبیؒ اور ابراہیم نخعیؒ کا یہی مسلک ہے۔

جہاں تک آیت کا تعلق ہے وہ جمہور کے نزدیک منسوخ ہے، اس لئے کہ میراث کا حکم نازل ہونے سے قبل وصیت واجب تھی، جب میراث کا حکم آگیا تو وصیت کی ضرورت باقی نہ رہی، آیت کے منسوخ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں "وصیت للوالدین" کا بھی ذکر ہے اور والدین کے لئے اب وصیت بالاجماع جائز نہیں اس لئے کہ وہ ورثہ میں داخل ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "لا وصية لوارث[3]" معلوم ہوا کہ "كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ" والی آیت، آیتِ میراث[4] سے منسوخ ہے۔

---

[1] وصیت نامہ کیسے لکھا جائے؟ اور کیسے مرتب کیا جائے؟ اس کا تفصیلی اور تسلی بخش طریقہ مرشدی و شیخی حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس سرہ نے اپنی مفید کتاب "احکامِ میت" (ص ۱۷۸ تا ۱۸۰) باب ہفتم میں لکھ دیا ہے، فلیراجعہ فانہ مھم۔ ۱۲ مرتب

[2] سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۱۸۰ پ ۲ - ۱۲ م

[3] دیکھئے سنن نسائی (ج ۲ ص ۱۳۱) کتاب الوصایا، باب إبطال الوصية للوارث - سنن ابی داؤد (ج ۲ ص ۳۹) کتاب الوصایا، باب ماجاء في الوصية للوارث - سنن ترمذی (ج ۲ ص ۳۲) أبواب الوصايا، باب ماجاء لا وصية لوارث - سنن ابن ماجہ (ص ۱۹۴) أبواب الوصايا، باب لا وصية لوارث ۱۲ م

[4] یعنی "يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ" الآیۃ، سورۂ نساء آیت ۱۱ پ ۴ - ۱۲ م

اور حدیثِ باب کا جواب یہ ہے کہ یہی روایت مسلم شریف میں بھی آئی ہے جس میں روایت کے الفاظ یہ ہیں : ”ما حق امرئ مسلم له شئ يريد أن يوصي فيه يبيت ليلتين إلا ووصيته مكتوبة عنده[1]“ اس میں ”له شئ يريد أن يوصي فيه“ کے الفاظ اس پر دال ہیں کہ حکم اُس شخص کے ساتھ خاص ہے جو وصیت کرنا چاہتا ہو، اگر وصیت کا حکم واجب ہوتا تو اس کو ارادہ کے ساتھ مقید نہ کیا جاتا۔

واضح رہے کہ جمہور کے نزدیک غیر وارث کے لئے اگرچہ وصیت واجب نہیں لیکن مستحب بہرحال ہے[2]۔ واللہ أعلم (از مرتب عفا اللہ عنہ)

باب[3] ما جاء في الوصية بالثلث والربع

عن[4] سعد بن مالك ...... أوص بالعشر، فما زلت أناقصه حتى قال : أوص بالثلث، والثلث كثير ” ہر آدمی کو اپنے مال کے ایک تہائی میں وصیت کرنے کا اختیار[5] ہے، البتہ

---

[1] دیکھئے (ج ۲ ص۳۸ و ۳۹) کتاب الوصیة ۱۲ م

[2] باب سے متعلق مذکورہ تفصیل کیلئے دیکھئے تکملہ فتح الملہم لأستاذنا المحترم صاحب الأمالی دام اقبالہم (ج ۲ ص۹۴ و ۹۵) کتاب الوصیة ۱۲ م

[3] شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲ م

[4] الحديث أخرجه البخاري في صحيحه (ج ۱ ص۱۷۳) كتاب الجنائز، باب رثاء النبي صلى الله عليه وسلم سعد بن أبي خولة - و (ج ۱ ص۳۸۲ و ص۳۸۳) كتاب الوصايا، باب أن يترك ورثته أغنياء خير من أن يتكففوا الناس وباب الوصية بالثلث - ومسلم في صحيحه (ج ۲ ص۳۹ و ۴۰) كتاب الوصية - والنسائي في سننه (ج ۲ ص۱۲۹ وص۱۳۰) كتاب الوصايا، باب الوصية بالثلث - وأبو داؤد في سننه (ج ۲ ص۳۹۵) كتاب الوصايا، باب ما جاء فيما لا يجوز للوصي في ماله - وابن ماجة في سننه (ص۱۹۴) أبواب الوصايا، باب الوصية بالثلث ۱۲ مرتب

[5] واضح رہے کہ تہائی مال سے مراد یہ ہے کہ تجہیز و تکفین اور قرض کی ادائیگی کے بعد جو ترکہ بچے اس کے ایک تہائی میں وصیت نافذ ہوگی نہ کہ کل مال کے ایک تہائی میں۔ دیکھئے المبسوط للسرخسی (ج ۲۷ ص۱۴۳) کتاب الوصایا۔
پھر اگر کسی نے ورثہ کی موجودگی میں ثلث سے زیادہ کی وصیت کی تو وہ نافذ نہ ہوگی، اِلّا یہ کہ وہ ورثہ اجازت دیں، بشرطیکہ ان میں کوئی بچہ یا مجنون نہ ہو۔ تکملہ فتح الملہم (ج ۲ ص۱۰) باب الوصیة بالثلث ۱۲ مرتب

حنفیہ کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ وصیت ایک تہائی سے بھی کم مال کی ہو[1] خواہ اس کے ورثہ اغنیاء ہوں یا فقراء[2]۔ جبکہ شافعیہ کے نزدیک اگر اس کے ورثہ فقراء ہوں تب تو وصیت کا ایک تہائی سے کم ہونا بہتر ہے اور اگر اس کے ورثہ اغنیاء ہوں تو ایک تہائی کی وصیت بہتر ہے[3]۔

واضح رہے کہ تہائی مال کی وصیت کے بارے میں مذکورہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ موصی کے ورثہ موجود ہوں، اگر موصی کا کوئی وارث ہی نہ ہو نہ ذوی الفروض میں سے، نہ عصبات میں سے، نہ ذوی الارحام میں سے، تو حنفیہ کے نزدیک تہائی مال سے زیادہ کی بھی وصیت درست ہے یہاں تک کہ کل مال کی وصیت بھی درست ہے[4]۔ مسروقؒ، شریکؒ، حسن بصریؒ اور امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے، امام مالکؒ

---

[1] ثلث سے کم کی تحدید مختلف حضرات سے مختلف منقول ہے:

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے بارے میں قتادہؒ سے مروی ہے: "أن أبا بكر أوصى بالخمس وقال: أوصي بما رضي الله به لنفسه، ثم تلا: وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ"

قتادہؒ حضرت عمرؓ کے بارے میں بھی نقل کرتے ہیں: "وأوصى عمر بالربع"

حارث حضرت علیؓ کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا "لأن أوصي بالخمس أحب إلي من أن أوصي بالربع، وأن أوصي بالربع أحب إلي من أن أوصي بالثلث، ومن أوصى بالثلث فلم يترك شيئاً"

مذکورہ تینوں آثار کے لئے دیکھئے مصنف عبدالرزاق (ج ۹ ص۶۶، ۶۷، رقم ۱۶۳۶۳ اور ۱۶۳۶۱) کتاب الوصایا، کم یوصی الرجل من ماله۔

"عن إبراهيم قال: كان السدس أحب إليهم من الثلث"

بعض نے عُشر کی تحدید کی ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ انھوں نے ایک آدمی سے فرمایا: "أوص بالعشر"

ان دونوں آثار کے لئے دیکھئے سنن دارمی (ج ۲ ص۲۹۲، رقم ۳۲۰۵ و ۳۲۰۱) کتاب الوصایا، باب الوصیۃ بأقل من الثلث۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ جس شخص کے پاس مال کم ہو اور اس کے ورثہ بھی موجود ہوں تو اس کو چاہئے کہ وصیت نہ کرے کما فی العمدۃ (ج ۱۴ ص۳۵) کتاب الوصایا، باب الوصیۃ بالثلث۔ واللہ أعلم ۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ

[2] کما فی الدر المختار ورد المحتار۔ (ج ۶ ص۶۵۱، ۶۵۲) طبع ایچ ایم سعید کمپنی) کتاب الوصایا ۱۲ م

[3] کما فی شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۲ ص۳۹) کتاب الوصیۃ ۱۲ م

[4] کما فی الدر المختار ورد المحتار (ج ۶ ص۶۵۲) کتاب الوصایا ۱۲ م

اور امام اسحٰقؒ کا بھی ایک قول اسی کے مطابق ہے[1]۔

حدیثِ باب میں "والثلث کثیر" کے تین مطلب ہو سکتے ہیں:

(۱) ثلث وصیت کا وہ انتہائی درجہ ہے جو جائز ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ اس سے کم کیا جائے۔

(۲) وصیت بالثلث یا تصدق بالثلث بھی اکمل ہے یعنی "کثیرٌ اجرہ"۔

(۳) ثلث بھی کثیر ہے قلیل نہیں ہے۔

ان تینوں مطالب میں سے حنفیہ نے پہلے کو اور شافعیہ نے تیسرے مطلب کو ترجیح دی ہے[2]۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے حنفیہ کے مطلب کی تائید ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"لو أنّ الناس غضّوا من الثلث إلی الربع فإن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: الثلث، والثلث کثیر[3]" یہی وجہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک وصیت میں ثلث سے کمی کرنا مستحب ہے کما بیّنّا آنفاً۔ واللّٰہ أعلم (از مرتب عفا اللّٰہ عنہ)

باب ماجاء فی تلقین المریض عند الموت والدعاء له

عن[4] أبی سعید عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: لقّنوا موتاکم لا الٰہ الا اللّٰہ"

یہاں دو مسئلے ہیں:

ایک مسئلہ تلقین قبیل الموت کا، دوسرا تلقین عند القبر کا۔

تلقین قبیل الموت | جب کسی پر موت کے اثرات ظاہر ہونے لگیں تو اس کو کلمۂ شہادت کی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۸ ص۹۱) کتاب الجنائز، باب رثاء النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم سعد بن خولۃ ۱۲ م

[2] دیکھئے تکملۂ فتح الملہم (ج ۲ ص۱۱) باب الوصیۃ بالثلث ۱۲ م

[3] صحیح مسلم (ج ۲ ص۴۱) کتاب الوصیۃ ۱۲ م

[4] الحدیث أخرجہ مسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص۳۰۰) کتاب الجنائز۔ والنسائی فی سننہ (ج ۱ ص۲۵۸ و ۲۵۹) کتاب الجنائز، باب تلقین المیت۔ وأبو داود فی سننہ (ج ۲ ص۴۴۲) کتاب الجنائز، باب فی التلقین۔ وابن ماجہ فی سننہ (ص۱۰۴) أبواب ماجاء فی الجنائز، باب ماجاء فی تلقین المیت لا إلٰہ إلا اللّٰہ۔ ۱۲ مرتب

تلقین کرنا مستحب ہے[1]، حدیثِ باب کا یہی مطلب ہے، اس لئے کہ "لقنوا موتاکم" "لقنوا من قرب موته" کے معنی میں ہے کما فی الهداية مع شرحه فتح القدير (ج ۲ ص۶۸، باب الجنائز) جس کی صورت یہ ہوگی کہ اس کے پاس موجود لوگ بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھیں، اس کو پڑھنے کا حکم نہ دیا جائے، اس لئے کہ وہ بڑے کٹھن لمحات ہوتے ہیں حکم دینے کی صورت میں نہ جانے اس کے منہ سے کیا نکل جائے[2]۔ پھر جب وہ ایک دفعہ کلمہ پڑھ لے تو یہ کوشش نہ کی جائے کہ وہ برابر کلمہ پڑھتا رہے، اس لئے کہ مقصود تو محض یہ ہے کہ اسے "من کان آخر کلامه: لا إله إلا الله، دخل الجنة"[3] کی فضیلت حاصل ہو جائے جب اس نے کلمہ پڑھ لیا تو اُسے یہ فضیلت حاصل ہوگئی اس لئے اعادہ کی ضرورت نہیں[4]۔ البتہ اگر وہ کلمہ پڑھنے کے بعد کوئی دنیوی بات چیت کرلے تو دوبارہ تلقین مستحب ہے۔

تلقین عند القبر حنفیہ کے نزدیک ظاہر الروایۃ کے مطابق تلقین عند القبر نہیں کی جائے گی[5]۔

---

[1] وقيل وجوبًا. في القنية: وكذا في النهاية عن شرح الطحاوي: الواجب على إخوانه وأصدقائه أن يلقنوه اهـ قال في النهر: لكنه تجوز لما في الدراية من أنه مستحب بالإجماع اهـ. فتنبه. أنظر الدر المختار مع رد المحتار (ج ۱ ص۵۶۵) باب صلوة الجنائز، مطلب في تلقين المحتضر الشهادة ۱۲ مرتب

[2] الدر المختار مع رد المحتار (ج ۱ ص۵۶۵ و ۵۶۶) ۱۲ م

[3] رواه معاذ بن جبل عن النبي صلى الله عليه وسلم، كما في سنن أبي داود (ج ۲ ص۸۸) كتاب الجنائز، باب في التلقين۔

ابن ابی حاتمؒ نے ابو زرعہؒ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو لوگوں نے انہیں تلقین کرنے کا ارادہ کیا اور حضرت معاذؓ کی حدیثِ مذکور کا ذکر کرنے لگے تو اس پر ابو زرعہؒ نے ان کو حضرت معاذؓ کی مذکورہ روایت اپنی سند سے بیان کی اور حدیث بیان کرتے کرتے "لا إله إلا الله" پر پہنچے تو اس کو پڑھ کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ ان کی روح نکل گئی۔ کما فی فتح الملهم (ج ۲ ص۴۶۶) أوائل كتاب الجنائز، ۱۲ مرتب

[4] جیسا کہ اسی باب میں حضرت عبداللہ بن المبارکؒ کے بارے میں مروی ہے "أنه لما حضرته الوفاة جعل رجل يلقنه لا إله إلا الله، وأكثر عليه، فقال له عبد الله: إذا قلت مرة فأنا على ذلك ما لم أتكلم بكلام" ۱۲ م

[5] كما في الدر المختار ورد المحتار (ج ۱ ص۵۶۶) باب صلاة الجنائز، مطلب في التلقين بعد الموت۔ اس مقام پر در مختار میں ہے کہ اگر کسی نے تلقین عند القبر کی تو اس کو روکا نہیں جائیگا، شامی میں شرح منیہ کے حوالہ سے تلقین بعد الدفن سے نہ روکنے کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے "لأنه لا ضرر فيه، بل فيه نفع، فإن الميت يستأنس بالذكر على ما ورد في الآثار" ۱۲ مرتب

امام احمدؒ کا مسلک بھی یہی معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ وہ فرماتے ہیں "ما رأیت أحداً فعل هذا إلا أهل الشام[1]" گویا ان حضرات کے نزدیک حدیثِ باب "لقنوا موتاکم" معنیٰ مجازی پر محمول ہے اور اس سے صرف تلقین المحتضر مراد ہے نہ کہ تلقین عند القبر۔ شرح منیہ میں اس روایت کو مجازی معنی پر محمول کرنے کو مسلکِ جمہور قرار دیا گیا ہے[2]۔

صاحبِ کفایہ نے عدمِ تلقین عند القبر کی یہ دلیل بیان کی ہے "لا فائدة في التلقين بعد الموت لأنه إن مات مومناً فلا حاجة إليه وإن مات كافراً فلا يفيد التلقين[3]"

لیکن شیخ زاہد صفارؒ نے "لقنوا موتاکم" کو اپنے معنی حقیقی پر محمول کرتے ہوئے تلقین عند القبر کو اہلِ سنت کا مسلک قرار دیا ہے اور عدمِ تلقین کو معتزلہ کا مسلک کہا ہے اس لئے کہ تلقین کی صورت میں یہ ماننا پڑیگا کہ قبر میں اللہ تعالیٰ مُردے کی روح کو لوٹا دیتے ہیں جبکہ معتزلہ اس اعادۂ روح کے قائل نہیں[4]۔ نیز صاحبِ جوہرہ نے بھی تلقین عند القبر کو اہلِ سنت کے نزدیک مشروع قرار دیا ہے[5]۔

شیخ ابن ہمامؒ نے بھی "لقنوا موتاکم" کے معنی حقیقی کو راجح قرار دیتے ہوئے تلقین عند القبر کو درست قرار دیا ہے[6]۔

اکثر شافعیہ نے بھی تلقین عند القبر کو مستحب قرار دیا ہے، ابن الصلاحؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے شارحِ مسلم اُبیؒ کہتے ہیں "ولا يبعد حمل حديث الباب على التلقين بعد الدفن[7]"

قائلین تلقین عند القبر کا ایک استدلال حضرت ابو امامہؓ کی روایت سے ہے، سعید بن عبد اللہ ازدیؒ فرماتے ہیں: "شهدت أبا أمامة وهو في النزع، فقال: إذا أنا متُّ فاصنعوا بي كما أمر رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: إذا مات أحد من إخوانكم فسويتم التراب على قبره فليقم أحدكم على

---

[1] كما في المغني لابن قدامة (ج ۲ ص۵۰۶) فصل: فأما التلقين بعد الدفن ۱۲ م

[2] كما في ردّ المحتار (ج ۱ ص۸۵۷) مطلب في التلقين بعد الموت ۱۲ م

[3] كفايه بہامش فتح القدير (ج ۲ ص۶۹) باب الجنائز ۱۲ م

[4] ردّ المحتار (ج ۱ ص۸۵۷) مطلب في التلقين بعد الموت ۱۲ م

[5] فتح الملهم (ج ۲ ص۴۶۶) كتاب الجنائز ۱۲ م

[6] فتح القدير (ج ۲ ص۶۸ و۶۹) باب الجنائز ۱۲ م

[7] فتح الملهم (ج ۲ ص۴۶۶) كتاب الجنائز ۱۲ م

رأس قبرہ ثم لیقل : یا فلان ابن فلانة، فإنہ یسمعه ولا یجیب، ثم یقول : یا فلان ابن فلانة، فإنہ یستوی قاعداً، ثم یقول یا فلان ابن فلانة، فإنہ یقول : أرشدنا رحمك الله، ولکن لا تشعرون، فلیقل : اذکر ما خرجت علیه من الدنیا: شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمداً عبدہ ورسوله، وأنك رضیت بالله رباً، وبالإسلام دیناً وبمحمدٍ نبیاً، وبالقرآن إماماً، فإن منکراً ونکیراً یأخذ کل واحد منهما بید صاحبه ویقول : انطلق بنا، ما نقعد عند من لقن حجته، فیکون الله حجیجه دونهما، قال رجل : یا رسول الله، فإن لم یعرف أمه قال : فینسبه إلی حواء، یا فلان ابن حواء "

لیکن علامہ ہیثمیؒ مجمع الزوائد[1] میں اس روایت کو نقل کر کے فرماتے ہیں : " رواہ الطبرانی فی الکبیر، وفی إسنادہ جماعة لم أعرفهم " البتہ حافظ ابن حجرؒ اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں:
" وإسنادہ صالح، وقد قواہ الضیاء فی أحکامه، وأخرجه عبد العزیز فی الشافی[2] "

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں[3] کہ حضرت ابو امامہؓ کی روایت کی سند اگرچہ ضعیف ہے لیکن محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ فضائل اور ترغیب و ترہیب کے باب میں توسع سے کام لیا جاتا ہے بالخصوص جبکہ اس روایت کے شواہد بھی موجود ہیں مثلاً حدیثِ تثبیت[4] اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی وصیت والی روایت[5] جو دونوں کی دونوں صحیح السند ہیں۔[6]

---

[1] (ج ۳ ص۴۵) کتاب الجنائز، باب تلقین المیت بعد دفنه ۱۲ م

[2] دیکھئے التلخیص الحبیر (ج ۲ ص۱۳۶، تحت رقم ۷۹۶) کتاب الجنائز ۱۲ م

[3] دیکھئے المجموع شرح المهذب (ج ۵ ص۳۰۴) قبیل باب التعزیة والبکاء علی المیت ۱۲ م

[4] رواہ أبو داؤد عن عثمان بن عفان قال: " کان النبی صلی الله علیه وسلم إذا فرغ من دفن المیت وقف علیه فقال : استغفروا لأخیکم واسألوا له بالتثبیت فإنہ الآن یسئل " (ج ۲ ص۴۵۹) کتاب الجنائز باب الاستغفار عند القبر للمیت فی وقت الانصراف ۱۲ مرتب

[5] جس میں وہ فرماتے ہیں: " فإذا أنا مت فلا تصحبنی نائحة ولا نار، فإذا دفنتمونی فشنوا علی التراب شناً، ثم أقیموا حول قبری قدر ما تنحر جزور ویقسم لحمها حتی أستأنس بکم وأنظر ماذا أراجع به رسل ربی "
صحیح مسلم (ج ۱ ص۷۶) کتاب الإیمان، باب کون الإسلام یهدم ما قبله، وکذا الحج والهجرة ۱۲ مرتب

[6] حافظ ابن حجرؒ نے زیر بحث روایت کے اور بھی شواہد ذکر کئے ہیں، دیکھئے التلخیص الحبیر (ج ۲ ص۱۳۶) ۱۲ م

صاحبِ اعلاء السنن علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے حنفیہ اور جمہور کے مسلک کے مطابق "لقنوا موتاکم" کو معنی مجازی پر محمول کیا ہے، یعنی اس کو "لقنوا من قرب موته" کے معنی میں لیا ہے، اور اس معنی مجازی پر انہوں نے یہ دلیل بیان کی ہے کہ صحیح ابن حبان میں یہ روایت "من کان آخر کلامه لا إله إلا الله عند الموت دخل الجنة" [1] کی زیادتی کے ساتھ آئی ہے جس سے معنی مجازی متعین ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک تلقین بعد الدفن کا تعلق ہے اس کو علامہ عثمانیؒ نے فی نفسہ مستحب قرار دیا ہے اس لئے کہ حضرت ابو امامہؓ کی روایت میں جو "فلیقم أحدکم علیٰ رأس قبرہ ثم لیقل ...." کے الفاظ آئے ہیں وہ علی الاقل استحباب پر محمول کئے جائیں گے لیکن آگے وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ تلقین بعد الدفن آج کل روافض کا شعار بن چکی ہے اور اہل سنت نے اُسے ترک کر دیا ہے اس لئے اب تلقین نہ کی جائے گی لأن فیه خوف التهمة، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اتقوا مواضع التهم[2]" یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے لیکن تائید کے لئے بہر حال پیش کیا جا سکتا ہے، پھر اگر کسی موقعہ پر تہمت کا اندیشہ نہ ہو تو تلقین بعد الدفن اب بھی مستحسن ہوگی[3]۔

یہ ساری بحث تلقین بعد الدفن سے متعلق تھی، جہاں تک دفن کے بعد قبر پر تھوڑی دیر ٹھہرنے، میت کے لئے دعائے مغفرت کرنے اور قرآن شریف پڑھ کر ثواب پہنچانے کا تعلق ہے سو یہ سب کام مستحب ہیں[4] اس کے علاوہ قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات "وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" تک اور پائنتی کی طرف سورۂ بقرہ کی آخری آیات "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ" سے ختم سورت

---

[1] کنز العمال میں یہ روایت صحیح ابن حبان ہی کے حوالے سے اس طرح نقل کی گئی ہے: "لقنوا موتاکم: لا إله إلا الله، فإنه من کان آخر کلامه لا إله إلا الله عند الموت دخل الجنة یوماً من الدهر، و إن أصابه قبل ذلك ما أصابه" (ج ۲۰ صفحہ ۹۹، رقم ۲۸۷) ۱۲ مرتب

[2] رواه البخاری فی تاریخه، کما فی کنوز الحقائق للمناوی بهامش الجامع الصغیر للسیوطی (ج ۱ ص ۸) ۱۲ م

[3] دیکھئے اعلاء السنن (ج ۸ ص ۲۴۷) باب ما یلقن المحتضر الخ ۱۲ م

[4] دیکھئے فتاویٰ عالمگیری (ج ۱ ص ۱۶۶) الباب الحادی والعشرون فی الجنائز، الفصل السادس فی القبر والدفن۔

فتاویٰ عالمگیری میں اسی مقام پر لکھا ہے "قراءة القرآن عند القبور عند محمد رحمه الله تعالیٰ لا تکره، ومشایخنا رحمهم الله تعالیٰ أخذوا بقوله، وهل ینتفع؟ والمختار أنه ینتفع" ۱۲ مرتب

تک پڑھنا مستحب ہے[1]۔ واللہ أعلم۔ (تم شرح الباب بزیادات کثیرۃ من المرتب)

باب ماجاء فی التشدید عند الموت

عن[2] عائشۃ قالت، ما أغبط أحداً بھون موت بعد الذی رأیت من شدۃ موت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" بعض[3] روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کی روح بہت آسانی سے نکل جاتی ہے، اس طرح ایک طرح کا تعارض ہو جاتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مومن مرض کی شدت میں تو مبتلا کیا جاتا ہے لیکن اس کی روح آسانی کے ساتھ نکل جاتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بھی مرض کی شدت تھی نہ کہ موت کی شدت۔ واللہ أعلم۔

باب ماجاء أن[4] المؤمن یموت بعرق الجبین

عن[5] عبد اللہ بن بریدۃ عن أبیہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: المؤمن

---

[1] معارف الحدیث (ج ۳ ص۸۵۔۸۶) "دفن کا طریقہ اور اس کے آداب" بحوالۂ بیہقی شعب الایمان، عن عمر رضی اللہ عنہ ۱۲م

[2] الحدیث أخرجہ النسائی فی سننہ (ج ۱ ص۲۵۹) کتاب الجنائز، باب شدۃ الموت ۱۲م

[3] مثلاً مسند احمد میں براء بن عازبؓ کی ایک مرفوع روایت میں ہے: "ثم یجیئ ملک الموت علیہ السلام حتی یجلس عند رأسہ، فیقول: أیتھا النفس الطیبۃ، اخرجی إلی مغفرۃ من اللہ ورضوان، قال: فتخرج تسیل کما تسیل القطرۃ من فی السقاء فیأخذھا" اس روایت کے تحت شرح کرتے ہوئے علامہ ساعاتی فرماتے ہیں: "یرید خروج روحہ بسھولۃ کسھولۃ تقطیر الماء من فم القربۃ"، دیکھئے الفتح الربانی لترتیب مسند الإمام أحمد بن حنبل الشیبانی مع شرحہ بلوغ الأمانی (ج ۷، ص۷۴) باب ما یراہ المحتضر الخ رقم (۵۳)۔ ۱۲ مرتب

[4] احمد شاکر والے مصری نسخہ میں اس باب پر یہی ترجمہ قائم کیا گیا ہے، دیکھئے (ج ۳ ص۳۱۰) کتاب الجنائز، باب ۱۰۔ لیکن ہمارے پاس جو ہند و پاک کے نسخے ہیں ان میں اس باب پر کوئی ترجمہ قائم نہیں کیا گیا ۱۲م

[5] الحدیث أخرجہ النسائی فی سننہ، (ج ۱ ص۲۵۹) کتاب الجنائز، باب علامۃ موت المؤمن ــ و ابن ماجہ (ص۱۰۵) أبواب الجنائز، باب ماجاء فی المؤمن یؤجر فی النزع ۱۲م

یموت بعرق الجبین »، اس حدیث کے مطلب میں علماء کے کئی اقوال ہیں :

(۱) عرقِ جبین کنایہ ہے اس مشقت سے جو مؤمن طلبِ رزقِ حلال کے لئے اٹھاتا ہے اور روایت کا مطلب یہ ہے کہ مومن زندگی بھر رزقِ حلال کمانے کی کوشش کرتا رہتا ہے یہانتک کہ اس کی موت آجاتی ہے، نیز عبادت کے لئے اس کے جہدِ مستمر سے بھی کنایہ ہے۔

(۲) موت کے وقت اپنی سیئات اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اکرام دیکھ کر جو بندہ پر ندامت کی کیفیت طاری ہوتی ہے اس کی وجہ سے اُسے پسینہ آجاتا ہے۔

(۳) مومن بندہ کی سیئات کو ختم کرنے یا اس کے درجات کو بلند کرنے کے لئے اس کے ساتھ قبضِ روح میں سختی کا معاملہ کیا جاتا ہے۔

(۴) عرقِ جبین مؤمنانہ موت کی علامت ہے اگرچہ اس کی وجہ عقل سے نہ سمجھی جاسکے[1]

باب (بلا ترجمہ)

عن[2] أنس أن النبي صلى الله عليه وسلم دخل على شاب وهو في الموت، فقال: كيف تجدك؟ قال: والله يا رسول الله، إني أرجو الله وإني أخاف ذنوبي، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يجتمعان في قلب عبد في مثل هذا الموطن إلا أعطاه الله ما يرجو وآمنه مما يخاف " معلوم ہوا کہ خوف اور رجاء دونوں مطلوب ہیں، احیاء[3] العلوم میں حضرت عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ اگر بالفرض میدانِ حشر میں یہ ندا لگائی جائے کہ جنت میں سوائے ایک آدمی کے کوئی نہیں جائیگا تو مجھے یہ امید ہوگی کہ اس ایک آدمی کا مصداق میں ہی ہوں اور اگر پکارا جائے کہ جہنم میں سوائے

---

[1] مذکورہ تمام اقوال کے لئے دیکھئے زهر الربى للسيوطی وحاشیۃ السندی علی سنن النسائی (ج ۱ ص۲۵۹) کتاب الجنائز، باب علامۃ موت المؤمن ۔ نیز دیکھئے إنجاح الحاجۃ علی سنن ابن ماجہ، (ص۱۰۵) أبواب الجنائز، باب ماجاء في المؤمن يؤجر في النزع ۱۲ م

[2] الحديث أخرجه ابن ماجه في سننه (ص۳۱۴) أبواب الزهد، باب ذكر الموت والاستعداد له ۱۲ م

[3] (ج ۴ ص۱۶۵) كتاب الخوف والرجاء، باب بيان أن الأفضل هو غلبة الخوف أو غلبة الرجاء أو اعتدالهما ۱۲ م

ایک آدمی کے کوئی داخل نہیں ہوگا تو مجھے یہ خوف ہوگا کہ وہ ایک آدمی میں ہی ہوں، شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں بھی جنت وجہنم کا ذکر آیا ہے تنہا نہیں آیا بلکہ دونوں کا اکٹھا ذکر ہے تاکہ خوف اور رجاء دونوں کا ضروری ہونا معلوم ہوجائے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ موت کے قریب رجاء کا غلبہ مناسب ہے اس لئے کہ اس سے محبت پیدا ہوتی ہے اور اس سے قبل خوف کا غلبہ مناسب ہے، اس لئے کہ اس سے شہوت کی آگ بجھ جاتی ہے اور دل سے دنیا کی محبت ختم ہوجاتی ہے[1]۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی کراھیۃ النعی

عن[2] عبد اللہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: إیاکم والنعی فإن النعی من عمل الجاھلیۃ" "نعی" لغت میں موت کی خبر کو کہتے ہیں[3]، یہاں اس سے نعی الجاھلیہ مراد ہے جس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ عرب میں جب کوئی بڑا آدمی مرجاتا یا قتل کردیا جاتا تو وہ کسی آدمی کو گھوڑے پر سوار کرکے مختلف قبائل کی طرف بھیجتے تھے جو روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا "نعاءِ[4] فلاناً" یعنی "إنْعَه" مطلب یہ کہ اس کی وفات کی خبر کو ظاہر کرو، نیز عرب اپنے کسی بڑے آدمی کے مرنے پر نوحہ کرنے والیوں کو جب اپنے گھروں پر بلاکر ٹھہراتے تھے تو وہ نوحہ کرنے کے ساتھ نعی کا کام بھی انجام دیتی تھیں کہ بہنٹے آنے والوں کو روتے ہوئے اس آدمی کے مرنے کی خبر دیتی تھیں۔ جن روایات[5] میں نعی کی ممانعت آئی ہے وہ مذکورہ نعی جاہلیت پر ہی محمول ہیں۔

---

[1] احیاء العلوم (ج ۴ ص۱۶۱) کتاب الخوف والرجاء، باب بیان أن الأفضل ھو غلبۃ الخوف او غلبۃ الرجاء أو اعتدالھما ۱۲م

[2] قال الشیخ محمد فؤاد عبد الباقی: "لم یخرجه من أصحاب الکتب الستۃ أحد سوی الترمذی" سنن ترمذی (ج ۳ ص۳۱۲) ۱۲م

[3] نعی الناعی المیّتَ نَعیاً: أخبر بموته، وھو مَنعِیٌّ۔ کذا فی المغرب (ج ۲ ص۲۱۳)۔ ۱۲م

[4] نیز کہا جاتا تھا: "یا نعاءِ العرب" جس کا مطلب یہ ہوتا تھا "یا ھذا انعَ العرب" یا "یا ھؤلاءِ انعَوا العربَ بموت فلان"۔ "یا نُعیان العرب" کے الفاظ بھی آئے ہیں، اس صورت میں "نُعیان" "ناعی" کی جمع ہوگی۔ اسی طرح "نعایا فلان" اور "یا نعایا العرب" بھی کہا جاتا تھا۔ تفصیل وتحقیق کے لئے دیکھئے لسان العرب (ج ۱۵ ص۳۳۳) ۱۲ مرتب

[5] مثلاً حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی حدیث مذکور اور حضرت حذیفہؓ کی حدیث باب ۱۲م

جہاں تک مطلق "نعی" یعنی میت کے رشتہ دار اور اقارب و اصدقاء کو موت کی خبر دینے کا تعلق ہے اس میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے[1] ۔ واللہ أعلم[2]

باب ما جاء أن الصبر عند الصدمة الأولى

عن[3] أنس أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: الصبر فی الصدمة الأولی ۔
یعنی صبر کی اصل فضیلت اوّلِ صدمہ کے وقت ہے اس لئے کہ مرورِ ایام کے ساتھ انسان کو صبر آہی جاتا

---

[1] چنانچہ وہ تمام روایات جن میں نعی کا ثبوت ہے مطلق خبر ہی پر محمول ہیں، مثلاً:

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت " أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعی النجاشی فی الیوم الذی مات فیہ، وخرج إلی المصلی فصف بھم وکبر أربعاً "۔

نیز غزوہ موتہ میں حضرت زید بن حارثہؓ وغیرہ کی شہادت کی خبر دینا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اس میں بھی مطلق اخبار ہی ہے نہ کہ نعی جاہلیت ۔ چنانچہ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے: " قال: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم أخذ الرأیة زید فأصیب، ثم أخذھا جعفر فأصیب، ثم أخذھا عبد اللہ بن رواحة فأصیب وإن عینی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لتذرفان ثم أخذھا خالد بن الولید من غیر إمرة ففتح لہ "

مذکورہ دونوں روایات کے لئے دیکھئے صحیح بخاری (ج ۱ ص۱۶۷) کتاب الجنائز، باب الرجل ینعی إلی أھل المیت بنفسہ۔

نیز حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے: " مات إنسان کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعودہ فمات باللیل فدفنوہ لیلاً، فلما أصبح أخبروہ، فقال: ما منعکم أن تعلمونی " الخ صحیح بخاری (ج ۱ ص۱۶۷) باب الإذن بالجنازہ۔۱۲م

[2] نعی سے متعلق بحث کے لئے دیکھئے عمدة القاری (ج ۸ ص۱۹ و ۲۰) باب الرجل ینعی إلی أھل المیت بنفسہ۔

نعی سے متعلق خلاصۂ بحث کے طور پر حافظ نقل کرتے ہیں " قال ابن العربی: یؤخذ من مجموع الأحادیث ثلاث حالات:

الأولی: إعلام الأھل والأصحاب وأھل الصلاح، فھذا سنة۔

الثانیة: دعوة الحفل للمفاخرة، فھذہ تکرہ ۔

الثالثة: الإعلام بنوع آخر کالنیاحة ونحو ذلک، فھذہ یحرم۔

دیکھئے فتح الباری (ج ۳ ص۹۳) باب الرجل ینعی الخ ۱۲ مرتب

[3] الحدیث أخرجہ البخاری فی صحیحہ (ج ۱ ص۱۷۱) کتاب الجنائز، باب زیارة القبور ۔ ومسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص۳۰۲ و ۳۰۳) کتاب الجنائز، فصل الصبر عند الصدمة الأولی ۱۲م

ہے اس کا اعتبار نہیں۔

یہاں صبر عند المصیبۃ کی حقیقت کو سمجھنا بھی ضروری ہے اس لئے کہ بسا اوقات لوگ اس کے بارے میں مغالطہ میں مبتلا رہتے ہیں اور بہت سی ایسی باتوں کو صبر کے منافی سمجھ لیتے ہیں جو درحقیقت صبر کے منافی نہیں۔

صبر کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک رضا بالقضاء، دوسرے جزع اختیاری سے احتراز۔

رضا بالقضاء کا طریقہ یہ ہے کہ یہ غور کرے کہ اللہ تعالیٰ حاکم بھی ہیں اور حکیم بھی، ان کے "حاکم" ہونے کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ہم ان کے ہر فیصلہ کو بے چون وچرا تسلیم کریں اور ان کے "حکیم" ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ ان کا کوئی کام حکمت سے خالی نہ ہو، حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ فرمایا اس کا انہیں کلی اختیار ہے اور اس کے نتیجہ میں ہمیں جس صدمہ کا سامنا کرنا پڑا وہ اگرچہ ہمارے لئے بظاہر ناگوار ہے لیکن ان کی حکمت کے مقتضیٰ اس میں یقیناً ہمارے لئے خیر ہوگا۔

صبر کے لئے دوسری بات جزع اختیاری سے احتراز ہے، دلی صدمہ اور تکلیف صبر کے منافی نہیں جیسا کہ "اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ ۝"[1] سے اس کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ اس میں دل کی کیفیات سے قطع نظر صرف "اِنَّا لِلّٰہِ الخ" کہنے پر صلوات ورحمت کا وعدہ ہے، اسی طرح بکاء غیر اختیاری بھی صبر کے منافی نہیں خواہ باآواز ہو یا بے آواز، معلوم ہوا کہ لوگوں کے درمیان جو یہ معروف ہے کہ باآواز رونا صبر کے منافی ہے درست نہیں۔

بعض بزرگوں کے بارے میں منقول ہے کہ جب انہیں اپنے بیٹے کی موت کی خبر ملی تو "الحمد للہ" کہا اور بالکل نہ روئے، بہت سے حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ یہ صبر کا اعلیٰ مقام ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ غلبۂ حال پر محمول ہے ورنہ ہمارے لئے "لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ"[2] پر عمل کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی لائق اتباع ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ کی آنکھیں آنسو بہانے لگیں، اس وقت حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا:

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۱۵۶ و ۱۵۷ پ ۲ - ۱۲م

[2] سورۂ احزاب آیت ۲۱ پ ۲۱ - ۱۲م

"وأنت يا رسول الله ؟!" فقال: يا ابن عوف: إنها رحمة، ثم أتبعها بأخرى، فقال: إن العين تدمع والقلب يحزن ولا نقول إلا ما يرضى ربنا، وإنا بفراقك يا إبراهيم لمحزونون"[1] والله اعلم

باب[2] ما جاء في تقبيل الميت

وعن[3] عائشة أن النبي صلى الله عليه وسلم قبّل عثمان بن مظعون وهو ميت، وهو يبكي أو قال: عيناه تذرفان" معلوم ہوا کہ میت کو بوسہ دینا جائز ہے چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق سے بھی ثابت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کو بوسہ دیا[4]۔

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ حضرات صحابہ کرامؓ کے درمیان امتیازی حیثیت کے حامل تھے ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی ہونے کا شرف حاصل ہے[5]، یہ سابقین فی الاسلام میں سے ہیں تیرہ آدمیوں کے بعد اسلام آئے؛ انہیں ہجرت الی المدینہ سے پہلے ہجرت الی الحبشہ کی سعادت حاصل ہوئی، غزوۂ بدر میں بھی شریک ہوئے، یہ مہاجرین میں سے سب سے پہلے وہ صحابی ہیں جن کا ہجرت کے بعد ۲ھ میں مدینہ میں انتقال ہوا، یہی پہلے وہ صحابی ہیں جو جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔ انہوں نے حرمتِ خمر کا حکم نازل ہونے سے پہلے ہی شراب اپنے اوپر حرام کرلی تھی خود فرماتے ہیں "لا أشرب شرابا يذهب عقلي، ويضحك بي من هو أدنى مني"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ کی جب وفات ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: "إلحق بالسلف الصالح عثمان بن مظعون"[6] والله أعلم (از مرتب عفا اللہ عنہ)

---

[1] دیکھئے صحیح بخاری (ج ۱ ص ۱۷۴) کتاب الجنائز، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: إنا بك لمحزونون ۱۲ م

[2] شرحِ باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲ م

[3] الحديث أخرجه أبوداؤد في سننه (ج ۲ ص ۴۵۱) كتاب الجنائز، باب في تقبيل الميت۔ وابن ماجه في سننه (ص ۱۰۵) أبواب الجنائز، باب ما جاء في تقبيل الميت ۱۲ م

[4] كما في صحيح البخاري (ج ۲ ص ۶۴۰) كتاب المغازي، باب مرض النبي صلى الله عليه وسلم ووفاته ۱۲ م

[5] كما في بذل المجهود في حل أبي داود (ج ۱۴ ص ۱۳۰) باب في تقبيل الميت ۱۲ م

[6] مذکورہ تفصیل کے لئے دیکھئے اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ لابن الاثیر (ج ۳ ص ۳۸۵ تا ص ۳۸۶) اور الإصابة في تمييز الصحابة (ج ۴ ص ۲۲۵) ۱۲ مرتب

باب ماجاء في غسل الميّت

عن[1] أم عطية قالت: توفيت إحدى بنات النبي صلى الله عليه وسلم "إحدى بنات" سے کونسی صاحبزادی مرادہیں؟ ایک قول یہ ہے کہ حضرت رقیہؓ مرادہیں دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت ام کلثومؓ مرادہیں، لیکن راجح یہ ہے کہ حضرت ابوالعاص ابن الربیعؓ کی اہلیہ حضرت زینبؓ مرادہیں[2] جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بنات میں سب سے بڑی ہیں[3]۔

فقال[4]: اغسلنها وترا ثلاثا أو خمسا أو أكثر من ذلك إن رأيتن "میت کو ایک دفعہ غسل دینا فرض کفایہ[5] ہے، اگرچہ وہ ظاہراً پاک صاف ہو، اور تین مرتبہ پانی بہانا مسنون ہے، پھر اگر انقاء حاصل نہ ہو تو تین سے زیادہ مرتبہ نہلایا جائیگا لیکن زیادتی کی صورت میں بھی ایتار مستحب ہوگا مثلاً پانچ یا سات مرتبہ، بلاضرورت تین سے زائد مرتبہ نہلانا مکروہ ہے[6]۔

واغسلنها بماء وسدر[7] واجعلن في الآخرة كافورا[8]، او شيئا من كافور "یہاں ماء مقید سے

---

[1] الحديث أخرجه البخاري في صحيحه (ج ۱ ص۱۶۷ و۱۶۸ و۱۹۹) كتاب الجنائز، باب غسل الميّت ووضوءه بالماء والسدر، باب مايستحب أن يغسل وترا، باب يبدأ بميامن الميت، باب مواضع الوضوء من الميت، باب هل تكفن المرأة في إزار الرجل، باب يجعل الكافور في الأخيرة، باب نقض شعر المرأة، باب كيف الإشعار للميت، باب هل يجعل شعر المرأة ثلاثة قرون، باب يلقى شعر المرأة خلفها ثلاثة قرون۔ ومسلم في صحيحه (ج ۱ ص۳۰۴ و۳۰۵) كتاب الجنائز، فصل في غسل الميت وترا ثلاثا أو خمسا أو أكثر إن كانت حاجة، وجعل الكافور في الآخرة، فصل في مشط شعر النساء ثلاثة قرون، فصل في البدء بميامن الميت ومواضع وضوءه۔

[2] جیساکہ مسلم کی روایت میں ام عطیہؓ نے "لما ماتت زينب بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم" کے الفاظ کیساتھ تصریح کی ہے۔ دیکھئے (ج ۱ ص۳۰۵) كتاب الجنائز ۱۲ م

[3] تفصیل کے لئے دیکھئے عمدة القاري (ج ۸ ص۳۹ و۴۰) كتاب الجنائز، باب غسل الميت ووضوءه بالماء والسدر۔ اور فتح الباري (ج ۳ ص۱۰۳) كتاب الجنائز، باب غسل الميت الخ ۱۲ م

[4] یہاں سے "فلما فرغنا آذناه، فاذا فرغنا آذناه" تک کی شرح مرتب کی تحریر کردہ ہے ۱۲ م

[5] أوجز المسالك (ج ۴ ص۱۹۵) كتاب الجنائز، غسل الميت ۱۲ م

[6] الدر المختار ورد المحتار (ج ۱ ص۵۷۵) باب صلاة الجنائز ـ نیز دیکھئے الكوكب الدري (ج ۲ ص۱۵۱) ۱۲ م

[7] ليزيل الأقذار ويمنع من تسارع الفساد ـ كما في العمدة (ج ۸ ص۴۰) باب غسل الميت الخ ۱۲ م

[8] والحكمة فيه أن الجسم يتصلب به وتنفر الهوام من رائحته، وفيه إكرام الملائكة عمده (ج ۸ ص۴۰) ۱۲ م

جوازِ طہارت کا مسئلہ زیرِ بحث آتا ہے۔
حنفیہ کے نزدیک وہ پانی جس میں کوئی پاک چیز مل گئی ہو مثلاً زعفران، صابون، اشنان وغیرہ، ایسے پانی سے وضوء وغیرہ درست ہے بشرطیکہ پانی ان چیزوں پر غالب ہو، رقیق ہو اور اس پر "ماء" کا اطلاق درست ہو۔

ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک پانی میں اگر کوئی پاک چیز مل جائے اور اس کے ذائقہ، رنگ یا بو میں سے کسی ایک کو تبدیل کر دے جیسے ماء باقلی اور ماء زعفران وغیرہ اس سے وضو وغیرہ درست نہیں۔
حدیثِ باب سے حنفیہ کا مسلک ثابت ہوتا ہے اور ان کو اس حدیث کے بارے میں کسی قسم کی تاویل کی احتیاج نہیں لیکن چونکہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ماء مقید سے وضو درست نہیں اس لئے وہ حدیثِ باب میں تاویل کرتے ہیں چنانچہ غسل میت بالماء والسدر والکافور کے بارے میں ائمہ اربعہ کے مذاہب اسطرح ہیں: حنابلہ کے نزدیک بیری کے پانی کے جھاگ سے میت کا صرف سر اور اس کی ڈاڑھی دھوئی جائیگی پھر اس کو تین مرتبہ سادہ پانی میں نہلایا جائے گا۔ البتہ آخری مرتبہ کے پانی میں کافور اور بیری کے پتے ملائے جائیں گے۔
شافعیہ کے نزدیک اس کو تین مرتبہ نہلایا جائیگا، ہر مرتبہ کے نہلانے میں تین مرتبہ پانی ڈالا جائیگا پہلی دفعہ بیری کا پانی، دوسری مرتبہ سادہ پانی، تیسری دفعہ تھوڑا سا کافور ملا ہوا پانی، چونکہ پہلا اور تیسرا پانی ان کے نزدیک ماءِ مطلق کے دائرے میں نہیں آتا اس لئے صرف دوسرے پانی کا اعتبار ہے لہذا تین مرتبہ نہلانے کی صورت میں تین مرتبہ ماءِ مطلق کا بہانا پایا جائے گا۔
مالکیہ کے نزدیک پہلی مرتبہ سادے پانی سے اس کی تطہیر کی جائے گی، دوسری مرتبہ بیری کے پانی سے اس کی تنظیف کی جائے گی جس کی صورت یہ ہوگی کہ بیری کے پتوں کو باریک کوٹ کر پانی میں پکایا جائیگا یہاں تک کہ جھاگ پیدا ہو جائے پھر اس پانی سے میّت کی تنظیف کی جائے گی، اگر بیری کا پانی میسر نہ ہو تو ماء الاشنان اور ماء الصابون سے بھی کام چل سکتا ہے، پھر تیسری مرتبہ خوشبو کے لئے اس کو ماءِ کافور سے نہلایا جائے گا۔ بعض مالکیہ "اغسلنہا بماء وسدر" کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ بیری کے پتے میت پر رگڑے جائیں گے اور اوپر سے پانی ڈالا جائے گا۔
جہاں تک حنفیہ کا تعلق ہے سو شیخ الاسلامؒ کے بیان کے مطابق میّت کو پہلے سادہ پانی سے دوسری مرتبہ بیری کے جوش دئے ہوئے پانی سے اور تیسری مرتبہ کافور والے پانی سے نہلایا جائیگا۔[1]

---

[1] اس سے معلوم ہوا کہ علامہ نوویؒ نے کافور کے استعمال کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا جو مسلک (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لیکن شیخ ابن ہمامؒ کہتے ہیں کہ اس کو پہلی دو مرتبہ بیری کے پانی سے نہلایا جائے گا کما ہو ظاہر الہدایۃ، اور تیسری مرتبہ کافور ملے ہوئے پانی سے۔ چنانچہ امّ علیہ کی ایک صحیح روایت سے یہی ثابت ہوتا ہے، "عن[1] محمّد بن سیرین أنّه کان یأخذ الغسل من أمّ عطیة، یغسل بالسدر مرّتین و الثالث بالماء والکافور[2]"

فإذا فرغتنّ فآذننی، فلمّا فرغنا آذنّاه، فألقی إلینا حقوه[3]، فقال: أشعرنها[4] إیاه" مراد یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ازار کو برکت کے لئے حضرت زینبؓ کے کفن کے نیچے ان کے جسم سے ملا کر رکھا جائے[5]۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

نقل کیا ہے کہ: "وقال أبو حنیفة: لا یستحب" شرح نووی علی صحیح مسلم۔ ج ۱ ص۳۰۵۔ کتاب الجنائز) وہ درست نہیں۔

نیز اس سے صاحب توضیح کا بھی رد ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں: "وانفرد أبو حنیفة، فقال: لا یستحب الکافور، والسنة قاضیة علیه" چنانچہ علامہ عینیؒ اُن پر رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "قلت: لم یقل أبو حنیفة هذا أصلاً" عمدہ (ج ۸ ص۴۶) باب غسل المیت الخ ۱۲ م

(حاشیہ صفحہ ھٰذا)

[1] سنن ابی داؤد (ج ۲ ص۴۴۹) کتاب الجنائز، باب کیف غسل المیت ۱۲ م

[2] مذکورہ بحث اور اس سے متعلق مزید تفصیل کے لئے دیکھئے أوجز المسالک إلی موطا مالک (ج ۴ ص۱۹۶ تا ۱۹۸) کتاب الجنائز، غسل المیت۔ اور فتح القدیر (ج ۲ ص۷۰) باب الجنائز، فصل فی الغسل ۱۲ مرتب

[3] أی إزاره، والأصل فیه معقد الإزار، وجمعه: أحقٍ و أحقاء، و یسمی به الإزار للمجاورة۔ کذا فی مجمع بحار الأنوار (ج ۱ ص۵۲۹) ۱۲ مرتب

[4] شعار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو آدمی کے بدن سے ملا ہوا ہو، اس کے مقابلے میں وہ کپڑا جو بدن سے ملا ہوا نہ ہو اس کو دثار کہتے ہیں "أشعرن" باب افعال سے امر کا صیغہ ہے "ھا" ضمیر حضرت زینب کی طرف اور "بہ" کی ضمیر "حقو" کی طرف لوٹ رہی ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس ازار کو حضرت زینبؓ کے لئے شعار بنادو ۱۲ مرتب

[5] علامہ عینیؒ اس کے تحت لکھتے ہیں: "هو أصل فی التبرک بآثار الصالحین" عمدہ (ج ۸ ص۴۲) قبیل باب ما یستحب أن یغسل وترا۔ ۱۲ م

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اِزار بطورِ سینہ بند[1] تھا اور سینہ بند کے لئے ضروری نہیں کہ اس کو کفن کے تمام کپڑوں کے نیچے رکھا جائے، بلکہ جہاں چاہیں اس کو رکھا جاسکتا ہے، لیکن حضرت زینبؓ کے حق میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کفن کے تمام کپڑوں سے نیچے رکھنے کا اس لئے حکم دیا تاکہ حضرت زینبؓ کو اس سے برکت حاصل ہوسکے[2]۔

"قالت: وضفرنا شعرها ثلاثة قرون، قال هشيم: و أظنه قال: فألقيناه خلفها" اس سے استدلال کر کے امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام اسحاقؒ فرماتے ہیں کہ میت اگر عورت ہو تو اس کے بالوں کی تین چوٹیاں بنائی جائینگی اور وہ تینوں چوٹیاں پشت کی طرف ڈال دی جائیں گی ان حضرات کے نزدیک حضرت ام عطیہؓ نے جو غسل دیا تھا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور آپ کی تعلیم سے دیا تھا لہٰذا حضرت ام عطیہؓ کا تین چوٹیاں بنا کر تینوں کو پیچھے ڈال دینا بھی لامحالہ آپ کے حکم سے ہوگا۔

حنفیہ کے نزدیک عورت کے بالوں کی دو چوٹیاں بنائی جائینگی اور دونوں کو اس کے سینے کرتہ پر ڈال دیا جائے گا، ایک چوٹی کو دائیں جانب سے اور ایک چوٹی کو بائیں جانب سے[3]۔

جہاں تک حدیثِ باب کا تعلق ہے اس کے بارے میں حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ اس میں کہیں یہ ذکر نہیں ہے کہ تین چوٹیاں بنا کر پیچھے ڈالنے کا حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا، اور یہ کہنا کہ حضرت ام عطیہؓ کا ایسا کرنا آپ کی تعلیم سے تھا یہ محض ایک امکان ہے، والحکم لایثبت بہ[4]۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ام عطیہؓ کے فعل کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یا تقریر پر محمول کرنا تکلف سے خالی نہیں[5] لہٰذا حنفیہ ہی کا مسلک بہتر ہے[6]۔ واللہ اعلم

---

[1] عورت کے کفن کا وہ کپڑا جو لمبائی میں بغل سے رانوں تک یا کم از کم ناف تک ہوتا ہے اور اتنا چوڑا ہوتا ہے کہ بندھ جائے۔ احکامِ میت (ص۱۵۱) "عورت کا کفن" ۱۲ م

[2] دیکھئے الکوکب الدری (ج ۲ ص۱۷۰ و ۱۷۱) ۱۲ م

[3] دیکھئے المغنی لابن قدامہ (ج ۲ ص۴۰۲) مسألۃ: و یضفر شعرها ثلاثة قرون - اور عمدۃ القاری (ج ۸ ص۴۳) باب ما یستحب أن یغسل وترا - ۱۲ م

[4] کما قال العلامۃ العینی فی العمدۃ (ج ۸ ص۴۳) ۱۲ م

[5] جس کا قرینہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کے سلسلہ میں حضرت ام عطیہؓ کو (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

باب ماجاء فی الغسل من غسل الميّت

عن[1] أبی هريرة عن النبی صلی الله عليه وسلم قال: من غسله الغسل ومن حمله الوضوء

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

جو ہدایات دی تھیں ان کا ذکر "اغسلنها وتراً ثلاثاً" الخ میں آگیا ہے، ان میں چوٹیوں کو پشت پر ڈالنے کا کوئی ذکر نہیں اگر آپ نے اس قسم کی کوئی ہدایت دی ہوئی ہوتی تو اس کا یہاں آپ ہی کی نسبت سے ذکر ہوتا۔ ۱۲ مرتب

[6] دیکھئے الکوکب الدرّی (ج ۲ ص ۱۷۱)

زیر بحث مسئلے میں احقر کو حنفیہ کی کوئی مضبوط دلیل تلاش کے باوجود نہ مل سکی، البتہ شمس الائمہ سرخسیؒ لکھتے ہیں: "ولا يسدل شعرها خلف ظهرها، ولكن يسدل من بين ثدييها من الجانبين جميعاً، لأن سدل الشعر خلف ظهرها في حال الحياة كان لمعنى الزينة وقد انقطع ذلك بالوفاة" المبسوط للسرخسی (ج ۲ ص ۵۹) باب غسل الميّت۔ نیز دیکھئے بدائع الصنائع (ج ۱ ص ۳۰۸) فصل وأما كيفية التكفين ــــ میت کے حق میں زینت نہ ہونے ہی کی وجہ سے اس کے بالوں میں کنگھی بھی نہیں کی جاتی چنانچہ حنفیہ اور حنابلہ کا یہی مسلک ہے، جبکہ شافعیہ کے نزدیک اس کے بالوں میں کنگھی کی جائیگی کما فی المغنی (ج ۲ ص ۴۶۴) حنفیہ وحنابلہ کے مسلک کی تائید مصنف عبدالرزاق کی ایک روایت سے ہوتی ہے "عن إبراهيم أن عائشة رأت امرأة يكدون رأسها، فقالت: علام تنصون ميتكم"؟ (ج ۳ ص ۴۳۷، رقم ۶۲۳۲، باب شعر الميت وأظفاره)۔

میت کے حق میں زینت نہ ہونے ہی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ نہ چوٹیاں بنائی جائیں اور نہ ان کو پیچھے ڈالا جائے، چنانچہ "المغنی" میں حنفیہ کا مسلک ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے: "وقال الأوزاعي وأصحاب الرأي: لا يضفر ولكن يرسل مع خديها من بين يديها من الجانبين" (ج ۲ ص ۴۶۴)

لیکن صحیح ابن حبان کی روایت میں صیغۂ امر کے ساتھ "واجعلن لها ثلاثة قرون" کے الفاظ آئے ہیں، عمدہ (ج ۸ ص ۴۳) حنفیہ کا مسلک ان پر منطبق نہیں ہوتا۔

اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: "هذا أمر بالتضفير، ونحن لا ننكر التضفير حتى يكون الحديث حجة علينا وإنما ننكر جعلها خلف ظهرها، لأن هذا التصنيع زينة، والميت ممنوع منها"۔ چنانچہ انہوں نے مسلک عدم تضفیر نہیں بلکہ تضفیر بیان کیا ہے، فرماتے ہیں: "وعندنا يجعل ضفيرتين على صدرها فوق الدرع" عمدہ (ج ۸ ص ۴۳) قبيل باب يبدأ بميامن الميت۔ گویا عورت کے بالوں کے دو حصے جو دائیں بائیں سے اس کے سینے پر ڈالے جاتے ہیں ان کو علامہ عینیؒ نے ضفیرتین سے تعبیر کر دیا لیکن چونکہ ان کی صورت باقاعدہ ضفیرہ کی نہیں ہوتی اس لئے بعض حضرات نے حنفیہ کا مسلک عدم تضفیر کے ساتھ بیان کیا۔

بہرحال اگر حنفیہ کا مسلک علامہ عینیؒ کے بیان کے مطابق تضفیر ہی مانا جائے تب بھی ان کے مسلک میں صرف ضفیرتین ہونگی جبکہ صحیح ابن حبان والی روایت میں تین چوٹیوں کا حکم دیا گیا ہے۔ نیز حضرت ام سلیمؓ کی ایک روایت میں "والوی شعرها ثلاثة أقرن قصة وقرنين" کے الفاظ آئے ہیں، اس روایت کے تحت علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: "رواه الطبراني في الكبير بإسنادين في أحدهما ليث بن سليم وهو مدلس ولكنه ثقة، وفي الآخر جنيد وقد وثق، وفيه بعض كلام" مجمع الزوائد (ج ۳ ص ۲۲) باب تجهيز الميت وغسله۔

یہ دونوں روایات حنفیہ کے مسلک پر منطبق نہیں ہوتیں۔ واللہ اعلم ۱۲ مرتب عفی عنہ

(حاشیہ صفحۂ ہذا)

[1] الحديث أخرجه أبو داؤد في سننه (ج ۲ ص ۴۵۵) باب في الغسل من غسل الميت ۱۲ م

یعنی المیت" حدیثِ باب اور اس جیسی دوسری احادیث کی بنا پر بعض صحابہؓ وتابعینؒ اس کے قائل رہے ہیں کہ میت کو غسل دینے سے غاسل پر غسل واجب ہوجاتا ہے، حضرت علیؓ، حضرت ابوہریرہؓ، سعید بن المسیبؒ، محمد بن سیرینؒ اور زہریؒ کا یہی مسلک ہے۔[۱]

لیکن صدرِ اول کے بعد اس پر اجماع منعقد ہوگیا کہ غسلِ میت سے غسل واجب نہیں ہوتا اور نہ حملِ جنازہ سے وضو واجب ہوتا ہے[۲]، جس کی دلیل بیہقیؒ میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے "قال: قال

---

[۱] مثلاً:

(۱) حضرت عائشہؓ کی روایت "أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: یغتسل من غسل المیت"۔

(۲) عن مکحول قال: "سأل رجل حذیفة کیف أصنع؟ قال: أغسله کیت کیت، فإذا فرغت فاغتسل"۔

(۳) عن علی قال: "من غسل میتاً فلیغتسل"۔

(۴) عن علی قال: "لما مات أبو طالب أتیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فقلت یا رسول اللہ ان عمك الشیخ الضال قد مات، قال: فقال: انطلق فواره، ثم لا تحدثن شیئاً حتی تأتینی، قال: فواریته ثم أتیته، فأمرنی فاغتسلت الخ"۔

تمام روایات کے لئے دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ (ج ۳ ص۲۶۹ و ۲۷۰) من قال علی غاسل المیت غسل، فی المسلم یغسل المشرك یغتسل أم لا۔ ۱۲ مرتب

[۲] عمدۃ القاری (ج ۸ ص۴۸) باب یلقی شعر المرأۃ خلفها ۱۲ م

[۳] چنانچہ علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں: "لا أعلم أحداً من الفقهاء یوجب الاغتسال من غسل المیت ولا الوضوء من حمله" معالم السنن للخطابی بذیل مختصر سنن ابی داؤد للمنذری (ج ۴ ص۳۰۵) باب فی الغسل من غسل المیت۔

لیکن حافظ ابن حجرؒ نے علامہ خطابیؒ پر اس بارے میں رد کیا ہے۔ فتح الباری (ج ۳ ص۱۰۵) باب یلقی شعر المرأۃ خلفها۔

"المجموع شرح المہذب" میں اس بارے میں امام شافعیؒ کے دو قول نقل کئے گئے ہیں، قولِ جدید یہ کہ غسل من غسل المیت سنت ہے، اور قولِ قدیم یہ کہ واجب ہے بشرطیکہ حدیث کی صحت ثابت ہوجائے ورنہ سنت ہے (ج ۵ ص۱۴۲) "ویستحب لمن غسل میتاً أن یغتسل"۔

زرقانیؒ نے اس بارے میں امام مالکؒ کی بھی دو روایتیں نقل کی ہیں، ایک وجوب کی، ایک استحباب کی، استحباب کی روایت کو مذہبِ مشہور قرار دیا گیا ہے۔ اوجز المسالک (ج ۴ ص۲۰۰) غسل المیت۔

علامہ عینیؒ نے امام احمدؒ، امام اسحاقؒ اور ابراہیم نخعیؒ کا مسلک وضوء من غسل المیت بیان کیا ہے۔ عمدہ (ج ۸ ص۴۸) باب یلقی شعر المرأۃ خلفها۔

حنفیہ کے نزدیک غسل من غسل المیت مندوب ہے، للخروج من الخلاف۔ کما فی الدر المختار مع رد المحتار (ج ۱ ص۱۱۴) مطلب یوم عرفة أفضل من یوم الجمعة، کتاب الطهارة ۱۲ مرتب عفی عنہ

[۴] (ج ۱ ص۳۰۶) کتاب الطهارة، باب الغسل من غسل المیت - ۱۲ م

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس علیکم فی غسل میتکم غسل إذا غسلتموہ، إنہ مسلم مؤمن طاھر و إن المسلم لیس بنجس فحسبکم أن تغسلوا ایدیکم» البتہ امام بیہقیؒ اس روایت کو ذکر کرکے فرماتے ہیں: «ھذا ضعیف والحمل فیہ علی أبی شیبة کما أظن»

لیکن حافظ ابن حجرؒ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: «أبو شیبة احتج بہ النسائی ووثقہ الناس...... فالإسناد حسن[۱]»

عدم وجوبِ غسل کی دوسری دلیل مؤطا[۲] امام مالک کی روایت ہے «عن عبد اللہ بن أبی بکر أن أسماء بنت عمیس امرأة أبی بکر الصدیق غسلت ابا بکر الصدیق حین توفی، ثم خرجت فسألت من حضرھا من المهاجرین، فقالت: إنی صائمة، و إن ھذا یوم شدید البرد، فهل علی من غسل؟ فقالوا: لا»

ایک اور دلیل حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے: «قالا لیس علی غاسل المیت غسل[۳]» واللہ أعلم[۴]۔

---

[۱] دیکھئے التلخیص الحبیر (ج ۱ ص ۱۳۸ تحت رقم ۱۸۲) کتاب الطہارة، باب الغسل — حافظؒ کا پورا کلام یہ ہے «قلتُ: أبو شیبة: ھو ابراھیم بن أبی بکر بن أبی شیبة، احتج بہ النسائی، ووثقہ الناس ومن فوقہ احتج بھم البخاری، وأبو العباس الھمدانی ھو ابن عقدة حافظ کبیر، إنما تکلموا فیہ بسبب المذھب ولأمور أخری، ولم یضعفہ بسبب المتون أصلاً، فالإسناد حسن» — ۱۲ م

[۲] (ص۲۴۰) کتاب الجنائز، غسل المیت — ۱۲ م

[۳] مصنف ابن ابی شیبہ (ج ۳ ص ۲۶۸) من قال: لیس علی غاسل المیت غسل — اس مقام پر مصنف ابن ابی شیبہ میں عدمِ غسل من غسل المیت سے متعلق اور بھی روایات مذکور ہیں۔ فراجعہ إن شئت ۱۲ مرتب

[۴] غسل من غسل المیت کے حکم میں کیا حکمت ہے؟ اس بارے میں دو قول ہیں:

ایک یہ کہ میت کی تنظیف اور اس کے غسل میں مبالغہ کرنا مقصود ہے، اس لئے کہ غاسل کو جب یہ علم ہوگا کہ خود اُسے غسل سے فارغ ہوکر غسل کرنا ہے تو وہ میت کو نہلانے میں چھینٹوں وغیرہ سے بچنے کی فکر نہ کریگا بلکہ میت کی تنظیف و غسل میں اہتمام کریگا۔

دوسرے یہ کہ غاسل کو چھینٹے وغیرہ لگ جانے کے شبہ اور وہم سے بچانا مقصود ہے، اس لئے کہ جب غاسل میت کو غسل دینے کے بعد خود غسل کریگا تو اس کو اپنی پاکی اور طہارت کے بارے میں پورا یقین اور اطمینان ہوگا۔ کذا قال الحافظ فی فتح الباری (ج ۳ ص ۱۰۱) باب یلقی شعر المرأة خلفها ۱۲ مرتب

باب ماجاء فی کم کفن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

عن[1] عائشة قالت: کفن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ثلاثة أثواب بیض یمانیة لیس فیها قمیص ولا عمامة » اس روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تین کپڑوں میں کفنانے کا ذکر ہے لیکن طبقات ابن سعد کی ایک روایت میں سات کپڑوں کا ذکر ہے[2] اس طرح تعارض ہوجاتا ہے،

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ طبقات ابن سعد والی روایت ضعیف ہے[3] اور اگر اس کی صحت تسلیم کرلی جائے تب بھی وہ اس پر محمول ہے کہ مختلف حضرات نے آپ کے کفن کے لئے مختلف کپڑے پیش کئے، لیکن حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ان میں سے تین کا انتخاب کرلیا اور باقی واپس کردئے، جیساکہ اسی روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے، راوی کہتے ہیں « فذکروا لعائشة قولهم: « فی ثوبین وبرد حبرة[4] » فقالت: قد أُتی بالبرد، ولکنهم ردوه، ولم یکفنوه فیه ».

---

[1] الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحه (ج ۱ ص۱۶۹) باب الثیاب البیض للکفن - وباب الکفن بغیر قمیص و باب الکفن بلا عمامة و (ج ۱ ص۱۸۶) باب موت یوم الاثنین ــــ ومسلم فی صحیحه (ج ۱ ص۳۰۵ وص۳۰۶) کتاب الجنائز، فصل فی کفن المیت فی ثلاثة أثواب ۱۲ م

[2] روایت اور اس کی سند اس طرح ہے « أخبرنا عفان بن مسلم، أخبرنا حماد بن سلمة عن عبد اللہ بن محمد بن عقیل، عن محمد بن علی ابن الحنفیة، عن أبیه ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کفن فی سبعة أثواب » الطبقات الکبری لابن سعد (ج ۲ ص۲۸۵) ذکر من قال: کفن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ثلاثة أثواب برود الخ ۱۲ م

[3] اس روایت کے پہلے راوی ثقہ ہیں، البتہ ابن المدینیؒ فرماتے ہیں: « کان إذا شك فی حرف من الحدیث ترکه وربما وهم » اور ابن معینؒ فرماتے ہیں: « أنکرناه فی صفر سنة تسع عشرة، ومات بعدها بیسیر » دیکھئے تقریب التہذیب (ج ۲ ص۲۵، رقم ۲۲۶)۔

اس روایت کے دوسرے راوی حماد بن سلمہ بن دینار بھی ثقہ ہیں، لیکن حافظؒ فرماتے ہیں « تغیر حفظه بآخره » تقریب (ج ۱ ص۱۹۷، رقم ۵۴۲)۔

اس روایت کے تیسرے راوی عبد اللہ بن محمد بن عقیل ہیں، ان کے بارے میں حافظؒ لکھتے ہیں: « صدوق، فی حدیثه لین ویقال: تغیر بآخره » تقریب (ج ۱ ص۴۴۷ و۴۴۸، رقم ۶۰۴)۔

چوتھے راوی محمد بن الحنفیہ ہیں جو ثقہ اور جلیل القدر تابعی ہیں۔ تقریب (ج ۲ ص۱۹۲، رقم ۵۴۹ - ۱۲ مرتب

[4] حِبَرَۃ، بروزن عِنَبَۃ، یمنی منقش چادر، حِبَرٌ اور حِبَرَات جمع آتی ہے۔ نہایہ (ج ۱ ص۳۲۸) ۱۲ م

ضرورت کے وقت صرف ایک کپڑے کا کفن بھی کافی ہوجاتا ہے چنانچہ اسی باب میں حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت ہے "أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کفن حمزۃ بن عبدالمطلب فی نمرۃ فی ثوب واحد"[1] بلکہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کے بارے میں آیا ہے کہ ان کو جس ایک کپڑے میں کفن دیا گیا تھا وہ پاؤں تک بھی نہ پہنچ سکا، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے پاؤں پر کپڑے کی جگہ گھاس پھونس رکھی گئی[2]۔

یہ کفنِ ضرورت کا بیان تھا، جہاں تک کفنِ مسنون کا تعلق ہے سو جمہور کے نزدیک مرد کے لئے تین کپڑے مسنون ہیں[3]۔ البتہ امام مالکؒ مرد کے حق میں پانچ تک اور عورت کے حق میں سات تک استحباب کے قائل ہیں[4]، چنانچہ مرد کا کفن ان کے نزدیک تین لفافوں، ایک قمیص اور ایک عمامہ پر مشتمل ہوگا[5]۔

حضرت عائشہؓ کی حدیثِ باب "کفن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ثلاثۃ أثواب بیض یمانیۃ، لیس فیہا قمیص ولا عمامۃ" سے جمہور کا مسلک ثابت ہوتا ہے، لیکن امام مالکؒ اس کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ تین کپڑے قمیص اور عمامہ کے علاوہ تھے اور قمیص اور عمامہ الگ سے تھے، مجموعہ پانچ کپڑے ہوئے[6]، لیکن ظاہر ہے کہ یہ تاویل خلافِ ظاہر ہے۔

---

[1] ھٰذا الحدیث لم یخرجہ من أصحاب الکتب الستۃ سوی الترمذی، کذا قال الشیخ محمد فؤاد عبدالباقی سنن ترمذی (ج ۳ ص۳۲۲، رقم ۹۹۷) ۱۲ م

[2] سنن نسائی میں یہ روایت اس طرح آئی ہے "حدثنا خباب قال: ھاجرنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبتغی وجہ اللہ فوجب أجرنا علی اللہ، فمنا من مات، لم یأکل من أجرہ شیئاً، منھم مصعب بن عمیر، قتل یوم أحد، فلم نجد شیئاً نکفنہ فیہ إلا نمرۃ، کنا إذا غطینا رأسہ خرجت رجلاہ وإذا غطینا بھا رجلیہ خرج رأسہ فأمرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن نغطی بھا رأسہ ونجعل علی رجلیہ إذخراً" الخ (ج ۱ ص۲۶۹) کتاب الجنائز، القمیص فی الکفن ۱۲ مرتب

[3] دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۸ ص۵۰) باب الثیاب البیض للکفن ۱۲ م

[4] الشرح الکبیر للدردیر مع حاشیۃ للدسوقی (ج ۱ ص۴۱۷) فصل ذکر فیہ أحکام الموتی۔ ۱۲ م

[5] یہ ایک قول ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ دو لفافوں، ایک ازار، ایک قمیص اور ایک عمامہ پر مشتمل ہوگا۔ کما فی بلوغ الأمانی من أسرار الفتح الربانی (ج ۸، ص۱۲۸) باب صفۃ الکفن للرجل والمرأۃ ۱۲ مرتب

[6] یہ توجیہ مؤطا امام مالکؒ کے حاشیہ "کشف الغطاء عن وجہ المؤطا" قسطلانی کے حوالہ سے ذکر کی گئی ہے۔ (ص۲۰۵ رقم الحاشیہ ۱۰) ماجاء فی کفن المیت ۱۲ م

تین کپڑوں کی تعیین کے بارے میں اختلاف جمہور کے نزدیک کفنِ مسنون کے لئے تین کا عدد تو متعین ہے البتہ ان تین کپڑوں کی تعیین کے بارے میں اختلاف ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک وہ تین کپڑے تین لفافے ہیں، امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے[1] جبکہ حنفیہ کے نزدیک وہ تین کپڑے یہ ہیں، لفافہ، ازار اور قمیص[2]۔

شافعیہ کا ایک استدلال حضرت عائشہؓ کی حدیثِ باب سے ہے جس میں قمیص کی صراحۃً نفی کی گئی ہے۔ نیز ان کا ایک استدلال سننِ ابن ماجہ[3] میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے ہے "کفن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ثلاث رياط بيض سحولية[4]" اس میں "رِياط" "رَيطة" کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں ایک پاٹ کی بڑی چادر۔

دلائلِ احناف حنفیہ کا استدلال سننِ ابی داؤد[5] میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ہے "قال: كفن رسول الله صلى الله عليه وسلم فی ثلاثة أثواب نجرانية، الحلة ثوبان وقميصه الذی مات فيه"

ہمارا ایک استدلال "الکامل" لابن عدی میں حضرت جابر بن سمرۃؓ کی روایت سے ہے[6] "قال: كفن النبی صلى الله عليه وسلم فی ثلاثة أثواب: قميص وإزار ولفافة"

---

[1] دیکھئے المغنی (ج ۲ ص۴۶۵) الكفن وصفة التكفين ــ البتہ "المهذب" اور اس کی شرح "المجموع" میں امام شافعیؒ کا مسلک "إزار ولفافتين" بیان کیا گیا ہے۔ دیکھئے (ج ۵ ص۱۵۱) باب الکفن ۱۲ مرتب

[2] بدائع الصنائع (ج ۱ ص۳۰۶) فصل وأما كيفية وجوبه ۱۲ م

[3] (ص۱۰۶) باب ما جاء فی کفن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ م

[4] يروى بفتح السين وضمها، فالفتح منسوب إلى السَّحول وهو القصار، لأنه يسحلها أى يغسلها أو إلى "سحول" وهی قرية باليمن، وأما الضم فهو جمع "سُحُل" وهو الثوب الأبيض النقی، ولا يكون إلا من قطن، وفيه شذوذ لأنه نسب إلى الجمع وقيل: اسم القرية بالضم أيضاً" النهاية لابن الأثير (ج ۲ ص۳۴۷) ۱۲ مرتب

[5] (ج ۲ ص۴۴۲) باب فی الکفن ۱۲ م

[6] دیکھئے الکامل (ج ۷ ص۱۵۱) ترجمۃ ناصح بن عبداللہ۔ روایت کی سند اس طرح ہے "حدثنا علی بن أحمد بن مروان، حدثنا يحيى بن داؤد أبو الصقر الوراق، حدثنا عبد الله بن صالح الحضرمی، أخبرنا ناصح عن سماك، عن جابر بن سمرة"۔ حافظ زیلعیؒ لکھتے ہیں "وضعف ناصح بن عبد الله، عن النسائی، ولينه هو، وقال: هو يكتب حديثه" نصب الرایہ (ج ۲ ص۲۶۱) فصل فی التکفین ۱۲ مرتب

یہ دونوں روایتیں اگر چہ ان کی سند پر کلام کیا گیا ہے پھر بھی سنن ابی داؤد کی روایت درجہ حسن سے کم نہیں، اس لئے کہ اسکی یزید بن ابی زیادؒ کی وجہ سے تضعیف کی گئی ہے، لیکن یزید بن ابی زیادؒ کی روایات امام مسلم متابعۃً ذکر کرتے ہیں[1] اور امام ابوداؤدؒ نے ان کی روایت پر سکوت کیا ہے اور شعبہؒ اور بعض دوسرے حضرات نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے[2] اور امام ترمذیؒ نے ان کی روایت کی تحسین کی ہے[3]

ایک اور استدلال مؤطا امام مالکؒ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے اثر سے ہے وہ فرماتے ہیں: "المیت یقمص ویؤزر ویلف بالثوب الثالث، فإن لم یکن إلا ثوب واحد کفن فیہ[4]"

نیز ایک استدلال امام محمدؒ کی کتاب الآثار[5] میں "ابوحنیفۃ عن حماد" کے طریق سے ابراہیم نخعیؒ کی ایک مرسل روایت سے ہے "أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کفن فی حلۃ یمانیۃ وقمیص" یہ مرسل صحیح ہے۔

ایک اور استدلال صحیح بخاری[6] میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے ہے: "أن عبد اللہ بن أبی لما توفی جاء ابنہ إلی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: أعطنی قمیصک أکفنہ فیہ وصل علیہ واستغفر لہ، فأعطاہ قمیصہ" الخ

---

[1] جیسا کہ خود امام مسلمؒ نے اس بات کا ذکر اپنے مقدمہ میں کیا ہے، دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص۵) ۱۲ م

[2] چنانچہ علی بن عاصم کہتے ہیں: "قال لی شعبۃ: ما أبالی إذا کتبت عن یزید بن أبی زیاد أن لا أکتب عن أحد" میزان الاعتدال (ج ۴ ص۴۲۳ رقم ۹۶۹۵)۔

یعقوب بن سفیانؒ کہتے ہیں: "ویزید وإن کانوا یتکلمون فیہ لتغیرہ فھو علی العدالۃ وإن لم یکن مثل الحکم ومنصور" اور ابن شاہین نے انہیں ثقات میں شمار کیا ہے، اور احمد بن صالح مصریؒ کہتے ہیں: "یزید بن أبی زیاد ثقۃ ولا یعجبنی قول من تکلم فیہ" تہذیب التہذیب (ج ۱۱ ص۳۳۰ و ص۳۳۱ رقم ۶۳۰) ۱۲ مرتب

[3] چنانچہ اخرج فی ابواب الحج، باب ما جاء ما یقتل المحرم من الدواب کے تحت حضرت ابوسعیدؓ کی مرفوع روایت "یقتل المحرم السبع العادی" الخ یزید بن ابی زیاد کے طریق سے ذکر کی ہے، اس کے تحت وہ فرماتے ہیں: "قال أبو عیسٰی: ھٰذا حدیث حسن" ترمذی (ج ۱ ص۱۷۱) ۱۲ مرتب

[4] مؤطا امام مالک (ص۲۱۰) ما جاء فی کفن المیت ۱۲ م

[5] (ص۴۶) باب الجنائز وغسل المیت، رقم ۲۲۸ — ۱۲ م

[6] (ج ۱ ص۱۶۹) باب الکفن فی القمیص الذی یکف أو لا یکف الخ ۱۲ م

نیز ہمارا ایک استدلال مستدرک میں عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے وہ فرماتے ہیں:
"إذا أنا مت فاجعلوا في آخر غسلي كافوراً وكفنوني في بردين وقميص، فإن النبي صلى الله عليه وسلم فعل به ذلك"[1] تلخیص المستدرک میں حافظ ذہبیؒ نے اس پر سکوت کیا ہے لہذا یہ کم از کم حسن ضرور ہے۔

جہاں تک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیثِ باب کا تعلق ہے اس میں قمیصِ میت کا نہیں بلکہ قمیصِ معتاد کا انکار مقصود ہے جو احیاء کے ساتھ مخصوص ہے، قمیصِ میت قمیصِ احیاء سے بالکل مختلف ہوتی ہے اس میں نہ آستینیں ہوتی ہیں نہ کلیاں اور نہ وہ سلی ہوئی ہوتی ہے بلکہ وہ گردن سے پاؤں تک کا وہ کپڑا ہے جس کا ایک سرا میت کی پشت پر ہوتا ہے اور دوسرا سرا میت کے سامنے۔ اور بیچ میں سے اس کو گریبان کے برابر چیر دیا جاتا ہے تاکہ گردن میں ڈالا جاسکے، حنفیہ کے مسلک پر تمام روایات میں تطبیق ہوجاتی ہے۔

اکثر کتبِ حنفیہ میں بیان کیا گیا ہے کہ میت کی قمیص میں نہ کلیاں ہوتی ہیں نہ آستینیں[2]، حضرت گنگوہیؒ نے اسکی یہ وجہ بیان کی ہے کہ قمیص میں آستین وغیرہ کی ضرورت زندہ کو ہوتی ہے تاکہ اس کو چلنے پھرنے، اترنے چڑھنے اور دوسری حرکات وسکنات میں کوئی دقت نہ ہو جبکہ میت کو اس طرح کی کوئی حاجت نہیں بلکہ میت کو آستین والی قمیص پہنانا ایک مشکل کام ہے، اس لیے آستین، کلی اور سلائی وغیرہ کے تکلفات کی میت کی قمیص میں کوئی حاجت نہیں۔

لیکن اس پر عبداللہ بن اُبَی کے قصہ سے اشکال ہوسکتا ہے کہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفن کیلئے اپنی قمیص مبارک عطا فرمائی جو لامحالہ آستین وغیرہ پر مشتمل ہوگی۔

حضرت گنگوہیؒ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بحث میت کے لیے قمیص تیار کرنے کے بارے میں ہے سو اس کی قمیص آستین وغیرہ کے تکلفات کے بغیر بنائی جائیں گی کما بیّنا۔ البتہ اگر قمیص پہلے سے تیار شدہ موجود ہو اور برکت وغیرہ کے لئے اس کو پہنانے کی حاجت ہو تو اس کی سلائی ادھیڑ کر آستین وغیرہ کو ختم کرنے کی حاجت نہیں کما فی قصۃ عبداللہ بن اُبَیّ۔[3]

---

[1] اعلاء السنن (ج ۸ ص ۱۹۶) باب کفن الرجل ونوعہ۔ بحوالہ مستدرک (ج ۳ ص ۵۷۸) ۱۲ م

[2] مثلاً دیکھئے فتح القدیر (ج ۲ ص ۷۶) فصل فی التکفین۔ البحر الرائق (ج ۲ ص ۱۸۵) کتاب الجنائز۔ اور ردّ المحتار (ج ۱ ص ۸۰۸) مطلب فی الکفن ۱۲ م

[3] دیکھئے الکوکب الدری (ج ۲ ص ۱۸۴ و ۱۸۵) باب مایستحب من الأکفان ۱۲ م

لیکن علامہ ظفر احمد عثمانیؒ اعلاء السنن[1] میں حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت گنگوہیؒ نے فتویٰ دیا تھا کہ قمیصِ میت قمیصِ حی کی طرح ہوگی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت گنگوہیؒ نے اپنے قول سے رجوع کرلیا تھا کہ قمیصِ میت اور قمیصِ حی میں فرق ہوگا۔

سننِ ابی داؤد میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت "كفن رسول الله صلى الله عليه وسلم .... وقميصه الذى مات فيه[2]" سے اسی قول کی تائید ہوتی ہے کہ قمیصِ میت اور قمیصِ حی میں کوئی فرق نہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے فرمایا: "انظروا ثوبيّ هذين فاغسلوهما ثم كفنوني فيهما، فإن الحي أحوج إلى الجديد منهما[3]"۔

احقر عرض کرتا ہے کہ حنفیہ کا اصل مسلک تو یہی ہے کہ میت کی قمیص میں نہ کلیاں ہوں، نہ آستینیں[4] البتہ روایات کے مجموعہ سے یہ راجح معلوم ہوتا ہے کہ احیاء کی قمیص بھی جائز ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روایت کو اسی پر محمول کیا جائے گا، جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کفن کا تعلق ہے اس میں بھی راجح یہی نظر آتا ہے کہ جس قمیص میں آپ کی وفات ہوئی اس قمیص کو کفن میں شامل کرکے برقرار رکھا گیا[5] "فلعله آثره لقرب عهده بالنبي صلى الله عليه وسلم وهو حي[6]" والله أعلم

---

[1] (ج ۸ صفحہ ۱۹۸) باب كفن الرجل ونوعه ۱۲ م

[2] سنن ابی داؤد (ج ۲ صفحہ ۴۴۹) باب في الكفن ۱۲ م

[3] رواه الإمام أحمد بن حنبل في كتاب الزهد ـ اس روایت کے طرق کی تفصیل کے لئے دیکھئے نصب الرایہ (ج ۲ صفحہ ۲۶۲ و ۲۶۳) فصل في التكفين ۱۲ م

[4] كما في فتح القدير (ج ۲ صفحہ ۹۹، باب الجنائز فصل في تكفينه) بحوالۂ الكافی، نیز دیکھئے البحر الرائق (ج ۲ صفحہ ۱۷۵) كتاب الجنائز ۱۲ م

[5] كما في رواية ابن عباسؓ التي مرّت ۱۲ م

[6] حضرت استاذ محترم دام اقبالہم کی مذکورہ ترجیح کو اختیار کرنے کی صورت میں حضرت عائشہؓ کی روایتِ باب (جس میں لیس فیہا قمیص ولا عمامۃ" کے الفاظ آئے ہیں) کا وہ جواب نہ چل سکے گا جو اصل تقریر میں آیا ہے کہ اس میں اصلِ قمیص کا نہیں قمیصِ معتاد کا انکار مقصود ہے، اس لئے کہ اس ترجیح کا حاصل ہی قمیصِ معتاد کا اثبات ہے۔

اس صورت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کفن میں قمیص کا انکار حضرت عائشہؓ کے اپنے علم کے مطابق ہے لیکن چونکہ تکفین و تدفین کے موقع پر وہ موجود نہ تھیں اسلئے حضرت ابن عباسؓ کی روایت راجح ہے جس میں قمیص کا اثبات ہے والله أعلم وعلمه أتم وأحكم ۱۲ مرتب

باب ماجاء فی الطعام یصنع لأھل المیت

"عن[1] عبد اللہ بن جعفر قال : لما جاء نعی جعفر قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم : اصنعوا لأھل جعفر طعاماً فإنہ قد جاء ما یشغلھم"

اس حدیث کی بناء پر مستحب ہے کہ جس گھر میں موت واقع ہوئی ہو اس کے اقارب یا پڑوسی کھانا پکا کر وہاں بھیجیں تاکہ وہ اپنی مصیبت کے وقت کھانے کی فکر میں مبتلا نہ ہوں۔

لیکن ہمارے زمانے میں اس کے برخلاف یہ رسم چلی ہے کہ میت کے گھر والے اس موقعہ پر رشتہ داروں اور تعزیت کے لئے آنے والوں کے لئے کھانے اور دعوت کا انتظام کرتے ہیں یہ مکروہ اور بدعت ہے اس لئے کہ دعوت سرور کے موقعہ پر ہوتی ہے نہ کہ شرور کے موقعہ پر۔ کما قال العلامۃ ابن عابدین[2]۔

اس کے بدعت ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ہمارے زمانے میں عوام نے میت کے گھر والوں کی جانب سے اس دعوت کو واجبات دینیہ میں سے سمجھ لیا ہے اور التزام مالا یلزم بدعت ہے[3]

---

[1] الحدیث أخرجہ أبوداؤد فی سننہ (ج ۲ ص ۴۴۰) کتاب الجنائز باب صنعۃ الطعام لأھل المیت ۔۔ وابن ماجۃ فی سننہ (ص ۱۱۵) أبواب الجنائز، باب ماجاء فی الطعام یبعث إلی أھل المیت ۱۲ م

[2] فی ردّ المحتار (ج ۱ ص ۶۰۳) مطلب فی کراھۃ الضیافۃ من أھل المیت۔ باب صلاۃ الجنائز۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "ویکرہ اتخاذ الضیافۃ من الطعام من أھل المیت لأنہ شرع فی السرور لا فی الشرور، وھی بدعۃ مستقبحۃ" ۱۲ مرتب

[3] دعوت من اہل المیت کے ممنوع ہونے کی ایک دلیل سنن ابن ماجہ میں حضرت جریر بن عبد اللہ بجلیؓ کی روایت ہے فرماتے ہیں: "کنا نری الاجتماع إلی أھل المیت وصنعۃ الطعام من النیاحۃ" (ص ۱۱۶) باب ما جاء فی النھی عن الاجتماع إلی أھل المیت وصنعۃ الطعام۔

یہ روایت امام احمدؒ نے مسند احمد میں بھی ذکر کی ہے، دیکھئے الفتح الربانی لترتیب مسند الامام احمد بن حنبل الشیبانی (ج ۸ ص ۹۴ و ۹۵، رقم ۱۷۰) باب صنع طعام لأھل المیت۔

علامہ ساعاتی بلوغ الامانی من اسرار الفتح الربانی میں لکھتے ہیں: "ورواہ ابن ماجۃ من طریقین: أحدھما علی شرط البخاری، والثانی علی شرط مسلم" ۱۲ مرتب

بعض اہل بدعت ضیافت من اھل المیت کے اثبات کے لئے مشکوٰۃ میں عاصم بن کلیب کی روایت سے استدلال کرتے ہیں جس میں ایک انصاری صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی میت کی تدفین سے فارغ ہوکر واپس آنے کا قصہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں «فلما رجع استقبله داعی امرأته[1]، فأجاب ونحن معه فجئ بالطعام فوضع يده[2]» الخ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دعوت زوجۂ میت کی جانب سے نہ تھی بلکہ کسی اور عورت کی جانب سے تھی اور ظاہر ہے کہ اس روایت کے نقل کرنے میں مشکوٰۃ کے کسی کاتب سے سہو ہوا ہے اور اس نے اضافت کے ساتھ "داعی امرأته" لکھ دیا، ورنہ اصل روایت "داعی امرأة" بغیر اضافت کے ہے، چنانچہ سنن ابی داوٗد کے تمام نسخوں میں روایت اسی طرح آئی ہے[3]، اور مشکوٰۃ میں یہ روایت سنن ابی داوٗد ہی کے حوالہ سے آئی ہے اس کے علاوہ اگر مشکوٰۃ کی روایت کو صحیح بھی تسلیم کیا جائے[4] تب بھی اس کا یہ جواب ہوسکتا ہے کہ یہ دعوت اگرچہ زوجۃ المیت کی جانب سے تھی لیکن محض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے برکت حاصل کرنے کے لئے تھی نہ کہ اہل میت ہونے کی حیثیت سے۔ واللہ أعلم۔

---

[1] گویا عبارت کا مطلب یہ ہے «استقبله داعی زوجة المیت» ۱۲ م

[2] مشکوٰۃ المصابیح (ج ۳ ص ۱۶۱ و ص ۱۹۲، رقم ۵۹۴۲) کتاب الفضائل والشمائل، باب فی المعجزات، الفصل الثالث ۱۲ م

[3] مثلاً سنن ابی داوٗد (طبع میر محمد کتب خانہ کراچی پاکستان - ج ۲ ص ۱۲۳) کتاب البیوع، باب فی اجتناب الشبہات۔ اور سنن ابی داوٗد (ج ۳ ص ۲۴۴، رقم ۳۳۳۲) بتحقیق الشیخ محمد محی الدین عبد الحمید۔

مسند احمد میں بھی یہ روایت «فلما رجعنا لقينا داعي امرأة من قريش» کے الفاظ کے ساتھ آئی ہے، دیکھئے الفتح الربانی (ج ۱۵ ص ۱۳۶) کتاب الغصب، باب من أخذ شاة فذبحها وشواها۔

سنن دارقطنی کی ایک روایت میں «فلما انصرف تلقاه داعي امرأة من قريش» اور ایک روایت میں «صنعت امرأة من المسلمين من قريش لرسول الله صلى الله عليه وسلم طعاما» کے الفاظ آئے ہیں۔ دیکھئے (ج ۴ ص ۲۸۶ رقم ۵۴-۵۵) باب الصید والذبائح والأطعمة وغیر ذالک ۱۲ مرتب عفی عنہ

[4] اس امکان پر کہ یہ بیہقی دلائل النبوۃ کے الفاظ ہوں اس لئے کہ مشکوٰۃ میں یہ روایت ابو داوٗد اور دلائل النبوۃ دونوں کے حوالے سے آئی ہے، مشکوٰۃ اور ابو داوٗد کی روایات میں الفاظ کا کسی قدر فرق اس امکان کی تائید کرتا ہے۔

واللہ اعلم ۱۲ مرتب

باب ماجاء فی کراھیة النّوح

عن علیؓ بن ربیعة الأسدی قال: مات رجل من الأنصار یقال له: قرظة بن کعب فنیح علیه، فجاء المغیرة بن شعبة، فصعد المنبر فحمد الله وأثنی علیه، وقال: مابال النّوح فی الاسلام! أما إنی سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: من نیح علیه عُذّب مانیح علیه[1]۔ مطلب یہ کہ میت کو اس کے گھر والوں کے نوحہ کرنے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے جب تک کہ وہ نوحہ کرتے رہتے ہیں۔

یہاں دو مسئلے ہیں:۔

پہلا مسئلہ بکاء علی المیت سے متعلق ہے، اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ بکاءِ خفیف جائز ہے اور بکاءِ شدید جو نوحہ کی حد تک پہنچ جائے جائز نہیں، بکاءِ شدید اور بکاءِ خفیف میں فرق مشکل ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ بکاءِ خفیف وہ ہے جو بغیر آواز کے ہو اور بکاءِ شدید وہ ہے جو آواز کے ساتھ ہو[2]۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بکاء بالصوت بھی متعدد روایات سے ثابت ہے[3] لہٰذا یوں کہا جائے گا کہ مطلقاً بکاء بالصوت بھی ممنوع نہیں بلکہ وہ بکاء بالصوت ممنوع ہے جو نوحہ کی حد تک پہنچ جائے یعنی زور زور سے رو یا دھویا جائے اور چیخ و پکار کیجائے یا میت کے مبالغہ آمیز فضائل گنائے جائیں، اور

---

[1] الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحه (ج ۱ ص ۱۷۲) باب مایکره من النیاحة علی المیت ۔ و مسلم فی صحیحه (ج ۱ ص ۳۰۳) فصل إن المیت لایعذّب ببکاء أهله الخ ۱۲ م

[2] هذا حاصل ما أفاده النووی رحمه الله فی شرحه علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۰۲) کتاب الجنائز۔ مذکورہ تشریح کی تائید صحیح بخاری میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت سے بھی ہوتی ہے، جس میں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت سعید بن عبادہؓ کی عیادت کے لئے آنے کا واقعہ ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: «فلمّا دخل علیه فوجده فی غاشیة أهله، فقال: قد قضی؟ قالوا: لا یارسول الله، فبکی النبی صلی الله علیه وسلم، فلمّا رأی القوم بکاء النبی صلی الله علیه وسلم بکوا، فقال: ألا تسمعون، إن الله لا یعذّب بدمع العین ولا بحزن القلب ولکن یعذب بهذا ۔ وأشار إلی لسانه ۔ الخ» (ج ۱ ص ۱۷۴) باب البکاء عند المریض ۱۲ م

[3] مثلاً مسند احمد میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے «فلمّا ماتت زینب (وفی روایة رقیة) ابنة رسول الله صلی الله علیه وسلم قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: الحقی بسلفنا الصالح الخیر عثمان بن مظعون، فبکت

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تقدیر خداوندی کی تغلیط اور اس کا تخطیہ کیا جاتے نیز دوسرے لوگوں کو رونے دھونے کی دعوت دی جائے[1]۔
واللہ أعلم ۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا میت کو اس کے اہل کے اس پر رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے؟
سو بعض حضراتِ صحابہؓ اس کے قائل ہیں، چنانچہ حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت مغیرہؓ کا یہی مسلک ہے[2]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

النساء ، فجعل عمر یضربهن بسوطه ، فأخذ رسول الله صلى الله عليه وسلم بيده ، فقال : مهلاً يا عمر ، ثم قال : أبكين وإياكن ونعيق الشيطان » الخ الفتح الربانی (ج ۷ ، ص ۱۳۰ ، رقم ۹۱) باب الرخصة بالبكاء من غير نوح۔

اس روایت کے تحت علامہ ساعاتیؒ لکھتے ہیں : « الظاهر أن بكاءهن كان بصوت لكن لا برفعه ، فنهاهن عمر حتى لا يجر إلى النياحة فأمره صلى الله عليه وسلم بتركهن » الخ۔

نیز عبداللہ بن یزیدؓ کی روایت ہے ، فرماتے ہیں : « رخص في البكاء من غير نوح » رواه الطبراني في الكبير و إسناده حسن ۔

نیز قرظہ بن کعبؓ اور ابو مسعود انصاریؓ سے مروی ہے « رخص لنا في البكاء عند المصيبة من غير نوح » رواه الطبراني في الكبير ، ورجاله رجال الصحيح ۔ دیکھئے مجمع الزوائد (ج ۳ ص ۱۷) کتاب الجنائز ، باب ماجاء في البكاء ۱۲ مرتب عفی عنہ

(حاشیہ صفحہ ھٰذا)

[1] جیسا کہ نوحہ میں ایسا ہی کیا جاتا ہے ۔ چنانچہ علامہ نوویؒ « إن الميت ليعذب ببكاء أهله » کی تشریح کے تحت لکھتے ہیں : « وقالت طائفة : معنى الأحاديث أنهم ينوحون على الميت ويندبونه بتعديد شمائله ومحاسنه في زعمهم ، وتلك الشمائل قبائح في الشرع يعذب بها » الخ ۔ شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۰۲) کتاب الجنائز ۱۲ م

[2] المغني لابن قدامة (ج ۲ ص ۵۴۵) تعذيب الميت ببكاء أهله عليه ۔

چنانچہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں : « فلما أصيب عمر (يعني بالجراحة التي مات فيها) دخل صهيب يبكي يقول : وا أخاه ! واصاحباه ! فقال له عمر : يا صهيب ، أتبكي علي ؟ وقد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : إن الميت يعذب ببعض بكاء أهله عليه » صحیح بخاری (ج ۱ ص ۱۷۲) باب قول النبي صلى الله عليه وسلم يعذب الميت ببعض بكاء أهله عليه ۔

نیز ابو عمرؒ کہتے ہیں : « سمعت ابن عمر يقول ـ وهو في جنازة رافع بن خديج ، وقام النساء يبكين على رافع ، فأجلسهن مراراً ، ثم قال لهن : ويحكن ! إن رافع بن خديج شيخ كبير لا طاقة له بالعذاب ، وإن الميت يعذب ببكاء أهله عليه » مصنف عبدالرزاق (ج ۳ ص ۵۵۵ ، رقم ۶۶۷۸) باب الصبر والبكاء والنياحة ، کتاب الجنائز ۔
حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا قصہ ترمذی کی روایتِ باب میں آگیا ہے ۱۲ مرتب

جبکہ حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کا مسلک یہ ہے کہ بکاءِ اہل سے میت کو عذاب نہیں ہوتا۔[1]

قائلینِ تعذیب کا استدلال حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی مرفوع روایت "إن المیت لیعذب ببکاء أھله علیه"[2] سے ہے۔

منکرینِ تعذیبِ میت ببکاء اھله کا استدلال "وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰی"[3] سے ہے، چنانچہ حضرت عائشہؓ نے اسی سے استدلال کیا ہے۔[4]

جہاں تک حضرت ابن عمرؓ کی روایت کا تعلق ہے اس کے بارے میں حضرت عائشہؓ لگے سے پیوستہ باب میں فرماتی ہیں: "یرحمه اللہ، لم یکذب ولکنه وھم، إنما قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لرجل مات یھودیا إن المیت لیعذب، وإن أھله لیبکون علیه"۔

لیکن حضرت ابن عمرؓ کی طرف وہم کی نسبت کرنا محلِ نظر ہے۔[5] اس لئے کہ اس مضمون کی روایات متعدد صحابہ کرامؓ سے جزم کے ساتھ مروی ہیں[6] لہذا صحیح یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث ثابت ہے اور اس میں کسی قسم کا وہم نہیں البتہ وہ بعض مخصوص احوال پر محمول ہے:-

---

[1] حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے مسلک کے لئے دیکھئے صحیح بخاری (ج ۱ صـ۱۷۲) باب قول النبی صلی اللہ علیه وسلم: یعذب المیت۔ اور حضرت ابوہریرہؓ کے مسلک کے لئے دیکھئے فتح الباری (ج ۳ صـ۱۲۲) باب قول النبی صلی اللہ علیه وسلم یعذب المیت الخ ۱۲م

[2] بخاری (ج ۱ صـ۱۷۱) ۱۲م

[3] سورۂ فاطر آیت ۱۸ پ ۲۲ ۱۲م

[4] نیز حضرت ابن عباسؓ نے عدمِ تعذیب کی تائید میں فرمایا "واللہ ھو أضحك وأبکی" دونوں دلائل کے لئے دیکھئے صحیح بخاری (ج ۱ صـ۱۷۲) ۱۲م

[5] چنانچہ علامہ ساعاتیؒ نقل کرتے ہیں: "قال القرطبي: إنکار عائشة ذلك وحکمها علی الراوي بالتخطئة والنسیان أو علی أنه سمع بعضا أو لم یسمع بعضا: بعید، لأن الرواة لھذا المعنی من الصحابة کثیرون وھم جازمون، فلا وجه للنفي مع إمکان حمله علی محمل صحیح" دیکھئے بلوغ الامانی من اسرار الفتح الربانی (ج ۸ صـ۷۲ تحت شرح حدیث رقم ۹۳) باب ماجاء في أن المیت یعذب الخ ۱۲ مرتب

[6] مثلاً محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں: "ذُکر عند عمران بن الحصین أن المیت یعذب ببکاء الحي، فقال عمران: قاله رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم" سنن نسائی (ج ۱ صـ۲۶۲) النھي عن البکاء علی المیت۔

حضرت سمرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: "قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: المیت یعذب ببکاء الحي" (قال الھیثمي) رواہ الطبراني في الکبیر وفیه عمر بن إبراھیم الأنصاري، وفیه کلام، وھو ثقة۔ مجمع الزوائد (ج ۳ صـ۱۵) باب ماجاء في البکاء۔

حضرت عمرؓ اور حضرت مغیرہؓ کی روایات پیچھے گذر چکی ہیں۔

کتبِ حدیث میں اس مضمون کی اور بھی روایات متعدد صحابہ کرامؓ سے مروی ہیں۔ فلیراجع ۱۲ مرتب

ایک یہ کہ تعذیب میت ببکاء اہلہ جب ہے جبکہ اس نے اپنے گھر والوں اور اقرباء کو وصیت کی ہو کہ میرے مرنے کے بعد میرے اوپر خوب رویا دھویا جائے اور نوحہ کیا جائے چنانچہ عرب میں اس کا رواج تھا کہ وہ مرنے سے پہلے بکاء اور نوحہ کی وصیت کر جاتے تھے اور اس نوحہ کو اپنے لئے قابلِ فخر سمجھتے تھے، مشہور شاعر طرفہ بن العبد کہتا ہے ؎

فإن مت فانعيني بما أنا أهله ۔۔۔ وشقي علی الجيب يا ابنة معبد[۱]

دوسرے یہ کہ تعذیبِ میت والی روایت اُس صورت پر محمول ہے جبکہ میت ترکِ نوحہ کی وصیت نہ کرے۔

تعذیبِ میت والی روایت کا ایک مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نوحہ کرنے والیاں اپنے نوحہ میں مدح کے طور پر میت کے جن افعال کا ذکر کرتی ہیں بسا اوقات وہ افعال ایسے بُرے ہوتے ہیں کہ ان کا مرتکب ہونے کی وجہ سے میت کو عذاب دیا جا رہا ہوتا ہے[۲]۔

ایک مطلب یہ ہے کہ نوحہ کرنے والیاں جب کہتی ہیں : "واجبلاہ ! واسیداہ !" تو فرشتے اس کے سینے پر ہاتھ مار کر کہتے ہیں : "أهكذا كنت[۳] ؟"۔

---

[۱] السبع المعلقات (ص۳۴) المعلقة الثانية ۔ شعر کا ترجمہ اس طرح ہے :
جب میں مر جاؤں تو اے معبد کی بیٹی (شاعر کی بھتیجی) تو میری موت کی خبر اس اہتمام سے لوگوں کو سُنانا جس کا میں اہل ہوں، اور میرے اوپر (بطورِ سوگ) گریبان چاک کرنا ۱۲ مرتب

[۲] چنانچہ اہلِ عرب کا طریقہ تھا کہ وہ اپنے نوحوں میں کہتے تھے : "یا مرمل، و مؤتم الولدان، و مخرب العمران، و مفرق الأخدان" یعنی اے عورتوں کو بیوہ کرنے والے ! اے بچوں کو یتیم کرنے والے ! اے آبادیوں کو برباد و ویران کرنے والے ! اے دوستوں کو جدا کرنے والے !۔ کما فی شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۳۰۲) کتاب الجنائز ۱۲ مرتب

[۳] جیسا کہ اگلے باب میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت آ رہی ہے "أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال : ما من میت یموت، فیقوم باکیه، فیقول : واجبلاہ ! واسیداہ ! أو نحو ذلك إلا وكل به ملكان يلهزانه (اللهز : الدفع في الصدر بجميع الكف) ويقولان : أهكذا كنت ؟"۔
مسندِ احمد میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کی ایک روایت اس طرح آئی ہے : "أن النبي صلی الله علیه وسلم قال : الميت يعذب ببكاء الحي عليه إذا قالت النائحة : واعضداه ! واناصراه ! واكاسياه ! جبذ الميت و قيل له : أنت عضدها ؟ أنت ناصرها ؟ أنت كاسيها ؟" دیکھئے الفتح الربانی (ج ۷ ص۱۲۵ رقم ۹۳) باب ما جاء في أن الميت يعذب ببكاء أهله عليه ۔
حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی تعذیبِ میت والی روایت کی توجیہات کے لئے دیکھئے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۳۰۲) کتاب الجنائز ۔ اور بلوغ الامانی من اسرار الفتح الربانی (ج ۷ ص۱۲۶ تا ص۱۲۵، تحت شرح حدیث رقم ۹۳) ۱۲ مرتب عفی عنہ

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی تعذیبِ میت والی روایت میں مذکورہ تمام امکانات نکل سکتے ہیں اور "لَاتَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" پر عمل کرنے کے لئے ان توجیہات میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا بہرحال ضروری ہے۔ واللہ اعلم۔

"عن[1] أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أربع في أمتي من أمر الجاهلية لن يدعهن الناس" مطلب یہ کہ یہ وہ امور ہیں جو بالکلیہ کبھی متروک نہ ہوں گے کہ کوئی ان کا مرتکب نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی ان کا اعتقاد رکھنے والا اور کرنے والا[2] ضرور ہوگا۔ "النياحة، والطعن في الأحساب[3]، والعدوى[4] أجرب[5] بعير فأجرب مائة بعير، من أجرب البعير الأول، والأنواء[6]، مطرنا بنوء كذا وكذا" حضرت

---

[1] الحديث لم يخرجه من أصحاب الكتب الستة سوى الترمذي. قاله الشيخ محمد فؤاد عبد الباقي، سنن ترمذی (ج ۳ ص۳۲۵، رقم ۱۰۰۱) ۱۲ م

[2] کما فی الکوکب الدری (ج ۲ ص۱۰۱) ۱۲ م

[3] أحساب: حسب کی جمع ہے، یعنی نسب، یہاں طعن فی الحسب سے مراد طعن فی النسب ہے چنانچہ مسند احمد میں حضرت ابوہریرہؓ کی ایک مرفوع روایت میں آیا ہے: "شعبتان من أمر الجاهلية لا يتركهما الناس أبدًا: النياحة والطعن في النسب" الفتح الربانی (ج ۸، ص۱۱۳، رقم ۹۵) باب ما لا يجوز من البكاء على الميت ـ مطلب یہ کہ غیر باپ کی طرف نسبت کیجائیگی ۱۲ مرتب

[4] عدوی: إعداء کا اسم ہے اور اس سے مرض کا متعدی ہونا مراد ہے ۱۲ م

[5] أجرب البعير: اونٹ کا خارش زدہ ہونا ۱۲ م

[6] أنواء: نوء بفتح النون وسکون الواو ـ کی جمع ہے۔ ابو عبیدؒ کہتے ہیں: انواء اٹھائیس مخصوص ستارے ہیں جو معروف مطالع سے سال بھر میں باری باری طلوع ہوتے ہیں، ہر تیرہ راتیں گذرنے پر ان میں سے ایک ستارہ صبح صادق کے وقت مغرب میں غروب ہوجاتا ہے، ٹھیک اسی وقت مشرق میں اس کے مقابلہ میں دوسرا ستارہ طلوع ہوتا ہے، تیرہ راتوں بعد یہ ستارہ بھی غروب ہوجاتا ہے اور دوسرا ستارہ نکل آتا ہے۔ و إنما سمّي نوءًا لأنه إذا سقط الساقط ناء الطالع، و ذلك النهوض هو النوء، سال کے پورے ہونے پر یہ اٹھائیس کے اٹھائیس ستارے طلوع ہوکر غروب ہوجاتے ہیں۔

جاہلیت میں اہلِ عرب یہ سمجھتے تھے کہ جب بھی ان اٹھائیس ستاروں میں سے کوئی ایک ستارہ غروب ہوکر طلوع ہوگا اس وقت ضرور بارش ہوگی یا ہوا چلے گی، پھر جب بارش ہوجاتی تو کہتے تھے "مُطرنا بنوء كذا" یعنی بارش ستارے کے طلوع ہونے کی وجہ سے ہوئی گویا اس کا طلوع ہونا ہی مؤثر ہے۔ دیکھئے بلوغ الامانی من اسرار الفتح الربانی (ج ۶ ص۲۵۲، ۲۵۳) أبواب صلوٰۃ الاستسقاء، باب الاعتقاد أن المطر بيد الله الخ ۱۲ مرتب

گنگوہی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ عدویٰ کی تردید کا یہ مطلب نہیں کہ یہ مانا جائے کہ تعدیۂ امراض سبب کے درجہ میں بھی متحقق نہیں ہوتا[1] بلکہ دراصل تعدیہ کے سلسلہ میں اہلِ عرب کا اعتقاد فاسد تھا، بعض لوگ اسے مؤثر بنفسہٖ سمجھتے تھے، بعض کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو تاثیر دیکر خود معاذ اللہ معطل ہوگیا ہے، بعض سمجھتے تھے کہ ان چیزوں کو تاثیر تو اللہ تعالیٰ نے ہی دی ہے لیکن اب تاثیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتی بلکہ ان ہی اشیاء کی طرف سے ہوتی ہے اور بعض کا کہنا تھا کہ مؤثر تو اللہ تعالیٰ ہی ہیں لیکن عدویٰ سے مرض متخلف نہیں ہو سکتا۔

مذکورہ اعتقاداتِ فاسدہ کی بناء پر عدویٰ کی تردید کی گئی ہے ورنہ سبب کے درجہ میں اُسے ماننا ممنوع نہیں، چنانچہ جمہور کا یہی مسلک ہے[2] واللہ أعلم۔

باب ماجاء في المشي أمام الجنازة

عن سالم عن أبيه[3] قال: رأيت النبي صلى الله عليه وسلم وأبا بكر وعمر يمشون أمام الجنازة "جنازہ کے آگے پیچھے، دائیں بائیں ہر طرف چلنا بالاتفاق جائز ہے، البتہ افضلیت میں اختلاف ہے[4]۔

ایک قول یہ ہے کہ کسی بھی جانب کی مشی کو دوسری جانب کی مشی پر کوئی فضیلت نہیں، سفیانِ ثوریؒ کا یہی قول ہے، امام بخاریؒ کا بھی اسی طرف میلان ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ پیدل چلنے والے کے لیے جنازے کے آگے چلنا اور سوار کے لئے جنازہ کے پیچھے چلنا افضل ہے، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا یہی مسلک ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ مطلقاً جنازہ کے آگے چلنا افضل ہے، امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ مطلقاً جنازہ کے پیچھے چلنا افضل ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، ان کے اصحابؒ اور امام اوزاعیؒ کا یہی مسلک ہے[5]۔

---

[1] گویا حضرت گنگوہیؒ یہ بیان فرمانا چاہتے ہیں کہ تعدیۂ امراض سبب کے درجہ میں پایا جا سکتا ہے اور سبب اور مسبب کے درمیان تلازم نہیں بلکہ ان میں تخلف ہو جاتا ہے، البتہ بعض اہلِ ظاہر کا یہ مسلک ہے کہ تعدیۂ امراض سبب کے درجہ میں بھی نہیں پایا جاتا، لیکن یہ درست نہیں۔ دیکھئے الکوکب (ج ۲ ص ۱۷۷) ۱۲ م

[2] مذکورہ تفصیل کے لئے دیکھئے الکوکب الدری (ج ۲ ص ۱۷۷) ۱۲ م

[3] الحديث أخرجه ابن ماجة في سننه (ص ۱۰۷) أبواب الجنائز، باب ما جاء في المشي أمام الجنازه ۱۲ م

[4] اس اختلاف سے متعلق آگے آنے والی تفصیل کے لئے دیکھئے اوجز المسالک (ج ۴ ص ۲۰۸) المشي أمام الجنازة ۱۲ م

[5] وذهب إبراهيم النخعي وسفيان الثوري والأوزاعي وسويد بن غفلة ومسروق وأبو قلابة وأبو حنيفة وأبو يوسف ومحمد وإسحٰق وأهل الظاهر إلى أن المشي خلف الجنازة أفضل، ويروى ذلك عن علي بن أبي طالب و عبد الله بن مسعود وأبي الدرداء وأبي أمامة، وعمرو بن العاص ـ عمدة القاري (ج ۸ ص ۱۱۵) باب الأمر باتباع الجنائز ۱۲ مرتب

حدیثِ باب امام شافعیؒ کی دلیل ہے، جبکہ مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک یہ ماشیاً کی صورت پر بھی محمول ہوسکتی ہے اور بیانِ جواز پر بھی، جہاں تک حنفیہ کا تعلق ہے سو ان کی طرف سے ایک جواب تو یہی ہے کہ یہ بیانِ جواز پر محمول ہے، نیز اس روایت کے موصول یا مرسل ہونے میں اختلاف ہے اور محدثینؒ کے نزدیک أصح یہ ہے کہ یہ مرسل[1] ہے۔ اور مرسل شافعیہ کے نزدیک حجت نہیں۔

مالکیہ اور حنابلہ کا استدلال ماشی کے حق میں تو حدیثِ باب ہی سے ہے اور راکب کے بارے میں ان کا استدلال حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت سے ہے: «أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: الراکب خلف الجنازۃ والماشی حیث یشاء منہا[2]»۔

---

[1] جس کی تفصیل یہ ہے کہ امام ترمذیؒ نے اسے موصولاً بھی روایت کیا ہے اور مرسلاً بھی۔ وصل کے ساتھ ایک روایت «سفیان بن عیینۃ عن الزہری عن سالم عن أبیہ قال: رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم» کے طریق سے آئی ہے، وصل کے ساتھ دوسری روایت «محمد بن بکر، حدثنا یونس عن یزید عن ابن شہاب عن أنس، أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم» کے طریق سے آئی ہے۔

جہاں تک پہلے طریق کا تعلق ہے اس میں بھی راجح یہی ہے کہ یہ مرسل ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن المبارکؒ فرماتے ہیں: «الحفاظ عن الزہری ثلاثۃ: مالک ومعمر وابن عیینۃ، فاذا اجتمع اثنان منہم علی قول أخذنا بہ وترکنا قول الآخر» (کما فی نصب الرایۃ ج ۲ ص ۲۹۴ - فصل فی حمل الجنازۃ) اور زیر بحث روایت بھی زہریؒ سے مذکورہ تینوں حفاظ نے نقل کی ہے، ان میں سے ابن عیینہؒ نے اگرچہ اس روایت کو موصولاً ذکر کیا ہے لیکن امام مالکؒ اور معمرؒ نے زہریؒ سے اس روایت کو مرسلاً ہی نقل کیا ہے کما صرح بہ الترمذی فی الباب، نیز وہ فرماتے ہیں: «وأہل الحدیث کلہم یرون أن الحدیث المرسل فی ذلک أصح»۔

جہاں تک وصل والے دوسرے طریق کا تعلق ہے اس کے بارے میں امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: «سألت محمداً عن ہذا الحدیث فقال: ہذا حدیث خطأ، أخطأ فیہ محمد بن بکر، وإنما یروی ہذا الحدیث عن یونس عن الزہری أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الخ» ۱۲ مرتب

[2] اللفظ للترمذی فی سننہ (ج ۱ ص ۱۵۵) باب فی الصلاۃ علی الأطفال۔ نیز دیکھئے سنن نسائی (ج ۱ ص ۲۷۵) کتاب الجنائز، مکان الراکب من الجنازۃ - اور - مکان الماشی من الجنازۃ - اور سنن ابن ماجہ (ص ۱۰۶) أبواب الجنائز، باب ما جاء فی شہود الجنائز۔

سنن ابی داؤد میں یہ روایت اس طرح آئی ہے «الراکب یسیر خلف الجنازۃ والماشی یمشی خلفہا وأمامہا وعن یمینہا وعن یسارہا قریب منہا» (ج ۲ ص ۴۵۳) باب المشی أمام الجنازۃ ۱۲ مرتب

اس کے جواب میں حضرت تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ افضل تو راکب و ماشی دونوں ہی کے لئے پیچھے چلنا ہے لیکن اس روایت سے راکب کے حق میں مزید تاکید مقصود ہے اس لئے کہ وہ رکوب کی وجہ سے جو ایک طرح کے سوء ادب میں مبتلا ہوا ہے[1] پیچھے چلنے کے ادب کی وجہ سے اس کی ایک درجہ میں تلافی ہو جائے گی، یہی وجہ ہے کہ حنفیہ میں سے اسبیجابیؒ کا کہنا یہ ہے کہ راکب کا جنازہ سے آگے بڑھ جانا مکروہ ہے[2] جبکہ ماشی کے حق میں یہ مکروہ نہیں ہے[3]۔

دلائل احناف | حنفیہ کے دلائل درج ذیل ہیں :-

(۱) حنفیہ کا ایک استدلال ان تمام روایات سے ہے جن میں "اتباع الجنائز" کا حکم دیا گیا ہے[4]۔ مثلاً بخاری شریف میں حضرت براء بن عازبؓ کی روایت "أمرنا النبي صلى الله عليه وسلم بسبع ونهانا عن سبع أمرنا باتباع الجنائز الخ"[5]۔

(۲) اگلے باب میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت آرہی ہے "سألنا رسول الله صلى الله عليه وسلم عن المشي خلف الجنازة، قال: ما دون الخبب" الخ۔

اس روایت پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں ابو ماجدؒ مجہول ہیں[6]۔ لیکن حضرت گنگوہی قدس سرہ فرماتے

---

[1] جنازہ کے ساتھ رکوب کا سوء ادب ہونا ترمذی ہی میں حضرت ثوبانؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں: "خرجنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم في جنازة، فرأى ناسا ركبانا، فقال: ألا تستحيون؟ إن ملائكة الله على أقدامهم وأنتم على ظهور الدواب" (ج ۱ ص ۱۵۲) باب ما جاء في كراهية الركوب خلف الجنازة ۱۲ مرتب

[2] دیکھئے البحر الرائق (ج ۲ ص ۱۹۱) فصل السلطان أحق بصلاته الخ ۱۲ م

[3] حضرت تھانوی قدس سرہ کے مذکورہ جواب کے لئے دیکھئے اعلاء السنن (ج ۸ ص ۲۴۳) باب المشي خلف الجنازة والإسراع بها۔

علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں: "فالظاهر من الحديث أن الأصل في اتباع الجنازة أن يكون خلفها لكن الماشي لحاجة الحمل يتوجه إلى جهات أخر أيضا بخلاف الراكب، فبقي حكمه على الأصل، وجوّز للماشي الجهات كلها والله أعلم" اعلاء السنن (ج ۸ ص ۲۴۳ و ص ۲۴۴) ۱۲ مرتب

[4] اس قسم کی روایات کے لئے دیکھئے مجمع الزوائد ج ۳ ص ۲۹ تا ۳۱) باب اتباع الجنازة والمشي معها والصلاة عليها۔ اس باب میں حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابو سعیدؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت انسؓ سے اس مضمون کی روایات مروی ہیں ۱۲ مرتب

[5] صحیح بخاری (ج ۱ ص ۱۶۶) باب الأمر باتباع الجنائز ۱۲ م

[6] چنانچہ حافظؒ لکھتے ہیں: "قيل اسمه عائذ بن نضلة، لم يرو عنه غير يحيى الجابر، من الثالثة۔ أخرج له أبو داود والترمذي وابن ماجة" تقریب (ج ۲ ص ۴۶۱ رقم ۱۵) ۱۲ م

ہیں کہ ابو ماجدؒ رواۃ کے طبقۂ ثانیہ یعنی کبارِ تابعین سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سے روایت نقل کرنے والے یحییٰ امام بنی تیم اللہ ہیں جو امام ترمذیؒ کی تصریح کے مطابق ثقہ ہیں، وقلة الرواية عنه لايقدح فيه۔ لہٰذا ان کی روایت کو رد نہیں کیا جاسکتا[1]، نیز دوسری روایات سے بھی اس روایت کی تائید ہوتی ہے۔

③ طحاوی میں عمرو بن حریثؒ کی روایت ہے، فرماتے ہیں: "قلتُ لعلي بن أبي طالب: ما تقول في المشي أمام الجنازة؟ فقال علي بن أبي طالب: المشي خلفها أفضل من المشي أمامها كفضل المكتوبة على التطوع، قال: قلتُ: إني رأيتُ أبا بكر وعمر يمشيان أمامها، فقال: إنما يكرهان أن يحرجا الناس"۔

طحاوی ہی میں أبزیٰ کی روایت ہے، فرماتے ہیں: "كنتُ أمشي في جنازة فيها أبو بكر وعمر وعلي، فكان أبو بكر وعمر يمشيان أمامها، وعلي يمشي خلفها، يدي في يده، فقال علي: أما إن فضل الرجل يمشي خلف الجنازة على الذي يمشي أمامها كفضل صلاة الجماعة على صلاة الفذ، وإنهما ليعلمان من ذلك مثل الذي أعلم، ولكنهما سهلان يسهلان على الناس"۔

④ نافعؒ بیان کرتے ہیں: "خرج عبد الله بن عمر وأنا معه على جنازة، فرأى معها نساء، فوقف، ثم قال: ردهن فإنهن فتنة الحي والميت، ثم مضى يمشي خلفها، فقلتُ: يا أبا عبد الرحمن، كيف المشي في الجنازة: أمامها أم خلفها؟ فقال: أما تراني أمشي خلفها"[2]۔

---

[1] الکوکب الدری (ج ۲ ص ۱۸۱) لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کے جواب سے ابو ماجدؒ کی جہالت تو دور نہیں ہوتی اس لئے کہ جہالت کے دور ہونے کے لئے دو معروف راویوں کا اس سے روایت کرنا ضروری ہے جو یہاں موجود نہیں۔ کما في التقريب للنووي مع تدريب الراوي (ج ۱ ص ۳۱۶) النوع الثالث والعشرون۔

غالباً حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا جواب اس ضابطہ کی بنیاد پر ہے کہ قرونِ ثلاثہ میں راوی کی جہالت مضر نہیں، کما في "قواعد في علوم الحديث" مقدمة "إعلاء السنن" (ص ۲۰۶ طبعة بيروت) و (ص ۱۲۷، طبعة إدارة القرآن كراتشي) یا اس قول کی بنا پر ہے کہ راوی مجہول سے جب ایک ثقہ روایت کرے تو اس کی جہالت مرتفع ہو جاتی ہے۔ کما في تدريب الراوي (ج ۱ ص ۳۱۶) والله أعلم ۱۲ مرتب

[2] مؤخر الذکر تینوں روایات کے لئے دیکھئے طحاوی (ج ۱ ص ۲۳۳) باب المشي مع الجنازة أين ينبغي أن يكون منها ۱۲ م

⑤ مصنفِ عبدالرزاق میں طاؤسؒ سے مرسلاً مروی ہے: "ما مشی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی جنازۃ حتی مات إلا خلف الجنازۃ"[1] حضرت ابن عمرؓ کی روایتِ باب مشی امام الجنازۃ کی مواظبت پر اتنی دال نہیں جتنی طاؤسؒ کی یہ روایت مشی خلف الجنازہ کی مواظبت پر دال ہے۔ واللہ أعلم[2]

باب[3] ماجاء فی کراھیۃ الرکوب خلف الجنازۃ

عن[4] ثوبان قال: خرجنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی جنازۃ فرأی ناساً رکباناً، فقال: ألا تستحیون، إن ملائکۃ اللہ علی أقدامھم وأنتم علی ظھور الدواب" اس روایت سے جنازہ کے ساتھ رکوب کی کراہت معلوم ہوتی ہے لیکن سنن ابی داؤد میں حضرت مغیرہؓ کی روایت بظاہر اس کے معارض ہے، اس لئے کہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "الراکب یسیر خلف الجنازۃ الخ"[5] جس سے جنازہ کے ساتھ رکوب کی اجازت معلوم ہوئی۔

اس تعارض کو اس طریقہ سے رفع کیا جاسکتا ہے کہ یوں کہا جائے کہ حضرت مغیرہؓ کی روایت جوازِ رکوب پر دال ہے اور جواز کے لئے عدمِ کراہت ضروری نہیں بلکہ جواز مع الکراہت بھی ہوسکتا ہے چنانچہ حدیثِ باب اسی کراہت پر دال ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رکوب پر نکیر ان ملائکہ کی وجہ سے تھی جو جنازہ کے ساتھ چل رہے تھے اور ملائکہ کا ساتھ چلنا ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ میمون کی وجہ سے ہو جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر جنازہ کے ساتھ ملائکہ کا ہونا ضروری نہیں، اس توجیہ کی بنیاد پر عام حالات میں جنازہ کے ساتھ رکوب بلاکراہت جائز ہوگا۔[6]

---

[1] مصنف عبدالرزاق (ج ۳ ص ۴۴۵، رقم ۶۲۶۷) باب المشی أمام الجنازۃ ۱۲ م

[2] قائلینِ مشی أمام الجنازۃ ایک عقلی دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ جنازہ کے ساتھ جانے والے لوگ میت کے شفعاء ہیں والشفیع یکون قدام المشفوع لہ، جبکہ قائلینِ مشی خلف الجنازۃ یہ کہتے ہیں کہ وہ میت کو رخصت کرنے والے ہیں والمودِّع یکون وراء المودَّع۔ کذا فی الأوجز (ج ۴ ص ۲۱۷) المشی أمام الجنازۃ ۱۲ مرتب۔

[3] شرحِ باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲ م

[4] الحدیث أخرجہ ابن ماجۃ فی سننہ (ص ۱۰۶) باب ماجاء فی شھود الجنائز ۱۲ م

[5] سننِ ابی داؤد (ج ۲ ص ۴۵۳) باب المشی أمام الجنازۃ ۱۲ م

[6] یہاں تک کی شرح کے لئے دیکھئے بذل المجہود فی حل أبی داؤد (ج ۱۴ ص ۱۳۴) باب الرکوب فی الجنازۃ ۱۲ م

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ رکوب بلا عذر میں کراہت ہو اور عذر مثلاً مرض، عرج اور شلل وغیرہ کی صورت میں کراہت نہ ہو[1]۔

علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے عدمِ رکوب کی روایت کو استحباب پر محمول کیا ہے، لأنہ من حسن الأدب مع الملائکۃ علیہم السلام[2]۔

واضح رہے کہ رکوب کی کراہت وعدمِ کراہت سے بحث جنازہ کے ساتھ جاتے ہوئے ہے، واپس لوٹتے ہوئے کراہت نہیں جیساکہ اگلے باب میں حضرت جابر بن سمرہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے "أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتبع جنازۃ أبی الدحداح ماشیاً ورجع علی فرس"۔ نیز سننِ أبی داؤد[3] میں حضرت ثوبانؓ سے مروی ہے: "أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أتی بدابۃ وھو مع الجنازۃ، فأبی أن یرکب، فلما انصرف أتی بدابۃ فرکب، قیل لہ، فقال: إن الملائکۃ کانت تمشی فلم أکن لأرکب وھم یمشون، فلما ذھبوا رکبت[4]"۔

میت کو مال واسباب کی طرح پیٹھ پر لادنا یا کسی جانور یا گاڑی وغیرہ پر رکھ کر لے جانا مکروہ ہے[5] البتہ اگر عذر ہو تو بلا کراہت جائز ہے، مثلاً اگر قبرستان بہت دور ہو[6] پھر ضرورت کے موقع پر میت کو کسی بس یا گاڑی وغیرہ پر لیجائے جانے کی صورت میں ساتھ جانے والوں کا بس یا دوسری سواریوں پر سوار ہونا بھی بظاہر مکروہ نہ ہوگا۔ واللہ أعلم۔ (از مرتب عفا اللہ عنہ)

باب ماجاء فی التکبیر علی الجنازۃ

عن[7] أبی ھریرۃ أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی علی النجاشی، نجاشی حبشہ کے

---

[1] کما فی التحفۃ (ج۲ ص۱۳۸) ۱۲ م

[2] إعلاء السنن (ج۸ ص۲۲۴) باب استحباب أن لا یرکب مع الجنازۃ ۱۲ م

[3] (ج۲ ص۴۵۲ و۴۵۳) باب الرکوب فی الجنازۃ ۱۲ م

[4] اس روایت کے الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رکوب کی کراہت اور عدمِ رکوب کے استحباب کی علت شہودِ ملائکہ اور ان کی مشی ہے، معلوم ہوا کہ جب یہ علت نہ پائی جائے تو رکوب میں کوئی حرج نہیں نہ ذہاباً نہ إیاباً۔ ۱۲ م

[5] دیکھئے الدر المختار مع رد المحتار (ج۱ ص۸۵۹) مطلب فی حمل المیت ۱۲ م

[6] بہشتی زیور حصہ یازدہم (ص۹۳) دفن کے مسائل ۱۲ م

[7] الحدیث أخرجہ الشیخان: البخاری فی صحیحہ (ج۱ ص۱۷۶) کتاب الجنائز، باب الصفوف علی الجنازۃ، ومسلم فی صحیحہ (ج۱ ص۳۰۹) کتاب الجنائز ۱۲ م

بادشاہوں کا لقب ہے، یہاں نجاشی سے "اصحمہؓ" مراد ہیں جو عہدِ نبوی میں حبشہ کے بادشاہ تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے[1]۔

غائبانہ نمازِ جنازہ اس حدیث سے شافعیہ اور حنابلہ نے غائبانہ نمازِ جنازہ کے جواز پر استدلال کیا ہے، علامہ خطابیؒ نے غائبانہ نمازِ جنازہ کے جواز کی یہ شرط بیان کی ہے کہ جس جگہ میت کا انتقال ہوا وہاں کوئی اس پر جنازہ پڑھنے والا موجود نہ ہو، شافعیہ میں سے رؤیانیؒ نے بھی اس قول کو پسند کیا ہے۔ امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ غائبانہ نمازِ جنازہ کے جواز کی شرط یہ ہے کہ مصلی کی نسبت سے میت جانبِ قبلہ میں ہو، لہذا اگر میت کا علاقہ مصلی کی نسبت سے قبلہ کی جانبِ مخالف میں ہو تو غائبانہ نماز جائز نہ ہوگی[2]۔

حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک غائبانہ نمازِ جنازہ مشروع نہیں، جہاں تک نجاشیؒ کے واقعہ کا تعلق ہے سو یہ ان کی خصوصیت ہے، نیز چونکہ وہ مسلمان بادشاہ تھے اور مسلمانوں کی انہوں نے بطورِ خاص مدد کی تھی اور ان پر کسی نے نماز نہیں پڑھی تھی اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر مدینہ میں نماز پڑھی، جبکہ نجاشیؒ کی وفات اپنے ملک میں ہوئی تھی، اس کے علاوہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور نجاشیؒ کے درمیان جتنے حجابات تھے وہ سب دور کر دیئے گئے تھے یہاں تک کہ نجاشی کا جنازہ آپ کو سامنے نظر آنے لگا تھا چنانچہ واحدیؒ نے اپنی "اسباب النزول" میں حضرت ابن عباسؓ سے بغیر سند کے نقل کیا ہے "کُشِف للنبي صلى الله عليه وسلم عن سرير النجاشي حتى رآه وصلّى عليه" اور ابن حبانؒ نے "أوزاعي عن يحيى بن أبي كثير عن أبي قلابة عن أبي المهلب" کے طریق سے عمران بن حصینؓ کی روایت نقل کی ہے جس میں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرماتے ہیں "فقام وصفّوا خلفه وهم لا يظنّون إلا أنّ جنازته بين يديه" اور ابو عوانہ کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں "فصلّينا خلفه ونحن لا نرى إلا أنّ الجنازة قدّامنا"۔

البتہ اس پر مجمع بن جاریہؓ کی روایت سے اشکال ہوسکتا ہے جو "صلوٰۃ علی النجاشی" کا واقعہ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں "فصففنا خلفه صفّين وما نرى شيئاً" أخرجه الطبراني[3]۔

---

[1] أسد الغابة في معرفة الصحابة (ج ۱ ص ۹۹) ۱۲ م

[2] وعن بعض أهل العلم: إنما يجوز ذلك في اليوم الذي يموت فيه الميت أو ما قرب منه، لا ما إذا طالت المدّة، حكاه ابن عبد البر- فتح الباري (ج ۳ ص ۱۸۵) باب الصفوف على الجنازة ۱۲ م

[3] كذا في فتح الباري (ج ۳ ص ۱۸۹) باب الصفوف على الجنازة - مجمع الزوائد (ج ۳ ص ۳۹، باب الصلاة على الغائب) میں یہ روایت اس طرح آئی ہے "وعن ابن خارجة قال: لما بلغ النبي صلى الله عليه وسلم وفاة النجاشي قال: إنّ أخاكم قد توفّي فخرجنا فصففنا خلفه، فصلّينا وما نرى شيئاً، رواه الطبراني في الكبير وفيه حمران بن أعين، وثقه أبو حاتم وضعّفه ابن معين وبقية رجاله ثقات" سنن ابن ماجہ (ص ۱۱۰، باب ما جاء في الصلاة على النجاشي) میں یہ روایت مجمع بن جاریہؓ سے "وما نرى شيئاً" کی زیادتی کے بغیر آئی ہے ۱۲ مرتب

لیکن اس اشکال کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ نجاشیؒ کے جنازے سے یہ حجابات بعض حضرات کے حق میں تو اٹھائے گئے ہوں اور بعض کے حق میں نہ اٹھائے گئے ہوں[1] ۔ واللہ اعلم[2]

غائبانہ نماز جنازہ پر ایک استدلال حضرت معاویہ بن معاویہ مزنیؓ کے واقعہ سے بھی کیا جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک میں ان کی نماز جنازہ پڑھی تھی حالانکہ ان کی وفات مدینہ منورہ میں ہوئی تھی[3] ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ روایت ثابت ہو جائے تو یہ بھی ان کی خصوصیت پر محمول ہو سکتی ہے[4] ۔ اس کے علاوہ اس واقعہ میں بھی ذکر ہے کہ حضرت معاویہ بن معاویہؓ کے جنازے سے حجابات دور کر دیئے گئے تھے، چنانچہ حافظؒ "الإصابة" میں طبرانی، ابن مندہ اور بیہقی وغیرہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں :

"عن أنس بن مالك قال : نزل جبرئيل على النبي صلى الله عليه وسلم فقال : يا محمد! مات معاوية بن معاوية المزني، أتحب أن تصلي عليه ؟ قال : نعم ، فضرب بجناحيه، فلم يبق أكمة ولا شجرة إلا تضعضعت ، فرفع سريره حتى نظر إليه ، فصلى عليه وخلفه صفان من الملائكة ، كل صف سبعون الف ملك ....." اس روایت میں ایک راوی محبوب بن ہلال ہیں جن کے بارے میں ابو حاتمؒ کہتے ہیں : "ليس بالمشهور" البتہ ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے ۔

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں : "فوضع جبرئيل جناحه الأيمن على الجبال فتواضعت

---

[1] گویا ان کا نہ دیکھنا ان نمازیوں کے درجہ میں ہے جو جنازے میں موجودگی میں امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہوں لیکن انہیں جنازہ نظر نہ آ رہا ہو ۔ کما يفهم ذلك من العمدة (ج ۸ ص۱۱۹) باب الصفوف على الجنازة وصرح به الحافظ في الفتح (ج ۳ ص۱۸۹) ۱۲ مرتب

[2] اس باب کی یہاں تک کی بیشتر تشریح فتح الباری (ج ۳ ص۱۸۸ و ص۱۸۹، باب الصفوف على الجنازة) سے ماخوذ ہے ۱۲ م

[3] اسد الغابة (ج ۴ ص۳۸۹) ۱۲ م

[4] ان کی وجہ خصوصیت خود روایت میں آئی ہے "فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لجبرئيل عليه السلام : بم بلغ معاوية هذا؟ قال : بكثرة قراءة قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ ، كان يقرأها قائماً وقاعداً وراقداً ، فبهذا بلغ ما بلغ " رواه الطبراني في الكبير ۔ مجمع الزوائد (ج ۳ ص۳۸) باب الصلاة على الغائب ۔ اور نجاشی کی خصوصیت کی وجہ پیچھے متن میں گزر چکی ہے ۱۲ مرتب

حتی نظرنا إلی المدینة » اور ایک روایت میں ہے « قال جبرئیل : فهل لك أن نصلي علیه فأقبض لك الأرض ، قال : نعم ، فصلّی علیه[1] » اس سے واضح ہو گیا کہ یہ « صلاۃ » غائبانہ نہ تھی بلکہ معجزۃً رفعِ حجاب کے بعد حاضرانہ نماز تھی۔

بہر حال پورے ذخیرۂ حدیث میں « صلاۃ علی الغائب » کے یہ صرف دو واقعے ہیں ان کی توجیہ بھی ہو سکتی ہے اور دونوں کو خصوصیت پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے ورنہ اگر اس کی عام اجازت ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان بیسیوں صحابہ کرام پر نماز پڑھنا نہ چھوڑتے جن کی وفات آپ کی حیات میں مدینہ طیبہ سے باہر ہوئی، اسی طرح آپ کے بعد صحابہ کرامؓ کا بھی کوئی معمولی « صلاۃ علی الغائب » کا نہیں ملتا، یہ بھی مسلکِ احناف کی ایک مضبوط دلیل ہے۔

نیز علامہ عبد الحق محدث دہلویؒ « لمعات التنقیح[2] » میں فرماتے ہیں : « وفی صلاته صلی الله علیه وسلم علی غیر النجاشی کمعاویة المزنی الذی مات بالمدینة والنبی صلی الله علیه وسلم بتبوك ، وعلی زید بن حارثة وجعفر بن أبي طالب استشهدا بمؤتة : کلام[3] من حیث إسناد الأحادیث التی رویت فیها[3] » ۔

---

[1] ذکر الروایات کلها الحافظ فی الإصابة ، کما فی إعلاء السنن (ج ۸ ص ۲۳۴ و ص ۲۳۵) باب أن صلاته صلی الله علیه وسلم علی الجنازة الغائبة عنه کانت لحضورها عنده علی طریق المعجزة ۱۲ م

[2] (ج ۴ ص ۳۲۸) کتاب الجنائز، باب المشی بالجنازة والصلاة علیها ، الفصل الأول ۱۲ م

[3] چنانچہ حضرت معاویہ بن معاویہؓ کا قصہ حضرت انسؓ کی روایت سے بھی آیا ہے، علامہ ہیثمیؒ اس کے بارے میں فرماتے ہیں : « رواه أبو یعلی والطبرانی فی الکبیر ، وفی إسناد أبی یعلی محمد بن إبراهیم بن العلاء ، وهو ضعیف جداً ، وفی إسناد الطبرانی محبوب بن هلال ، قال الذهبی : لا یُعرف ، وحدیثه منکر » ۔

حضرت معاویہ بن معاویہؓ ہی کا قصہ حضرت ابو امامہؓ کی روایت سے بھی آیا ہے، اس کے بارے میں علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں « رواه الطبرانی فی الکبیر والأوسط ، وفیه نوح بن عمر ، قال ابن حبان : یقال إنه سرق هذا الحدیث ، قلت : لیس هذا بضعف فی الحدیث ، وفیه بقیة ، وهو مدلس ولیس فیه علة غیر هذا » ۔

یہی قصہ حضرت معاویہؓ کی روایت سے بھی آیا ہے، اس کے بارے میں علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں : « رواه الطبرانی فی الکبیر وفیه صدقة بن أبي سهل ولم أعرفه ، وبقیة رجاله ثقات » ۔

مجمع الزوائد (ج ۳ ص ۳۷ و ۳۸) باب الصلوٰة علی الغائب ۔ صلوٰۃ علی زید بن حارثہ وجعفر بن ابی طالب سے متعلق کوئی ضعیف روایت بھی احقر کو تلاش کے باوجود نہ مل سکی ۱۲ مرتب

تکبیراتِ نمازِ جنازہ | "فکبّر أربعاً" اس حدیث کی بناء پر ائمہ اربعہ اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ نمازِ جنازہ چار تکبیرات پر مشتمل ہے البتہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ کا یہ مسلک ہے کہ نمازِ جنازہ میں پانچ تکبیرات ہیں، امام ابو یوسفؒ کی ایک روایت بھی یہی ہے[1]

دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نمازِ جنازہ میں چار سے لیکر نو تک تکبیریں ثابت ہیں[2] لیکن جمہور نے چار کو ترجیح دی ہے اس مسلک کی وجوہِ ترجیح درج ذیل ہیں:۔

① نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے حضرت علیؓ کی والدہ فاطمہ بنت اسدؓ کی نمازِ جنازہ میں چار تکبیرات کہیں، اس اجتماع میں حضراتِ شیخینؓ اور حضرت علیؓ کے علاوہ حضرت عباسؓ، حضرت ابو ایوب انصاریؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ جیسے جلیل القدر حضراتِ صحابہؓ بھی موجود تھے[3]

② حافظ ابن عبدالبرؒ نے "الاستذکار" میں "ابوبکر بن سلیمان بن ابی حثمہ عن ابیہ" کے طریق سے روایت نقل کی ہے: "قال: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یکبّر علی الجنائز أربعاً وخمساً وسبعاً وثمانیاً حتی جاء موت النجاشی فخرج إلی المصلی وصفّ الناس وراءہ وکبّر علیہ أربعاً ثم ثبت النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی أربع حتی توفاہ اللہ عزوجل" أوردہ الحافظ فی التلخیص[4] وسکت علیہ۔

③ بیہقی میں حضرت ابو وائلؒ کی روایت آئی ہے "کانوا یکبّرون علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سبعاً وخمساً وستاً أو قال أربعاً، فجمع عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ أصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فأخبر کل رجل بما رأی فجمعہم عمر رضی اللہ عنہ علی أربع تکبیرات کأطول الصلاۃ" یہ روایت سنداً حسن ہے[5]۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۸ ص ۱۱۶، باب الصفوف علی الجنازۃ) ۔ اس مقام پر عمدۃ القاری میں عیسیٰ مولیٰ حذیفہؓ حضرت معاذ بن جبلؓ کے اصحاب، ظاہریہ اور شیعہ حضرات کا بھی یہ مسلک نقل کیا گیا ہے کہ وہ بھی پانچ تکبیرات کے قائل تھے بلکہ علامہ عینیؒ نے حازمیؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ: "وممن رأی التکبیر علی الجنائز خمساً: ابن مسعود، وزید بن أرقم، و حذیفۃ بن الیمان" ۱۲ مرتب

[2] ان روایات کے لئے دیکھئے التلخیص الحبیر (ج ۲ ص ۱۱۹ تا ۱۲۲) کتاب الجنائز تحت رقم ۷۶۵ تا ۷۶۷۔ البتہ نو تکبیروں والی روایت کے لئے دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ (ج ۳ ص ۳۰۳) کتاب الجنائز، من کان یکبر علی الجنازۃ سبعاً وتسعاً ۱۲ مرتب

[3] مجمع الزوائد (ج ۹ ص ۲۵۶ و ص ۲۵۷) باب مناقب فاطمۃ بنت أسد ۱۲ م

[4] (ج ۲ ص ۱۲۱ و ۱۲۲) کتاب الجنائز تحت رقم ۷۶۷ - ۱۲ م

[5] (ج ۴ ص ۳۷) کتاب الجنائز، باب ما یستدل بہ علی أن أکثر الصحابۃ اجتمعوا علی أربع ورأی بعضہم الزیادۃ منسوخۃ ۱۲ م

طحاوی[1] میں ابراہیم نخعیؒ سے مروی ہے فرماتے ہیں: "قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والناس مختلفون فی التکبیر علی الجنائز لا تشاء أن تسمع رجلاً یقول، سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکبر سبعاً، وآخر یقول: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکبر خمساً، وآخر یقول: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکبر أربعاً إلا سمعته، فاختلفوا فی ذلک، فکانوا علی ذلک حتی قبض أبوبکر، فلما ولی عمرؓ ورأی إختلاف الناس فی ذلک شق ذلک علیہ جداً، فأرسل إلی رجال من أصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فقال: إنکم معاشر أصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متی تختلفون علی الناس یختلفون من بعدکم، ومتی تجتمعون علی أمر یجتمع الناس علیہ، فانظروا أمراً تجتمعون علیہ، فکأنما أیقظهم، فقالوا: نعم، ما رأیت یا أمیر المؤمنین؟ فأشر علینا، فقال عمرؓ: بل أشیروا أنتم علیّ، فإنما أنا بشر مثلکم، فتراجعوا الأمر بینهم، فأجمعوا أمرهم علی أن یجعلوا التکبیر علی الجنائز مثل التکبیر فی الأضحی والفطر أربع تکبیرات، فأجمع أمرهم علی ذلک".

البتہ اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ سے یہ ثابت ہے کہ انہوں نے حضرت سہل بن حنیفؓ کے جنازے میں پانچ یا چھ تکبیریں کہیں[2]۔

لیکن طحاوی[3] میں اس کی یہ حقیقت بتائی گئی ہے کہ حضرت علیؓ نے نماز کے بعد فرمایا: "إنه من أهل بدر" چنانچہ عبداللہ بن معقل اسی واقعہ میں نقل کرتے ہیں "ثم صلیت مع علیّ علی جنائز، کل ذلک کان یکبر علیها أربعاً" معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ کا اصل عمل چار ہی تکبیروں کا تھا لیکن چونکہ سہل بن حنیفؓ بدری صحابی تھے اس لئے انہوں نے ان پر زیادہ تکبیریں کہیں[4] واللہ أعلم۔

---

[1] (ج ۱ ص۳۲۱) باب التکبیر علی الجنائز کم هو؟ ۱۲ م

[2] التلخیص الحبیر (ج ۲ ص۱۲۰) تحت رقم ۷۶۶، کتاب الجنائز ۱۲ م

[3] (ج ۱ ص۳۲۹) باب التکبیر علی الجنائز کم هو؟ ۱۲ م

[4] چنانچہ طحاوی ہی میں عبد خیر سے منقول ہے "کان علیّ یکبر علی أهل بدر ستاً وعلی أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم خمساً وعلی سائر الناس أربعاً" (ج ۱ ص۳۲۹)۔

طبقات ابن سعد میں بھی عمیر بن سعید سے منقول ہے، فرماتے ہیں: "صلی علیؓ علی سهل بن حنیفؓ، فکبر علیه خمساً، فقالوا ما هذا التکبیر؟ فقال: هذا سهل بن حنیف من أهل بدر، ولأهل بدر فضل علی غیرهم، فأردت أن أعلمکم فضلهم" (ج ۳ ص۴۷۳) ترجمة سهل بن حنیف ۱۲

باب ماجاء فی القراءة علی الجنازة بفاتحة الکتاب

عن ابن عباس أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قرأ علی الجنازة بفاتحة الکتاب"
شافعیہ، حنابلہ اور امام اسحاقؒ کا مسلک یہ ہے کہ نمازِ جنازہ میں قرأتِ فاتحہ واجب ہے جبکہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ قراءتِ فاتحہ نماز جنازہ میں واجب نہیں[1]۔
پھر عالمگیریہ[2] میں یہ تفصیل لکھی ہے کہ اگر نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ بنیّتِ دعاء پڑھ لی جائے تو کوئی حرج نہیں البتہ قراءت کی نیت سے جائز نہیں اس لئے کہ وہ قراءت کا محل نہیں۔

شافعیہ کی دلیل حضرت ابن عباسؓ کی حدیثِ باب ہے لیکن یہ ابراہیم[3] بن عثمان کی وجہ سے ضعیف ہے۔ البتہ اسی باب میں اگلی روایت صحیح ہے "عن[4] طلحة بن عوف أن ابن عباس صلی علی جنازة، فقرأ بفاتحة الکتاب، فقلت له، فقال: إنه من السنة أو من تمام السنة" نیز سنن نسائی[5] میں حضرت ابو امامہؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں: "السنة فی الصلاة علی الجنازة أن یقرأ فی التکبیرة الأولی بأم القرآن مخافتة الخ"۔

حنفیہ کی دلیل میں عموماً ابوداؤد کی ایک حدیث پیش کی جاتی ہے: "عن أبی هریرة قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: إذا صلیتم علی المیت فأخلصوا له الدعاء[6]" لیکن اس سے استدلال درست نہیں کیونکہ اس کا مطلب اخلاص کے ساتھ دعاء کرنا

---

[1] المغنی (ج ۲ ص۴۸۵) مسألة: قال والصلاة علیه یکبر ویقرأ الحمد ۱۲ م

[2] (ج ۱ ص۱۶۴) باب الجنائز، الفصل الخامس فی الصلاة علی المیت ۱۲ م

[3] ابراهیم بن عثمان العبسی بالموحدة، أبو شیبة الکوفی، قاضی واسط، مشهور بکنیته، متروک الحدیث، من السابعة، مات سنة تسع وستین/ت ق۔ تقریب التهذیب (ج ۱ ص۳۹، رقم ۲۴۱) ۱۲ م

[4] الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحه (ج ۱ ص۱۷۸) کتاب الجنائز، باب قراءة فاتحة الکتاب علی الجنازة۔ والنسائی فی سننه (ج ۱ ص۲۸۱) کتاب الجنائز، باب الدعاء ۱۲ م

[5] (ج ۱ ص۲۸۱) کتاب الجنائز، باب الدعاء ۱۲ م

[6] سنن ابی داؤد (ج ۲ ص۴۵۶) کتاب الجنائز، باب الدعاء للمیت، انہی الفاظ کے ساتھ یہ روایت سنن ابن ماجہ میں بھی آئی ہے (ص۱۰۸) کتاب الجنائز، باب ماجاء فی الدعاء فی الصلاة علی الجنازة ۱۲ مرتب

ہے نہ یہ کہ فاتحہ نہ پڑھی جائے۔ کما یظھر ذلک من بعض الروایات[1]۔

لہٰذا حنفیہ کا صحیح استدلال موطا[2] امام مالک میں نافع کی روایت سے ہے "أن عبد اللہ بن عمر کان لایقرأ فی الصلاۃ علی الجنازۃ" اسی طرح حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابوھریرۃؓ وغیرہ بھی نماز جنازہ میں قراءتِ فاتحہ کے قائل نہ تھے[3]، ابن وھبؒ نے فضالہ بن عبیدؓ، جابرؓ، واثلہ بن الاسقعؓ اور فقہائے مدینہ کا عمل بھی یہ بیان کیا ہے کہ وہ جنازہ میں فاتحہ نہیں پڑھتے تھے اور امام مالکؒ کہتے ہیں کہ جنازہ میں فاتحہ پڑھنے کا ہمارے شہر میں معمول نہیں[4]۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ[5] میں لکھا ہے کہ صحابہؓ سے اس بارے میں مختلف عمل منقول ہیں بعض صحابہ کرام فاتحہ پڑھتے تھے اور بعض نہیں اور یہ جواز کی علامت ہے نہ کہ وجوب کی، یہی قول ہمارا بھی ہے۔

نمازِ جنازہ میں تکبیرِ اولیٰ کے بعد ثناء کا ثبوت حضرت ابوھریرۃؓ کے قول سے ماخوذ ہے جس میں وہ فرماتے ہیں ــــ "فإذا وُضِعَتْ (ای الجنازۃ) کبّرتُ وحمدتُ اللہ الخ[6]"

اس سے ظاہر ہوا کہ تکبیرِ اولیٰ کے بعد سنت حمد ہے خواہ "الحمد للہ" کے ذریعہ ہو یا اس کے علاوہ ثنا وغیرہ کے ذریعہ، صاحبِ اعلاء السنن مبسوط سے نقل کرتے ہیں کہ مشائخ کا ثنا کے بارے میں اختلاف

---

[1] عن الزھری قال سمعتُ أبا أمامۃ بن سھل بن حنیف یحدث ابن المسیب قال: السنۃ فی الصلاۃ علی الجنازۃ أن تکبر ثم تقرأ بأم القرآن ثم تصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم تخلص الدعاء للمیت الخ" المنتقی لابن الجارود (ص ۱۸۹، رقم ۵۴۰) کتاب الجنائز۔

اس روایت میں فاتحہ کے ساتھ اخلاص دعا کا بھی ذکر ہے، ظاہر ہے کہ اخلاص دعا کا مطلب عدمِ فاتحہ نہیں لیا جا سکتا۔

حضرت ابوامامہؓ کی مذکورہ روایت مصنف عبدالرزاق میں بھی مروی ہے دیکھئے (ج ۳ ص ۴۸۹، رقم ۶۴۲۸) باب القراءۃ والدعاء فی الصلاۃ علی المیت ۱۲ مرتب

[2] (ص ۲۱۰) کتاب الجنائز، مایقول المصلی علی الجنازۃ ۱۲ م

[3] اوجز المسالک (ج ۴ ص ۲۳۰) مایقول المصلی علی الجنازۃ ۱۲ م

[4] دیکھئے اعلاء السنن (ج ۸ ص ۲۱۱) باب کیفیۃ صلاۃ الجنازۃ، نقلاً عن المدونۃ الکبریٰ (ج ۱ ص ۱۵۸ و ۱۵۹) ۱۲ م

[5] دیکھئے فتاویٰ شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ (ج ۲۴ ص ۱۹۰ و ۱۹۱) باب صلاۃ الجمعۃ، سئل عن الصلاۃ بعد أذان الأول یوم الجمعۃ الخ ـ اس مقام پر علامہ ابن تیمیہؒ نے نماز جنازہ میں قراءت کے عدمِ وجوب کا قول کرتے ہوئے اس کی سنیت واستحباب کو راجح قرار دیا ہے ۱۲ مرتب

[6] موطا امام مالکؒ (ص ۲۰۹) مایقول المصلی علی الجنازۃ ۱۲ م

ہے بعض نے کہا کہ ثنا "الحمد للہ" کے ذریعہ ہوگی کما فی ظاہر الروایۃ اور بعض نے کہا کہ ثنا "سبحٰنک اللّٰھم وبحمدک الخ" کے ذریعہ ہوگی، وھو روایۃ الحسن عن الامام[۱]، واللہ أعلم۔

باب ماجاء فی کراھیۃ الصّلاۃ علی الجنازۃ عند طلوع الشمس وعند غروبھا

عن[۲] عقبۃ بن عامر الجھنی قال: ثلاث ساعات کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینھانا أن نصلی فیھن أو نقبر فیھن موتانا" اوقات مکروہہ میں نماز جنازہ پڑھنا امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے اور حدیثِ باب ان کے نزدیک دفن پر محمول ہے[۳]، جبکہ جمہور کا مسلک یہ ہے کہ ان اوقات میں نماز جنازہ مکروہ ہے۔[۴]

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ "ہمارے نزدیک اوقاتِ ثلاثہ مکروہہ میں فرائض ونوافل، نمازِ جنازہ اور سجدۂ تلاوت سب ناجائز ہیں البتہ اگر جنازہ وقتِ مکروہ ہی میں آئے یا اُس وقت آیتِ سجدۂ تلاوت کیجائے تو ایسی صورت میں نہ سجدہ مکروہ ہوگا نہ نمازِ جنازہ، لیکن اس صورت میں بھی وقتِ مکروہ کے ختم ہونے تک ان دونوں کو مؤخر کرنا اولیٰ ہے[۵]"۔

جہاں تک دفن کا تعلق ہے وہ ہمارے نزدیک اوقاتِ مکروہہ میں بھی درست ہے اور حدیثِ باب میں "أو نقبر فیھن موتانا" سے نماز جنازہ مراد ہے[۶] چنانچہ بعض روایات میں "نقبر فیھن

---

[۱] دیکھئے اعلاء السنن (ج ۸ ص۲۱۶) باب کیفیۃ صلوٰۃ الجنازۃ ۱۲ م

[۲] الحدیث أخرجہ النسائی فی سننہ (ج ۱ ص۲۸۲) کتاب الجنائز، باب الساعات التی نھی عن إقبار الموتی فیھن - وابن ماجہ (ص۱۱۰) باب ماجاء فی الأوقات التی لایصلی فیھا علی المیت ولا یدفن ۱۲ م

[۳] کما فی تحفۃ الأحوذی (ج ۲ ص۱۴۴) باب ماجاء فی کراھیۃ الصلاۃ علی الجنازۃ عند طلوع الشمس وعند غروبھا ۱۲ م

[۴] "عن علی بن أبی طالب أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لہ: یا علی، ثلاث لا تؤخرھا، الصلاۃ إذا أتت، والجنازۃ إذا حضرت، والأیم إذا وجدت لھا کفوًا" سنن ترمذی (ج ۱ ص۲۳) أبواب الصلاۃ، باب ماجاء فی الوقت الأول من الفضل ۱۲ م

[۵] مرقاۃ المفاتیح (ج ۳ ص۲۲۱-۲۲۲) باب أوقات النھی ۱۲

[۶] کما فی المبسوط للسرخسی (ج ۲ ص۶۸) باب غسل المیت ــ نیز ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں: "قال ابن المبارک: معنی "أن نقبر فیھن موتانا" الصلاۃ علی الجنازۃ، ذکرہ الطیبی، وقال ابن الملک: المراد منہ صلاۃ الجنازۃ لأن الدفن فیہ غیر مکروہ" مرقاۃ (ج ۳ ص۴۷) ۱۲ م

موتانا» کی جگہ «أن نصلی علی موتانا» کے الفاظ آئے ہیں چنانچہ امام ابوحفص عمر بن شاہین «کتاب الجنائز» میں «خارجہ بن مصعب عن لیث بن سعد عن موسی بن علی» کے طریق سے روایت بیان کرتے ہیں «نہانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن نصلی علی موتانا عند ثلاث[۱] الخ» یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے لیکن متعدد طرق سے مروی ہے جن میں سے بعض صاحب تحفۃ الاحوذی نے ذکر کئے ہیں[۲]۔ فیتقوی بعضها ببعض۔ واللہ أعلم

باب ماجاء فی الصلاۃ علی المیّت فی المسجد

«عن[۳] عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت: صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی سہیل بن بیضاء فی المسجد» اس حدیث سے استدلال کرکے شافعیہ اور حنابلہ اس بات کے قائل ہیں کہ مسجد میں نمازِ جنازہ میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ مسجد کے آلودہ ہونے کا خطرہ نہ ہو، امام اسحاقؒ، ابوثورؒ اور داؤد ظاہریؒ کا بھی یہی مسلک ہے جبکہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک مسجد میں «صلاۃ علی المیّت» مکروہ ہے[۴]۔

پھر حنفیہ میں سے شیخ ابن ہمامؒ کے نزدیک مسجد میں نمازِ جنازہ مکروہ تنزیہی[۵] ہے جبکہ ان کے شاگرد علامہ قاسم بن قطلوبغاؒ نے اس کو مکروہ تحریمی قرار دیا ہے[۶]۔

حنفیہ اور مالکیہ کے دلائل درج ذیل ہیں:۔

---

[۱] نصب الرایہ (ج ۱ ص ۲۵۰) فصل فی الأوقات المکروھۃ ۱۲ م

[۲] چنانچہ صاحبِ تحفۃ الاحوذی نے یہ روایت امام ابوحفص عمر بن شاہین کے علاوہ اسحاق بن راہویہؒ کی «کتاب الجنائز» کے حوالہ سے بھی نقل کی ہے۔ دیکھئے (ج ۲ ص ۱۴۳) باب ماجاء فی کراھیۃ الصلاۃ علی الجنازۃ عند طلوع الشمس وعند غروبها ۱۲ م

[۳] الحدیث أخرجہ مسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص ۳۱۳ و ۳۱۳) فصل فی جواز الصلاۃ علی المیّت فی المسجد۔ وأبوداؤد فی سننہ (ج ۲ ص ۴۵۴) کتاب الجنائز، باب الصلاۃ علی الجنازۃ فی المسجد ۱۲ م

[۴] المغنی (ج ۲ ص ۴۹۳) فصل ولا بأس بالصلاۃ علی المیت فی المسجد ۱۲ م

[۵] کما فی فتح القدیر (ج ۲ ص ۹۱) تحت شرح: «ولا یصلی علی میت فی مسجد جماعۃ ۱۲ م

[۶] منحۃ الخالق بهامش البحر الرائق (ج ۲ ص ۱۸۷) ۱۲ م

(۱) صحیح بخاری[1] میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی مشہور روایت ہے "أن الیھود جاء وا إلی النبی صلی اللہ علیہ وسلم برجل منھم وامرأۃ زنیا فأمر بھما فرُجما قریباً من موضع الجنائز عند المسجد" اس سے واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں نماز جنازہ کے لئے مسجد سے باہر ایک جگہ مخصوص تھی، اگر نماز جنازہ مسجد میں ہوتی تو آپ مسجد نبوی کو چھوڑ کر باہر تشریف نہ لے جاتے کیونکہ مسجد نبوی کی فضیلت ظاہر ہے۔

(۲) سنن أبی داوٗد[2] میں مروی ہے: "حدثنا مسدد نا یحیی عن ابن أبی ذئب حدثنی صالح مولی التوأمۃ عن أبی ھریرۃ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من صلی علی جنازۃ فی المسجد فلا شیء لہ"۔

اس پر بعض شافعیہ نے اعتراض کیا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے اس لئے کہ یہ صالح مولی التوأمۃ کا تفرد ہے جو ضعیف ہیں کما قال احمد بن حنبل[3]، نیز امام مالکؒ نے بھی انھیں ضعیف قرار دیا ہے[4]۔

اس کا جواب یہ ہے کہ صالح مولی التوأمۃ ثقہ ہیں یحیی بن معین وغیرہ نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے البتہ وہ آخری عمر میں مختلط ہو گئے تھے۔ امام مالکؒ نے چونکہ ان سے آخری عمر میں روایات حاصل کی ہیں اس لئے ان کو ضعیف قرار دیا لیکن یہ حدیث ان سے ابن ابی ذئب نے روایت کی ہے جنہوں نے صالح مولی التوأمۃ سے اختلاط سے قبل روایات لی ہیں اس لئے یہ روایت بے غبار ہے[5]، اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ابن ابی ذئب بذاتِ خود "صلاۃ الجنازۃ فی المسجد" کی کراہت کے قائل ہیں کما صرح بہ الحافظ فی الفتح[6]۔

علامہ نوویؒ نے اس حدیث پر دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ ابوداوٗد کے مشہور نسخوں میں "من صلی علی جنازۃ فی المسجد فلا شیء لہ" کی جگہ "من صلی علی جنازۃ فی المسجد فلا شیء علیہ" آیا ہے، اس صورت میں مفہوم بالکل بدل جاتا ہے[7]۔

---

[1] (ج ۱ ص۱۷۷) کتاب الجنائز، باب الصلاۃ علی الجنائز بالمصلی والمسجد ۱۲ م

[2] (ج ۲ ص۴۵۳) باب الصلاۃ علی الجنازۃ فی المسجد ۱۲ م

[3] شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۳۱۳) کتاب الجنائز ۱۲ م

[4] میزان الاعتدال (ج ۲ ص۳۰۳) رقم (۳۸۳۳) ۱۲ م

[5] تفصیل کے لئے دیکھئے میزان الاعتدال (ج ۲ ص۳۰۳، رقم ۳۸۳۳) ۱۲ م

[6] (ج ۳ ص۱۹۹) باب الصلاۃ علی الجنائز بالمصلی والمسجد ۱۲ م

[7] شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۳۱۳) ۱۲ م

اس کا جواب یہ ہے کہ « فلاشئ له » والا نسخہ ہی صحیح ہے، جس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ یہ روایت سنن ابن ماجہ[1]، مسند احمد بن حنبل[2] اور طحاوی[3] سب میں « فلاشئ له » یا « فلیس له شئ » کے الفاظ کے ساتھ آئی ہے[4]۔ نیز خطیب بغدادیؒ جو سنن ابی داؤد کے اصل راوی ہیں وہ بھی فرماتے ہیں: « المحفوظ: فلاشئ له »[5] پھر ابن ابی ذئبؒ کا مسلک بھی اس بات کی دلیل ہے کہ « فلاشئ له » والی روایت صحیح ہے اس لئے کہ اگر « فلاشئ علیه » والی روایت صحیح ہوتی تو وہ مسجد میں نماز جنازہ کی کراہت کے قائل نہ ہوتے۔

(۳) صحیح مسلم[6] میں روایت ہے « عن عباد بن عبد اللہ بن الزبیر أن عائشة أمرت أن یمرّ بجنازة سعد بن أبي وقاص في المسجد فتصلّی علیه فأنکر الناس ذلك علیها » اس سے معلوم ہوا کہ عام صحابہ کرامؓ مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے کو مکروہ قرار دیتے تھے لامحالہ ان کے پاس اس سلسلہ میں کوئی نہ کوئی حدیثِ مرفوع ہوگی ورنہ انکار کی حاجت نہ تھی لیکن اس پر کہا جاتا ہے کہ اسی حدیث میں آگے مذکور ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا « ما أسرع ما نسي الناس، ما صلّی رسول اللہ علی سهیل بن البیضاء إلا في المسجد » اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کا یہ استدلال احادیث کلیہ کے مقابلہ میں منقوض ہے اور اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے « أنه واقعة حال لا عموم لها » اور وہ بارش کی حالت پر بھی محمول ہو سکتا ہے نیز یہ بھی ممکن ہے کہ آپ اُس وقت معتکف ہوں اور صحابہ کرامؓ کا انکار اس بات کی دلیل ہے کہ آخر میں معاملہ کراہت پر مستقر ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ سہیل بن بیضاء کے واقعہ کے مقابلہ میں « فلاشئ له » والی روایت قوی ہونے کی حیثیت سے بھی راجح ہے۔ حنفیہ کا اُس صورت میں اختلاف ہے جب جنازہ مسجد کے باہر ہو اور مصلّی مسجد کے اندر ہو کہ اس

---

[1] (ص۱۱۰) باب ما جاء في الصلاة على الجنائز في المسجد ۱۲ م

[2] عن أبي هريرةؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من صلّى على جنازة فلا شئ له،
مسند امام احمد بن حنبل (ج۲ ص۵۰۵) مسند أبي هريرةؓ ۱۲ م

[3] (ج۱ ص۲۳۷) باب الصلاة على الجنازة هل ينبغي أن تكون في المساجد أو لا؟ ۱۲ م

[4] نیز مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی « فلاشئ له » یا « فلا صلاة له » کے الفاظ کے ساتھ آئی ہے (ج۳ ص۳۶۵،۳۶۴) من کره الصلاة على الجنازة في المسجد ۱۲ م

[5] نصب الرایہ (ج۲ ص۲۷۵) فصل في الصلاة على الميّت ۱۲ م

[6] (ج۱ ص۳۱۳) کتاب الجنائز فصل في جواز الصلاة على الميّت في المسجد ۱۲ م

صورت میں نماز جائز ہے یا نہیں؟ دونوں ہی قول ہیں[1] ــــ دراصل اس اختلاف کی بنیاد اس پر ہے کہ «من صلّٰی علیٰ جنازۃ فی المسجد فلا شیٔ لہ» میں «فی المسجد» کا تعلق «صلّٰی» سے ہے، یا «جنازہ» سے۔ اگر «صلّٰی» سے اس کا تعلق ہو تو اس کا تقاضا یہ ہوگا کہ جنازہ کے باہر اور مصلّی کے مسجد کے اندر ہونے کی صورت میں بھی نماز کی اجازت نہ ہو اور اگر «جنازۃ» سے اس کا تعلق ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مذکورہ صورت میں نماز کی اجازت ہوگی ـ اس سلسلہ میں علمائے اصول نے یہ ضابطہ ذکر کیا ہے کہ اگر فعل ایسا ہو کہ اس کا اثر مفعول تک پہنچ رہا ہے تو اُس صورت میں ظرف کا تعلق فعل و مفعول دونوں سے ہوگا اور اگر فعل ایسا ہو کہ اس کا ظاہری اثر مفعول تک پہنچ رہا ہو تو ظرف کا تعلق صرف فعل سے ہوگا، لہٰذا اگر کوئی شخص کہے «إن ضربتُ زیدًا فی المسجد فامرأتی کذا» تو اس صورت میں چونکہ فعل مفعول پر اثر انداز ہے اس لئے حانث ہونے کے لئے زید کا بھی مسجد میں ہونا ضروری ہے لہٰذا اگر ضارب مسجد میں ہو اور زید خارجِ مسجد تو حانث نہ ہوگا، اس کے برعکس «إن شتمتُ زیدًا فی المسجد فامرأتی کذا» کی صورت میں چونکہ فعل مفعول پر اثر انداز نہیں لہٰذا «شتم» کے مسجد میں اور «زید» کے خارج مسجد ہونے کی صورت میں بھی حانث ہو جائے گا۔[2] اس تشریح سے یہ بات واضح ہوتی کہ ان حضرات کا قول راجح ہے جو «صلاۃ علی الجنازۃ فی المسجد» کے بارے میں عموم کراہت کے قائل ہیں خواہ جنازہ مسجد میں ہو یا باہر اس لئے کہ «صلاۃ» کا اثر بھی میّت پر واقع نہیں ہوتا جس کا تقاضا یہ ہے کہ جنازہ باہر ہو صلاۃ مسجد میں نہ ہونی چاہئے۔[3]

حضرت گنگوہی قدس سرہ نے قولِ راجح (یعنی جنازہ اگرچہ خارجِ مسجد ہو مسجد میں نماز تب بھی

---

[1] وفی الدر المختار وغیرہ: المختار الکراھۃ مطلقًا سواء کان المیّت فی المسجد أو خارجہ، بناءً علیٰ أن المسجد بُنی للمکتوبۃ وتوابعہا، قال ابن عابدین: أما إذا عللنا بخوف تلویث المسجد فلا یکرہ إذا کان المیّت خارج المسجد، وإلیہ مال فی المبسوط وغیرہ، وفی التعلیل الأوّل خفاء إذ لا شک أن الصلاۃ علی المیّت دعاء وذکر وھما مما بنی لہ المسجد. انتھیٰ۔ کذا فی الأوجز (ج ۲ ص۲۳۵) الصلاۃ علی الجنائز فی المسجد ۱۲ م

[2] دیکھئے اصول الشاشی (ص۱۵۶ و ۱۵۶) فصل کلمۃ «فی» للظرف، نیز دیکھئے الجامع الکبیر (ص۳۳) باب الحنث فی الشتمۃ ونحوھا، کتاب الایمان ۱۲ مرتب

[3] دیکھئے فتح الملہم (ج ۲ ص۵۰۹) کتاب الجنائز، تکملۃ تتعلق بشرح معنی الحدیث الوارد فی سنن أبی داؤد: «من صلّٰی علیٰ جنازۃ فی المسجد فلا شیٔ لہ» ـ ۱۲ م

درست نہیں) پر نجاشیؒ کے واقعہ سے استدلال کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشیؒ کی نماز جنازہ مسجد میں نہیں پڑھی[1] باوجودیکہ نجاشیؒ کی نعش مسجد میں موجود نہ تھی، اس سے معلوم ہوا کہ میت کے خارج ہونے کی صورت میں بھی مسجد میں نماز جنازہ درست نہیں[2]۔

پھر جگہ کی تنگی یا بارش وغیرہ اعذار کی صورت میں مسجد میں نماز جنازہ درست ہے، اس صورت میں بھی بہتر یہ ہے کہ میت امام اور بعض مقتدی خارج مسجد ہوں اور بقیہ مسجد میں، اس لئے کہ یہ صورت بعض احناف کے نزدیک بغیر عذر کے بھی جائز ہے[3]۔ واللہ أعلم

باب ماجاء أين يقوم الإمام من الرجل والمرأة

"عن[4] أبي غالب قال: صليت مع أنس بن مالك على جنازة رجل فقام حيال رأسه ثم جاء وا بجنازة امرأة من قريش فقالوا: يا أبا حمزة، صلّ عليها فقام حيال وسط السرير" اس روایت کے مطابق شافعیہ کا مسلک یہ ہے کہ امام مرد کے جنازے میں سر کے مقابل اور عورت کے جنازے میں وسط میں کھڑا ہوگا[5]، جبکہ امام ابوحنیفہؒ کی اس مسئلہ میں دو روایتیں ہیں[6] ایک شافعیہ کے مطابق، اور امام طحاویؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے اور اس کو امام ابو یوسفؒ سے بھی روایت کیا ہے[7]۔

---

[1] چنانچہ نجاشیؒ کا واقعہ مسلم میں اس طرح مروی ہے "عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نعى للناس النجاشي اليوم الذى مات فيه فخرج بهم إلى المصلّى وكبّر أربع تكبيرات" (ج ۱ ص ۳۰۹) کتاب الجنائز ۱۲ مرتب

[2] دیکھئے الکوکب الدرّی (ج ۲ ص ۱۸۷) باب الصلاۃ علی المیت فی المسجد ۱۲ م

[3] چنانچہ فتاویٰ دار العلوم دیوبند (ج ۲ ص ۴۴۵) یعنی امداد المفتین میں اس صورت کو فتاویٰ بزازیہ کے حوالہ سے بلا کراہت جائز قرار دیا ہے لیکن فتاویٰ عالمگیری (ج ۱ ص ۱۶۵، الفصل الخامس فی الصلاۃ علی المیت) میں اس صورت کو بھی مکروہ کہا ہے۔ اگرچہ عذر کی صورت میں عالمگیریہ میں بھی جواز ہی کا قول ہے ۱۲ مرتب

[4] الحديث أخرجه أبو داوٗد في سننه (ج ۲ ص ۴۵۵) كتاب الجنائز، باب أين يقوم الإمام من الميت إذا صلى عليه۔ وابن ماجة في سننه (ص ۱۰۷) كتاب الجنائز، باب ما جاء في أين يقوم الإمام إذا صلى على الجنازة ۱۲ م

[5] بدائع الصنائع (ج ۱ ص ۳۱۲) فصل وأما بيان كيفية الصلاة على الجنازة ۱۲ م

[6] كما في الهداية مع فتح القدير (ج ۲ ص ۸۹) فصل في الصلاة على الميت ۱۲ م

[7] شرح معاني الآثار (ج ۱ ص ۲۳۲) باب الرجل يصلي على الميت أين ينبغي أن يقوم منه ۱۲ م

امام ابوحنیفہؒ کی مشہور روایت یہ ہے کہ امام میت کے سینے کے مقابل کھڑا ہو[1] خواہ میت مرد ہو یا عورت امام ابو یوسفؒ کی مشہور روایت بھی یہی ہے[2]، شیخ ابن ہمامؒ نے امام ابوحنیفہؒ کی اسی روایت کو راجح قرار دیا[3] اور اس کی دلیل کے طور پر امام احمدؒ کی ایک روایت ذکر کی ہے "أن أبا غالب قال: صلیت خلف أنس علی جنازۃ فقام حیال صدرہ[3]" اور "صدر" ہی وسطِ جسم ہے[4]۔ لیکن اس روایت کے بارے میں علامہ عثمانیؒ فتح الملہم[5] میں فرماتے ہیں "ولکنی لم أجدہ إلی الآن فی کتب الحدیث"

حضرت شاہ صاحبؒ "العرف الشذی" میں فرماتے ہیں کہ جب امام ابوحنیفہؒ کی ایک روایت حدیثِ باب کے موافق ہے اس لئے حدیثِ باب میں تاویل کی چنداں حاجت نہیں[6]۔ واللہ أعلم

باب ما جاء فی ترک الصلاۃ علی الشہید

"أن جابر بن عبد اللہ أخبرہ ...... ولم یصل علیہم ولم یغسلوا[7]" شہید کو غسل نہ دینے کے بارے میں اتفاق ہے[8] بشرطیکہ اس کی شہادت حالتِ جنابت میں واقع نہ ہوئی ہو۔

البتہ شہید کی نمازِ جنازہ کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، اور امام اسحاقؒ کا مسلک یہ ہے کہ اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔

---

[1] لأنہ موضع القلب وفیہ نور الإیمان فیکون القیام عندہ إشارۃ إلی الشفاعۃ لإیمانہ - ہدایہ مع فتح القدیر (ج ۲ ص۸۹) ۱۲ م

[2] طحاوی (ج ۱ ص۲۳۳) باب الرجل یصلی علی المیت أین ینبغی أن یقوم منہ ۱۲ م

[3] فتح القدیر (ج ۲ ص۸۹) ۱۲ م

[4] لأن الرجلین والرأس من جملۃ الأطراف فیبقی البدن من العجیزۃ إلی الرقبۃ فکان وسط البدن ھو الصدر۔ بدائع الصنائع (ج ۱ ص۳۱۲) فصل وأما بیان کیفیۃ الصلاۃ علی الجنازۃ ۱۲ م

[5] (ج ۲ ص۵۰۲) أین یقوم الإمام من الجنازۃ وأقوال العلماء فی ذلک ۱۲ م

[6] جامع الترمذی مع العرف الشذی (ج ۱ ص۱۹۹) ـــــ واضح رہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی مشہور روایت کو اختیار کرتے ہوئے صاحبِ ہدایہؒ نے حدیثِ باب میں تاویل کی ہے، فراجعہ إن شئت ۱۲ م

[7] الحدیث أخرجہ البخاری فی صحیحہ (ج ۱ ص۱۷۹) کتاب الجنائز، باب الصلاۃ علی الشہید ـ وابن ماجہ فی سننہ (ص۱۰۹) باب ما جاء فی الصلاۃ علی الشہداء ودفنہم ۱۲ م

[8] البتہ حضرت حسن بصریؒ اور سعید بن المسیبؒ فرماتے ہیں کہ شہید کو غسل دیا جائیگا۔ المغنی (ج ۲ ص۵۲۸ و ۵۲۹) مسألۃ: قال: والشہید إذا مات فی موضعہ لم یغسل ولم یصل علیہ ۱۲ م

جبکہ امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ، سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ اور ابن ابی لیلیٰؒ وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ امام احمدؒ اور امام اسحاقؒ کی ایک ایک روایت بھی اسی کے مطابق ہے، اہل حجاز کا قول بھی یہی ہے[1]۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کا استدلال حضرت جابر بن عبداللہؓ کی حدیثِ باب سے ہے جس میں ذکر ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان پر نماز نہیں پڑھی۔

حنفیہ کے دلائل درج ذیل ہیں:

(۱) مستدرک حاکم میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے: "فقد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حمزۃ حین جاء الناس من القتال ...... ثم جئ بحمزۃ فصلّٰی علیہ[2]"

اس حدیث پر علامہ شوکانی اور صاحبِ تحفۃ الاحوذی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کا مدار ابوحماد الحنفی پر ہے جو متروک ہے[3]۔

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ایک مختلف فیہ راوی ہیں[4] اور ان کے بارے میں صحیح یہ ہے کہ ان کی روایت مقبول ہے۔

(۲) سننِ ابی داوٗدؒ میں حضرت انسؓ کی روایت ہے: "أنّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم مرّ بحمزۃ وقد مثّل بہ ولم یصلّ علی أحدٍ من الشہداء غیرہ[5]" امام طحاویؒ نے بھی اس روایت کا اخراج کیا ہے[6] اور اس روایت کی سند بھی قوی ہے، اس روایت میں "ولم یصلّ علی أحدٍ من الشہداء" کا جملہ

---

[1] مذاہب کی مذکورہ تفصیل کے لئے دیکھئے "المغنی" (ج۲ ص۵۲۹)۔ وعمدۃ القاری (ج۸ ص۱۵۲) باب الصلاۃ علی الشہید ۱۲ مرتب

[2] نیل الاوطار (ج۴ ص۴۷) ترک الصلاۃ علی الشہید ۱۲ م

[3] تحفۃ الأحوذی (ج۲ ص۱۴۷) ۱۲ م

[4] چنانچہ جہاں ان کی تضعیف کی گئی ہے وہاں متعدد حضرات نے ان کی توثیق بھی کی ہے، حافظ ذہبیؒ نقل کرتے ہیں: "قال ابن عدی ما أری بحدیثہ بأسًا، وکان أحمد بن محمد شعیب یثنی علیہ ثناءً تامًّا، وقال الأھوازی: کان عطاء بن مسلم یوثقہ" میزان الاعتدال (ج۴ ص۱۶۸) ترجمۃ مفضل بن صدقۃ أبوحماد الحنفی (رقم ۸۷۲۹) ۱۲ مرتب

[5] (ج۲ ص۴۴۲) باب فی الشہید یغسل ۱۲ م

[6] طحاوی (ج۱ ص۲۴۲) باب الصلاۃ علی الشہداء ۱۲ م

آیا ہے، اس کا مطلب آگے آئیگا۔

(۳) مسند احمد میں شعبیؒ سے مروی ہے "عن ابن مسعود قال: کان النساء یوم أحد خلف المسلمین، یجھزن علی جرحی المشرکین ـ إلی أن قال ـ فوضع النبی صلی اللہ علیہ وسلم حمزۃ وجیء برجل من الأنصار فوضع إلی جنبہ فصلی علیہ فرفع الأنصاری وترك حمزۃ، ثم جیء بآخر فوضع إلی جنب حمزۃ، فصلی علیہ، ثم رفع وترك حمزۃ حتی صلی علیہ یومئذ سبعین صلاۃ[1]۔

اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ شعبیؒ کا حضرت ابن مسعودؓ سے سماع نہیں ـ اس کا جواب یہ ہے کہ شعبیؒ ثقہ ہی سے ارسال کرتے ہیں لہذا ان کی حدیث صحیح ہے[2]۔

(۴) سنن ابن ماجہ[3]، سنن کبریٰ بیہقی[4]، مستدرک حاکم اور معجم طبرانی[5] میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے "قال: أتی بھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم أحد، فجعل یصلی علی عشرۃ عشرۃ، وحمزۃ ھو کما ھو یرفعون وھو کما ھو موضوع" (اللفظ لابن ماجہ)

اس روایت پر یزید بن ابی زیاد کی وجہ سے اعتراض کیا جاتا ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مسلم

---

[1] نصب الرایہ (ج ۲ ص ۳۰۹) باب الشہید، أحادیث الصلاۃ علی الشہید ـ مصنف عبدالرزاق میں بھی یہ روایت شعبیؒ سے حضرت ابن مسعودؓ کے ذکر کے بغیر مرسلاً مروی ہے، فرماتے ہیں: "صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی حمزۃ یوم أحد سبعین صلاۃ، کلما أتی برجل صلی علیہ وحمزۃ موضوع یصلی علیہ معہ" (ج ۳ ص ۵۴۵ و ۵۴۶، رقم ۶۶۵۳) باب الصلاۃ علی الشہید وغسلہ ۱۲ مرتب

[2] چنانچہ حافظ ذہبیؒ تذکرۃ الحفاظ میں نقل کرتے ہیں "قال أحمد العجلی: مرسل الشعبی صحیح لا یکاد یرسل إلا صحیحاً" (ج ۱ ص ۷۹ و ۸۸) ترجمۃ الشعبی (رقم ۷۶) ۱۲ مرتب

[3] (ص ۱۰۹) باب ماجاء فی الصلاۃ علی الشہداء ودفنھم ۱۲ م

[4] (ج ۴ ص ۱۲) باب من زعم أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی علی شہداء أحد ۱۲ م

[5] أخرجہ الحاکم فی المستدرك (فی معرفۃ الصحابۃ ج ۳ ص ۱۹۸) والطبرانی فی معجمہ ـ کذا فی نصب الرایۃ (ج ۲ ص ۳۱۰)۔

یہ روایت طحاوی میں بھی آئی ہے، دیکھئے (ج ۱ ص ۲۴۲) باب الصلاۃ علی الشہداء ـ سنن دارقطنی میں بھی مروی ہے، دیکھئے (ج ۴ ص ۱۱۶، رقم ۴۲ و ۴۳) کتاب السیر ـ نیز دیکھئے طبقات ابن سعد (ج ۳ ص ۱۴) ۱۲ مرتب

کے راوی ہیں اور جہاں ان کی تضعیف کی گئی ہے وہاں انہیں ثقہ بھی قرار دیا گیا ہے[۱]۔

⑤ صحیح بخاری[۲] میں حضرت عقبہ بن عامرؓ سے مروی ہے "أن النبي صلى الله عليه وسلم خرج يوماً فصلّى على أهل أحد صلاته على الميت الخ" یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے کچھ عرصہ پہلے کا واقعہ[۳] ہے جس کی حقیقت آگے آرہی ہے۔

⑥ طحاوی[۴] میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے "أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أمر يوم أحد بحمزة فسجي ببردة ثم صلّى عليه فكبّر تسع تكبيرات ثم أتي بالقتلى يصفّون ويصلّي عليهم وعليه معهم"

اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ غزوۂ احد کے وقت صرف دو سال کے تھے اس لئے کہ ہجرت کے سال ان کی ولادت ہوئی[۵] جبکہ غزوۂ احد ۳ھ[۶] میں ہوا۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مرسلِ صحابی ہے جو بالاتفاق مقبول[۷] ہے۔

---

[۱] چنانچہ حافظ زیلعیؒ فرماتے ہیں "وهو ممن يكتب حديثه على لينه وقد روى له مسلم مقروناً بغيره وروى له أصحاب السنن، وقال أبوداؤد: لا أعلم أحداً ترك حديثه" نصب الرایہ (ج ۲ ص ۳۱۱) حافظ ذہبیؒ ان کے بارے میں نقل کرتے ہیں "وقال علي بن عاصم: قال لي شعبة: ما أبالي إذا كتبت عن يزيد بن أبي زياد أن لا أكتب عن أحد" میزان الاعتدال (ج ۴ ص ۴۲۳، رقم ۹۶۹۵) ۔ واضح رہے کہ یہاں یزید بن ابی زیاد سے مراد کوفی ہیں نہ کہ دمشقی ۱۲ مرتب

[۲] (ج ۱ ص ۱۷۹) باب الصلاة على الشهيد ۱۲ م

[۳] چنانچہ یہی روایت بخاری کی کتاب المغازی میں بھی آئی ہے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں: "صلّى رسول الله صلى الله على قتلى أحد بعد ثماني سنين كالمودّع للأحياء والأموات" دیکھئے (ج ۲ ص ۵۸۴) باب غزوة أحد ۱۲ مرتب

[۴] (ج ۱ ص ۲۴۲) باب الصلاة على الشهداء ۱۲ م

[۵] دیکھئے اسد الغابہ (ج ۳ ص ۱۶۱ و ۱۶۲) ۱۲ م

[۶] چنانچہ حافظ لکھتے ہیں "وكانت أحد في شوال سنة ثلاث" فتح الباری (ج ۳ ص ۲۱۱) باب الصلاة على الشهيد ۱۲ م

[۷] قال ابن الحنبلي في قفو الأثر "والمختار في التفصيل قبول مرسل الصحابي إجماعاً....." قواعد في علوم الحديث (ص ۱۳۸) الفصل الخامس ۱۲ م

(۷) طحاویؒ[1] میں ابومالک غفاریؒ کی مرسل روایت ہے "قال: کان قتلی أحد یؤتی بتسعة وعاشرهم حمزة فیصلی علیهم رسول الله صلی الله علیه وسلم ثم یحملون، ثم یؤتی بتسعة فیصلی علیهم وحمزة مکانه حتی صلی علیهم رسول الله صلی الله علیه وسلم"

(۸) امام ابو داودؒ کی "مراسیل"[2] میں حضرت عطاءؒ سے مروی ہے "قال: صلی النبی صلی الله علیه وسلم علی قتلی أحد"

(۹) سنن نسائی[3] میں حضرت شداد بن الہادؓ سے ایک قصہ مروی ہے جس میں انہوں نے ایک دیہاتی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے، اسلام لانے اور غزوہ میں شریک ہوکر شہید ہونے کا ذکر کیا ہے اس میں وہ آگے فرماتے ہیں "ثم کفنه النبی صلی الله علیه وسلم فی جبة النبی صلی الله علیه وسلم ثم قدمه فصلی علیه الخ" یہ روایت امام طحاویؒ نے بھی ذکر کی ہے[4]۔

اس پر علامہ شوکانیؒ نے یہ اعتراض کیا ہے "وأما حدیث شداد بن الهاد فهو مرسل لأن شدادا تابعی"[5]

اس کا جواب یہ ہے کہ شداد بن الہادؓ بلاشبہ صحابی ہیں امام بخاریؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں "له صحبة"[6] اور حافظؒ "تقریب التہذیب"[7] میں فرماتے ہیں "صحابی شهد الخندق وما بعدها"

یہ تمام روایات شہید کی نماز جنازہ پر دال ہیں اگر ان میں سے کسی میں ضعف ہو بھی تب بھی کثرتِ روایات سے اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔

جہاں تک حضرت جابرؓ کی حدیثِ باب کا تعلق ہے جس میں شہدائے اُحد پر نماز کی نفی کی گئی ہے

---

[1] (ج ۱ ص۲۳۲ و ص۲۳۳) باب الصلاة علی الشهداء ۱۲ م

[2] (ص۲۱) فی الصلاة علی الشهداء ۱۲ م

[3] (ج ۱ ص۲۷۷) الصلاة علی الشهداء ۱۲ م

[4] شرح معانی الآثار (ج ۱ ص۲۳۳) باب الصلاة علی الشهداء ۱۲ م

[5] نیل الاوطار (ج ۴ ص۴۲) ترک الصلاة علی الشهید ۱۲ م

[6] تهذیب التهذیب (ج ۴ ص۳۱۹، رقم ۵۴۲) ۱۲ م

[7] (ج ۱ ص۳۴۸، رقم ۳۳) ۱۲ م

سو جب مذکورہ بالا متعدد روایات سے ان کی نمازِ جنازہ کا ثبوت ہو گیا تو اس حدیث کی توجیہ کیا ہوگی چنانچہ اس کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں۔

امام طحاویؒ نے اس کا جواب دیتے ہوئے یہ امکان ذکر کیا ہے کہ ہو سکتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس تو ان کی نماز جنازہ نہ پڑھی ہو اس لئے کہ آپؐ زخمی تھے لیکن آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو ان کی نماز جنازہ پڑھنے کا حکم دیدیا ہو[۱] لہذا جن روایات میں شہداءِ اُحد کی نمازِ جنازہ کی نفی ہے وہ اسی پر محمول ہے۔ لیکن اس توجیہ پر تمام روایات منطبق نہیں ہوتیں۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ حدیثِ باب میں "لم یُصَلّ علیہم" سے مراد یہ ہے کہ آپؐ نے حضرت حمزہؓ کے سوا کسی پر مستقلاً و منفرداً نماز نہیں پڑھی بلکہ متعدد صحابہ کرامؓ پر ایک ساتھ نماز پڑھی، یہ توجیہ احقر کے نزدیک درست اور بہتر ہے اس لئے کہ اس پر مجموعی طور پر روایات منطبق ہو جاتی ہیں[۲]۔

جہاں تک حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت کا تعلق ہے جس میں وصال سے کچھ پہلے دوبارہ شہدائے اُحد پر "صلاۃ" کا ذکر ہے اس میں اگرچہ ایک امکان یہ بھی ہے کہ اس سے محض دعا مراد ہو کما اختارہ النووی[۳] لیکن ایک قوی امکان یہ بھی ہے کہ آپؐ نے ان پر باقاعدہ نمازِ جنازہ پڑھی ہو[۴] اور یہ دوسری دفعہ نمازِ جنازہ کا پڑھا جانا شہدائے اُحد کے ساتھ مخصوص ہو۔

امام طحاویؒ نے اس کی یہ توجیہ بھی کی ہے کہ غزوۂ اُحد کے وقت نماز جنازہ واجب نہیں تھی بعد میں جب اس کا وجوب ہوا تو آپؐ نے دوبارہ نماز ادا فرمائی[۵]۔ واللہ اعلم

---

[۱] شرح معانی الآثار (ج ۱ ص ۲۴۱) ۱۲ م

[۲] شہدائے احد اور حضرت حمزہؓ پر نماز جنازہ سے متعلق احادیث میں عدد کے لحاظ سے بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے اس سے متعلق بحث اور تطبیق کے لئے دیکھئے نصب الرایہ (ج ۲ ص ۳۱۲ و ص ۳۱۳) اور اعلاء السنن (ج ۸ ص ۳۰۹ تا ۳۱۱) باب الصلاۃ علی الشہید ۱۲ مرتب۔

[۳] المجموع شرح المہذب (ج ۵ ص ۲۶۵) فرع فی مذاہب العلماء فی غسل الشہید والصلاۃ علیہ۔ طبع دار الفکر ۱۲ م

[۴] جیسا کہ روایت میں "صلاتہ علی المیت" کے الفاظ سے یہی معنی سمجھ میں آتے ہیں اور دعا والے امکان کی تردید ہوتی ہے اگرچہ علامہ نوویؒ نے "صلاتہ علی المیت" کی بھی یہ تاویل کی ہے "ای دعا لہم کدعاء صلاۃ المیت" کما فی المجموع (ج ۵ ص ۲۶۵) لیکن یہ تاویل خلافِ ظاہر ہے چنانچہ علامہ عینیؒ نے اس کی سخت تردید کی ہے کما فی عمدۃ القاری (ج ۸ ص ۱۵۶) باب الصلاۃ علی الشہید ۱۲ م

[۵] تفصیل کے لئے دیکھئے طحاوی (ج ۱ ص ۲۴۳) باب الصلاۃ علی الشہداء ۱۲ م

باب ماجاء فی الصلاۃ علی القبر

حدثنا الشعبی أخبرنی من رأی النبی صلی اللہ علیہ ورأی قبراً منتبذاً[1][2]

فصف أصحابہ خلفہ فصلی علیہ، فقیل لہ من أخبرک، فقال: ابن عباس»

قبر پر نماز جنازہ کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام مالکؒ کے نزدیک «صلاۃ علی القبر» علی الاطلاق ناجائز ہے[3] یعنی خواہ اس میت پر پہلے نماز جنازہ پڑھی گئی ہو یا نہ پڑھی گئی ہو۔

امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور داؤد ظاہریؒ وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ جو شخص میت کی نماز جنازہ نہ پڑھ سکا ہو اس کے لئے «صلاۃ علی القبر» کا جواز ہے۔

حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ «صلاۃ علی القبر» صرف ولیِ میت کے لئے جائز ہے جبکہ وہ دفن سے پہلے نماز میں شامل نہ ہو سکا ہو یا پھر اس صورت میں جائز ہے جبکہ کسی شخص کو نماز کے بغیر دفن کر دیا گیا، اس کے سوا حنفیہ کے نزدیک جواز کی کوئی صورت نہیں۔

پھر جن حضرات کے نزدیک «صلاۃ علی القبر» کا جواز ہے وہ اس جواز کے لئے حدوثِ دفن کی شرط لگاتے ہیں، چنانچہ امام شافعیؒ کے نزدیک دفن کئے جانے کے بعد سے ایک مہینہ تک نماز کی گنجائش ہے[4]

---

[1] الحدیث أخرجہ البخاری فی صحیحہ (ج ۱ ص۱۷۸) باب الصلاۃ علی القبر بعد ما یدفن۔ ومسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص۳۰۹) کتاب الجنائز، باب الصلاۃ علی القبر ۱۲ م

[2] أی بعیداً منفرداً عن القبور ۱۲ م

[3] البتہ امام مالکؒ کی ایک روایت شاذہ «صلوٰۃ علی القبر» کے جواز کی ہے۔ اوجز المسالک (ج ۴ ص۲۲۳) التکبیر علی الجنائز ۱۲ م

[4] علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: «وإلی متی تجوز الصلاۃ علی المدفون؟ فیہ ستۃ أوجہ، أحدھا: یصلی علیہ إلی ثلاثۃ أیام ولا یصلی بعدھا، والثانی إلی شہر، والثالث، ما لم یبل جسدہ، والرابع: یصلی علیہ من کان من أھل فرض الصلاۃ علیہ یوم موتہ، والخامس، یصلی من کان من أھل الصلاۃ علیہ یوم موتہ وإن لم یکن من أھل الفرض فیدخل الصبی الممیز، والسادس، یصلی علیہ أبداً فعلی ھذا تجوز الصلاۃ علی قبور الصحابۃ رضی اللہ عنھم ومن قبلھم الیوم، واتفق الأصحاب علی تضعیف ھذا السادس» کذا فی المجموع ملخصاً (ج ۵ ص۲۴۷) إذا صلی علی المیت بور بدفنہ الخ ۱۲ مرتب

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جن دو صورتوں میں "صلاۃ علی القبر" کا جواز ہے وہ جواز صرف اتنی مدت تک ہے جب تک کہ میت کے اعضاء منتشر نہ ہوئے ہوں، پھر اس کی حد تین دن بیان کی گئی ہے لیکن اصح یہ ہے کہ اس کی کوئی متعینہ مدت مقرر نہیں بلکہ اماکن کے اختلاف سے حکم مختلف ہو سکتا ہے مدار اسی پر ہے کہ میت کے اعضاء میں انتشار نہ ہوا ہو[1]۔

بہرحال دو صورتوں کے سوا کسی بھی صورت میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک "صلاۃ علی القبر" جائز نہیں۔

ہماری دلیل طبرانی میں حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے "أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی أن یصلی علی الجنائز بین القبور" (قال الهیثمی) رواہ الطبرانی فی الأوسط و إسنادہ حسن[2]۔ علامہ عثمانیؒ اس حدیث کو ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ جب قبور کے درمیان نماز جنازہ ممنوع ہے تو عین قبر پر نماز جنازہ بطریق اولیٰ ممنوع ہوگی[3]۔

ہماری ایک دلیل تعامل امت بھی ہے کہ سلف و خلف میں سے کسی نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر نماز نہیں پڑھی حالانکہ انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے اجساد مبارک بعینہٖ محفوظ رہتے ہیں اور زمین انھیں ادنیٰ نقصان نہیں پہنچاتی[4]۔

جہاں تک حدیث باب کا تعلق ہے سو وہ آپ کی خصوصیت ہے اس لئے کہ آپ تمام مؤمنین کے ولی ہیں جیسا کہ ارشاد ہے "اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ"[5]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت پر مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت دلیل ہے "أن امرأۃ سوداء کانت تقم المسجد أو شابًا ففقدھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فسأل عنها أو عنه، فقالوا: مات، قال: أفلا کنتم آذنتمونی؟ قال: فکأنهم

---

[1] مذاہب وغیرہ کی مذکورہ تفصیل بدایۃ المجتہد (ج۱ ص۲۳۵، الباب الخامس، الفصل الأول، المسألۃ السابعۃ) اور بدائع الصنائع (ج۱ ص۳۱۵) فصل: وأما بیان ما تصح بہ وما تفسد و ما یکرہ سے ماخوذ ہے ۱۲ م

[2] مجمع الزوائد (ج ۳ ص۳۹) باب الصلاۃ علی الجنازۃ بین القبور ۱۲ م

[3] فتح الملہم (ج ۲ ص۴۹۵) باب ماجاء فی الصلاۃ علی القبر الخ ۱۲ م

[4] حوالۂ بالا ۱۲ م

[5] سورۃ الاحزاب آیت ۶ پ ۲۱۔ ۱۲ م

صغروا أمرها أو أمره، فقال: دُلّونی علی قبره، فدلّوه فصلّی علیها، ثم قال: إن هذه القبور مملوءة ظلمة علی أهلها و إن الله ینوّرها لهم بصلاتی علیهم[1]"، اس روایت کا آخری جملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت پر دال ہے۔

اس سے زیادہ صریح روایت صحیح ابن حبان میں حضرت یزید بن ثابتؓ کی ہے، فرماتے ہیں: "خرجنا مع رسول الله صلی الله علیه وسلم، فلما وردنا البقیع إذا هو بقبر، فسأل عنه؟ فقالوا: فلانة، فعرفها فقال: ألا آذنتمونی بها؟ قالوا: کنت قائلاً صائماً، قال: فلا تفعلوا، لا أعرفنّ ما مات منکم میت ما کنت بین أظهرکم إلا آذنتمونی به فإن صلاتی علیه رحمة قال: ثم أتی القبر فصففنا خلفه وکبّر علیه أربعاً[2]"

باب ما جاء فی القیام للجنازة

"عن عامر بن ربیعة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: إذا رأیتم الجنازة فقوموا لها حتی تخلّفکم أو توضع[3]" امام احمدؒ و امام اسحاقؒ، ابن حبیب مالکیؒ اور ابن ماجشون مالکیؒ کے نزدیک جنازے کے لئے قیام اور عدم قیام دونوں کا اختیار ہے بلکہ ابن حزمؒ تو قیام کے استحباب کے قائل ہیں، جبکہ امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ اس قیام کو منسوخ مانتے ہیں[4] اور اگلے باب (باب الرخصة فی ترك القیام لها) میں حضرت علیؓ کی روایت

---

[1] صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۰۹ و ۳۱۰) کتاب الجنائز ۱۲ مرتب

[2] یہ روایت صحیح ابن حبان کے علاوہ مستدرک حاکم (ج ۳ ص ۵۹۱، کتاب الفضائل) میں بھی آئی ہے اور امام حاکمؒ نے اس پر سکوت کیا ہے، نیز مسند احمد (ج ۴ ص ۳۸۸) میں بھی مروی ہے۔ دیکھئے نصب الرایہ مع حاشیته بغیة الألمعی (ج ۲ ص ۲۶۵) فصل فی الصلاة علی المیت۔

مذکورہ کتب کے علاوہ یہ روایت درج ذیل کتب میں بھی مروی ہے:

سنن نسائیؒ (ج ۱ ص ۲۸۴) الصلاة علی القبر۔ سنن ابن ماجہ (ص ۱۱۰) باب ما جاء فی الصلاة علی القبر۔ شرح معانی الآثار (ج ۱ ص ۲۴۲) باب الدفن باللیل۔ سنن کبریٰ بیہقی (ج ۴ ص ۴۸) باب الصلاة علی القبر بعد ما یدفن المیت ۱۲ م

[3] الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحه (ج ۱ ص ۱۷۵) باب القیام للجنازة۔ و مسلم فی صحیحه (ج ۱ ص ۳۱۰) فصل فی استحباب القیام للجنازة و جواز القعود ۱۲ م

[4] مذاہب کے لئے دیکھئے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۱۰ و حاشیه الکوکب الدری (ج ۲ ص ۱۹۲) ۱۲ م

کواس کے لئے ناسخ قرار دیتے ہیں «أنه ذکر القیام فی الجنائز حتی توضع فقال علیؓ: قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم قعد[1]» جس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شروع میں جنازہ کے لئے قیام فرماتے تھے پھر بعد میں آپؐ نے اس کو ترک کر دیا تھا، فکان لا یقوم إذا رأی الجنازة[2]۔ یہ روایت طحاوی[3] میں زیادہ صریح الفاظ کے ساتھ آئی ہے اور نسخ پر دال ہے «عن علی بن أبی طالب قال: قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع الجنازة حتی توضع وقام الناس معہ ثم قعد بعد ذلك وأمرهم بالقعود» اس روایت کے رجال مسلم کے رجال ہیں[4] نیز بیہقی میں بھی مروی ہے[5]۔ واللہ أعلم

باب ماجاء فی قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللحد لنا والشق لغیرنا

«عن[6] ابن عباس قال: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: "اللحد[7] لنا والشق لغیرنا» اس روایت کا ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ "لحد" مسلمانوں کے لئے ہے اور "شق" یہود ونصاریٰ وغیرہ دوسرے کفار کے لئے، اس صورت میں روایت "شق" پر "لحد" کی فضیلت پر دال ہوگی۔

اس کا دوسرا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ "لحد" اہل مدینہ کے لئے ہے اور "شق" اہل مکہ

---

[1] یہ روایت سنن ابی داؤد (ج ۲ ص۴۵۲) باب القیام للجنازة میں بھی آئی ہے ۱۲ م

[2] بلکہ سنن ابی داؤد میں حضرت عبادہ بن صامتؓ کی ایک روایت سے ترکِ قیام کی وجہ بھی معلوم ہوتی ہے فرماتے ہیں: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقوم فی الجنازة حتی توضع فی اللحد، فمرّ به حبر من الیهود فقال: هکذا نفعل، فجلس النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقال: اجلسوا خالفوهم» (ج ۲ ص۴۵۲) باب القیام للجنازة ۱۲ م

[3] (ج ۱ ص۲۳۵) باب الجنازة تمر بالقوم أیقومون لها أم لا؟ ۱۲ م

[4] اعلاء السنن (ج ۸ ص۲۲۸) باب القیام لتابع الجنازة الخ ۱۲ م

[5] (ج ۴ ص۲۷) باب حجة من زعم أن القیام للجنازة منسوخ ۱۲ م

[6] الحدیث أخرجه النسائی فی سننه (ج ۱ ص۲۸۳) باب اللحد والشق۔ وأبوداؤد فی سننه (ج ۲ ص۴۵۸) باب فی اللحد۔ وابن ماجه فی سننه (ص۱۱۱) باب ماجاء فی استحباب اللحد ۱۲ م

[7] صفة اللحد أن یحفر القبر ثم یحفر فی جانب القبلة منه حفیرة فیوضع فیه المیت، وصفة الشق أن یحفر حفیرة فی وسط القبر فیوضع فیه المیت۔ بدائع الصنائع (ج ۱ ص۳۱۸) فصل وأما سنة الحفر ۱۲ مرتب

کے لئے، اس صورت میں کسی ایک کی فضیلت کا بیان نہیں ہوگا بلکہ بیانِ واقع ہوگا کہ مدینہ کی زمین سخت ہونے کی بنا پر "لحد" کی صلاحیت رکھتی ہے اس لئے اہلِ مدینہ "لحد" بناتے ہیں اور مکہ کی سرزمین چونکہ ریتیلی ہونے کی بنا پر "لحد" کی صلاحیت نہیں رکھتی اس لئے وہاں شق کو اختیار کیا جاتا ہے[۱]۔

ان دونوں مطلبوں میں پہلا مطلب راجح ہے، چنانچہ جمہور لحد کی افضلیت کے قائل ہیں[۲] البتہ اگر زمین نرم ہو اور اس میں "لحد" کی صلاحیت نہ ہو تو شق ہی درست ہے[۳]۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی الثوب الواحد یلقی[۱] تحت المیّت

"حدثنا عثمان بن فرقد قال سمعت جعفر بن محمد عن أبیه[۲] قال: الذی ألحد قبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أبوطلحة، والذی ألقی القطیفة تحته شقران مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" اس حدیث کی بنا پر شافعیہ میں سے علامہ بغویؒ فرماتے ہیں کہ قبر میں

---

[۱] دیکھئے لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح (ج ۴ ص ۳۲۹) باب دفن المیت، الفصل الثانی، رقم الحدیث ع۱۷۰۱ - ۱۲ م

[۲] کما فی شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۱۱) فصل فی استحباب اللحد ۱۲ م

[۳] لیکن یہاں ایک سوال رہ جاتا ہے کہ جب "لحد" "شق" کے مقابلہ میں افضل ہے اور مدینہ منورہ کی سرزمین اس کی صلاحیت بھی رکھتی ہے تو صحابہ کرامؓ کے درمیان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو "لحد" یا "شق" بنانے میں اختلاف کیوں ہوا؟ جیسا کہ روایات سے اس اختلاف کا پتہ چلتا ہے، دیکھئے سنن ابن ماجہ (ص ۱۱۲) باب ماجاء فی الشق اور طبقات ابن سعد (ج ۲ ص ۲۹۵) ذکر حفر قبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللحد لہ۔

حضرت گنگوہی قدس سرہ اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"والجواب أنہم وإن کانوا علی ثقة واستیقان من کون اللحد أفضل إلا أن ما لزمه من العوارض جعل الشق مختارًا عندہم وراجحًا علی اللحد، لا لفضل فی نفسہ علی اللحد بل لتلک العوارض، منہا ما وقع فی تکفینه صلی اللہ علیہ وسلم ودفنه من تاخیرات، فلو أنہم اشتغلوا باللحد لزاد التراخی علی التراخی"۔ الکوکب الدری (ج ۲ ص ۱۹۳) ۱۲ مرتب عفی عنہ

[۴] الحدیث لم یخرجه من أصحاب الکتب الستة سوی الترمذی۔ قاله الشیخ محمد فؤاد عبدالباقی۔ سنن ترمذی (ج ۳ ص ۳۶۵، رقم الحدیث ع۱۰۴۷) ۱۲ م

میت کے نیچے چادر وغیرہ بچھانے میں کوئی حرج نہیں لیکن امام شافعیؒ سمیت جمہور اس کی کراہت کے قائل ہیں[1] اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے صحابہ کرامؓ سے یہ عمل ثابت نہیں[2] بلکہ ابوبردہ سے مروی ہے فرماتے ہیں: «أوصى أبو موسى حين حضره الموت قال إذا انطلقتم بجنازتي فأسرعوا بي المشي ولا تتبعوني بمجمر، ولا تجعلن على لحدي شيئاً يحول بيني وبين التراب» پھر روایت کے آخر میں ہے: «قالوا له: سمعت فيه شيئاً؟ قال: نعم، من رسول الله صلى الله عليه وسلم[3]»۔

جہاں تک حدیث باب کا تعلق ہے سو یہ فعل حضرت شقرانؓ نے صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے نہیں کیا تھا بلکہ عین ممکن ہے کہ صحابہ کرامؓ کو اس کا علم ہی نہ ہو، پھر قبر مبارک بھی گہری تھی اس میں آسانی سے چادر بھی نظر نہ آسکتی تھی[4]۔

پھر خود حضرت شقرانؓ کا یہ فعل سنتِ تدفین کے طور پر نہ تھا بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ آپ کی چادر آپ کے بعد کوئی استعمال نہ کرسکے جیساکہ التلخیص الحبیر کی ایک روایت میں اس کی تصریح بھی آئی ہے[5]۔

اس کے علاوہ حافظؒ نقل کرتے ہیں: «وذكر ابن عبد البر أن تلك القطيفة استخرجت

---

[1] دیکھئے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۳۱۱) ۱۲ م

[2] بلکہ حضرت ابن عباسؓ سے اس کی کراہت بھی منقول ہے چنانچہ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں «وقد روي عن يزيد بن الأصم عن ابن عباس أنه كره أن يجعل تحت الميت ثوباً في القبر» سنن کبریٰ بیہقی (ج ۳ ص۴۰۸) کتاب الجنائز، باب ما روي في قطيفة رسول الله صلى الله عليه وسلم ۱۲ م

[3] سنن کبریٰ بیہقی (ج ۳ ص۳۹۵) کتاب الجنائز، باب لا يتبع الميت بنار ۱۲ م

[4] الکوکب الدری (ج ۲ ص۱۹۱) ۱۲ م

[5] چنانچہ حافظؒ لکھتے ہیں: «وروى ابن إسحاق في المغازي والحاكم في الإكليل من طريقه والبيهقي عنه عن طريق ابن عباس قال: كان شقران حين وضع رسول الله صلى الله عليه وسلم في حفرته أخذ قطيفة قد كان يلبسها ويفترشها فدفنها معه في القبر وقال: والله لا يلبسها أحد بعدك فدفنت معه» التلخیص الحبیر (ج ۲ ص۱۳۱، تحت رقم ۸۰۸) کتاب الجنائز۔

امام بیہقیؒ اپنی سنن کبریٰ میں اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: «فهذه الرواية - إن كانت ثابتة - دلالة على أنهم لم يفرشوها في القبر استعمالاً للسنة في ذلك» (ج ۳ ص۴۰۸) باب ما روي في قطيفة رسول الله صلى الله عليه وسلم ۱۲ مرتب

قبل أن یہال التراب[1] » جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب صحابہ کرامؓ کو اس چادر کے رکھنے کا علم ہوا تو انہوں نے وہ چادر نکلوادی، اس سے بھی جمہور کے مسلک کی تائید ہوتی ہے ۔ واللہ اعلم۔

باب ما جاء فی تسویۃ القبر

« عن أبی[2] وائل أن علیاً قال لأبی الهیاج الأسدی: أبعثک علی ما بعثنی به النبی صلی اللہ علیہ وسلم: أن لا تدع قبراً مشرفاً إلا سویته ولا تمثالاً إلا طمسته » اس روایت میں قبر مشرف سے مراد وہ قبر ہے جو قدر مسنون سے زائد اونچی ہو، دراصل اہل جاہلیت قبروں پر باقاعدہ عمارت بنالیتے تھے اور انہیں بہت زیادہ اونچا کر دیتے تھے اسلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔ لہذا اس روایت میں "تسویہ" سے مراد بالکل زمین کے برابر کر دینا نہیں ہے جیسا کہ بعض اہل ظاہر نے سمجھا بلکہ اس کا صحیح ترجمہ "ٹھیک کرنا" یعنی "قاعدہ کے مطابق لانا" ہے کما فی قولہ تعالیٰ: « وَنَفْسٍ وَمَا سَوّٰىهَا[3] » چنانچہ بیشتر فقہاء کے نزدیک قبر کو ایک بالشت تک بلند کرنا مشروع ہے[4] اور اس کا جواز متعدد روایات سے ثابت ہے۔

سنن ابی داؤد[5] میں حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکرؒ کا واقعہ مذکور ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخینؓ کی قبریں دیکھنے کی فرمائش کی، اس کے بارے میں وہ فرماتے ہیں: « فکشفت لی عن ثلاثة قبور لا مشرفة ولا لاطئة الخ » یعنی وہ قبریں نہ زیادہ اونچی تھیں اور نہ زمین

---

[1] التلخیص (ج ۲ ص ۱۳۱) اسی مقام پر حافظؒ آگے چل کر لکھتے ہیں « وروی الواقدی عن علی بن حسین أنهم أخرجوها، وبذلک جزم ابن عبد البر » ۱۲ م

[2] الحدیث أخرجه مسلم فی صحیحه (ج ۱ ص ۳۱۲) فصل فی تسویة القبر۔ وأبو داؤد فی سننه (ج ۲ ص ۴۵۹) باب فی تسویة القبر ۱۲ م

[3] سورۃ الشمس آیت ۷، پ ۳۰ ۔ ۱۲ م

[4] دیکھئے بدائع الصنائع (ج ۲ ص ۳۲۰) فصل وأما سنة الدفن ۔ المجموع (ج ۵ ص ۲۹۵،۲۹۶) ولا یزاد فی التراب التی أخرج من القبر الخ ۔ اور المغنی (ج ۲ ص ۵۰۴) فصل وإذا فرغ من اللحد أهال علیه التراب الخ ۱۲ م

[5] (ج ۲ ص ۴۵۹) باب فی تسویة القبر ۱۲ م

کے برابر۔

صحیح ابن حبّان اور بیہقیؒ میں حضرت جابرؓ کی حدیث ہے " أنه ألحد لرسول الله صلى الله صلى الله لحدًا ونصب عليه اللبن نصبًا، ورفع قبره عن الأرض قدر شبر[۱] "

نیز امام ابو داؤدؒ نے اپنی مراسیل[۳] میں صالح بن ابی صالحؒ سے روایت کیا ہے " رأيتُ قبر النبي صلى الله عليه وسلم شبرًا أو نحوًا من شبر يعني في الارتفاع "۔

حدیثِ باب میں " تسویہ " کا جو مطلب ہم نے بیان کیا اگلے باب میں ابو مرثد غنویؓ کی روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے فرماتے ہیں " لا تجلسوا على القبور ولا تصلوا إليها " ظاہر ہے کہ اگر قبر زمین کے بالکل برابر ہو اور اس میں اور زمین میں امتیاز نہ ہو تو اس حکم پر کیسے عمل ہو سکتا ہے ؟ نیز پیچھے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث گزری ہے : " ورأى قبرًا منتبذًا فصف أصحابه خلفه فصلى عليه[۴] " اگر قبر ممتاز نہ ہوتی تو آپ اُسے کیسے پہچانتے جبکہ وہ قبرستان سے بالکل الگ تھی۔

ایک اور مضبوط دلیل صحیح بخاریؒ[۵] میں سفیان تمارؒ کی روایت ہے " أنه رأى قبر النبي صلى الله عليه وسلم مسنّمًا "

ان تمام روایات سے قبر کو ایک حد تک بلند کرنے کی اجازت معلوم ہوئی البتہ ایک شبر سے زیادہ قبر کو بلند کرنا مکروہ ہے اور جو قبر اس سے زیادہ بلند ہو اس کو ایک شبر تک لے آنا مستحب ہے، حدیثِ باب میں " لا تدع قبرًا مشرفًا إلا سوّيته " اسی پر محمول ہے[۶]۔

---

[۱] (ج ۳ ص۴۱۰) باب لا يزاد في القبر على أكثر من ترابه لئلا يرتفع جدًا۔ بیہقی کی اس روایت میں " ورفع قبره من الأرض نحوًا من شبر " کے الفاظ آئے ہیں۔ ۱۲ م

[۲] التلخيص الحبير (ج ۲ ص۱۳۲، رقم ۷۸۹) ۱۲ م

[۳] (ص۱۸) في الدفن ۱۲ م

[۴] ترمذی (ج ۲ ص۱۵۵) باب ماجاء في الصلاة على القبر ۱۲ م

[۵] (ج ۱ ص۱۸۶) باب ماجاء في قبر النبي صلى الله عليه وسلم وأبي بكر وعمر ۱۲ م

[۶] اس روایت کے بارے میں علامہ ماردینیؒ فرماتے ہیں " الظاهر أن المراد قبور المشركين، بقرينة عطف " التمثال " عليها، وكانوا يجعلون عليها الأنصاب والأبنية فأراد عليه السلام إزالة آثار الشرك " الجوهر النقي في ذيل السنن الكبرى للبيهقي (ج ۴ ص۳) باب تسوية القبور أو تسطيحها۔ اس قول کی تقدیر پر " إلا سويته " سے قبروں کو یکسر ختم کرکے زمین کے برابر کردینا بھی مراد لیا جاسکتا ہے لیکن یہ حکم قبورِ مشرکین کے ساتھ مخصوص ہوگا ۱۲ مرتب

پھر قبروں کو ایک بالشت کے بقدر اونچا کرنے کی ہیئت کیا ہوگی اس کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ اور سفیان ثوریؒ کا مسلک یہ ہے کہ قبر کو کوہان نما بنایا جائے گا جبکہ امام شافعیؒ کے نزدیک اس کو مسطح اور مربع بنایا جائے گا۔[1]

ہماری دلیل صحیح بخاری میں سفیان تمار کی روایت ہے جو ابھی گذر چکی ہے یعنی "أنه رأى قبر النبي صلى الله عليه وسلم مسنّماً"۔

نیز مصنف[2] ابن ابی شیبہ میں سفیان تمار ہی کی روایت ہے فرماتے ہیں "دخلت البيت الذي فيه قبر النبي صلى الله عليه وسلم، فرأيت قبر النبي صلى الله عليه وسلم وقبر أبي بكر وعمر مسنّمة" اس روایت کی سند بھی صحیح ہے کما فی اعلاء السنن[3]۔ ابن سعد نے بھی طبقات[4] میں اس روایت کو ذکر کیا ہے۔

امام شافعیؒ اپنے استدلال میں فرماتے ہیں "بلغنا أن رسول الله صلى الله عليه وسلم سطح قبر ابنه إبراهيم" نیز حدیثِ باب میں "إلا سويته" کو بھی مسطح بنانے پر محمول کرتے ہیں[5]۔

واضح رہے کہ یہ اختلاف فضیلت میں ہے ورنہ جائز دونوں طریقے ہیں[6]۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی الرخصة فی زیارة القبور

"عن سليمان بن بريدة عن أبيه[8] قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم قد كنت

---

[1] المغنی (ج ۲ ص۵۰۵) فصل: وتسنيم القبر أفضل من تسطيحه ـ بدائع الصنائع (ج ۱ ص۳۲۰) فصل وأما سنة الدفن ۱۲ م

[2] (ج ۳ ص۳۳۴) ما قالوا في القبر يسنم ـ مصنف میں اس مقام پر تسنیم قبر سے متعلق اور بھی روایات ذکر ہیں۔ فلیراجع ۱۲ م

[3] (ج ۸ ص۲۷۱) باب النهي عن تربيع القبور واختيار تسنيمها ۱۲ م

[4] (ج ۲ ص۳۰۶) ذكر تسنيم قبر رسول الله صلى الله عليه وسلم ۱۲ م

[5] المغنی (ج ۲ ص۵۰۵) ۱۲ م

[6] نصب الرایہ (ج ۲ ص۳۰۵) فصل فی الدفن ۱۲ م

[7] فتح الباری (ج ۳ ص۲۵۷) باب ماجاء في قبر النبي صلى الله عليه وسلم وقبر أبي بكر وعمر رضي الله عنهما ۱۲ م

[8] الحديث أخرجه مسلم في صحيحه (ج ۱ ص۳۱۴) فصل في الذهاب إلى زيارة القبور ـ والنسائي في سننه (ج ۱ ص۲۸۵) زيارة القبور ۱۲ م

نهیتکم عن زیارة القبور وقد اذن لمحمد فی زیارة قبر أمّه فزوروها فإنها تذکر الآخرة » نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع اسلام میں جبکہ قوم کے عقائد پختہ نہ تھے زیارتِ قبور سے منع فرمادیا تھا لیکن بعد میں جب عقائد میں پختگی پیدا ہوگئی تو زیارتِ قبور کی اجازت دیدی گئی کما فی حدیث الباب۔

حدیثِ باب میں جو « فزوروھا » کا صیغۂ امر ہے وہ اباحت اور ندب کے لئے ہے چنانچہ جمہور کا اس پر اتفاق ہے کہ مردوں کے لئے زیارتِ قبور مسنون و مستحب ہے[1] واجب نہیں البتہ صرف ابن حزمؒ اس بات کے قائل ہیں کہ زیارتِ قبور مردوں کے لئے واجب ہے اگرچہ زندگی میں ایک مرتبہ ہو وہ حدیثِ باب میں « فزوروھا » کے امر کو وجوب کے لئے مانتے ہیں[2]۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی کراهیة زیارة القبور للنساء

« عن ابی[3] هریرة أن رسول الله صلی الله علیه وسلم لعن زوّارات القبور » جمہور کے نزدیک عورتوں کے لئے زیارتِ قبور مکروہ ہے[4]۔

جہاں تک حنفیہ کا تعلق ہے سو اس بارے میں ان کی دو روایات ہیں ایک عدمِ جواز کی[5]، جس کی دلیل حضرت ابوہریرہؓ کی حدیثِ باب ہے۔

---

[1] شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۳۱۴) ۱۲ م

[2] فتح الباری (ج ۳ ص۱۴۸) باب زیارة القبور۔ ونیل الاوطار (ج ۴ ص۱۱۸و۱۱۹) باب استحباب زیارة القبور للرجال دون النساء ۱۲ م

[3] الحدیث أخرجه ابن ماجه فی سننه (ص۱۱۳) باب ماجاء فی النهی عن زیارة النساء القبور ۱۲ م

[4] خود اصحابِ مذاہب کے ہاں اس مسئلہ میں اختلاف ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے المجموع شرح المهذب (ج ۵ ص۳۰۹ تا ص۳۱۱) ویستحب للرجال زیارة القبور۔ المغنی (ج ۲ ص۵۷۰) مسألة: قال: وتکره للنساء۔ الفقه الاسلامی وأدلته (ج ۲ ص۵۳۹ تا ۵۴۲) زیارة القبور ۱۲ م

[5] حنفیہ کے نزدیک زیارتِ قبور للنساء کے عدمِ جواز کی کوئی مطلق روایت تو احقر کو نہ مل سکی البتہ صاحب ردالمحتار لکھتے ہیں « وقال الخیر الرملی: إن کان ذلك لتجدید الحزن والبکاء والندب علی ما جرت به عادتهن فلا تجوز » کذا فی فتح الملهم (ج ۲ ص۵۱۲) أحادیث زیارة القبور ۱۲ مرتب

دوسری روایت یہ ہے کہ زیارتِ قبور عورتوں کے لئے بھی بغیر کراہت کے جائز ہے[1]۔ فتاوی عالمگیری میں شمس الائمہ سرخسیؒ سے نقل کیا گیا ہے «الأصح أنه لا بأس بها[2]»۔

اس قول کی تائید پچھلے باب میں حضرت بریدہؓ کی روایت سے ہوتی ہے جس میں ممانعت کے بعد «فزوروها» کا حکم دیا گیا ہے جو مردوں اور عورتوں سب کو شامل ہے اس لئے کہ عورتیں تمام احکام میں مردوں کے تابع ہوتی ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے التلخیص الحبیر[3] میں زیارتِ قبور للنساء کے جواز پر مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: «کیف أقول لهم یا رسول اللہ؟ (تعني إذا زارت القبور) قال: قولي: السلام علی أهل الدیار من المؤمنین والمسلمین ویرحم الله المستقدمین منا والمستأخرین وإنا إن شاء الله بکم للاحقون[4]»۔

حافظؒ نے جواز کی ایک دلیل مستدرک حاکم کے حوالہ سے ذکر کی ہے «عن علي أن فاطمة بنت النبي صلی الله علیه وسلم کانت تزور قبر عمها حمزة کل جمعة فتصلي وتبکي عنده[5]»۔ لیکن اس روایت کی سند ضعیف ہے کما حققه الذهبي[6]۔

جواز کی ایک دلیل صحیح بخاریؒ[7] میں حضرت انسؓ کی روایت ہے «قال: مرّ النبي صلی الله علیه وسلم بامرأة تبکي عند قبر، فقال: اتقي الله واصبري، قالت: إلیك عني (أی تنحّ عني وابعد) فإنك لم تصب بمصیبتي، ولم تعرفه، فقیل لها: إنه النبي صلی الله علیه وسلم فأتت باب النبي صلی الله علیه وسلم

---

[1] چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے «لا بأس بزیارة القبور وهو قول أبي حنیفة رحمه الله تعالیٰ وظاهر قول محمد رحمه الله تعالیٰ یقتضي الجواز للنساء أیضاً لأنه لم یخص الرجال (ج ۵ ص۳۵۰) کتاب الکراهیة، الباب السادس عشر في زیارة القبور ۱۲ م

[2] چنانچہ مبسوط سرخسی میں صراحت کے ساتھ ذکر ہے «والأصح عندنا أن الرخصة ثابتة في حق الرجال والنساء جمیعاً»۔ دیکھئے (ج ۲۴ ص۱۰) کتاب الأشربة، الرخصة في زیارة القبور ۱۲ م

[3] (ج ۲ ص۱۳۷) تحت رقم ۷۹۵ - ۱۲ م

[4] صحیح مسلم (ج ۱ ص۳۱۳) قبیل کتاب الزکوٰة ۱۲ م

[5] تلخیص (ج ۲ ص۱۳۷) ۱۲ م

[6] چنانچہ حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں: (قلت) هذا منکر جداً وسلیمان ضعیف۔ دیکھئے تلخیص المستدرک بذیل المستدرک (ج ۱ ص۳۷۷) کتاب الجنائز ۱۲ مرتب

[7] (ج ۱ ص۱۷۱) باب زیارة القبور ۱۲ م

فلم تجد عنده بوّابين، فقالت: لم أعرفك، فقال: إنما الصبر عند الصدمة الأولىٰ»
معلوم ہوا کہ آپؐ نے اس عورت کو صبر کی تلقین تو کی لیکن زیارتِ قبر کی وجہ سے اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی۔

زیارت القبور للنساء کے جواز کی ایک دلیل طبقات[1] ابن سعد کی روایت ہے «أخبرنا موسی بن داؤد سمعت مالك بن أنس يقول: قسم بيت عائشة باثنين، قسم كان فيه القبر، وقسم كان تكون فيه عائشة وبينهما حائط، فكانت عائشة ربما دخلت حيث القبر فضلاً[2]، فلما دُفن عمر لم تدخله إلا وهي جامعة عليها ثيابها[3]»

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں «احوال کے اختلاف سے حکم بدل جائیگا[4]»، مطلب یہ ہے کہ اگر عورتوں سے کثرتِ جزع یا بے پردگی، مَردوں سے اختلاط یا بدعات کے ارتکاب یا کسی اور فتنے کا اندیشہ ہو تو مخالفت راجح ہے اور ایسا اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے، اگلے باب میں حضرت عائشہؓ کے واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ان کا حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کی قبر پر جانا زیارتِ قبور للنساء کے جواز کی دلیل ہے اور آخر میں یہ فرمانا کہ «ولو شهدتك ما زرتك» اس بات کی دلیل ہے کہ اس اجازت کو عام نہ کرنا چاہیے کیونکہ عام اجازت سے خطرہ ہے کہ عورتیں شرائط کی پابندی نہیں کریں گی۔ واللہ أعلم

---

[1] (ج ۲ صـ۲۹۴) ذکر موضع قبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ م

[2] یعنی عام لباس میں، «يقال: تفضلت المرأة: إذا لبست ثياب مهنتها أو كانت في ثوب واحد فهي فُضُلٌ والرجل فُضُلٌ أيضاً» النہایہ فی غریب الحدیث والاثر (ج ۳ صـ۴۵۶) ۱۲ م

[3] زیارتِ قبور للنساء کے جواز کی ایک اور دلیل «التمہید» میں عبداللہ بن ابی ملیکہؒ کی روایت ہے «أن عائشة رضي الله تعالى عنها أقبلت ذات يوم من المقابر، فقلت لها: يا أم المؤمنين، من أين أقبلت؟ قالت: من قبر أخي عبدالرحمن بن أبي بكر رضي الله عنه، فقلت لها: أليس كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ينهى عن زيارة القبور؟ قالت: نعم، كان ينهى عن زيارتها ثم أمر بزيارتها» كذا في عمدة القاري (ج ۸ صـ۶۹) باب زيارة القبور۔

اس سے معلوم ہوا کہ پچھلے باب میں «قد كنت نهيتكم عن زيارة القبور..... فزوروها» والی روایت حضرت عائشہؓ کے نزدیک اجازت مردوں اور عورتوں سب کو شامل ہے ۱۲ م

[4] دیکھئے العرف الشذی تحت سنن الترمذی (ج ۱ صـ۲۰۳) ۱۲ م

باب ماجاء فی الزیارۃ للقبور للنساء

«عن عُبَیداللہ بن أبی ملیکۃ قال: توفی عبدالرحمٰن بن أبی بکر بالحُبشی، قال: فحُمل إلی مکۃ فدفن فیہا» میت کو ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل کرنے کے بارے میں اختلاف ہے بعض حضرات کے نزدیک یہ مکروہ ہے اور بعض کے نزدیک جائز، ایک قول یہ ہے کہ ایک دومیل شہر سے باہر لیجانے میں حرج نہیں اس سے زائد مکروہ ہے، ایک قول یہ ہے کہ ما دون السفر لیجانے کی گنجائش ہے، ایک قول یہ ہے کہ سفر کے بقدر لیجانا بھی مکروہ نہیں، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانا پسندیدہ نہیں الا یہ کہ مکہ، مدینہ اور بیت المقدس میں سے وہ کسی سے قریب ہو تو اس صورت میں وہاں منتقل کردینا درست ہے۔ امام محمدؒ سے منقول ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا گناہ اور معصیت ہے[1]۔

بہرحال حنفیہ کے ہاں فتویٰ اس پر ہے کہ نعش کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک لیجانا جائز نہیں الا یہ کہ وہ دوسرا مقام ایک دومیل کے فاصلہ پر ہو اور دفن کے بعد نعش نکالکر لے جانا تو ہرحالت میں ناجائز ہے[3]۔

فلما قدمت عائشۃ أتت قبر عبدالرحمٰن بن أبی بکر فقالت:

وکنّا کندمانی جذیمۃ حقبۃ ... من الدھر حتی قیل لن یتصدعا
فلما تفرقنا کأنی و مالکًا ... لطول اجتماع لم نبت لیلۃ معًا[4]

---

[1] لم یخرجہ من أصحاب الکتب الستۃ أحد سوی الترمذی- قالہ الشیخ محمد فؤاد عبدالباقی. سنن ترمذی (ج ۳ ص۳۷۱، رقم ۱۰۵۵) ۱۲ م

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۸ ص۱۶۳ و ص۱۶۴) باب ھل یخرج المیت من القبر واللحد لعلّۃ۔ اوجزالمسالک (ج ۴ ص۲۵۱) ماجاء فی دفن المیت ۱۲ مرتب

[3] احکام میت (ص۸۸) ۱۲ مر

[4] ترجمہ:- ہم ایک طویل عرصہ تک جذیمہ کے دو مصاحب کی طرح تھے (کہ کبھی جدا نہ ہوتے تھے) یہاں تک کہ کہا جانے لگا کہ یہ دونوں ہرگز جدا نہ ہوں گے، پھر جب ہم ایک طویل عرصہ ساتھ رہنے کے بعد جدا ہوگئے تو ایسے ہوگئے گویا کہ میں نے اور مالک نے ایک رات بھی کبھی ساتھ نہیں گذاری۔

ان دونوں اشعار سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے لمعات التنقیح (ج ۴ ص۳۵۵ و ۳۵۶) باب دفن المیت، الفصل الثالث، رقم (ص۱۷۱۸) ۱۲ مرتب

جذیمہ عراق کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کا نام ہے اس کے دو مصاحب تھے مالک اور عقیل جو ایک طویل عرصہ تک اس کے ساتھ رہے، دونوں ہمیشہ اکٹھے اور ساتھ رہتے تھے یہاں تک سچی دوستی اور طولِ رفاقت میں ضرب المثل بن گئے۔

"حقبہ" طویل زمانے کو کہتے ہیں۔

یہ دونوں شعر متمم بن نویرہ یربوعی کے ہیں جو اس نے اپنے بھائی مالک بن نویرہ کے مرثیہ میں کہے ہیں جو واقعہ ردّت میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے ایک لشکری حضرت ضرار بن الازورؓ کے ہاتھوں قتل کیا گیا[1] متمم کو اپنے بھائی مالک سے شدید محبت تھی اس نے متعدد قصائد مرثیہ کے طور پر مالک کے بارے میں کہے، ادب میں اس کے مراثی کو بڑا مقام حاصل ہے، حضرت عمرؓ ان کے مراثی کو پسند فرماتے تھے اور بلا کر سنا کرتے تھے ایک مرتبہ آپ نے اس سے پوچھا "انك لتجزل في مدح أخيك فأين هو منك؟"

اس پر متمم نے یہ بلیغانہ جواب دیا:

"كان والله أخي في الليلة ذات الأزيز والصر يركب الجمل الثقال ويجنب الفرس الجرور ويحمل الرمح الطويل وعليه الشملة الفلوت وهو بين مزادتين فيصبح وهو متبسم"[2]۔

باب ما جاء في الدفن بالليل

"عن ابن عباس[3] أن النبي صلى الله عليه وسلم دخل قبراً ليلاً" اس سے معلوم ہوا کہ میت کو رات کو دفنانا جائز ہے، چنانچہ جمہور کا یہی مسلک ہے۔

---

[1] مالک بن نویرہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کسی غلط فہمی کی بناء پر مسلمان ہونے کی حالت میں قتل کئے گئے، دیکھئے اسد الغابہ (ج ۲ ص ۹۵) ترجمۃ خالد بن الولید۔

مالک بن نویرہ اور متمم سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے الکامل لابن الاثیر (ج ۲ ص ۳۵۷ تا ۳۶۰) ذکر مالک بن نویرہ ۱۲ مرتب

[2] كما في نزهة الأبصار بطرائف الأخبار والأشعار (ج ۲ ص ۱۷۸، شعر متمم بن نويرة اليربوعي)۔

ترجمہ: خدا کی قسم! میرا بھائی جاڑے کی ٹھٹھری ہوئی رات میں سرکش اونٹوں پر سوار ہوتا، منہ زور گھوڑے دوڑاتا، لمبے لمبے نیزے اٹھاتا، ایسے میں اس پر صرف ایک تنگ چادر ہوتی اور وہ پانی کی دو مشکوں کے درمیان بیٹھا ہوتا، جب صبح ہوتی تو اس پر تبسم کھیل رہا ہوتا ۱۲ مرتب

[3] الحديث أخرجه من أصحاب الكتب الستة أحد سوى الترمذي، قاله الشيخ محمد فؤاد عبد الباقي۔ جامع ترمذی (ج ۳ ص ۳۷۲، رقم ۱۰۵۷) ۱۲ م

البتہ حسن بصریؒ، سعید بن المسیبؒ اور قتادہؒ کے نزدیک رات کو دفنا نا مکروہ ہے، امام احمدؒ کی ایک روایت بھی اسی کے مطابق ہے، ابن حزمؒ کہتے ہیں رات کو دفنانا جائز ہی نہیں الّا یہ کہ کوئی مجبوری ہو۔

ان حضرات کی دلیل حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے " أن رجلاً من بنی عذرة دفن لیلاً ولم یصل علیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فنھی عن الدفن لیلاً " نیز حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے " أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا تدفنوا موتاکم باللیل[1] "

حدیثِ باب کے علاوہ جمہور کی دلیل صحیح بخاری[2] میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے " قال: صلی النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی رجل بعد ما دفن بلیلة قام ھو وأصحابہ وکان سأل عنہ، فقال: من ھذا؟ قالوا: فلان، دفن البارحة، فصلّوا علیہ " اگر میّت کو رات کو دفن کرنے میں کوئی کراہت ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس موقعہ پر ضرور نکیر فرماتے۔

نیز رات کو دفنانا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے، چنانچہ سنن ابی داؤد[3] میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت آئی ہے فرماتے ہیں " رأی ناس ناراً فی المقبرة، فأتوھا، فإذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی القبر، وإذا ھو یقول: ناولونی صاحبکم الخ "

اس کے علاوہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم رات کو دفنائے گئے[4] کتبِ حدیث میں اور بھی اس قسم کے واقعات مل سکتے ہیں، ان تمام واقعات کو ضرورت یعنی خوفِ زحام یا خوفِ حرب وغیرہ پر محمول کرنا تکلف سے خالی نہیں۔

جہانتک ان روایات کا تعلق ہے جن سے رات کو دفنانے کی ممانعت یا کراہت معلوم ہوتی ہے ان کا جواب یہ ہے کہ وہ ممانعت رات کو دفنانے کی کراہت کی وجہ سے نہ تھی بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ میں فوت ہونے والے تمام مؤمنین کی نمازِ جنازہ پڑھنا چاہتے تھے اور آپ کا

---

[1] ان دونوں روایات کے لئے دیکھئے طحاوی (ج ۱ ص۲۴۷) باب الدفن باللیل ۱۲ م

[2] (ج ۱ ص۱۷۸ و ۱۷۹) باب الدفن باللیل ۱۲ م

[3] (ج ۲ ص۹۵) باب فی الدفن باللیل ۱۲ م

[4] دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ (ج ۳ ص۳۴۶ و ۳۴۷) باب ماجاء فی الدفن باللیل ۔ طبقات ابن سعد (ج ۲ ص۳۰۴ و ۳۰۵) ذکر دفن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ اسد الغابہ (ج ۴ ص۳۹) ترجمۃ علی بن ابی طالب ۱۲ مرتب

ارشادنا «لا أعرفن ما مات منكم ميّت ما كنت بين أظهركم إلا آذنتموني به فإن صلاتي عليه رحمة[1]» اور رات کو دفنانے میں چونکہ اس کا خطرہ تھا کہ آپؐ کی راحت کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپؐ کو اس کی اطلاع نہ دیجائے اس لئے ممانعت کی گئی[2] واللہ اعلم[3]

«فأسرج له سراج» معلوم ہوا کہ ضرورت کے موقعہ پر قبر کے پاس روشنی وغیرہ کا انتظام کیا جاسکتا ہے، البتہ محض زینت کے لئے چراغ وغیرہ کا جلانا درست نہیں۔

«فأخذه من قبل القبلة» حنفیہ کے نزدیک سنّت یہ ہے کہ میت کو قبلہ کی جانب سے قبر میں داخل کیا جائے جس کی صورت یہ ہو کہ جنازہ کو قبر سے قبلہ کی جانب میں رکھا جائے اور پھر اس کو اسی جانب سے عرضاً قبر میں اتارا جائے[4]۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک «سل» افضل ہے، اس کی صورت یہ ہوگی کہ میت کو قبر کی پائنتی کی جانب اس طریقہ سے رکھا جائے کہ میت کا سر قبر کی پائنتی کے ساتھ ہو، پھر اس کو قبر میں کھینچا جائے اس طور پر کہ سر پہلے قبر میں داخل ہو اور پاؤں بعد میں[5]۔

حنفیہ کی دلیل حدیثِ باب ہے جس میں «فأخذه من قبل القبلة» کے الفاظ آئے ہیں۔

لیکن حدیثِ باب پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کا مدار حجاج بن ارطاۃ پر ہے جو مدلس ہیں اور یہاں اس نے سماع کا ذکر نہیں کیا بلکہ عنعنہ کیا ہے[6]۔

---

[1] نصب الرایہ (ج ۲ ص ۲۶۵) فصل في الصلاة على الميت ۱۲ م

[2] یہ جواب مزید وضاحت کے ساتھ طحاوی (ج ۱ ص ۲۴۷، باب الدفن بالليل) سے ماخوذ ہے ۱۲ م

[3] شروع باب سے یہاں تک کی شرح مرتب کی تحریر کردہ ہے جو بیشتر عمدۃ القاری (ج ۸ ص ۱۵۰ و ۱۵۱، باب الدفن بالليل) سے ماخوذ ہے ۱۲ م

[4] بدائع الصنائع (ج ۱ ص ۳۱۸) فصل و أما سنة الدفن ۱۲ م

[5] «سل» کی کیفیت بدائع الصنائع (ج ۱ ص ۳۱۸) میں مذکورہ تفصیل سے ذرا مختلف بیان کی گئی ہے لیکن ہم نے اس سلسلہ میں اصحابِ مذاہب کی کتابوں پر اعتماد کیا ہے، دیکھئے المجموع شرح المہذب (ج ۵ ص ۲۹۴) فرع في مذاهب العلماء في كيفية إدخال الميت القبر، نیز دیکھئے (ص ۲۹۱ و ۲۹۲) — المغنی (ج ۲ ص ۴۹۶) مسألة: قال: ويدخل قبره من عند رجليه ۱۲ مرتب

[6] نصب الرایہ (ج ۲ ص ۳۰۰) فصل في الدفن ۱۲ م

اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت کو امام ترمذیؒ نے "حسن" قرار دیا ہے اور امام ترمذیؒ حدیث اور فنِ رجال دونوں کے امام ہیں، لہٰذا ان کا اس روایت کو حسن قرار دینا اس حدیث سے استدلال کے لئے کافی ہے نیز معلوم ہوا کہ حجاج بن ارطاۃ ان کے نزدیک ثقہ ہیں اور ثقہ اگر تدلیس کرے تو یہ روایت کے حسن ہونے کے منافی نہیں نیز یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے پاس اس کا کوئی متابع موجود ہو۔[1]

حنفیہ کی ایک اور دلیل مصنف عبد الرزاق کی روایت ہے "أن علیاً أخذ یزید بن المکفف من قِبَل القبلة"[2] یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ[3] میں بھی آتی ہے اور اس کی سند بھی صحیح ہے ابن حزمؒ نے المحلی میں اس کی صحت کا اعتراف کیا ہے۔[4]

امام شافعیؒ کا استدلال سنن ابی داوُدؒ[5] کی روایت سے ہے "عن أبي إسحاق قال: أوصى الحارث أن یصلّي علیه عبد الله بن یزید فصلّى علیه، ثم أدخله القبر من قِبَل رجلي القبر وقال: هذا من السنة"۔

امام شافعیؒ کا ایک استدلال اپنی ہی سند کی ایک روایت سے ہے "عن ابن عباس قال: سُلّ رسول الله صلی الله علیه وسلم من قبل رأسه"[6]۔

---

[1] دیکھئے اعلاء السنن (ج ۸ ص ۲۵۲) باب طریق إدخال المیت فی القبر۔

حدیثِ باب پر ایک اعتراض "منہال بن خلیفہ" کے ضعف کا بھی کیا جاتا ہے۔ کما فی نصب الرایة (ج ۲ ص ۳۰۰)۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ "منہال بن خلیفہ" ایک مختلف فیہ راوی ہیں جہاں ان کی تضعیف کی گئی ہے وہاں بہت سے حضرات نے انہیں ثقہ بھی قرار دیا ہے، بالخصوص امام ترمذیؒ کی تحسین کے بعد اس روایت کے قابلِ استدلال ہونے پر شبہ نہیں کیا جاسکتا، دیکھئے اعلاء السنن (ج ۸ ص ۲۵۲) ۱۲ مرتب

[2] صاحب "مصنف" امام عبد الرزاق بن ہمام صنعانیؒ اس روایت کو ذکر کرکے فرماتے ہیں "وبه نأخذ" دیکھئے (ج ۳ ص ۴۹۹، رقم ۶۴۷۲) باب من حیث یدخل للمیت القبر ۱۲ م

[3] (ج ۳ ص ۳۲۸) من أدخل میتاً من قِبَل القبلة ۱۲ م

[4] دیکھئے آثار السنن ص ۳۳۶) باب فی الدفن وبعض أحکام القبور، رقم ۱۰۹۰) - نیز دیکھئے اعلاء السنن (ج ۸ ص ۲۵۲) ۱۲ م

[5] (ج ۲ ص ۴۵۸) باب کیف یدخل المیت قبره ۱۲ م

[6] نصب الرایة (ج ۲ ص ۲۹۸) ۱۲ م

علامہ عثمانیؒ نے اعلاء السنن[1] میں مسندِ شافعی والی روایت کا یہ جواب دیا ہے کہ اوّل تو اس کی سند ضعیف ہے اور اگر اس کی سند درست بھی ہو تب بھی یہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کے مقابلہ میں حجت نہیں کما فی حدیث الباب، اس کے علاوہ صحابہ کرامؓ کا آپ کو دفناتے وقت "سل" پر عمل کرنا ضرورت کی وجہ سے تھا اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک اصلِ حائط میں تھی اور قبلہ کی جانب سے ادخال ممکن ہی نہ تھا[2]، سنن ابی داودؒ والی روایت کا بھی یہی جواب ہے۔

واللہ أعلم

باب[3] ماجاء فی کراھیۃ الفرار من الطاعون

" عن[4] أسامة بن زید أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذکر الطاعون، فقال: بقیة رجز أو عذاب أرسل علی طائفة من بنی اسرائیل " علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اس طائفہ سے مراد بنی اسرائیل کے وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا " وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا[5] " لیکن انہوں نے حکم پر عمل نہ کیا اور خلاف ورزی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر طاعون مسلط کر دیا جیسا کہ ارشاد ہے " فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَظْلِمُونَ[6] " طاعون کی اس وبا سے ایک وقت میں ان کے چوبیس ہزار آدمی مر گئے[7]۔

" فإذا وقع بأرض وأنتم بھا فلا تخرجوا منھا، وإذا وقع بأرض ولستم بھا فلا تھبطوا

---

[1] (ج ۸ ص۲۵۳ و ص۲۵۴) ۱۲ م

[2] چنانچہ حافظ ابن حجرؒ ابن عدی اور ابن ماجہ کی دو (ایسی) روایات (جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حنفیہ کے مسلک کے مطابق دفنائے جانے کا ذکر ہے) کا جواب دیتے ہوئے نقل کرتے ہیں " قال الشافعی: لا یمکن إدخاله من جهة القبلة، لأن القبر فی أصل الحائط " الدرایہ (ج۱ ص۲۴۰) فصل فی الدفن ۱۲ مرتب

[3] شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲

[4] الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحه (ج ۲ ص۸۵۳) کتاب الطب، باب ما یذکر فی الطاعون۔ ومسلم فی صحیحه (ج ۲ ص۲۲۸) کتاب السلام، باب الطاعون والطیرة والکھانة ونحوھا ۱۲ م

[5] سورۃ الاعراف آیت ۱۶۱ پ ۹ - ۱۲ م

[6] سورۃ الاعراف آیت ۱۶۲ پ ۹ - ۱۲ م

[7] تحفۃ الاحوذی (ج ۲ ص۱۶۰) ۱۲ م

علیہا " درمختار میں ہے کہ طاعون زدہ علاقے میں جانا اور اس سے نکلنا اس شخص کے لئے جائز ہے جس کا اعتقاد پختہ ہو کہ نفع نقصان جو کچھ لاحق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے ہوتا ہے لیکن اگر اس کے اعتقاد میں کمزوری ہو اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ اگر شہر سے نکل جائیگا تو نجات پا جائے گا اور اگر اس میں داخل ہوگا تو مرض میں مبتلا ہو جائے گا تو ایسے شخص کے لئے دخول وخروج مکروہ ہے[1]، حدیثِ باب میں جو ممانعت آئی ہے وہ اسی سوءِ اعتقاد کی صورت پر محمول ہے۔

حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کا اپنا اعتقاد درست اور پختہ ہو لیکن اس کے دخول وخروج کی صورت میں دوسروں کے اعتقاد کے فساد کا خطرہ ہو تو اس صورت میں بھی دخول وخروج درست نہیں[2]۔ واللہ أعلم (شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ)

باب ماجاء فیمن قتل نفسہ

"عن[4] جابر بن سمرة أن رجلاً قتل نفسه فلم يصل عليه النبي صلى الله عليه وسلم"

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور داؤد ظاہریؒ کے نزدیک خودکشی کر کے مرنے والے کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی جبکہ امام احمد کا مسلک یہ ہے کہ خلیفۂ وقت تو اس کی نماز نہ پڑھے گا البتہ بقیہ لوگ اس کی نماز پڑھیں گے[5]۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اور امام اوزاعیؒ کے نزدیک خودکشی کرنے والے پر کسی حال میں نماز نہیں پڑھی جائے گی[6]۔

حدیثِ باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز نہ پڑھنے کو امام احمدؒ اسی پر محمول کرتے ہیں۔

جمہور کی دلیل سنن دارقطنی میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے " صلوا خلف كل برّ و

---

[1] درمختار مع ردّ المحتار (ج ۵ ص ۳۸۲) قبیل کتاب الفرائض ۱۲ م

[2] حاشیۃ الکوکب الدرّی (ج ۲ ص ۲۰۲) ۱۲ م

[3] شرح باب از مرتب ۱۲

[4] الحديث أخرجه مسلم في صحيحه (ج ۱ ص ۳۱۴) آخر حديث من كتاب الجنائز۔ والنسائي في سننه (ج ۱ ص ۲۷۹) ترك الصلاة على من قتل نفسه ۱۲ م

[5] دیکھئے المجموع شرح المہذب (ج ۵ ص ۲۶۷) فرع من قتل نفسہ ۱۲ م

[6] المغنی (ج ۲ ص ۵۵۶) مسألۃ قال: ولا يصلي الإمام على الغال ولا من قتل نفسه ۱۲ م

فاجر وصلوا علی کل بر وفاجر الخ» لیکن اس روایت میں مکحولؒ ہیں جو اگرچہ ثقہ ہیں[1] لیکن حضرت ابوہریرہؓ سے ان کا سماع ثابت نہیں چنانچہ امام دارقطنیؒ اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں «مکحول لم یسمع من أبی هریرة ومن دونه ثقات[2]»۔

علامہ ابن قدامہؒ نے جمہور کی دلیل کے طور پر یہ روایت ذکر کی ہے «صلوا علی من قال: لا إله إلا الله[3]»۔

حضرت جابرؓ کے اثر سے بھی جمہور کے مسلک کی تائید ہوتی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں «صلّ علی من قال: لا إله إلا الله[4]» نیز مصنفؒ عبد الرزاق میں حضرت قتادہ کا اثر ہے «صلّ علی من قال: لا إله إلا الله، وإن کان رجل سوء جدًا، قل اللّٰهم اغفر للمؤمنین والمؤمنات والمسلمین والمسلمات، قال: ولا أعلم أحدًا من أهل العلم اجتنب الصلاة علی من قال: لا إله إلا الله»۔

جہاں تک حدیثِ باب کا تعلق ہے وہ جمہور کے نزدیک زجر پر محمول ہے تاکہ اس فعل کی شناعت واضح ہو سکے ورنہ دوسرے صحابہ کرامؓ نے ضرور اس پر نماز پڑھی ہوگی، جیسا کہ اس قسم کا عمل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدیون کے بارے میں بھی ثابت ہے[5]، چنانچہ اگلے باب میں روایت آرہی ہے «أتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم أتی برجل لیصلی علیه فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: صلوا علی صاحبکم فإن علیه دینًا» — آپؐ کا صلوٰۃ ترک کرنا محض زجرًا تھا قاتلِ نفس کے حق میں اس جواب

---

[1] کما فی التقریب (ج ۲ ص۲۷۳، رقم ۱۳۵۳) ۱۲ م

[2] سنن دارقطنی (ج ۲ ص۵۶، رقم ۱۰) باب صفة من تجوز الصلاة معه والصلاة علیه ۱۲ م

[3] اس روایت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں «رواه الخلال بإسناده» المغنی (ج ۲ ص۴۱۵) مسألة: قال: ولا یصلی الإمام علی الغال ولا من قتل نفسه — سنن دارقطنی میں بھی اس قسم کی متعدد روایات آئی ہیں لیکن وہ سب کی سب ضعیف ہیں، امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں: «لیس فیها شیئ یثبت» دارقطنی (ج ۲ ص۵۵ تا ۵۷) نیز دیکھئے نصب الرایہ (ج ۲ ص۲۷ تا ۲۸) کتاب الصلوٰۃ، باب الإمامة ۱۲ مرتب

[4] مصنف ابن أبی شیبہ (ج ۳ ص۳۵) کتاب الجنائز، فی الرجل یقتل نفسه والنفساء من الزنا هل یصلی علیهم؟ ۱۲ م

[5] (ج ۳ ص۵۳۶، رقم ۶۶۱۳) باب الصلاة علی ولد الزنا والمرجوم ۱۲ م

[6] یہ جواب علامہ نوویؒ کے کلام سے ماخوذ ہے، دیکھئے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۳۱۳) قبیل کتاب الزکوٰۃ ۱۲ م

کی تائید سنن نسائی کی روایت سے ہوتی ہے جس میں حضرت جابر بن سمرہؓ کے حدیثِ باب والے واقعہ میں یہ الفاظ آئے ہیں «فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أمّا أنا فلا أصلّی علیہ»[1]۔

بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ بین مناسب ہے کہ قاتلِ نفس کی نمازِ جنازہ میں کوئی مقتدا شخصیت شریک نہ ہو تاکہ ایک درجہ میں اس قبیح فعل پر زجر ہو سکے، کما فی المسك الذکی[2]۔ واللہ أعلم

(شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ)[3]

باب[4] ماجاء فی المدیون

«سمعت عبد اللہ بن أبی قتادۃ یحدث عن أبیہ أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أتی برجل لیصلی علیہ، فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلوا علی صاحبکم فإن علیہ دیناً» جس کے ذمہ قرضہ ہوتا اور وہ مال چھوڑے بغیر فوت ہو جاتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شروع دور میں اس کی نماز نہ پڑھا کرتے تھے البتہ دوسروں سے پڑھوا دیا کرتے تھے لیکن بعد میں آپ نے مدیون کی نمازِ جنازہ بھی پڑھانی شروع کر دی تھی جیسا کہ اسی باب کی اگلی روایت میں آرہا ہے «فلمّا فتح اللہ علیہ الفتوح قام، فقال: أنا أولی بالمؤمنین من أنفسهم، فمن توفی من المسلمین فترك دیناً علیّ قضاءہ الخ»۔

کفالت عن المیت

قال أبو قتادۃ: ھو علیّ، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: بالوفاء؟ قال: بالوفاء، فصلی علیہ» اس حدیث سے استدلال کر کے ائمہ ثلاثہؒ اور حضرات صاحبینؒ کا مسلک یہ ہے کہ میت کی جانب سے کفالت درست ہے خواہ اس نے اتنا مال چھوڑا ہو جس سے اس کا دین ادا کیا جا سکے یا نہ چھوڑا ہو۔

---

[1] سنن نسائی (ج ۱ ص ۲۷۹) ترك الصلاۃ علی من قتل نفسه ۱۲ م

[2] یعنی تقریر حکیم الامت حضرت تھانویؒ علی سنن الترمذی (مخطوطہ - ج ۱ ص ۲۴۴) ۱۲ مر

[3] شرح باب از مرتب ۱۲ م

[4] الحدیث لم یخرجه من أصحاب الکتب الستة سوی الترمذی - قاله الشیخ محمد فؤاد عبد الباقی سنن ترمذی (ج ۳ ص ۳۸۱ رقم ۱۰۶۹) ۱۲ مر

جبکہ امام ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر میت نے اتنا مال نہ چھوڑا ہو جس سے اس کا قرضہ ادا کیا جاسکے تو میت کی جانب سے کفالت درست نہیں اِلّا یہ کہ میت کی حیات ہی میں کوئی آدمی اس کی جانب سے کفیل بن گیا ہو[1]، اس لئے کہ کفالت نام ہے "ضم ذمّۃ إلی ذمّۃ فی المطالبۃ مطلقاً"[2] کا، اور میت کے مرنے کے بعد اس سے مطالبہ ساقط ہوگیا، لہٰذا "ضم ذمّۃ إلی ذمّۃ" ممکن نہ رہا کہ کفالت عن المیت درست ہوسکے البتہ اگر زندگی ہی میں کفیل بن گیا ہو تو "ضم ذمّۃ إلی ذمّۃ" کا تحقق ہوگیا، پھر اصیل کے مرنے کے بعد مطالبہ کے لحاظ سے اصیل کا ذمّہ تو ساقط ہوگیا لیکن کفیل کا ذمّہ باقی رہ گیا لہٰذا وہ کفالت معتبر رہے گی[3]۔

جہاں تک حدیثِ باب کا تعلق ہے، اس میں ابو قتادہؓ کا قول "ھو علیّ"۔ کفالت کیلئے نہیں بلکہ وعدہ ہے جس کا قرینہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کلمہ ہے "بالوفاء؟"[4] نیز یہ بھی ممکن ہے کہ ابو قتادہؓ اس میت کے اس کی حیات ہی میں کفیل بن چکے ہوں اور اس وقت "ھو علیّ" کہہ کر اس کفالتِ سابقہ کا اِخبار مقصود ہو نہ کہ انشاءِ کفالت[5]۔

---

[1] مذکورہ بالا تفصیل المجموع شرح المہذّب (ج ۱۴ ص ۔، کتاب الضمان) المغنی (ج ۴ ص ۵۹۳، باب الضمان) بدائع الصنائع (ج ۶ ص ۔، کتاب الکفالہ، فصل وأما شرائط الکفالۃ) سے ماخوذ ہے ۱۲ مرتب

[2] الفقہ الإسلامی وأدلتہ (ج ۵ ص ۱۴۱) ۱۲ م

[3] دیکھئے الفقہ الإسلامی وأدلتہ (ج ۵ ص ۱۴۲، المبحث الثانی فی شروط الکفالۃ)۔

وفی البدائع (ج ۶ ص ۔، فصل و أما شرائط الکفالۃ) وجہ قول أبی حنیفۃ أن الدین عبارۃ عن الفعل، والمیت عاجز عن الفعل، فکانت ھٰذہ کفالۃ بدین ساقط، فلا تصح، کما کفل علی إنسان بدین ولا دین علیہ، و إذا مات ملیاً فھو قادر بنائبہ، وکذا إذا مات عن کفیل، لأنہ قائم مقامہ فی قضاء دینہ ۱۲ مرتب

[4] اس لئے کہ اگر یہ کفالت ہوتی تو "بالوفاء" کہہ کر استفسار کی حاجت نہ تھی بلکہ ابو قتادہؓ کا "ھو علیّ" کہنا کافی تھا اس لئے کہ لفظ "علیّ" التزام کے لئے کافی تھا، یہ اس کا قرینہ ہے کہ ابو قتادہؓ کے قول کو وعدہ سمجھا گیا جس میں قضاءً التزام نہیں ہوتا اس لئے "بالوفاء" کہہ کر وعدے میں پختگی طلب کی گئی، اگرچہ قضاءً التزام اس تاکید کے بعد بھی نہ ہوگا۔ دیکھئے الکوکب الدری (ج ۲ ص ۲۰۰) اور المسک الذکی (ج ۱ ص ۲۷۷، مخطوط) ۱۲ مرتب

[5] بذل المجہود (ج ۱۴ ص ۳۰۸) کتاب البیوع، قبیل باب فی المطل ۱۲ م

لیکن سنن نسائی اور ابن ماجہ کی ایک روایت میں "فقال أبو قتادة : أنا أتكفل به" کے الفاظ آئے ہیں[۱]۔ ان کو نہ وعدہ پر محمول کیا جاسکتا ہے اور نہ اِخبار عن الکفالۃ السابقہ پر، کما فی إعلاء السنن[۲]۔

لہذا اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ ہماری بحث کفالت عن المیت قضاءً کے بارے میں ہے نہ کہ دیانۃً کے بارے میں اور کفالت عن المیت قضاءً کا اس روایت سے ثبوت نہیں ہوسکتا، اس کا ثبوت تو تب ہوتا جب کفیل کے انکار کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر دین کی ادائیگی لازم قرار دیدی ہوتی حالانکہ روایت میں اس کا کوئی ذکر نہیں[۳]۔

اسی باب میں حضرت ابوہریرہؓ کی اگلی روایت کو بھی جمہور کی جانب سے دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے[۴] جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "فمن توفی من المسلمین فترك دیناً، عليّ قضاءه"۔

اس روایت کے جواب میں بھی یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ وعدہ پر محمول ہے اور اس میں کفالت مقصود نہیں بلکہ اس کا وعدہ کیا جارہا ہے کہ ایسے آدمی کا قرضہ بیت المال سے ادا کر دیا جائے گا[۵]۔

واللہ أعلم و علمہ أتم و أحکم ۔

(شیخ یا ماہ زمرتب عفا اللہ عنہ)

باب ماجاء فی رفع الیدین علی الجنازة

عن[۶] أبی هریرة أن رسول الله صلی الله علیه وسلم کبر علی جنازة فرفع یدیه

---

[۱] سنن نسائی (ج ۲ ص ۲۳۳) کتاب البیوع، الکفالة بالدین ۔ سنن ابن ماجہ (ص ۱۷۳) أبواب الصدقات، باب الکفالة ۱۲ م

[۲] (ج ۱۴ ص ۴۷۶ و ۴۷۷)، باب الکفالة عن المیت ۱۲ م

[۳] یہ جواب کسی قدر وضاحت کے ساتھ العرف الشذی مع جامع الترمذی (ج ۱ ص ۲۰۵) سے ماخوذ ہے نیز دیکھئے اعلاء السنن (ج ۱۴ ص ۴۷۷) ۱۲ مرتب

[۴] کما فی المجموع (ج ۱۴ ص ۸) کتاب الضمان ۱۲ م

[۵] اس مسئلہ سے متعلق مزید تفصیل کے لئے دیکھئے اعلاء السنن (ج ۱۴ ص ۴۷۶ تا ۴۷۹) باب الکفالة عن المیت ۱۲ م

[۶] الحدیث لم یخرجه من أصحاب الکتب الستة سوى الترمذی ۔ قاله الشیخ محمد فؤاد عبدالباقی ۔ سنن ترمذی (ج ۳ ص ۳۸۸، رقم ۱۰۷۷) ۱۲ م

فی أول تکبیرۃ ووضع الیمنیٰ علی الیسریٰ » نمازِ جنازہ کی پہلی تکبیر کے موقعہ پر ہاتھ اٹھائے جائیں گے اس پر تمام اہلِ علم کا اتفاق ہے البتہ بقیہ تکبیرات کے بارے میں اختلاف ہے، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام اسحاقؒ، امام اوزاعیؒ اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ ہر تکبیر کے موقعہ پر ہاتھ اٹھائے جائیں گے۔[1]

امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ وغیرہ کے نزدیک بقیہ تکبیروں میں ہاتھ نہیں اٹھائے جائیں گے لأن کلّ تکبیرۃ مقام رکعۃ ولا ترفع الأیدی فی جمیع الرکعات[1]۔

مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے کہ جو حضرات عام نمازوں میں عند الرکوع رفع یدین کے قائل ہیں وہ نمازِ جنازہ کی ہر تکبیر میں بھی رفع یدین کے قائل ہیں اور جو حضرات عام نمازوں میں عند الرکوع رفعِ یدین کے قائل نہیں وہ نمازِ جنازہ میں بھی بقیہ تکبیرات میں رفعِ یدین کے قائل نہیں[2]۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیثِ باب ہماری دلیل ہے کہ اس میں تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف پہلی تکبیر میں رفعِ یدین فرمایا۔

لیکن اس روایت میں یحیی بن یعلی الاسلمی اور ابو فروہ یزید بن سنان دو راوی ضعیف ہیں[3]، لیکن علامہ عثمانیؒ نے ثابت کیا ہے کہ یہ حدیث درجہ حسن سے کم نہیں[4]۔

---

[1] مذاہب کی مذکورہ تفصیل کے لئے دیکھئے المغنی (ج ۲ ص ۴۹۰) مسألۃ: قال: ویرفع یدیہ فی کل تکبیرۃ۔ المجموع (ج ۵ ص ۲۳۲) فرع فی رفع الأیدی فی تکبیرات الجنازۃ۔

[2] کما یفہم من بدایۃ المجتہد (ج ۱ ص ۲۳۵) الفصل الأول فی صفۃ صلاۃ الجنازۃ ۱۲ م

[3] یحیی بن یعلی کے لئے دیکھئے تقریب التہذیب (ج ۲ ص ۳۶۱، رقم ۲۰۸)۔

لیکن علامہ عثمانیؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: « ولکن روی عنہ الأجلۃ الأعلام وأخرج لہ ابن حبان فی صحیحہ حدیثاً واحداً، فہو ممن یکتب حدیثہ ولا بأس بہ » اعلاء السنن (ج ۸ ص ۲۲۱) باب کیفیۃ صلاۃ الجنازۃ۔

ابو فروہ یزید بن سنان کے لئے دیکھئے تقریب (ج ۲ ص ۳۶۶، رقم ۲۶۵)

لیکن یہ بھی ایک مختلف فیہ راوی ہیں، مروان بن معاویہؒ ان کو بھی ثبت قرار دیتے ہیں اور ابو حاتمؒ فرماتے ہیں: « محلّہ الصدق یکتب حدیثہ ولا یحتج بہ » اور امام بخاریؒ فرماتے ہیں « مقارب الحدیث » نیز ان سے شعبہؒ نے بھی روایت کی ہے وہو لا یروی إلا عن ثقۃ عندہ۔ اعلاء السنن (ج ۸ ص ۲۲۲) ۱۲ مرتب

[4] دیکھئے اعلاء السنن (ج ۸ ص ۲۲۲ و ۲۲۱) ۱۲ م

اس روایت کی تائید حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ہوتی ہے «أن رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یرفع یدیه علی الجنازة فی أول تکبیرة ثم لا یعود»[1]

لیکن اس میں بھی «فضل بن السکن» مجہول ہے[2]۔

شوافع وغیرہ کی دلیل حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے «أن النبی صلی الله علیه وسلم کان إذا صلّی علی الجنازة رفع یدیه فی کل تکبیرة وإذا انصرف سلّم» أخرجه الدارقطنی فی علله، لیکن اس روایت کو مرفوع قرار دینا درست نہیں[3]۔ دراصل اس باب میں کوئی صحیح حدیثِ مرفوع فریقین میں سے کسی کے پاس نہیں اور اختلاف بھی افضلیت میں ہے نہ کہ جواز میں، کذا قال الشیخ الأنور رحمه الله تعالیٰ[4] والله أعلم۔

تم بفضل الله وکرمه شرح أبواب الجنائز ویلیه إن شاء الله تعالیٰ

شرح أبواب النکاح۔

وقد وقع الفراغ منه بیوم الأحد فی الحادی والعشرین من

شهر رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ الموافق الثامن من مایو ۱۹۸۸م

---

[1] سنن دارقطنی (ج ۲ ص۷۵) کتاب الجنائز، باب وضع الیمنیٰ علی الیسریٰ ورفع الأیدی عند التکبیر۔ اس روایت پر امام دارقطنیؒ نے سکوت کیا ہے ۱۲ م

[2] حافظ زیلعیؒ لکھتے ہیں «أعلّه العقیلی فی کتابه بالفضل بن السکن، وقال: إنه مجهول۔ انتهی» پھر فرماتے ہیں «ولم أجده فی ضعفاء ابن حبان» نصب الرایه (ج ۲ ص۲۸۵) أحادیث رفع الیدین فی التکبیرة الأولیٰ ۱۲ م

[3] چنانچہ خود امام دارقطنی اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں «هکذا رفعه عمر بن شبة وخالفه جماعة، فرووه عن یزید بن هارون موقوفًا، وهو الصواب» کذا فی نصب الرایه (ج ۲ ص۲۸۵) اب اگر حضرت ابن عمرؓ کی اس روایت کو موقوف مانا جائے تو اس روایت کے معارض ان کی دوسری موقوف روایت بھی موجود ہے جو حنفیہ کے مسلک کے مطابق ہے۔ علامہ عینیؒ نقل کرتے ہیں «وفی المبسوط: أن ابن عمر وعلیاً رضی الله تعالیٰ عنهما قالا: لا ترفع الیدی فیها إلا عند تکبیرة الإحرام، وحکاه ابن حزم عن ابن مسعود وابن عمر، ثم قال: لم یأت بالرفع فیما عدا الأولیٰ نص ولا إجماع» عمدة القاری (ج ۸ ص۱۱۱) باب سنة الصلاة علی الجنازة۔

[4] العرف الشذی مع جامع الترمذی (ج ۱ ص۲۰۶)

البتہ حنفیہ کی دلیل کے طور پر حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت پیش کی جا سکتی ہے جو معجم طبرانی میں مرفوعًا اور مصنف ابن ابی شیبہ میں موقوفًا مروی ہے «ترفع الأیدی فی سبعة مواطن، افتتاح الصلاة، استقبال البیت، الصفا والمروة، والموقفین، وعند الحجر» (لفظه للطبرانی) دیکھئے مجمع الزوائد (ج ۲ ص۱۰۳) باب رفع الیدین فی الصلاة۔ اور مصنف ابن ابی شیبة (ج ۱ ص۲۳۶ و۲۳۷) من کان یرفع یدیه فی أول تکبیرة ثم لا یعود۔ اس روایت میں ہاتھ اٹھانے کے جن سات مقامات کا ذکر ہے ان میں نماز جنازہ کی بقیہ تکبیرات شامل نہیں۔

اس روایت سے متعلق کلام درس ترمذی (ج ۲ ص۳۴ و۳۵) باب رفع الیدین عند الرکوع کے تحت گذر چکا ہے۔ نیز دیکھئے نصب الرایه (ج ۱ ص۳۸۹ تا ص۳۹۲)

[5] علامہ شوکانیؒ اس مسئلہ کے تحت لکھتے ہیں: «والحاصل أنه لم یثبت فی غیر التکبیرة الأولیٰ شیء یصلح للاحتجاج به عن النبی صلی الله علیه وسلم، وأفعال الصحابة وأقوالهم لا حجة فیها، فینبغی أن یقتصر علی الرفع عند تکبیرة الإحرام لأنه لم یشرع فی غیرها إلا عند الانتقال من رکن إلی رکن فی سائر الصلوات ولا انتقال فی صلاة الجنازة» نیل الأوطار (ج ۴ ص۶۶) باب القراءة والصلاة علی رسول الله صلی الله علیه وسلم ۱۲ مرتب عفی عنه

أبوابُ النكاح
عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

نکاح کے لغوی معنی "وطی" کے بھی ہیں اور "عقد" کے بھی، پھر بعض نے پہلے معنی کو حقیقت اور دوسرے کو مجاز قرار دیا ہے کما ہو مذہب الحنفیۃ اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے، یعنی عقد کے معنی میں حقیقت اور وطی کے معنی میں مجاز، اور بعض نے اس کو مشترک قرار دیا ہے[1]۔
علامہ سہارنپوریؒ ابوالحسن ابن الفارسؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے وہ عقد اور تزویج ہی کے معنی میں آیا ہے سوائے اس ایک آیت کے: "وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ[2]" کہ یہاں نکاح سے "حُلُم" یعنی بلوغ مراد ہے[3]۔

عن[4] أبي أيوب قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أربع من سنن المرسلين، "یہاں مرسلین سے اکثر رسل مراد ہیں چنانچہ ان خصال میں سے بعض خصال بعض انبیاء علیہم السلام میں موجود نہ تھے، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام سے نکاح

---

[1] اس لفظ سے متعلق تشریح کے لئے دیکھئے تاج العروس بتحقیق عبدالسلام محمد ہارون (ج ۷، ص۱۹۵)۔ البحرالرائق (ج ۳ ص۸۲)۔ بذل المجہود (ج ۱۰ ص۳۰۹)۔

اور اصطلاح میں "عقد یفید ملك المتعة قصدًا" کو کہا جاتا ہے۔ کما فی تنویر الأبصار مع الدرالمختار ورد المحتار (ج ۲ ص۲۵۸ تا ۲۶۰) ۱۲ مرتب

[2] سورۃ النساء، آیت ۶ پ۴۔ ۱۲ م

[3] بذل المجہود (ج ۱۰ ص۷)۔

وفی الفقہ الإسلامی وأدلتہ "(ج ۷، ص۳۰)": "وقد قال الزمخشری۔ وھو من علماء الحنفیۃ۔ لیس فی الکتاب لفظ النکاح بمعنی الوطء إلا قولہ تعالی: "حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ"۔ ۱۲م

[4] لم یخرجہ أحد من أصحاب الکتب الستۃ سوی الترمذی۔ قالہ الشیخ محمد فؤاد عبدالباقی۔ سنن ترمذی (ج ۳ ص۳۹۱، رقم ۱۰۸۰)۔ ۱۲ م

ثابت نہیں [1]۔

"الحیاء" علامہ توربشتیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں لفظ "الحیاء" کی جگہ "الختان" بھی منقول ہے یا یہ ایک قول "الحیاء" کی جگہ "الحناء" کا بھی ہے، شروع کی دو روایتیں تو درست ہیں لیکن "الحناء" کی روایت میں تصحیف ہے اس لئے کہ مَردوں کے لئے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگانا عورتوں کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے ناجائز ہے، اس لئے اس کے سنّتِ مرسلین ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جہانتک سر میں مہندی لگانے کا تعلق ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تو سنّت ہے لیکن دوسرے انبیاء کرام سے ثابت نہیں، اس لئے اس کو بھی سننِ مرسلین میں شمار کرنا درست نہیں [2]۔

نکاح کی شرعی حیثیت

"والنکاح" امام شافعیؒ کے نزدیک نکاح عبادت نہیں، گویا دوسرے عقودِ مالیہ کی طرح ایک معاملہ ہے جبکہ حنفیہ کے نزدیک وہ عقدِ مالی ہونے کے ساتھ عبادت بھی ہے [3]۔

حنفیہ کی بات کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ نکاح میں "خطبہ" اور "ولیمہ" مسنون ہیں، نکاح شاہدین کے بغیر درست نہیں ہوتا، اس کا فسخ ناپسندیدہ ہے، اس کے بعد عدّت واجب ہوتی ہے، تین طلاقوں کے بعد بغیر حلالہ کے تجدیدِ نکاح کی اجازت نہیں ہوتی، یہ خصوصیات کسی اور معاملہ میں نہیں پائی جاتیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح دوسرے معاملات کی طرح محض ایک معاملہ نہیں بلکہ یہ عبادت بھی ہے۔

اس پر اتفاق ہے کہ غلبۂ شہوت کی صورت میں نکاح ضروری ہے چنانچہ ایسا شخص مہر اور نفقہ پر قدرت رکھنے اور حقوقِ زوجیت ادا کرنے پر قادر ہونے کے باوجود اگر نکاح نہ کریگا تو گنہگار ہوگا [4]۔

---

[1] دیکھئے مرقاۃ المفاتیح (ج ۲ ص۱) باب السواک، الفصل الثانی۔ جہاں تک حضرت یحییٰ علیہ السلام کا تعلق ہے ان کی صفت تو خود قرآن کریم نے "حصور" بیان کی ہے، جس کا مطلب محققین کے نزدیک "الذی لا یأتی النساء لا للعجز بل للعفّۃ والزھد" ہے کما فی التفسیر الکبیر (ج ۸ ص۳۹) ۱۲ مرتب

[2] مرقاۃ (ج ۲ ص۲) باب السواک ۱۲ م

[3] فتح الباری (ج ۹ ص۱۰۴) باب الترغیب فی النکاح۔ عمدۃ القاری (ج ۲۰ ص۶۶) باب الترغیب فی النکاح ۱۲ م

[4] بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (ج ۲ ص۲۲۸) کتاب النکاح ۱۲ م

لیکن اگر حالتِ توقان نہ ہو تو نکاح کی شرعی حیثیت کے بارے میں اختلاف ہے:
ظاہریہ کے نزدیک نکاح اس صورت میں بھی فرضِ عین ہے، بشرطیکہ وہ حقوق زوجیت کے ادا کرنے پر قادر ہو۔ ان حضرات کا استدلال اُن آیات واحادیث سے ہے جن میں نکاح کیلئے امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، جیسے: "فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ"[1] اور "وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ"[2] اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "تزوّجوا فإنی مکاثر بکم الأمم"[3]۔
لیکن جمہور کے نزدیک ایسی صورت میں نکاح فرض نہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نکاح کو چھوڑ رکھا تھا پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر کوئی نکیر نہیں فرمائی، اگر نکاح فرض ہوتا تو آپ انہیں نکاح کا ضرور حکم دیتے اور ترک پر نکیر بھی فرماتے[4]۔

---

[1] سورۃ النساء آیت ۳ پ ۴ - ۱۲ م

[2] سورۃ النور آیت ۳۲ پ ۱۸ - ۱۲ م

[3] رواہ الطبرانی فی الأوسط عن سہل بن حنیف، وفیہ موسیٰ بن عبیدۃ وھو ضعیف - مجمع الزوائد (ج ۴ ص۲۵۸) باب الحث علی النکاح وما جاء فی ذلک ۱۲ مرتب

[4] کما فی التفسیر الکبیر (ج ۲۳ ص۲۱۲) تحت قولہ تعالیٰ: "وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ الخ"

لیکن اس پر عکاف بن بشر تمیمیؓ کے واقعہ سے اعتراض ہو سکتا ہے جس میں ذکر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: "ألک زوجۃ؟ قال: لا، قال: ولا جاریۃ؟ قال: لا، قال: وأنت صحیح موسر؟ قال: نعم والحمد للہ، قال: فأنت إذاً من إخوان الشیاطین، إما أن تکون من رھبان النصاریٰ فأنت منھم، وإما أن تکون منا فاصنع کما نصنع فإن من سنتنا النکاح، شرارکم عزابکم وأراذل أمواتکم عزابکم" - رواہ ابویعلی والطبرانی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ الفاظ کے تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ مسند احمد میں بھی آیا ہے لیکن اس کے بارے میں علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: "وفیہ راو لم یسم" جہاں تک مسند ابویعلی اور طبرانی کی مذکورہ روایت کا تعلق ہے اس کے بارے میں علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں "وفیہ أبو معاویۃ بن یحیی الصدفی، وھو ضعیف" دیکھئے مجمع الزوائد (ج ۴ ص۲۵۰ و ۲۵۱) باب الحث علی النکاح وما جاء فی ذلک۔

پھر اس واقعہ کو درست ماننے کی تقدیر پر یہ ایک واقعہ جزئیہ ہے اس کے بارے میں شیخ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: "وأما حدیث عکاف فإیجاب علی معین فیجوز کون سبب الوجوب تحقق فی حقہ" فتح القدیر (ج ۳ ص۱۰۱) کتاب النکاح ۱۲ مرتب عفی عنہ

پھر جمہور میں سے امام شافعیؒ کے نزدیک نکاح محض مباح ہے اور نفلی عبادات کے لئے خود کو فارغ کرلینا اشتغال بالنکاح کے مقابلہ میں افضل ہے۔

ان کا استدلال آیتِ قرآنی "وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا"[1] سے ہے کہ تبتّل کے معنی "انقطاع عن النساء" اور "ترکِ نکاح" کے ہیں[2] نیز آیتِ قرآنی "سَيِّدًا وَّحَصُوْرًا"[3] سے بھی استدلال ہے کہ قرآن کریم نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی منقبت ذکر کرتے ہوئے ان کی صفت "حصور" بیان کی ہے جس کے معنی ہیں "الذی لایأتی النساء" اگر نکاح افضل ہوتا تو "حصور" کو بطور صفتِ مدح ذکر نہ کیا جاتا[4]

احناف کی اس مسئلہ میں تین روایات ہیں، ایک استحباب کی، دوسری سنّیت کی اور تیسری وجوب کی۔[5]

---

[1] سورۃ المزمل آیت ۸ پ ۲۹ - ۱۲ م

[2] کما فی النہایۃ (ج ۱ ص ۹۹) ۱۲ م

[3] سورۃ آل عمران آیت ۳۹ پ ۳ - ۱۲ م

[4] امام شافعیؒ کا ایک استدلال قرآن کریم کے ارشاد: "زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ" (سورۃ آل عمران آیت ۱۴ پ ۳) سے بھی ہے، اس آیت میں حبّ النساء والبنین کو بطور مذمّت بیان کیا گیا ہے جس سے نکاح کا افضل نہ ہونا معلوم ہوتا ہے، نیز امام شافعیؒ کا استدلال اس سے بھی ہے کہ نکاح بیع کی طرح ایک عقدِ معاوضہ ہے جس طرح بیع کے مقابلہ میں اشتغال بالعبادۃ افضل ہے اسی طرح نکاح کے مقابلہ میں بھی اشتغال بالعبادات النافلۃ افضل ہوگا کما فی المغنی (ج ۶ ص ۴۴۶) فصل: والناس فی النکاح علی ثلاثۃ أضرب۔

جہاں تک آیت سے استدلال کا تعلق ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کے اندر نساء اور بنین کی فطری محبت کا ذکر ہے جو اگر حدود کے اندر ہو تو مذموم نہیں۔ جہاں تک نکاح کو بیع کی طرح عقدِ معاوضہ قرار دینے کا تعلق ہے سو اس کے بارے میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ نکاح محض ایک معاملہ نہیں بلکہ عبادت بھی ہے، لہٰذا بیع پر اس کو قیاس کرنا درست نہیں۔ واللہ اعلم ۱۲ مرتب۔

[5] کما فی فتح القدیر (ج ۳ ص ۱۸۷) شیخ ابن ہمامؒ نے یہاں واجب کے ساتھ "کفایہ" کی اور سنت کے ساتھ "مؤکدہ" کی قید بھی ذکر کی ہے اور سنتِ مؤکدہ ہی کے قول کو اصح قرار دیا ہے۔ نیز وہ فرماتے ہیں کہ جن حضرات نے علی الاطلاق مستحب کہا ہے اور سنّیت کا قول ذکر نہیں کیا ان کی بھی استحباب سے سنّیت مراد ہے "وکثیرًا ما یتساھل فی إطلاق المستحب علی السنۃ"۔

علامہ کاسانیؒ نے حنفیہ کا مسلک نقل کرتے ہوئے ان کے درج ذیل اقوال نقل کئے ہیں:

(۱) مندوب و مستحب، و إلیہ ذھب الکرخی۔

(۲) جہاد اور نماز جنازہ کی طرح فرض کفایہ، إذا قام بہ البعض سقط عن الباقین۔

(۳) واجب علی الکفایہ، سلام کے جواب کی طرح۔

(۴) واجب علی العین، لیکن عملاً نہ کہ اعتقاداً، نماز وتر، صدقۃ الفطر اور قربانی کی طرح۔

بدائع الصنائع (ج ۲ ص ۲۲۸) أوائل کتاب النکاح

اصل تقریر میں نکاح کی شرعی حیثیت سے متعلق مذاہب کی تفصیل بھی "بدائع" سے ماخوذ ہے ۱۲ مرتب عفی عنہ

بہرحال حنفیہ کے نزدیک نکاح مسنون ہے اور قدرت کے باوجود ترکِ نکاح خلافِ اولیٰ ہے۔

نیز اشتغال بالنکاح تخلی للعبادۃ کے مقابلہ میں افضل ہے، حنفیہ کے دلائل درجِ ذیل ہیں:

① آیت قرآنی: "وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً"[1]

اس سے واضح ہے کہ انبیاءِ کرام کی اکثریت نکاح پر عمل کرتی آئی ہے، اگر ترکِ نکاح اولیٰ ہوتا تو یہ حضرات اُسے نہ چھوڑتے۔

② حضرت ابوایوب انصاریؓ کی حدیثِ باب: "قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: أربع من سنن المرسلین: الحیاء، والتعطر، والسواك، والنكاح" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو "حدیثٌ حسن غریب" کہا ہے لیکن اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس روایت میں "ابوالشمال"[2] راوی مجہول ہیں، لہٰذا امام ترمذیؒ کا اس روایت کو حسن قرار دینا کیسے درست ہوسکتا ہے؟

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ امام ترمذیؒ کا اس روایت کو حسن قرار دینا اس کی علامت ہے کہ یہ راوی ان کے نزدیک مجہول نہیں، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو اس وجہ سے "حسن" قرار دیا ہو کہ اس کے متعدد شواہد موجود ہیں[3]۔

③ اسی باب میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "یا معشر الشباب، علیکم بالباءۃ، فإنہ أغض للبصر وأحصن للفرج" "باءۃ" کے معنی نکاح کے ہیں، یہ "مباءۃ" سے نکلا ہے جس کے معنی "ٹھکانے" کے ہیں، مناسبت ظاہر ہے کہ جو شخص کسی عورت سے نکاح کرتا ہے وہ اس کے لئے ٹھکانا بھی مہیا کرتا ہے[4]۔

واضح رہے کہ علامہ نوویؒ نے قاضی عیاضؒ سے "الباءۃ" میں چار لغات نقل کی ہیں:

(۱) "الباءۃ" بالمد والهاء (۲) "الباہ" بالهاء بلا مد (۳) "الباء" بالمد بلا هاء (۴) "الباهة" بهائین۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ بہرصورت اس کے لغوی معنی "جماع" کے

---

[1] سورۂ رعد آیت ۳۸۔ پ۱۳۔ ۱۲ م

[2] أبو الشمال بكسر أوله وتخفيف الميم، مجهول، من الثالثة/ت۔ تقریب التہذیب (ج ۲ ص ۴۶۳، رقم ۱۲۶) ۱۲ مرتب

[3] چنانچہ حافظ ابن حجرؒ اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں: "رواه أحمد والترمذي، ورواه ابن أبي خيثمة وغيره من حديث مليح بن عبد الله عن أبيه عن جده نحوه، ورواه الطبراني من حديث ابن عباس" التلخیص الحبیر (ج ۱ ص ۶۶، تحت رقم ۶۹) باب السواك ۱۲ مرتب

[4] وقیل: لأن الرجل يتبوأ من أهله، أي يستمكن، كما يتبوأ من منزله۔ النہایۃ (ج ۱ ص ۱۶۰) ۱۲ م

ہیں، اگرچہ بعد میں "نکاح" کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہونے لگا[1]۔

(۴) سنن ابن ماجہ میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، فرماتی ہیں: "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: النکاح من سنتی، فمن لم یعمل بسنتی فلیس منی، وتزوجوا فإنی مکاثر بکم الأمم، ومن کان ذا طول فلینکح[2] الخ"

(۵) اگلے باب ("فی النھی عن التبتل") میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: "ردّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی عثمان بن مظعون التبتل، ولو أذن له لاختصینا"

(۶) سنن ابی داؤد[3] میں حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایت ہے: "لا صرورۃ فی الإسلام" یعنی ترکِ نکاح اسلام میں نہیں۔

جہاں تک "وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا" سے استدلال کا تعلق ہے سو اس سے مراد رہبانیت نہیں بلکہ زہد ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ دل میں اللہ کی محبت غالب ہو اور علائقِ دنیویہ اس میں رکاوٹ نہ بن سکیں، اگر اس میں ترکِ نکاح کا حکم ہوتا تو اس کے پہلے مخاطب تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے جس کا تقاضا یہ تھا کہ آپ کبھی نکاح نہ فرماتے، حالانکہ آپؐ نے متعدد نکاح کئے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس آیت سے ترکِ نکاح مراد نہیں، خود باری تعالیٰ کے ایک دوسرے فرمان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: "وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ"[4]

---

[1] شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۴۸) کتاب النکاح، باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسہ إلیہ الخ ۱۲ مرتب

[2] سنن ابن ماجہ (ص ۱۳۳) باب ما جاء فی فضل النکاح ـ اس روایت میں اگرچہ عیسیٰ بن میمون المدنی مولی القاسم بن محمد ضعیف ہیں، کما فی التقریب (ج ۲ ص ۱۰۲، رقم ۹۲۶) لیکن "صحیحین" میں اس کا شاہد موجود ہے، چنانچہ حضرت انس بن مالکؓ کی ایک طویل روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے: "أما واللہ! إنی لأخشاکم للہ وأتقاکم له، لکنی أصوم وأفطر وأصلی وأرقد وأتزوج النساء، فمن رغب عن سنتی فلیس منی" اللفظ للبخاری (ج ۲ ص ۷۵۷ و ۷۵۸، الترغیب فی النکاح) نیز دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۴۹) باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسہ إلیہ الخ ۱۲ مرتب عفی عنہ۔

[3] (ج ۱ ص ۲۴۲) کتاب المناسک، باب لا صرورۃ فی الإسلام ۱۲ م

[4] سورۃ حدید آیت ۲۷۔ پ ۲۷۔ ۱۲ م

اور "سَيِّدًا وَّحَصُوْرًا" سے استدلال کا جواب یہ ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شریعت میں اگر ترکِ نکاح افضل ہو تو وہ مندرجہ بالا دلائل کی روشنی میں شریعتِ محمدیہ کے لئے حجت نہیں۔
واللہ اعلم

باب ماجاء فیمن ترضون دینه فزوّجوه

عن ابی ھریرة قال : قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم : إذا خطب إلیکم من ترضون دینه وخلقه فزوّجوه[1] اس سے امام مالکؒ نے استدلال کیا ہے کہ "کفاءت" صرف "دین" میں معتبر ہے، "حرفت" اور "نسب" میں نہیں۔

جبکہ جمہور کے نزدیک "حرفت" اور "نسب" میں بھی معتبر ہے[2] ان کے نزدیک اسی حدیث میں "وخلقه" کے الفاظ حرفت اور نسب کی "کفاءت" پر دال ہیں، اس لئے کہ نسب اور حرفت کا انسان کے اخلاق پر بہت اثر پڑتا ہے۔

پھر کفاءت اسلام کے اصولِ مساوات کے منافی نہیں، کیونکہ اس کا مقصد کسی کو کسی پر فضیلت دینا نہیں، فضیلت کا معیار تو محض تقویٰ ہے بلکہ "کفاءت" کا مقصد رشتۂ نکاح میں پائیداری اور خوشگواری پیدا کرنا ہے جو عادۃً اس کے بغیر نہیں ہوتی۔

---

[1] الحدیث أخرجه ابن ماجه فی سننه (ص۱۴۱) باب الأکفاء ۱۲ م

[2] دیکھئے "المغنی" (ج ۶ ص۴۸۲) مسألة : قال : والکفء والدین والمنصب۔

کفاءت کے بارے میں ائمہ اربعہؒ کے مذاہب کا خلاصہ اس طرح ہے :

"فهم متفقون علی الکفاءة فی الدین، واتفق غیر المالکیة علی الکفاءة فی الحرّیة والنسب والحرفة، واتفق المالکیة والشافعیة علی خصلة السلامة من العیوب المثبتة للخیار، واتفق الحنفیة فی ظاهر الروایة والحنابلة علی خصلة المال، وانفرد الحنفیة بخصلة إسلام الأصول" کذا فی "الفقه الإسلامی وأدلته" (ج ۷، ص۲۴۰ و ۲۴۱) المبحث الخامس ما تکون فیه الکفاءة ۱۲ مرتب

باب ماجاء فی النظر إلی المَخطوبَة

عن المغیرة[1] بن شعبة أنه خطب امرأة، فقال النبی صلی الله علیه وسلم: انظر إلیها فإنه أحریٰ أن یؤدَم[2] بینکما»، بعض حضرات کے نزدیک خاطب کے لئے مخطوبہ کو دیکھنا جائز نہیں اور نکاح سے قبل اس میں اور اجنبیہ میں کوئی فرق نہیں[3]، امام مالکؒ سے بھی ایک روایت یہی ہے جبکہ ان کی دوسری روایت یہ ہے کہ مخطوبہ کو دیکھنا اس کی اجازت کے ساتھ جائز ہے[4]۔

جبکہ جمہور یعنی امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام اسحاقؒ، امام اوزاعیؒ اور سفیان ثوریؒ کا مسلک یہ ہے کہ مخطوبہ کو دیکھنا مطلقاً جائز ہے، اس کی اجازت کے ساتھ بھی اور بغیر اجازت کے بھی، پھر مخطوبہ کو دیکھنے کا محض جواز ہی نہیں بلکہ استحباب بھی ہے[5]۔

---

[1] الحدیث أخرجه النسائی فی سننه (ج ۲ صـ۷۳) إباحة النظر قبل التزویج ـ وابن ماجه فی سننه (صـ۱۳۴) باب النظر إلی المرأة إذا أراد أن یتزوّجها ۱۲ م

[2] یہ لفظ أدَمَ، یأدِمُ، أدْمًا باب ضَرَبَ سے بھی ہوسکتا ہے اور آدَمَ، إیدَامًا باب افعال سے بھی، بمعنی الفت واتفاق پیدا کرنا۔ کما فی النہایة (ج ۱ صـ۳۲) ۱۲ م

[3] کما فی شرح معانی الآثار (ج ۲ صـ۹) باب الرجل یرید تزوّج المرأة هل یحل له النظر إلیها أم لا؟ ۱۲ م

[4] امام مالکؒ کے مسلک سے متعلق یہ دو روایتیں ہم نے ملا علی قاریؒ کی مرقاة سے لی ہیں، دیکھئے (ج ۶ صـ۱۹۵) کتاب النکاح، باب النظر إلی المخطوبة وبیان العورات، الفصل الأول ـ لیکن علامہ نوویؒ نے امام مالکؒ کا مسلک بھی جمہور کے مطابق جواز بلا اذن کا نقل کیا ہے اور بالإذن والی روایت کو انھوں نے ضعیف قرار دیا ہے، عدمِ جواز کی کوئی روایت انہوں نے امام مالکؒ سے متعلق ذکر نہیں کی، البتہ وہ لکھتے ہیں: « لکن قال مالك: أکره نظره فی غفلتها مخافة من وقوع نظره علی عورة » گویا امام مالکؒ کے نزدیک بلا إذن بھی نظر کا جواز ہے لیکن مخطوبہ کے علم میں لاکر۔ دیکھئے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ صـ۴۵۶) باب ندب من أراد نکاح امرأة إلی أن ینظر إلی وجهها الخ ۱۲ مرتب۔

[5] چنانچہ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں: « فإنه مندوب لأنه سبب تحصیل النکاح وهو سنة مؤکدة » مرقاة (ج ۶ صـ۱۹۵) باب النظر إلی المخطوبة، الفصل الثانی ـ اصل تقریر میں مذکور جمہور کا مسلک مرقاة (ج ۶ صـ۱۹۵) سے ماخوذ ہے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حدیثِ باب جمہور کے مسلک کی دلیل ہے، گویا اس حدیث میں "انظر إلیھا" کا صیغہ امر جمہور کے نزدیک استحباب پر محمول ہے، عدم وجوب کا قرینہ "مستدرکِ حاکم" میں محمد بن مسلمہؓ کی روایت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: "إذا ألقی اللہ فی قلب امرئٍ منکم خطبة امرأة فلا بأس أن ینظر إلیھا[1]" نیز ابو حمیدؓ فرماتے ہیں: "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: إذا خطب أحدکم امرأة فلا جناح علیہ أن ینظر إلیھا إذا کان إنما ینظر إلیھا لخطبتہ و إن کانت لا تعلم[2]"

پھر جمہور کے نزدیک "نظر إلی المخطوبہ" کا جواز صرف "وجہ" اور "کفین" کی حد تک ہے، امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں: "یجتھد وینظر إلی ما یرید منھا إلا العورة" جبکہ ابن حزمؒ کہتے ہیں کہ جسم کا ہر حصہ دیکھ سکتا ہے[3]، وھو باطل بلا ریب[4]۔ واللہ أعلم

بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ

نیز علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: "قال أصحابنا: یستحبّ أن یکون نظرہ إلیھا قبل الخطبة، حتی إن کرھھا ترکھا من غیر إیذاء، بخلاف ما إذا ترکھا بعد الخطبة" شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۵۶)۔

پھر نظر إلی المخطوبة کا جواز عدمِ شہوت کے ساتھ مقید ہے یا شہوت کی صورت میں بھی جواز ہے؟ اس سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۲۰ ص۱۱۹) باب النظر إلی المرأة قبل التزویج۔ الکوکب الدری (ج ۲ ص۲۱۳، ۲۱۴) ـ ردّ المحتار علی الدرّ المختار (ج ۵ ص۲۳۷) ـ کتاب الحظر والإباحة، فصل فی النظر والمس ۱۲ مرتب عفی عنہ

(حاشیہ صفحۂ ھٰذا)

[1] امام حاکمؒ نے یہ روایت فضائلِ محمد بن مسلمہ انصاریؓ کے تحت (ج ۳ ص۴۳۴) پر ذکر کی ہے۔ دیکھئے نصب الرایہ مع البغیة (ج ۴ ص۲۴۱) فصل فی الوطئ و النظر والمس۔ نیز دیکھئے سنن ابن ماجہ (ص۱۳۴) باب النظر إلی المرأة إذا أراد أن یتزوّجھا ۱۲ مرتب

[2] رواہ أحمد والبزار والطبرانی فی الأوسط والکبیر، ورجال أحمد رجال الصحیح۔ دیکھئے مجمع الزوائد (ج ۴ ص۲۷۶) باب النظر إلی من یرید تزوجھا ۱۲ م

[3] مذکورہ تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری (ج ۹ ص۱۸۲) باب النظر إلی المرأة قبل التزویج۔ حافظؒ نے اس مقام پر امام احمدؒ کے مسلک سے متعلق تین روایات ذکر کی ہیں: "الأولی کالجمھور، والثانیة: ینظر إلی ما یظھر غالباً، والثالثة: ینظر إلیھا متجردة" ۱۲ مرتب

[4] علامہ نوویؒ نے داؤد ظاہریؒ کا بھی یہی مسلک نقل کیا ہے اور اس کے بارے میں وہ فرماتے ہیں: "وھذا خطأ ظاھر منابذ لأصول السنة والإجماع" شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۵۶) ۱۲ مرتب

باب ما جاء فی إعلان النکاح

عن الربیّع بنت معوّذ قالت: جاء رسول الله صلی الله علیه وسلم فدخل علیّ غداة بُنِیَ بی، فجلس علی فراشی کمجلسك منّی»

یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ حضرت ربیّع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اجنبیہ اور غیر محرم تھیں پھر آپ ان کے قریب کیسے تشریف فرما ہوئے؟

اس کا ایک جواب تو یہ دیا جاتا ہے کہ حجاب النساء کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہیں تھا، لیکن یہ جواب اُس وقت درست ہوسکتا ہے جب حکمِ حجاب کی تخصیص پر قرآن وسنت کی کوئی دلیل قائم ہوجائے۔[۲]

لہٰذا صحیح جواب یہ ہے کہ یا تو یہ نزولِ حجاب سے پہلے کا واقعہ ہے، اور اگر نزولِ حجاب کے بعد کا واقعہ ہو تب بھی یوں کہا جاسکتا ہے کہ «وجہ» اور «کفین» حکمِ حجاب سے مستثنیٰ ہیں لیکن فتنے

---

[۱] الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحه (ج ۲ ص۷۷۳) باب ضرب الدف فی النکاح والولیمة - وأبو داؤد فی سننه (ج ۲ ص۶۷۱) کتاب الأدب، باب فی الغناء ۱۲ م

[۲] لیکن حافظ ابن حجرؒ نے اسی جواب کو راجح قرار دیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: «والذی وضح لنا بالأدلة القویة أن من خصائص النبی صلی الله علیه وسلم جواز الخلوة بالأجنبیة والنظر إلیها، وهو الجواب الصحیح عن قصة أم حرام بنت ملحان فی دخوله علیها ونومه عندها وتفلیتها رأسه، ولم یکن بینهما محرمیة ولا زوجیة» فتح الباری (ج ۹ ص۲۰۳) باب ضرب الدف فی النکاح والولیمة - علامہ عینیؒ نے بھی تقریباً یہی بات بیان کرکے خصوصیت والے جواب کو راجح قرار دیا، دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۲۰ ص۱۳۶) باب ضرب الدف الخ -

لیکن حقیقت یہ ہے کہ دعوائے خصوصیت کے لئے مضبوط دلیل کی ضرورت ہے، اس لئے کہ جہاں تک ام حرامؓ کے واقعہ کا تعلق ہے سو اُن کے بارے میں راجح یہ ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محرم تھیں، چنانچہ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: «اتفق العلماء علی أنها کانت محرمًا له صلی الله علیه وسلم، واختلفوا فی کیفیة ذلك، فقال ابن عبد البر وغیره: کانت إحدی خالاته صلی الله علیه وسلم من الرضاعة، وقال آخرون: بل کانت خالة لأبیه أو لجده، لأن عبد المطلب کانت أمه من بنی النجار» شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۲ ص۱۴۱) کتاب الإمارة، باب فضل الغزو فی البحر -

جہاں تک حدیثِ باب کا تعلق ہے اس کے دو جواب تو اصل تقریر میں بھی آچکے ہیں، نیز علامہ کرمانیؒ نے یہ امکان بھی بیان کیا ہے کہ «فجلس علی فراشی کمجلسك منی» میں لفظ «مجلَسك» لام کے فتحہ کے ساتھ ہو (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی وجہ سے ان کو چھپانے کا حکم دیا گیا[1] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں چونکہ فتنہ کا کوئی ادنیٰ اندیشہ بھی نہ تھا اس لئے آپ کے لئے یہ عمل جائز تھا۔

" وجویریات لنا یضربن بدفوفھن ویندبن من قتل من آبائی یوم بدر إلی أن قالت إحداھن : و فینا نبی یعلم ما فی غد، فقال لھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : اسکتی عن ھذہ، وقولی التی کنت تقولین قبلھا " اس حدیث کے آخری جملے سے استدلال کرکے علماء نے کہا ہے کہ نکاح کا اعلان "دف" بجاکر اور "غنا" کے ساتھ کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی حدود کے اندر ہو، اور اس کے اندر گانے بجانے کے دوسرے آلات اور ساز کا استعمال نہ ہو۔

غنا اور موسیقی کا شرعی حکم

اس روایت سے استدلال کرکے بعض صوفیہ اور بعض متجددین عصر نے کہا ہے کہ "غناء" اور "موسیقی" جائز ہے۔

لیکن اس استدلال کا بطلان ظاہر ہے، اس لئے کہ روایت میں صرف "دف" کا ذکر ہے جو آلاتِ موسیقی میں سے نہیں اور جہاں تک غنا کا تعلق ہے اس کے بارے میں ہم ذکر کرچکے ہیں کہ کسی خوشی کے موقع پر اپنی حدود کے اندر اور بغیر آلاتِ موسیقی کے اس کا جواز متفق علیہ ہے، بہرحال یہ حدیث کسی بھی طرح موسیقی کے جواز پر دلیل نہیں بن سکتی۔

اس قسم کے آلات کی قسمیں

اس مسئلہ کی تفصیل یہ ہے کہ اس قسم کے آلات کی تین قسمیں ہیں :

(۱) وہ آلات جو اصلاً اعلان وغیرہ کے لئے وضع کئے گئے ہوں اور ان کا مقصد لہو وطرب

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

اس صورت میں یہ لفظ "جلوس" کے معنی میں ہوگا، اور کوئی اشکال نہ ہوگا کما قال الحافظ۔ نیز علامہ کرمانی نے "مجلسک" بکسر اللام کی صورت میں ایک جواب یہ بھی دیا ہے کہ ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اتنے قریب تو بیٹھے ہوں لیکن پردے کی آڑ میں، دیکھئے شرح کرمانی (ج ۱۹ صفحہ ۱۰) باب ضرب الدف الخ۔ اور فتح الباری (ج ۹ صفحہ ۲۰۳) ۱۲ مرتب عفی عنہ

[1] کما فی تنویر الأبصار والدر المختار مع رد المحتار (ج ۵ صفحہ ۲۳۶، ۲۳۷) کتاب الحظر والإباحۃ، فصل فی النظر والمس ۱۲ م

نہ ہو، یہ اور بات ہے کہ کسی کو اس میں لذت محسوس ہونے لگے، مثلاً "دف"، "نقارہ" اور "گھنٹیاں"
وغیرہ، ان کا استعمال بالاتفاق جائز ہے۔

(۲) وہ آلات جو لہو و طرب کے لئے وضع کئے گئے ہوں اور فساق کا شعار ہوں، جیسے "ستار" اور "ہارمونیم" وغیرہ، ان کی حرمت پر اتفاق ہے۔

(۳) وہ آلات جو اگرچہ لہو و طرب کے لئے وضع کئے گئے ہوں لیکن فساق کا شعار نہ ہوں، امام غزالیؒ نے اس کی مثال "طبل" سے دی ہے، امام غزالیؒ اور بعض صوفیہ نے خاص شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے، مثلاً ایک شرط یہ ہے کہ سنانے والا کوئی بے ریش لڑکا یا اجنبیہ نہ ہو، دوسرے اس پر جو اشعار پڑھے جائیں ان کے مضامین خلافِ شرع نہ ہوں، تیسرے مقصود تحریکِ قلب ہو نہ کہ لہو و طرب[1]۔

لیکن جمہور فقہاء کے نزدیک امام غزالیؒ وغیرہ کا یہ قول مقبول نہیں اور موسیقی کے تمام آلات جو طرب کے لئے وضع کئے گئے ہیں بلا استثناء ناجائز ہیں۔

دلائلِ حرمت | جمہور کے دلائل درج ذیل ہیں:

(۱) ارشادِ باری تعالیٰ: "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ[2]"۔ اس آیت میں "لہو الحدیث" سے مراد "غنا" اور "مزامیر" ہیں، چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے اس کی یہی تفسیر منقول ہے[3]۔

(۲) آیتِ قرآنی: "وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ[4]" اس میں "صوت الشیطان"

---

[1] مذکورہ مضمون احیاء العلوم (ج ۲ ص ۲۸۱ تا ۲۸۳) کتاب آداب السماع والوجد، الباب الاول فی ذکر اختلاف العلماء فی اباحۃ السماع وکشف الحق فیہ، العوارض المحرمۃ للسماع۔ سے ماخوذ ہے۔

و نقل الزبیدی عن السہروردی: "ومن أباحہ من الفقہاء لم یر إعلانہ فی المساجد والبقاع الشریفۃ" إتحاف السادۃ المتقین (ج ۶ ص ۴۵۷) ۱۲ مرتب

[2] سورۂ لقمان آیت ۶ پ ۲۱۔ ۱۲ م

[3] چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ میں سندِ صحیح کے ساتھ ان سے اس کی تفسیر "ھو واللہ الغناء" کے الفاظ کے ساتھ منقول ہے، اس تفسیر کو امام حاکمؒ اور بیہقیؒ نے بھی نقل کیا ہے اور اس کو سنداً صحیح قرار دیا ہے، نیز بیہقی میں حضرت ابن عباسؓ سے بھی اس کی تفسیر "ھو الغناء واشباھہ" کے الفاظ کے ساتھ منقول ہے، مذکورہ تمام تفصیل کے لئے دیکھئے نیل الاوطار (ج ۸ ص ۱۰۰) أبواب السبق والرمی، باب ماجاء فی آلۃ اللھو ۱۲ مرتب

[4] سورۃ الإسراء آیت ۶۴ پ ۱۵۔ ۱۲ م

کی تفسیر "غنا" اور "مزامیر" وغیرہ سے کی گئی ہے کما ھو منقول عن مجاھد[1]

(۳) "اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ وَاَنْتُمْ سَامِدُوْنَ"[2] ابو عبیدہؒ کہتے ہیں کہ لغتِ حمیر میں "سمود" غنا کو کہا جاتا ہے۔ عکرمہؒ سے بھی یہی مروی ہے، نیز حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: "ھو الغناء بالیمانیة[3]"

(۴) صحیح بخاریؒ میں حضرت ابو مالک اشعریؓ کی مرفوع روایت ہے: "لیکونن من اُمتی أقوام یستحلون الحِرَ[5] والحریر والخمر والمعازف"[4]

(۵) سنن ابن ماجہ[6] میں مجاہدؒ سے مروی ہے، "قال: کنتُ مع ابن عمر فسمع صوت طبل فأدخل إصبعیه فی أذنیه، ثم تنحّی حتی فعل ذلك ثلاث مرّات، ثم قال: هكذا فعل رسول الله صلی الله علیه وسلم"

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ امام ابو داؤدؒ نے اس روایت کو "منکر" قرار دیا ہے[7] کما فی نسخة اللؤلؤی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حافظ ابن حجرؒ نے "تلخیص" میں یہ روایت نقل کرکے اس پر سکوت

---

[1] روح المعانی (ج ۱۵ ص۶۸) ۱۲ م

[2] سورة النجم آیت ۵۹ تا ۶۱ پ۲۷ ۔ ۱۲ م

[3] تفصیل کے لئے دیکھئے روح المعانی (ج ۲۷ ص۷۲) قبیل سورة القمر۔

واضح رہے کہ امام الصوفیہ شیخ سہروردیؒ نے بھی اپنی کتاب "عوارف المعارف" میں مذکورہ تین آیات سے غنا کی حرمت پر استدلال کیا ہے۔ کما فی أحکام القرآن للشیخ المفتی محمد شفیع رحمه الله تعالیٰ (ج ۳ ص۲۰۵)، نیز آیت: "وَلَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ" (سورۂ فرقان آیت ۷۲، پ۱۹) محمد بن الحنفیہؒ، مجاہدؒ اور امام ابو حنیفہؒ سے بھی اس کی ایک تفسیر غنا کے ساتھ منقول ہے۔ حوالۂ بالا ۱۲ مرتب

[4] (ج ۲ ص۸۳۷) کتاب الأشربة، باب ما جاء فیمن یستحلّ الخمر ویسمّیه بغیر اسمه ۱۲ م

[5] الحِرُ: بتخفیف الراء "الفرج"، وأصله "حرح" بکسر الحاء وسکون الراء، وجمعه "أحراح" ومنهم من یشدّد الراء ولیس بجیّد، فعلی التخفیف یکون فی حرح لا فی حرر۔ کذا فی النهایة (ج ۱ ص۳۶۶ مادة حرر) ۱۲ مرتب

[6] (ص۱۳۷) أبواب النکاح، باب الغناء والدف ۱۲ م

[7] دیکھئے سنن ابی داؤد (ج ۲ ص۶۷۳) کتاب الأدب، باب کراهیة الغناء والزمر ۱۲ م

کیا ہے[1]۔ جو ان کے نزدیک روایت کے قابلِ استدلال ہونے کی دلیل ہے، اس لئے امام ابوداؤدؒ کا "منکر" قرار دینا یا تو کسی خاص طریق کی بناء پر ہے یا "منکر" سے ان کی مراد "غریب" ہے اور متقدمین کی کتابوں میں اس قسم کے اطلاقات کی کافی نظیریں ملتی ہیں[2]، لہٰذا اس روایت کو اصطلاحی اعتبار سے منکر قرار دینا درست نہیں[3]۔

(۹) سنن ترمذی[4] میں حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت ہے: "أن رسول الله صلی الله

---

[1] کما فی نیل الأوطار (ج ۸ ص۱۰۱) أبواب السبق والرمی، باب ما جاء فی آلۃ اللھو ۱۲ م

[2] جس کی وضاحت یہ ہے کہ منکر اصطلاح میں "ما رواہ الضعیف مخالفاً لما رواہ الثقۃ" کو کہا جاتا ہے کما ذکرہ الحافظؒ، کما فی تیسیر مصطلح الحدیث (ص۹۵) لیکن اصولِ حدیث کی یہ اصطلاحات متقدمین کے زمانہ میں اتنی مرتب اور منضبط نہ تھیں جتنی کہ متأخرین کے دور میں ہوگئیں، چنانچہ متقدمین کے دور میں ایک اصطلاح کو دوسری اصطلاح کی جگہ استعمال کرلیا جاتا تھا جبکہ متأخرین کے ہاں اس کا التزام کیا جاتا ہے کہ ہر اصطلاح اپنے مخصوص معنی ہی میں استعمال ہو، اس کے بعد یہ سمجھیں کہ متقدمین "منکر" بول کر بسا اوقات "غریب" (یعنی جس کا راوی متفرد ہو اگرچہ ثقہ ہی کیوں نہ ہو) مراد لے لیتے ہیں، اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے دیکھئے الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل (ص۲۰۲ تا ص۲۰۳ ایقاظ ۸) فی الفرق بین قولھم: حدیث منکر ومنکر الحدیث، ویروی المناکیر۔ زیر بحث روایت میں بھی عین ممکن ہے کہ امام ابوداؤدؒ نے جو اس کو منکر کہا ہے وہ متقدمین کی اصطلاح کے مطابق ہو یعنی منکر بول کر حدیث غریب مراد لی ہو، اگرچہ راجح یہ ہے کہ منکر ہونا تو کجا یہ روایت غریب بھی نہیں ہے، اس لئے کہ جنہوں نے اس کو غریب قرار دیا ہے وہ سلیمان بن موسیٰ کو متفرد قرار دیتے ہیں حالانکہ سلیمان اس کی روایت میں متفرد نہیں، چنانچہ مسند ابویعلیٰ میں میمون بن مہران نے اور طبرانی میں مطعم بن مقدام صنعانی نے ان کی متابعت کی ہے، کذا فی عون المعبود (ج ۴ ص۴۳۴ و ص۴۳۵) باب کراھیۃ الغناء والزمر، کتاب الأدب ۱۲ مرتب عفی عنہ

[3] چنانچہ صاحبِ بذل المجہودؒ (ج ۱۹ ص۱۱۶) الأدب، کراھیۃ الغناء والزمر میں لکھتے ہیں:

أما قول أبی داؤد أن الحدیث منکر فلم أعرف علی وجہ نکارتہ، لأن رواتہ ثقات، ولیس بمخالف لمن ھو أوثق منہ۔ واللہ اعلم۔

اور صاحبِ عون المعبود (ج ۴ ص۴۳۴) پر لکھتے ہیں:

ولا یعلم وجہ النکارۃ فإن الحدیث رواتہ کلھم ثقات، ولیس بمخالف لروایۃ أوثق الناس ۱۲ م

[4] (ج ۲ ص۴۴) أبواب الفتن، باب بلا ترجمۃ قبیل باب ما جاء فی قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم "بعثت أنا والساعۃ کھاتین" ۱۲ م

صلی اللہ علیہ وسلم قال : فی ھٰذہ الأمۃ خسف ومسخ وقذف، فقال رجل من المسلمین: یا رسول اللہ! ومتی ذلک؟ قال: إذا ظھرت القیان[1] والمعازف[2] وشربت الخمور "

ان احادیث کے علاوہ معازف ومزامیر کے عدم جواز پر اور بھی بہت سی احادیث ہیں جنہیں والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ نے اپنے عربی رسالہ "کشف العناء عن وصف الغناء" میں جمع کر دیا ہے، یہ رسالہ "احکام القرآن" کا ایک جزو ہے[3]، اس رسالہ میں انہوں اس موضوع پر بتیس احادیث جمع کر دی ہیں جن میں سے متعدد صحیح، بعض حسن اور بعض ضعیف ہیں، لیکن ان کا مجموعہ معازف ومزامیر کا عدم جواز ثابت کرنے کے لئے کافی ہے[4]۔

---

[1] "القیان": "قینۃ" کی جمع ہے بمعنی "باندی"، "وکثیرا ما تطلق علی المغنیۃ من الإماء"، اس کی ایک جمع "قینات" بھی آتی ہے، دیکھئے النہایہ (ج ۴ ص ۱۳۵) ۱۲ م

[2] معازف: "معزفۃ" کی جمع ہے گانے بجانے کے آلات ۱۲م

[3] اور حضرت مفتی صاحبؒ کے رسالہ "السعی الحثیث فی تفسیر لھو الحدیث" کے ایک حصہ کی حیثیت رکھتا ہے، یہ دونوں رسالے احکام القرآن میں شامل ہیں۔ دیکھئے (ج ۳ ص ۱۹۲ تا ص ۲۶۱) طبع جدید ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی۔ ۱۲ م

[4] ان روایات کی اجمالی فہرست مآخذ کے حوالہ کے ساتھ اس طرح ہے :

(۱) حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت: سنن ابی داؤد (ج ۲ ص ۱۶۹) کتاب الأشربۃ باب ماجاء فی السکر، اور مسند احمد (ج ۲ ص ۱۵۸)

(۲) حضرت ابن عباسؓ کی روایت: سنن ابی داؤد (ج ۲ ص ۵۲) باب فی الأوعیۃ، مسند احمد (ج ۱ ص ۲۸۹) سنن کبریٰ بیہقی (ج ۱۰ ص ۲۲۱) کتاب الشہادات، باب ما جاء فی ذم الملاھی من المعازف والمزامیر ونحوھا۔

(۳) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت: سنن ترمذی (ج ۲ ص ۴۲) أبواب الفتن باب (بلا ترجمہ) بعد باب ماجاء فی أشراط الساعۃ۔

(۴) حضرت علی بن ابی طالبؓ کی روایت: حوالہ بالا۔

(۵) حضرت ابن مسعودؓ کی روایت: نیل الاوطار (ج ۸ ص ۱۰۰، باب ماجاء فی آلۃ اللھو) بحوالہ محمد بن اسحاق۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

قائلینِ اباحت کے دلائل اور ان کے جوابات

اب ان روایات پر ایک نگاہ ڈال لینی چاہیے جن سے موجودہ زمانہ کے اہلِ تجدد اور بعض صوفیاء موسیقی کے جواز پر استدلال کرتے ہیں:

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

(۶) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت، حوالۂ بالا۔

(۷) حضرت علیؓ کی روایت، رواہ ابن غیلان، حوالۂ بالا۔

(۸) حضرت عمرؓ کی روایت، رواہ الطبرانی، حوالۂ بالا۔

(۹) حضرت علیؓ کی روایت، اخرجہ قاسم بن سلام، حوالۂ بالا۔

(۱۰) حضرت ابوامامہؓ کی روایت، مسند احمد بن حنبل (ج ۵ ص۲۵۷) کنز العمال (ج ۱۱ ص۲۲۳ و ص۲۲۴) رقم ۳۲۰۸۹ برمز ط۔ حم۔ طب۔

(۱۱) حضرت ابن عباسؓ کی روایت، بیہقی (ج ۱۰ ص۲۲۳) کتاب الشہادات، باب ماجاء فی ذم الملاھی من المعازف والمزامیر ونحوھا۔

(۱۲) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت جو احکام القرآن (ج ۳ ص۲۰۱) میں مسدد اور ابن حبان کے حوالہ سے منقول ہے، نیز دیکھیے کنز العمال (ج ۱۴ ص۲۸۱) کتاب القیامۃ، الخسف والمسخ۔

(۱۳) حضرت سہل بن سعدؓ کی روایت، کنز العمال، حوالۂ بالا بحوالہ عبد بن حمید، ابن ابی الدنیا اور ابن النجار نیز دیکھیے سنن ابن ماجہ (ص۲۹۵) کتاب الفتن باب الخسوف۔

(۱۴) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت، سنن کبریٰ بیہقی (ج ۱۰ ص۲۲۳) باب الرجل یغنی۔ اور سنن ابی داؤد بتصحیح محی الدین عبدالحمید (ج ۴ ص۲۸۲) کتاب الأدب، باب کراھیۃ الغناء والزمر۔ کنز العمال (ج ۱۵ ص۲۱۸ و ص۲۱۹ رقم ۴۰۶۵۸) التغنی المحظور، کتاب اللھو واللعب بحوالہ ابن ابی الدنیا فی ذم الملاھی۔

(۱۵) حضرت علیؓ کی روایت، کنز العمال (ج ۱۵ ص۲۲۴ رقم ۴۰۶۹۳) بحوالہ دارقطنی۔

(۱۶) حضرت انسؓ کی روایت، کنز العمال (ج ۱۵ ص۲۲۰ رقم ۴۰۶۶۹) التغنی المحظور بحوالہ ابن مصری فی أمالیہ وتاریخ ابن عساکر۔

(۱۷) حضرت صفوان بن امیہؓ کی روایت، کنز العمال (ج ۱۵ ص۲۲۱ و۲۲۲) رقم ۴۰۶۷۰) التغنی المحظور

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

① ان حضرات کا پہلا استدلال حضرت ربیعؓ بنت معوذؓ کی حدیث باب سے ہے لیکن اس کا جواب گذر چکا ہے کہ خوشی کے مواقع پر دف بجانا جائز ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

بحوالہ بیہقی، طبرانی، دیلمی۔ نیز دیکھئے سنن ابن ماجہ (صفحہ ۱۸۷) أبواب الحدود، باب المختثین۔

(۱۸) حضرت علیؓ کی روایت، کنز العمال (ج ۱۵ صفحہ ۲۲۲، رقم ۴۰۶۴۳) بحوالہ حاکم فی تاریخہ والدیلمی۔

(۱۹) حضرت ابن عباسؓ کی روایت، احکام القرآن (ج ۳ صفحہ ۲۱۰) یہ روایت الفاظ کے ذرا فرق کے ساتھ اسی حاشیہ میں نمبر ۲ کے تحت گزر چکی ہے۔

(۲۰) حضرت ابن عباسؓ کی روایت، احکام القرآن (ج ۳ صفحہ ۲۱۰) بحوالہ دیلمی، البتہ کنز العمال (ج ۱۵ صفحہ ۲۲۲، رقم ۴۰۶۶۵) میں دیلمی ہی کے حوالہ سے حضرت جابرؓ کی طرف منسوب ہے۔

(۲۱) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت، کنز العمال (ج ۱۵ صفحہ ۲۲۰ رقم ۴۰۶۶۸) بحوالہ دیلمی۔

(۲۲) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت، کنز (ج ۱۵ صفحہ ۲۲۰ رقم ۴۰۶۶۷) نیز دیکھئے رقم ۴۰۶۰ بحوالہ دیلمی عن انسؓ۔

(۲۳) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت، کنز (ج ۱۵ صفحہ ۲۱۹ رقم ۴۰۶۶۰) بحوالہ حکیم ترمذی۔

(۲۴) حضرت انسؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایت، (کنز (ج ۱۵ صفحہ ۲۲۳، رقم ۴۰۶۷۰) بحوالہ ابن مردویہ والبزار، وذکرہ فی الکنز عن الضیاء۔ أیضاً روایۃ عن انسؓ (صفحہ ۲۱۹، رقم ۴۰۶۶۱)۔

(۲۵) حضرت ابن عمرؓ کی روایت، کنز رقم ۴۰۶۶۲ بحوالہ طبرانی وخطابی۔

(۲۶) حضرت علیؓ کی روایت، کنز العمال (ج ۱۵ صفحہ ۲۲۶، رقم ۴۰۶۸۸) الغناء۔ بحوالہ مسند ابو یعلیٰ۔

(۲۷) حضرت زید بن ارقمؓ کی روایت، کنز، رقم ۴۰۶۹۱ بحوالہ حسن بن سفیان والدیلمی۔

(۲۸) حضرت ابو امامہؓ کی روایت، کنز العمال (ج ۴ صفحہ ۳۹، رقم ۹۳۹۴) المکاسب المحظورہ۔ الإکمال بحوالہ ابن ابی الدنیا اور ابن مردویہ۔

(۲۹) حضرت عائشہؓ کی روایت، رواہ الطبرانی فی الاوسط دیکھئے مجمع الزوائد (ج ۴ صفحہ ۹۱) باب فی ثمن القینۃ، کتاب البیوع۔

یہاں ۲۹ روایات کے اصل مآخذ کا حوالہ درج ہے، تین روایات اصل تقریر میں آچکی ہیں، اس طرح کل بتیس ۳۲ روایات ہوئیں یہ تمام روایات احکام القرآن (ج ۳ صفحہ ۲۰۵ تا ۲۱۳) میں اکٹھی دیکھی جاسکتی ہیں، کتب حدیث میں اس موضوع سے متعلق اور بھی متعدد روایات موجود ہیں، تلاش وجستجو سے اس تعداد میں معتد بہ اضافہ ہوسکتا ہے۔ واللہ اعلم ۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ

(۲) دوسرا استدلال صحیح بخاری[1] میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے ہے: "قالت: دخل أبو بکر وعندی جاریتان من جواری الأنصار تغنیان بما تقاولت الأنصار یوم بعاث، قالت: ولیستا بمغنیتین، فقال أبو بکر: أبمزامیر الشیطان فی بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ وذلک فی یوم عید فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یا أبا بکر! إن لکل قوم عیدا وھذا عیدنا"

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہ غنا بغیر الآلات یا محض دف کے ساتھ تھا جس کا مواضع سرور میں جواز ہے[2]۔

(۳) بخاری[3] میں حضرت عائشہؓ کی روایت: "أنھا زفت امرأۃ إلی رجل من الأنصار فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: یا عائشۃ! ما کان معکم لھو؟ فإن الأنصار یعجبھم اللھو۔" اس میں لفظِ "لہو" مطلق ہے جو تمام آلاتِ طرب کو شامل ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں "لہو" سے مراد غنا بغیر الآلات ہے چنانچہ سنن ابن ماجہؒ کی

---

[1] صحیح بخاری (ج ۱ ص ۱۳۰) کتاب العیدین، باب سنۃ العیدین لأھل الإسلام۔ ایک روایت میں آپ کے یہ الفاظ مروی ہیں: "دعھما یا أبا بکر فإنھا أیام عید" (ج ۱ ص ۱۳۵) باب إذا فاتہ العید یصلی رکعتین۔ حضرت عائشہؓ کی مذکورہ روایت ان دو مقامات کے علاوہ بخاری کے درج ذیل مواضع میں بھی آتی ہے: (۱)۔ ج ۱ ص ۴۰۶۔ کتاب الجہاد، باب الدرق (۲) ج ۱ ص ۴۹۹۔ کتاب المناقب، باب قصۃ الحبش (۳)۔ ج ۱ ص ۵۵۹ کتاب المناقب، باب مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم وأصحابہ إلی المدینۃ۔ نیز دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۹۱) کتاب العیدین، فصل فی جواز لعب الجواری الصغار وغناءھن۔ ۱۲ مرتب

[2] اس جواب کی تائید حضرت عائشہؓ کے الفاظ "ولیستا بمغنیتین" سے بھی ہو رہی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوئی پیشہ ور گانے والی نہ تھیں، مزید وضاحت کے لئے دیکھئے فتح الباری (ج ۲ ص ۳۴۲) باب الحراب والدرق یوم العید ۱۲ مرتب

[3] (ج ۲ ص ۷۷۵) کتاب النکاح، باب النسوۃ اللاتی یھدین المرأۃ إلی زوجھا۔ ۱۲ م

[4] ص ۱۳۷، باب الغناء والدف ۱۲ م

روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں : « أرسلتم معها من يغنّي ؟ قالت : لا ، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : إن الأنصار قومٌ فيهم غزل فلو بعثتم معها من يقول :

أتيناكم أتيناكم فحيّانا وحيّاكم

یا زیادہ سے زیادہ غنا ، بالدف مراد ہے ، چنانچہ ایک روایت میں « فهل بعثتم معها جارية تضرب بالدف وتغنّي ؟ » کے الفاظ آئے ہیں[1] ، بہرحال غنا ، بغیر الآلات ہو یا دف کے ساتھ دونوں صورتیں جائز ہیں بالخصوص مواقعِ سرور میں ۔

④ عمدة القاری[2] کی روایت سے بھی استدلال ہے : « عمر بن شبة عن أبي عاصم النبيل حدثنا ابن جريج عن عطاء عن عبيد بن عمير قال : كان لداؤد عليه الصلاة والسلام معزفة يتغنّي عليها ويَبكي ويُبكي »

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت حافظ ابن حجرؒ نے بھی فتح الباری میں نقل کی ہے لیکن اسمیں « معزفہ » کا کوئی ذکر نہیں[3] ، اگر بالفرض علامہ عینیؒ ہی کی روایت کو تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ عبید بن عمیر کا قول سمجھا جائے گا ، اس لئے کہ اگرچہ وہ تابعی اور ثقہ ہیں لیکن حافظؒ نے لکھا ہے : كان قاص أهل مكة[4] » اور خزرجیؒ نے "خلاصة تذهيب تهذيب الكمال" میں ذکر کیا ہے : « أول من قص عبيد بن عمير »[5] اور اپنی اس روایت کی نسبت انہوں نے نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی ہے نہ کسی صحابی کی طرف ، لہٰذا ظاہر یہی ہے کہ یہ جملہ کوئی حدیث یا اثر نہیں بلکہ ان کے قصوں میں سے کوئی قصہ ہے جو شرعی طور پر حجت نہیں ۔

---

[1] چنانچہ شریک کی روایت میں یہی الفاظ آئے ہیں ، کما فی فتح الباری (ج ۹ ص۲۲۶) باب النسوة اللاتی الخ ۱۲ م

[2] (ج ۲۰ ص۶۷) کتاب فضائل القرآن ، باب من لم يتغن بالقرآن ۱۲ م

[3] چنانچہ حافظؒ نے یہ روایت عمر بن شبہ عن ابی عاصم النبیل حدثنی ابن جریج عن عطاء عن عبید بن عمیر کے طریق سے ان الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے : « کان داؤد علیہ السلام یتغنی ۔ یعنی حین یقرأ ویبکی ویُبکی » فتح الباری (ج ۹ ص۶۱) ۱۲ م

[4] چنانچہ تقریب التہذیب (ج ۱ ص۵۴۴ ، رقم ۱۵۶۱) میں حافظؒ نے ان کا تذکرہ ان الفاظ کیساتھ کیا ہے « عبيد بن عمير بن قتادة الليثي أبو عاصم المكي ولد على عهد النبي صلى الله عليه وسلم ، قاله مسلم وعدّه غيره من كبار التابعين ، وكان قاص أهل مكة ، مجمع على ثقته ، مات قبل ابن عمر ، بوعن « ع » ۱۲ مرتب

[5] (ج ۲ ص۲۰۳) رقم ۴۶۲۴ ، قال ثابت : أول من قص الخ ۱۲ م

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ علامہ شوکانیؒ نے سماع کے بارے میں اپنے رسالہ[1] میں یہی روایت مصنف عبد الرزاق کے حوالہ سے نقل کی ہے اور اسے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن غالب یہ ہے کہ اس نقل میں علامہ شوکانیؒ کو یا ان کے رسالہ کے کسی کاتب کو مغالطہ ہوا ہے اور اس نے عبید بن عمیر کے بجائے اس روایت کو عبداللہ بن عمرؓ کی طرف منسوب کر دیا، جس کی دلیل یہ ہے کہ مصنف عبدالرزاق شوکانیؒ کے پاس نہیں تھی[2]، یقیناً انہوں نے یہ روایت کہیں اور سے نقل کی ہے اور نقل در نقل میں اس قسم کی غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں، مصنف عبدالرزاق کے طبع ہونے کے بعد احقر نے یہ روایت اسمیں تلاش کی لیکن ممکنہ مواقع مثلاً باب الغناء والدف[3] اور کتاب فضائل القرآن[4] میں مجھے نہیں ملی، ہو سکتا ہے کسی مناسبت سے کسی اور باب میں آئی ہو[5]، البتہ احقر کو یہ روایت حافظ ابن کثیرؒ کی "البدایہ والنہایہ" میں مل گئی، جو مصنف عبدالرزاق ہی کے حوالہ سے ذکر کی گئی ہے اس میں روایت عبید بن عمیر ہی کی طرف منسوب ہے نہ کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی طرف[6]۔

---

[1] جس کا نام انہوں نے "إبطال دعوى الإجماع على تحريم مطلق السماع" ذکر کیا ہے، دیکھئے نیل الأوطار (ج ۸ صفحہ ۱۰۱) آخر باب ماجاء فی آلة اللهو لیکن کوشش کے باوجود یہ رسالہ دستیاب نہ ہو سکا ۱۲ مرتب

[2] اس بات کا کوئی حوالہ احقر کو تلاش کے باوجود نہ مل سکا، البتہ اس کا قوی قرینہ یہ ہے کہ یہ کتاب مخطوطوں کی صورت میں تو موجود تھی طبع نہ ہو سکی تھی، کچھ ہی عرصہ قبل طبع ہو کر منظرِ عام پر آئی ہے اس لئے ظاہر یہی ہے کہ شوکانیؒ کے پاس نہ ہوگی۔ واللہ اعلم۔ ۱۲ مرتب

[3] مصنف عبدالرزاق (ج ۱۱ صفحہ ۳) ۱۲ م

[4] مصنف (ج ۳ صفحہ ۳۳۵ تا صفحہ ۳۸۴) ۱۲ م

[5] الحمد للہ! یہ روایت أبواب القراءة فی الصلوٰة میں باب النائم والسکران والقراءة علی الغناء کے تحت مل گئی، دیکھئے مصنف عبدالرزاق (ج ۲ صفحہ ۴۸۱، رقم ۴۱۶۵) روایت اس طرح ہے "عبد الرزاق قال أخبرنا ابن جريج قال: قلتُ لعطاء: القراءة على الغناء؟ قال: ما بأس بذلك، سمعتُ عبيد بن عمير يقول: كان داؤد النبي صلى الله عليه وسلم يأخذ المعزفة فيضرب بها عليه، يردّ عليه صوته يريد أن يبكي بذلك ويُبكي۔ مرتب عفی عنہ

[6] دیکھئے البدایة والنہایة (ج ۲ صفحہ ۱۱) قصة داؤد علیہ السلام وما كان فی أيامه الخ۔ لیکن اسمیں راوی کا نام عبید بن عمر ذکر ہے، درست یقیناً عبید بن عمیر ہی ہے جیسا کہ ہم اصل مأخذ یعنی مصنف عبدالرزاق کے حوالہ سے پچھلے حاشیہ میں نقل کر چکے ہیں ۱۲ مرتب

⑤ علامہ زبیدیؒ نے احیاء العلوم کی شرح اتحاف السادۃ المتقین[1] میں استاذ ابو منصور بغدادی شافعیؒ سے نقل کیا ہے: "کان عبد اللہ بن جعفر مع کبر شانہ یصوغ الألحان لجواریہ و یسمعہا منہن علی أوتارہ"

نیز وہ نقل کرتے ہیں: "کان لعبد اللہ ابن الزبیر جوار عوادات" اور نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عمرؓ ان کے پاس آئے تو انہوں نے وہاں "عود" دیکھا تو پوچھا: ماھذا؟ یا صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! تو حضرت ابن زبیرؓ نے وہ "عود" ان کے ہاتھ میں دیدیا، حضرت ابن عمرؓ نے اسے غور سے دیکھ کر فرمایا: "ھٰذا میزان شامی" حضرت ابن زبیرؓ نے جواب دیا: "توزن بہ العقول"

ان سب کا مشترک جواب یہ ہے کہ یہ روایات علامہ شوکانیؒ نے بھی "نیل الاوطار"[2] میں ذکر کی ہیں، نیز انہوں نے یہ روایت بھی ابو محمد بن حزمؒ سے نقل کی ہے: "أن رجلاً قدم المدینۃ بجوار فنزل علی عبد اللہ بن عمر و فیہن جاریۃ تضرب، فجاء رجل فساومہ فلم یھو منہن شیئا، قال: انطلق إلی رجل ھو أمثل لك بیعاً من ھٰذا، قال: من ھو؟ قال: عبد اللہ بن جعفر، فعرضہن علیہ، فأمر جاریۃ منہن، فقال لہا: خذ العود فأخذتہ فغنت فبایعہ" لیکن صحابہؓ و تابعینؒ سے ——— یہ روایات نہ تو سنداً ثابت ہیں، نہ ان کے ماخذ کا کوئی علم ہے، جہاں تک حضرت عبد اللہ بن جعفرؓ کا تعلق ہے سو ان کے بارے میں یہ بات تو معروف ہے کہ "وکان لایریٰ بسماع الغناء بأساً"[3] لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ غناء بغیر الآلات ہوتا تھا، چنانچہ آلات کے ساتھ غناء کا ثبوت کسی معتبر روایت میں نہیں ملتا، احقر نے "الاصابۃ"[4]، "الاستیعاب"[5]، "أسد الغابۃ"[6]، "البدایۃ والنہایۃ"[7] وغیرہ تمام معتبر

---

[1] (ج ۶ ص۴۵۵ و ۴۵۶) کتاب السماع والوجد، الباب الأول، بیان الدلیل علی إباحۃ السماع ۱۲ م

[2] (ج ۸ ص۱۰۱) باب ما جاء فی آلۃ اللھو ۱۲ م

[3] قالہ ابن عبد البر فی الاستیعاب فی ذیل الإصابۃ (ج ۲ ص۲۷۶) ۱۲ م

[4] (ج ۲ ص۲۸۰ و ۲۸۱، رقم ۴۵۹۱) اس میں غناء سے متعلق کسی قسم کی روایت مذکور نہیں ۱۲ م

[5] تحت الإصابۃ (ج ۲ ص۲۶۶ تا ص۲۶۸) روایت صرف مطلق غناء سے متعلق ہے ۱۲ م

[6] (ج ۳ ص۱۳۳ تا ص۱۳۵) غناء سے متعلق کسی قسم کی روایت مروی نہیں ۱۲ م

[7] (ج ۹ ص۳۳ و ۳۴) صرف مطلق غناء کی روایت ہے ۱۲ م

تواریخ میں جستجو کی تو اوتار پران کے غناء سننے کی کوئی معتبر روایت نہ مل سکی، روایات میں صرف غناء کا ذکر ہے آلات کا کہیں ذکر نہیں، یہاں تک کہ حافظ ابن عساکرؒ نے اپنی تاریخ میں حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کا تذکرہ تقریباً پندرہ صفحات میں کیا ہے[۱] اور اپنی عادت کے مطابق اس میں ہر طرح کی رطب ویابس روایات جمع کی ہیں لیکن ان میں محض غناء کا ذکر ہے آلات پر سننے کا کوئی ذکر نہیں، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ روایات حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کی طرف غلط منسوب ہیں، لہٰذا ان بے حوالہ اور بے سند روایات کا کوئی اعتبار نہیں[۲]۔

غناء بغیر الآلات کا حکم | جہاں تک غناء بغیر الآلات کا تعلق ہے سو اگر خوشی کا موقع ہو یا انسان دفعِ وحشت کے لئے گائے تو وہ بالاتفاق جائز ہے، بشرطیکہ اشعار کا مفہوم شریعت کے خلاف نہ ہو، مثلاً اس میں کسی معین عورت کا نام لیکر تشبیب نہ ہو، جن احناف سے ان مواقع پر بھی غناء کی کراہت کا قول منقول ہے وہ "إذا کان فی الکلام مالا یجوز" پر محمول ہے، بہرحال راجح یہ ہے کہ اگر طبعی سادگی کے ساتھ غناء ہو اور اس کو عادت یا پیشہ نہ بنایا جائے تو اس کی گنجائش ہے[۳]۔

لیکن واضح رہے کہ مذکورہ غناء کا جواز اس صورت میں منحصر ہے جب سماع من الأجنبیۃ نہ ہو اجنبیہ سے سماع بالاتفاق حرام ہے حتی کہ امام غزالیؒ نے بھی اسے ناجائز قرار دیا ہے، کما تقدم۔

---

[۱] تہذیب تاریخ ابن عساکر جلد ہفتم، حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کا تذکرہ ص۳۲۵ سے ص۳۴۴ تک ہے، انمیں مطلق غناء کی صرف دو روایات مروی ہیں ۱۲ مرتب

[۲] وقد ذکر الزبیدی ثبوت السماع من عمرؓ (نقلہ ابن عبد البرؒ) وعثمان بن عفانؓ (نقلہ الماوردی فی الحاوی) وعبدالرحمٰن بن عوف (رواہ أبوبکر بن أبی شیبۃ) وعبیدۃ بن أبی الجراح (عند البیهقی) وسعد بن أبی وقاص (عند ابن قتیبۃ) وأبی مسعود البدری (عند البیهقی) وبلال المؤذن (عند البیهقی أیضًا) وعبداللہ بن الأرقم (رواہ ابن عبدالبر) وأسامۃ بن زید (عند البیهقی) وحمزۃ بن عبد المطلب (وقصتہ فی الصحیحین) وعبداللہ بن عمر (رواہ ابن طاهر) والبراء بن مالک (رواہ أبو نعیم) وعمرو بن العاص (عند ابن قتیبۃ) والنعمان بن بشیر (رواہ صاحب الأغانی) وحسان بن ثابت (الأغانی) وآخرین۔ إتحاف السادۃ المتقین (ج ۶ ص۴۵۹) بیان الدلیل علی إباحۃ السماع۔

قال العبد الضعیف: لعلها فی السماع بغیر الآلات ۱۲ از استاذ محترم دام اقبالہم۔

[۳] تفصیل کے لئے دیکھئے فتح القدیر (ج ۶ ص۴۸۱ تا ص۴۸۲) کتاب الشهادات، باب من تقبل شهادته ومن لا تقبل ـ نیز دیکھئے احکام القرآن (للتھانوی)، (ج ۳ ص۲۳ و ص۲۵) ۱۲ م

لیکن اس پر "مسند احمد"[1] اور "طبرانی"[2] کی روایت سے اشکال ہوتا ہے: "عن السائب ابن یزید أن امرأۃ جاءت إلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فقال: یاعائشۃ! أتعرفین ھٰذہ؟ قالت: لا! یا نبی اللہ! فقال: ھٰذہ قینۃ بنی فلان، تحبین أن تغنیك؟ قالت: نعم! قال: فأعطاھا طبقاً فغنتھا، فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: قد نفخ الشیطان فی منخریھا" اس روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اجنبیہ سے سماع غناء ثابت ہو رہا ہے، علامہ ھیثمی مجمع الزوائد[2] میں اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"رواہ أحمد والطبرانی ورجال أحمد رجال الصحیح"

متقدمین کی کتابوں میں احقر کو اس کا کوئی جواب نہ مل سکا، البتہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ عورت اپنی ذات میں محرم نہیں نہ اس کا غناء سننا حرام لعینہٖ ہے۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ہر فتنہ سے مامون تھے اس لئے آپ کے لئے اس قسم کے سماع میں حرج نہ تھا، لیکن عام لوگوں کے حق میں فتنہ سے امن نہیں، نہ ہی آپ کے بعد کوئی معصوم ہو سکتا ہے، لہٰذا اس روایت سے جواز کے عموم پر استدلال نہیں کیا جا سکتا، فإنھا واقعۃ حال لا عموم لھا۔ حاصل یہ کہ یہ روایت اس عمومی حکم کا معارضہ نہیں کر سکتی جن میں ممانعت حدِ شہرت کو پہنچ گئی ہے۔ واللہ سبحانہٗ أعلم۔

باب مایقال للمتزوّج

عن[3] أبی ھریرۃ أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان إذا رفأ الإنسان إذا تزوج قال: بارك اللہ[4] وبارك علیك وجمع بینکما فی خیر"۔

---

[1] (ج ۳ ص ۴۴۹) ۱۲ م

[2] (ج ۸ ص ۱۳۰) کتاب الأدب، باب غناء النساء ۱۲ م

[3] الحدیث أخرجہ أبو داود فی سننہ (ج ۱ ص ۲۹۰) کتاب النکاح، باب مایقال للمتزوج، وابن ماجۃ فی سننہ (ص ۱۳۶) باب تھنئۃ النکاح ۱۲ م

[4] وفی نسخۃ أحمد شاکر بتحقیق الشیخ محمد فؤاد عبد الباقی "بارك اللہ لك" أنظر (ج ۳ ص ۴۰۰، رقم ۱۰۹۱) ۱۲ م

"رِفاء" لغت میں ضم اور اتفاق کے معنی میں آتا ہے[1]، "رَفَّأَ" کا مطلب ہوتا ہے نکاح کی مبارکباد کے موقع پر برکت اور موافقت بین الزوجین کی دعاء دینا، جاہلیت میں لوگ نکاح کی مبارکباد ان الفاظ کے ساتھ دیا کرتے تھے: "بالرفاء والبنین"[2] لیکن بقی بن مخلدؒ نے اپنی مسند میں ایک روایت نقل کی ہے[3] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے مبارکباد کے اس طریقہ کو ختم کرکے وہ دعاء برکت سکھلائی تھی جو حدیثِ باب میں آئی ہے[4]، اگرچہ اس روایت کی سند میں ایک راوی مجہول ہے[5] لیکن اس کی تائید حضرت عقیل بن ابی طالبؓ کے اثر (جس کا حوالہ امام ترمذیؒ نے بھی "وفی الباب عن عقیل بن أبی طالب" کے الفاظ کے ساتھ دیا ہے) سے ہوتی ہے کہ انھوں نے "بالرفاء والبنین" کہنے والے پر نکیر کی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے مطابق دعاء دینے کی تلقین فرمائی[6]۔ واللہ اعلم۔

---

[1] چنانچہ علامہ ابن الاثیرؒ لکھتے ہیں: "الرِّفاء: الالتئام والاتفاق والبرکة والنماء" النہایہ (ج ۲ ص۲۴۰) ۱۲ م

[2] یعنی تم دونوں میں اتفاق واتحاد رہے اور تمہارے بیٹے پیدا ہوں ۱۲ م

[3] چنانچہ حافظؒ لکھتے ہیں: روی بقی بن مخلد من طریق غالب عن الحسن عن رجل من بنی تمیم قال: کنا نقول فی الجاهلیة "بالرفاء والبنین" فلما جاء الإسلام علّمنا نبیّنا، قال: قولوا: بارك الله لکم وبارك فیکم وبارك علیکم" - فتح الباری (ج ۹ ص۲۲۲) باب کیف یدعی للمتزوج ۱۲ م

[4] قال الحافظؒ فی الفتح (ج ۹ ص۲۲۲) باب کیف یدعی للمتزوج۔

واختلف فی علة النهی عن ذلك، فقیل: لأنه لاحمد فیه ولاثناء ولا ذکر لله، وقیل: لما فیه من الاشارة إلی بغض البنات لتخصیص البنین بالذکر (قال العینیؒ: قلتُ: فعلی هذا إذا قیل بالرفاء والأولاد ینبغی أن لایکره۔ عمدة القاری۔ (ج ۲۰ ص۱۴۶) وقال ابن المنیر: الذی یظهر أنه صلی الله علیه وسلم کره اللفظ لما فیه من موافقة الجاهلیة، لأنهم کانوا یقولونه تفاؤلاً لا دعاء، فیظهر أنه لو قیل للمتزوج بصورة الدعاء لم یکره، کأن یقول: اللّٰهمّ ألّف بینهما وارزقهما بنین صالحین مثلاً، أو ألّف الله بینکما ورزقکما ولداً ذکراً ونحو ذلك ۱۲ م

[5] جیساکہ پیچھے حاشیہ میں فتح الباری کے حوالہ سے اس کی سند ذکر کی گئی جس میں "عن الحسن عن رجل من بنی تمیم" کے الفاظ آئے ہیں ۱۲ م

[6] چنانچہ نسائی میں حضرت عقیلؓ کی روایت اس طرح آئی ہے: "عن الحسن قال: تزوّج عقیل بن أبی طالب امرأة من بنی جشم فقیل له: بالرفاء والبنین، قال: قولوا کما قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: بارك الله فیکم وبارك لکم" (ج ۲ ص۹۰) باب کیف یدعی للرجل إذا تزوّج - اور سنن ابن ماجہ میں یہ الفاظ آئے ہیں "لا تقولوا هکذا ولکن قولوا کما قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الحدیث (ص۱۳۷) باب تهنئة النکاح۔

سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ دونوں میں یہ روایت "حسن عن عقیل بن أبی طالب" کے طریق سے آئی ہے نیز طبرانی میں بھی مروی ہے، حافظ ابن حجرؒ نسائی اور طبرانی کے حوالہ سے اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "ورجاله ثقات إلا أن الحسن لم یسمع من عقیل فیما یقال" فتح الباری (ج ۹ ص۲۲۲) - لیکن مسند احمد میں یہ روایت دو طریق سے مروی ہے، ایک طریق سالم بن عبداللہ عن عبداللہ بن محمد بن عقیل قال تزوّج عقیل بن أبی طالب الخ کا بھی ہے اس میں "حسن" نہیں ہیں دیکھئے (ج ۱ ص۲۰۱ و ج ۳ ص۴۵۱) لہذا یہ روایت حسن سے کم نہیں ۱۲ مرتب

بَاب مَا جَاءَ فِی الولِيمَة

لفظ "ولیمہ" ولم سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کے ہیں، پھر اس کا اطلاق ہر اس کھانے پر ہونے لگا جس کے لئے لوگوں کو جمع کیا جائے، بعد میں یہ لفظ "طعام العرس" کے ساتھ خاص ہوگیا[1]

اہل عرب ہر قسم کی ضیافت کے لئے علیحدہ نام استعمال کرتے ہیں:

(۱) الولیمة: للعرس (۲) الخُرس یا الخُرص: طعام ولادت[2] (۳) الاعذار: ختنہ کے موقع پر کھلایا جانے والا کھانا (۴) الوکیرة، طعام بناء البیت (۵) النقیعة: طعام یصنع عند قدوم المسافر[3] (۶) العقیقة: لطعام الحلق یوم سابع الولادة (۷) الوضیمة: طعام عند المصیبة جو اگر مبتلیٰ بھائی جانب سے ہو تو جائز نہیں (۸) المأدبة: الطعام المتخذ ضیافة بلا سبب (۹) الحذاق وہ طعام جو بچہ کے سمجھدار ہونے یا قرآن کریم ختم کرنے کے موقع پر کھلایا جاتا ہے۔ کذا فی تحفة الاحوذی[4]

عن[5] أنس بن مالك أن رسول الله صلى الله عليه وسلم رأى على عبد الرحمن بن عوف أثر صفرة فقال: ما هذا؟ "یہ صفرہ کا اثر قلیل تھا اس لئے ان احادیث

---

[1] بمناسبة اجتماع الزوجين ١٢ م

[2] وقيل لسلامة المرأة من الطلق ١٢ م

[3] وقيل: النقيعة التي يصنعها القادم، والتي تصنع له تسمى التحفة ١٢ م

[4] (ج ٢ ص١٨٢) باب ماجاء في الوليمة ـ نیز دیکھئے فقہ اللغة وسر العربية للثعالبي (ص٣١١) باب ٢٤ فصل في تقسيم أطعمة الدعوات وغيرها۔ وراجع لمزيد التحقيق فتح الباري (ج ٩ ص٢٤١) باب حق إجابة الوليمة والدعوة ١٢ مرتب

[5] الحديث أخرجه البخاري في صحيحه (ج ٢ ص٧٧٣) كتاب النكاح، باب قول الله تعالى: وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً ـ و (ج ١ ص٢٧٤) كتاب البيوع، باب ماجاء في قول الله تعالى: فإذا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا الخ و (ج ١ ص٥٣٣) كتاب المناقب، باب إخاء النبي صلى الله عليه وسلم بين المهاجرين والأنصار ـ ومسلم في صحيحه (ج ١ ص٤٥٧) باب الصداق وجواز كونه تعليم قرآن ـ ٢ م

کے معارض نہیں جن میں مرد کے لئے رنگ والی خوشبو استعمال کرنے سے منع کیا گیا ہے[1] اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نشان بغیر قصد کے اہلیہ کے کپڑوں سے لگ گیا ہو۔

فقال: إني تزوجت امرأة علی وزن نواة من ذهب" حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں[2] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کا خصوصی تعلق مخفی نہیں، اس کے باوجود انہوں نے نکاح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلانے کا اہتمام نہیں فرمایا، نہ آپ نے اس بات پر ان سے کوئی شکایت کی، معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ مجلس نکاح میں تداعی کا کوئی خاص اہتمام نہ کرتے تھے، حضرت جابرؓ کے بارے میں بھی مروی ہے کہ انہوں نے نکاح کے بعد آپ کو اطلاع دی[3]، اس سے نکاح میں سادگی کا پسندیدہ اور مستحب ہونا معلوم ہوا۔

---

[1] مثلاً حضرت انسؓ کی روایت: قال: "نهى النبي صلى الله عليه وسلم أن يتزعفر الرجل" صحیح بخاری (ج ۲ ص ۸۶۹) کتاب اللباس، باب التزعفر للرجال - وصحیح مسلم (ج ۲ ص ۱۹۸) اللباس والزینة، باب نهی الرجل عن التزعفر - وقال الترمذی: ومعنی كراهية التزعفر للرجال أن يتزعفر الرجل، يعني أن يتطيب به - ترمذی (ج ۲ ص ۱۰۲) أبواب الاستیذان والآداب، باب ماجاء فی کراهية التزعفر والخلوق للرجال۔

نیز حضرت انسؓ ہی سے مروی ہے: "أن رجلا دخل على رسول الله صلى الله عليه وسلم وعليه أثر صفرة فكان رسول الله صلى الله عليه وسلم قلما يواجه رجلا في وجهه بشيء يكرهه، فلما خرج قال: لو أمرتم هذا أن يغسل هذا عنه" سنن ابی داؤد (ج ۲ ص ۵۷۶) کتاب الترجل، باب فی الخلوق للرجال۔

سنن ابی داؤد میں اسی باب میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے: "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يقبل الله صلاة رجل في جسده شيء من خلوق (ضرب من الطيب ذو لون)

مزید روایات کے لئے دیکھئے جامع الاصول (ج ۴ ص ۷۶۸ تا ص ۷۷۲، رقم ۲۸۶۹ تا ۲۸۸۲) الزینة، الباب الثالث فی الخلوق - ۱۲ مرتب

[2] کما فی تقریب التہذیب (ج ۱ ص ۴۹۴، رقم ۱۰۸۰) - ۱۲ م

[3] جیسا کہ آگے تیسرے باب (ماجاء فی تزویج الأبكار) میں مروی ہے: "عن جابر بن عبد الله قال: تزوجت امرأة فأتيت النبي صلى الله عليه وسلم فقال: أتزوجت يا جابر؟ فقلت نعم الحديث، ترمذی (ج ۱ ص ۱۶۳) نیز دیکھئے بخاری (ج ۱ ص ۴۲۱) کتاب الجهاد، باب استیذان الرجل الإمام، وصحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۷۴) کتاب الرضاع، باب استحباب نکاح ذات الدین وباب استحباب نکاح البکر ۱۲ مرتب

فقال : بارك الله لك ، أولِم » « أَوْلِمْ » کے صیغۂ امر سے استدلال کر کے اہلِ ظاہر کہتے ہیں کہ ولیمہ واجب ہے[1]، لیکن جمہور کے نزدیک ولیمہ مسنون ہے[2]۔ یہ حضرات « أَوْلِمْ » کے صیغۂ امر کو سنّیت و ندب پر محمول کرتے ہیں۔

جمہور کی دلیل حضرت ابوھریرہؓ کی وہ مرفوع روایت ہے جو ابو الشیخؒ نے نقل کی ہے، نیز علامہ طبرانیؒ نے معجم اوسط میں ذکر کی ہے : « الولیمة حق[3] وسنة[4] »۔

ولو بشاة » اکثر حضرات نے یہاں « لَوْ » کو تقلیل کے معنیٰ پر محمول کیا ہے[5]، لیکن

---

[1] چنانچہ علامہ ابن حزمؒ لکھتے ہیں : « وفرض على كل من تزوج أن يولم بما قل أو كثر » دیکھئے المحلی (ج ۹ ص۴۵۰) مسألة رقم ۱۸۱۹ ۔ بعض شافعیہ کے نزدیک بھی ولیمہ واجب ہے، چنانچہ علامہ نوویؒ لکھتے ہیں : « و أما وليمة العرس فقد اختلف أصحابنا : فمنهم من قال هي واجبة ...... و منهم من قال : هي مستحبة، المجموع شرح المهذب (ج ۱۵ ص۵۲۸) باب الولیمة والنثر ۔ نیز علامہ قرطبیؒ نے مالکیہ کا مذہب غیر مشہور « وجوب » بیان کیا ہے، پھر استحباب کو مذہب مشہور قرار دیا ہے، ابن التینؒ نے امام احمدؒ کا مسلک بھی وجوب نقل کیا ہے، لیکن « المغنی » میں سنّیت کا قول ذکر ہے ۔ حوالۂ بالا (ج ۱۵ ص۵۵۰) ۱۲ مرتب عفی عنہ

[2] قال الموفق : لا خلاف بين أهل العلم أن الوليمة سنة في العرس...... وليست بواجبة في قول أكثر أهل العلم، كذا في أوجز المسالك (ج ۹ ص۳۵۲) ما جاء في الوليمة ۱۲ م

[3] قال ابن بطال : قوله : « الوليمة حق » أي ليست بباطل بل يندب إليها وهو سنة فضيلة، وليس المراد بالحق الوجوب ۔ فتح الباری (ج ۹ ص۲۳۰) باب الولیمة حق ۔ ۱۲ مرتب

[4] فتح الباری (ج ۹ ص۲۳۰) ۔ لیکن سنّیت کے قول پر مسند احمد میں حضرت بریدہؓ کی روایت سے اعتراض ہوتا ہے کہ اس سے وجوبِ ولیمہ سمجھ میں آتا ہے : « قال : لما خطب علي فاطمة قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : إنه لابد للعروس من وليمة » ۔ حوالۂ مذکورہ ۔ نیز دیکھئے کنز العمال (ج ۱۶ ص۳۰۵، رقم ۴۴۶۱۶) ۔
لیکن علامہ عثمانیؒ اعلاء السنن میں اس کے بارے میں فرماتے ہیں : « دلالته على تاكيد الوليمة ظاهرة أي استحبابا مؤكدا » دیکھئے (ج ۱۱ ص۱۰) باب استحباب الولیمة ۔ ۱۲ مرتب عفی عنہ ۔

[5] چنانچہ حافظؒ لکھتے ہیں : « ليست « لو » هذه الامتناعية وإنما هي التي للتقليل » فتح الباری (ج ۹ ص۲۳۵) باب الولیمة ولو بشاة ۔

اور علامہ عینیؒ فرماتے ہیں : قال بعضهم : « كلمة لَوْ هنا للتمني » قلت : ليس كذلك بل هي للتقليل » عمدة القاری (ج ۲۰ ص۱۵۱) باب الولیمة ولو بشاة ۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ یہ تکثیر کے لئے ہے[۱]۔ بہرحال اس پر اتفاق ہے کہ اس کی کوئی مقدار مقرر نہیں، اسراف سے بچتے ہوئے ہر مقدار جائز ہے۔

عن[۲] ابن مسعود قال : قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : طعام أوّل یوم حق، وطعام یوم الثانی سنة، وطعام یوم الثالث سمعة، ومن سمّع سمّع اللہ بہ "

اس روایت سے استدلال کرکے جمہور اس بات کے قائل ہیں کہ ولیمہ دو دن تک جائز ہے، اس سے زیادہ مکروہ ہے[۳]۔ یہ روایت اگرچہ زیاد بن عبد اللہ[۴] کی وجہ سے ضعیف ہے لیکن ان متعدد روایات سے اس

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

و في الأوجز (ج ۹ ص۲۴۲، ماجاء في الولیمة) قال الباجي، قوله : " ولو بشاة و إن کان یقتضي التقلیل إلا أنہ لیس بحد لأقل الولیمة، فإنہ لاحد لأقلها، و إنما ذلك علی حسب الوجود، ولعلّ ذلك کان أقلّ ما رآہ صلی اللہ علیہ وسلم في حال عبد الرحمن بن عوف في مثل ذلك الوقت ۱۲ مرتب

(حاشیہ صفحۂ ھذا)

[۱] چنانچہ فرماتے ہیں: "أو طھنا للتکثیر وکان عبد الرحمن قد تموّل، فصح أن یأمرہ بذلك، وکان ذلك للإشارة إلی أنہ لا إسراف فیہ۔ الکوکب الدري (ج ۲ ص۱۴۱) ۱۲ مرتب

[۲] الحدیث لم یروہ أحد من أصحاب الکتب الستة سوی الترمذي، قالہ الشیخ محمد فؤاد عبد الباقي۔ ترمذی (ج ۳ ص۴۰۳، رقم ۱۰۹۷) ۔ البتہ سنن أبي داوّد میں ایک روایت اس طرح مروی ہے : " حدثنا محمد بن المثنی قال نا عفان بن مسلم قال، حدثنا ھمام قال نا قتادة عن الحسن عن عبد اللہ بن عثمان الثقفي عن رجل أعور من ثقیف کان یقال لہ معروفا، أي یثني علیہ خیرا إن لم یکن اسمہ زھیر بن عثمان فلا أدري ما اسمہ أن النبي صلی اللہ علیہ وسلم قال: " الولیمة أول یوم حق والثاني معروف والیوم الثالث سمعة و ریاء ۔ (ج ۲ ص۵۲۱) کتاب الأطعمة، باب في کم تستحب الولیمة ۱۲ مرتب

[۳] شافعیہ اور حنابلہ کے مذہب کے لئے دیکھئے المغني (ج ، ص۳) کتاب الولیمة، فصل و إذا صنعت الولیمة أکثر من یوم جاز ۔ حنفیہ کے مسلک کی تصریح نہ مل سکی، البتہ ملا علی قاریؒ زیر بحث روایت کو ذکر کرکے فرماتے ہیں : " وفیہ رد صریح علی أصحاب مالك رحمہ اللہ تعالی حیث قالوا باستحباب سبعة أیام لذلك " مرقاة (ج ۶ ص۲۵۱) نکاح باب الولیمة ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حنفیہ کا مسلک بھی شافعیہ وحنابلہ کے مطابق ہے ۔ نیز دیکھئے اعلاء السنن (ج ۱۱ ص۱۲) باب جواز الولیمة إلی أیام إن لم یکن فخرا۔

[۴] ان کے ضعف کی تصریح خود امام ترمذیؒ نے کردی ہے ۱۲ م

کے ضعف کی تلافی ہوجاتی ہے جو حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں ذکر کی ہیں[۱]۔

البتہ مالکیہ ولیمہ کے سات دن تک استحباب کے قائل ہیں[۲]، یہ حضرات ان روایات سے استدلال کرتے ہیں جن میں بعض صحابہ کرامؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے سات دن تک دعوت ولیمہ کی[۳]۔

لیکن جمہور کے نزدیک یہ واقعات اس صورت پر محمول ہیں جبکہ ہر روز کے مدعوین جدا جدا ہوں[۴]، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بعض صحابہ کا اجتہاد ہو جو روایت کے مقابلہ میں حجت نہیں۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی إجابة الداعی

عن[۵] ابن عمرؓ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "ائتوا الدعوة إذا دعیتم"

جمہور کے نزدیک دعوتِ ولیمہ کو قبول کرنا واجب اور دوسری دعوتوں میں اجابتِ داعی مسنون و مستحب ہے[۶]۔

---

[۱] دیکھئے فتح الباری (ج ۹ ص۲۴۳) باب حق إجابة الولیمة، چنانچہ حافظؒ فرماتے ہیں: "وهذه الأحادیث و إن كان كل منها لا یخلو عن مقال فمجموعها یدل علی أن للحدیث أصلاً" ۱۲ مرتب

[۲] مالکیہ کے مسلک کا حوالہ مرقاۃ کی نسبت سے پیچھے ذکر ہوچکا ہے، نیز دیکھئے فتح الباری (ج ۹ ص۲۴۳) ۱۲ م

[۳] مثلاً مصنف ابن ابی شیبہ میں روایت ہے: "حدثنا أبو أسامة عن هشام عن حفصة قالت: لما تزوج أبي سیرین دعا أصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم سبعة أیام فلما كان یوم الأنصار دعاهم و دعا أبي بن كعب و زید بن ثابت الخ (ج ۲/۴ ص۳۱۳) من كان یقول یطعم فی العرس والختان ۔ نیز دیکھئے سنن کبریٰ بیہقی (ج ۷ ص۲۶۱) باب أیام الولیمة ۱۲ مرتب

[۴] قال الحافظؒ: وقال العمرانی: إنما تكره إذا كان المدعو فی الثالث هو المدعو فی الأول، وكذا صوره الرویانی، واستبعده بعض المتأخرین ولیس ببعید، لأن إطلاق كونه ریاء وسمعة یشعر بأن ذلك صنع للمباهاة، وإذا كثر الناس فدعا فی كل یوم فرقة لم یكن فی ذلك مباهاة غالباً۔ فتح الباری (ج ۹ ص۲۴۳) ۱۲ م

[۵] الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحه (ج ۲ ص۷۷۷) باب حق إجابة الولیمة والدعوة الخ ومسلم فی صحیحه (ج ۱ ص۴۶۲) باب الأمر بإجابة الداعی ۱۲ م

[۶] فتح الباری (ج ۹ ص۲۴۲) باب حق إجابة الولیمة ۔ اس مسئلہ میں ائمہ کے اقوال کی مزید تفصیل کے لئے اسی کتاب کا ص۲۴۲ ملاحظہ ہو ۱۲ م

مشائخ حنفیہ کا اس بارے میں اختلاف ہے، راجح یہ ہے کہ دعوتِ ولیمہ میں جانا سنت مؤکدہ ہے[1] واللہ اعلم

باب ماجاء فیمن یجیئ إلی الولیمة بغیر دعوة

عن[2] أبی مسعود قال: جاء رجل ...... إنه تبعنا رجل لم یکن معنا حین دعوتنا فإن أذنت له دخل، قال: فقد أذنا له فلیدخل" اس سے معلوم ہوا کہ کسی غیر مدعو شخص کو دعوت میں لیجانا جائز نہیں الّا یہ کہ داعی سے اجازت لے لی جائے۔

لیکن اس پر حضرت جابرؓ کے اس واقعہ سے اشکال ہوتا ہے جو غزوۂ احزاب کے موقع پر پیش آیا تھا، نیز حضرت ابوطلحہؓ کے ساتھ بھی ایک ایسا ہی واقعہ مروی ہے، ان دونوں واقعات میں آپ دعوت میں غیر مدعوین کی ایک بڑی تعداد کو اپنے ساتھ لے گئے تھے[3]۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جس مقام پر یہ یقین ہو کہ داعی کو تکلیف یا تنگدلی نہ ہوگی وہاں ایسا کرنا جائز ہے، ان واقعات میں بھی ایسا ہی تھا، اس کے علاوہ ان دونوں مواقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر اس معجزہ کا مظاہرہ بھی تھا جس کے تحت کھانا کثیر ہوگیا تھا، ظاہر ہے کہ کھانے کو معجزۃً

---

[1] علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: وفی الاختیار ولیمة العرس سنة قدیمة إن لم یجبها أثم، لقوله صلی اللہ علیہ وسلم من لم یجب الدعوة فقد عصی اللہ ورسوله، فإن کان صائماً أجاب ودعا، وان لم یکن صائماً أکل ودعا وإن لم یأکل ولم یجب أثم وجفا، لأنه استهزاء بالمضیف، وقال علیه الصلاة والسلام: لو دعیت إلی کراع لأجبت اهـ ومقتضاه أنها سنة مؤکدة بخلاف غیرها، وصرح شرّاح الهدایة بأنها قریبة من الواجب، وفی التاترخانیة عن الینابیع: لو دعی إلی دعوة فالواجب الإجابة إن لم یکن هناك معصیة ولا بدعة، والامتناع أسلم فی زماننا، إلا إذا علم یقیناً أن لا بدعة ولا معصیة اهـ والظاهر حمله علی غیر الولیمة لما مرّ ویأتی، تأمل۔ ردّ المحتار (ج۵ ص۲۴۹) کتاب الحظر والإباحة تحت قوله دعی إلی ولیمة الخ قبیل فصل فی اللبس ۱۲ مرتب عفی عنہ

[2] الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحه (ج ۲ ص۸۱۰) الأطعمة، باب الرجل یتکلف الطعام لإخوانه ومسلم فی صحیحه (ج ۲ ص۱۷۶) أشربة، باب ما یفعل الضیف إذا تبعه غیر من دعاه صاحب الطعام ۱۲ م

[3] دونوں واقعات کے لئے دیکھئے صحیح مسلم (ج ۲ ص۱۷۸ و۱۷۹) باب جواز استتباع غیره إلی دار من یثق برضاه الخ ۱۲ م

بڑھا کر غیر مدعوین کو بیجانے میں داعی کو کسی پریشانی کا خطرہ نہ تھا اس لئے اس قسم کے واقعات حدیث باب کے معارض نہیں[1]۔ واللہ اعلم

باب ماجاء "لانکاح إلّا بولیّ"

پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ یہاں دو اختلافی مسئلے الگ الگ ہیں لیکن ان کے درمیان اکثر خلط اور اشتباہ واقع ہو جاتا ہے۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ عبارات نساء سے نکاح منعقد ہوجاتا ہے یا نہیں؟ یعنی عورت اپنا نکاح خود کرسکتی ہے یا نہیں؟

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اولیاء نکاح کو کن عورتوں پر ولایتِ اجبار حاصل ہے؟ واضح رہے کہ یہاں صرف پہلا مسئلہ زیر بحث ہے، دوسرے مسئلہ کے لئے امام ترمذیؒ نے آگے مستقل باب قائم کیا ہے، یعنی "باب ماجاء فی استئمار البکر والثیب" یہ مسئلہ تفصیل کے ساتھ انشاء اللہ اسی کے تحت زیر بحث آئیگا۔

حکم النکاح بعبارة النساء پہلے مسئلہ کی تفصیل یہ ہے کہ جمہور کے نزدیک عبارتِ نساء سے نکاح منعقد نہیں ہوتا بلکہ ولی کی تعبیر ضروری ہے[2] اور اس میں صغیرہ، کبیرہ، باکرہ اور ثیبہ عاقلہ اور مجنونہ سب برابر ہیں۔

اس کے برخلاف امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ عبارتِ نساء سے نکاح منعقد ہوجاتا ہے، بشرطیکہ عورت آزاد اور عاقلہ بالغہ ہو[3] البتہ ولی کا ہونا مندوب و مستحب ہے۔

---

[1] پھر جس روایت میں حضرات شیخینؓ کو اپنے ساتھ لیجانے کا ذکر ہے وہ بھی مُضیف کے ساتھ بے تکلفی اور اعتماد پر مبنی ہے، لہٰذا کوئی اشکال نہیں۔ اس واقعہ کے لئے بھی دیکھئے مسلم (ج ۲ ص۱۷۶ و ص۱۷۷) ۱۲ م

[2] مالکیہ کے مسلک کے لئے دیکھئے بدایۃ المجتہد (ج ۲ ص۷) نکاح، الباب الثانی، الفصل الأوّل، شافعیہ کے مسلک کے لئے دیکھئے المجموع شرح المہذب (ج ۱۵ ص۲۰۲) باب ما یصح بہ النکاح۔ حنابلہ اور امام اسحٰقؒ کے مسلک کے لئے دیکھئے المغنی (ج ۶ ص۴۴۹) نکاح، مسألۃ قال: "ولا نکاح إلا بولی"۔ علامہ ابن حزمؒ کے مسلک کے لئے دیکھئے المحلّی (ج ۹ ص۴۵۱) مسألۃ ۱۸۲۱۔ ۱۲ مرتب

[3] دیکھئے ھدایہ (ج ۲ ص۳۱۳) باب فی الأولیاء والأکفاء امام ابوحنیفہؒ سے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس مسئلہ میں حنفیہ کو بہت زیادہ نشانۂ ملامت بنایا گیا ہے اس لئے کہ اس میں امام ابوحنیفہؒ متفرد ہیں، بلکہ اس مسئلہ میں بہت سے وہ فقہاء بھی ان کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں جن کا مذہب عموماً امام ابوحنیفہؒ کے مطابق ہوا کرتا ہے مثلاً ابراہیم نخعیؒ، سفیان ثوریؒ، عبداللہ بن المبارکؒ وغیرہ[1]۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں بھی امام ابوحنیفہؒ کا مسلک متفرد ہونے کے باوجود نہایت مضبوط، قوی اور راجح ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

اس مسئلہ میں دو روایتیں ہیں: ایک وہی جو تقریر میں مذکور ہے یعنی علی الاطلاق جوازِ نکاح۔ کفو میں ہو، یا غیر کفو میں۔ البتہ بلا ولی خلافِ مستحب ہے، یہی روایت ظاہر الروایہ ہے، دوسری روایت حسن بن زیاد سے مروی ہے، یعنی اگر اس عورت نے نکاح کفو میں کیا ہے تو درست، اگر غیر کفو میں کیا ہے تو درست نہیں (واختار بعض المتأخرین الفتوٰی بھذہ الروایۃ لفساد الزمان، تبیین الحقائق (ج ۲ ص۱۱۸) باب الأولیاء والأکفاء)

امام ابویوسفؒ سے اس مسئلہ میں تین روایتیں منقول ہیں:
ان کی پہلی روایت جمہور کے مطابق تھی، یعنی بلا ولی مطلقاً عدمِ جواز۔ بعد میں انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کی دوسری روایت کی طرف رجوع کر لیا تھا، یعنی عدمِ جواز فی غیر الکفو، آخر میں انہوں نے امام صاحبؒ کی پہلی روایت کی طرف رجوع کر لیا تھا، یعنی مطلقاً جواز جو ظاہر الروایت ہے۔

امام محمدؒ کی اس مسئلہ میں دو روایتیں ہیں:
پہلی روایت یہ کہ "نکاح بغیر ولی" ولی کی اجازت پر موقوف ہے، خواہ نکاح کفو میں ہو یا غیر کفو میں، البتہ اگر کفو میں اور ولی اجازت نہ دے تو قاضی کو چاہیئے کہ تجدیدِ عقد کر دے اور ولی کی بات کی طرف توجہ نہ دے۔
ان کی دوسری روایت یہ ہے کہ انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کی پہلی روایت کی طرف رجوع کر لیا تھا۔
حاصل یہ کہ امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کا اس پر اتفاق ہے کہ عبارتِ مکلّفہ سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے خواہ کفو میں ہو یا غیر کفو میں۔

تفصیل کے لئے دیکھئے فتح القدیر (ج ۳ ص۱۵۷) باب الاولیاء والأکفاء اور المبسوط للسرخسی (ج ۵ ص۱۰) باب النکاح بغیر ولی ـ مرتب عفی عنہ

[2] بدائع الصنائع (ج ۲ ص۲۴۸) فصل وأما ولایۃ الندب والإستحباب ۱۲ م

(حاشیہ صفحۂ ھٰذا)

[1] کما صرح بہ الترمذی فی الباب ۱۲ م

جمہور کا استدلال حضرت ابوموسیٰؓ کی حدیثِ باب: "لا نکاح إلّا بولی"[1] اور حضرت عائشہؓ کی روایتِ باب: "أیّما امرأۃ نکحت بغیر إذن ولیھا فنکاحھا باطل فنکاحھا باطل فنکاحھا باطل" سے ہے[3]۔

یہ دونوں حدیثیں بھی سنداً متکلم فیہ ہیں کما سیأتی۔

---

[1] الحدیث أخرجہ أبو داؤد فی سننہ (ج ۱ ص۲۸۴) باب فی الولی، وابن ماجۃ فی سننہ (ص۱۳۵) باب لا نکاح إلا بولی ۱۲ م

[2] الحدیث أخرجہ ابن ماجۃ فی سننہ (ص۱۳۵) ۱۲ م

[3] جمہور نے مذکورہ دو حدیثوں کے علاوہ اور بھی متعدد دلائل سے اپنے مسلک پر استدلال کیا ہے، چند اہم دلائل کا خلاصہ جوابات کے ساتھ درج ذیل ہے:

(۱) فرمانِ باری تعالیٰ "وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ" (سورۂ نور آیت ۳۲) اس میں اولیاء کو خطاب ہے، یعنی "زوّجوا من لا زوج له منکم" معلوم ہوا کہ عورتوں کو خود اپنے نکاح کا حق حاصل نہیں، یہ ذمہ داری اولیاء کی ہے، اسی لئے انکاح کے لئے ان کو خطاب ہے۔

اس آیت سے علامہ قرطبی مالکیؒ نے اپنی تفسیر (ج ۱۲ ص۲۳۹) میں نیز دوسرے محققین نے جمہور کے مسلک پر استدلال کیا ہے۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ "أیامیٰ" ایّم کی جمع ہے اور "ایّم" "من لا زوج لہ" کو کہا جاتا ہے، خواہ مرد ہو یا عورت جیسا کہ خود علامہ قرطبیؒ نے بھی اس کی وضاحت کی ہے، اس کی روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہوا کہ مرد و عورت دونوں کے لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ بلا واسطۂ ولی نکاح کا اقدام نہ کریں، رہی یہ بات کہ اگر کوئی بلا واسطۂ ولی نکاح کرے تو اس کا کیا حکم ہوگا اس سے یہ آیت ساکت ہے، پھر جب "ایامیٰ" کے مصداق میں بالغ مرد و عورت دونوں داخل ہیں اور بالغ لڑکوں کا نکاح بلا واسطۂ ولی بالاتفاق درست ہو جاتا ہے اور کوئی اسے باطل نہیں کہتا اسی طرح ظاہر یہی ہے کہ اگر بالغ لڑکی اپنا نکاح خود کرلے تو وہ بھی درست ہوجائیگا، البتہ خلافِ سنت کام کرنے پر ملامت کے دونوں مستحق ہوں گے، بالخصوص لڑکی۔ حضرت مفتی صاحب قدس سرہ نے معارف القرآن (ج ۶ ص۴۰۴) میں یہی جواب اختیار کیا ہے۔

(۲) فرمانِ باری تعالیٰ: "وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا" (سورۂ بقرہ آیت ۲۲۱) اس آیت سے بھی علامہ قرطبیؒ نے جمہور کے مسلک پر استدلال کیا ہے کہ اس میں خطاب اولیاء کو ہے نہ کہ عورتوں کو۔

لیکن اس کا جواب بھی یہی ہے کہ نکاح کا مسنون و مستحب طریقہ حنفیہ کے نزدیک (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

دلائلِ احناف جمہور کے دلائل کے مقابلہ میں حنفیہ کے پاس دلائل کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے، جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) قرآن کریم میں اولیاء کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہے: "وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ"[1]

اس آیت سے دو طرح حنفیہ کے مسلک پر استدلال ہوسکتا ہے، ایک یہ کہ اس میں نکاح کی نسبت عورتوں کی طرف کی گئی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ نکاح عباراتِ نساء سے منعقد ہو جاتا ہے، دوسرے اس میں اولیاء کو منع کیا گیا ہے کہ وہ عورتوں کو اپنے سابقہ ازواج سے نکاح کرنے سے نہ روکیں، معلوم ہوا کہ اولیاء کو مکلّفہ عورت کے معاملہ میں مداخلت کا حق نہیں، اس میں

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

بھی یہی ہے کہ اولیاء نکاح کرائیں، اسی مستحب طریقہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے خطاب اولیاء کو ہے، اس میں اس پر کوئی دلالت نہیں کہ عاقلہ بالغہ اپنا نکاح خود کرلے تو اس کا نکاح منعقد نہ ہوگا۔ اس کے ایک اور جواب کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۲۰ ص ۱۲۱)

(۳) فرمانِ باری تعالیٰ: "فَانْكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ" (سورۂ نساء آیت ۲۵) اس آیت سے بھی جمہور کے مسلک پر استدلال کیا گیا ہے کہ اس میں بھی خطاب مردوں کو کیا گیا ہے ولو كان النكاح إلى النساء لذكرهن۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نکاح کی نسبت عورت کی طرف دوسری آیات سے ثابت ہے جن کا ذکر اصل تقریر میں حنفیہ کے دلائل کے تحت آرہا ہے، اس کے علاوہ مذکورہ آیت سے تو حنفیہ کا مسلک ثابت ہوتا ہے لأن فيها دلالة على أن للمرأة أن تزوّج أمتها، لأن قوله: "أهلهن" المراد به الموالي، أعم من ان يكون ذكرًا أو أنثى، كما في أحكام القرآن للتھانوی (ج ۲ ص ۲۳۹)

(۴) سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے: "قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تزوج المرأة المرأة ولا تزوج المرأة نفسها، فإن الزانية هي التي تزوج نفسها" (ص ۱۳۵، باب لا نكاح إلا بولي)

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں جمیل بن الحسین العتکی ایک متکلم فیہ راوی ہیں، اگر ان کے ثقہ ہونے کے قول کو بھی اختیار کیا جائے تب بھی یہ روایت نکاح بلا بیّنہ اور نکاح فی غیر کفو پر محمول ہوسکتی ہے، کما أشار إليه القاریؒ فی المرقاۃ (ج ۶ ص ۲۰۹) قبیل باب إعلان النكاح) ۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ

(حاشیہ صفحہ ہٰذا)

[1] اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پورا کرچکیں اپنی عدّت کو تو اب نہ روکو ان کو اس سے کہ نکاح کرلیں اپنے شوہروں سے۔ سورۂ بقرہ، آیت ۲۳۲ ۱۲ م

پہلا استدلال اشارۃ النص سے اور دوسرا استدلال عبارۃ النص سے۔

لیکن اس پر شافعیہ کی جانب سے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ آیت تو ہمارے مسلک کی دلیل ہے اس لئے کہ نہی تو اسی وقت درست ہوسکتی ہے جبکہ اولیاء کو منعِ نکاح پر قدرت ہو اور اگر یہ مان لیا جائے کہ نکاح بغیر ولی کے منعقد ہوسکتا ہے تو پھر اولیاء کو منع کرنے کی قدرت ہی نہ رہی، اور اس صورت میں نہی بے فائدہ ہے[1]

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں قانونی اور شرعی رکاوٹ مراد نہیں بلکہ اخلاقی اور معاشرتی دباؤ مراد ہے جو عورتوں کے حق میں عموماً مؤثر ہوتا ہے[2]، چنانچہ یہ آیت حضرت معقل بن یسارؓ کے واقعہ میں نازل ہوئی جو اپنی بہن کو سابق شوہر سے نکاح کرنے سے روک رہے تھے[3]۔ آیت کا یہ مفہوم "یَنْکِحْنَ" میں نکاح کی نسبت عورتوں کی طرف کرنے سے مؤکد ہوجاتا ہے۔

(۲) "فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ[4]" جس کا مطلب یہ ہے کہ عدت گزرنے کے بعد عورتیں نکاح کے معاملہ میں مکمل مختار ہیں اور "فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ" کے الفاظ صراحۃً بتا رہے ہیں کہ نکاح عورت کا فعل ہے اور اس کی عبارت سے نکاح منعقد ہوجاتا ہے۔

(۳) "فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ[5]" اس میں بھی نکاح کی نسبت عورتوں کی طرف کی گئی ہے جو اشارۃ النص کے طور پر عبارتِ نساء سے نکاح کے منعقد ہونے کی دلیل ہے۔

---

[1] چنانچہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: "هذه أبين آية في كتاب الله تعالى تدل على أن النكاح لا يجوز بغير ولي لأنه نهى الولي عن المنع، وإنما يتحقق المنع منه إذا كان الممنوع في يده - كذا في المبسوط للسرخسیؒ (ج ۵ ص۱۰) باب النکاح بغیر ولی ۱۲ م

[2] اس آیت سے حنفیہ کے استدلال کے بارے میں بحث کے لئے دیکھئے احکام القرآن (ج ۱ ص۴۰۰، باب النکاح بغیر ولی) فإنه نفیس ۱۲ مرتب

[3] تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر قرطبی (ج ۳ ص۱۵۸) ۱۲ م

[4] سورۂ بقرہ آیت ۲۳۴، پ۲ ۱۲ م

[5] سورۂ بقرہ آیت ۲۳۰، پ۲ ۱۲ م

④ مؤطا[1] امام مالک میں حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں : " ولدت سبیعة الأسلمية بعد وفاة زوجها بنصف شهر فخطبها رجلان ، أحدهما شاب والآخر كهل ، فحطت إلى الشاب ، فقال الكهل : لم تحلى بعد وكان أهلها غيبا ورجا إذا جاء أهلها أن يؤثروه بها فجاءت رسول الله صلى الله عليه وسلم فذكرت له ذلك ، فقال : قد حللت فانكحي من شئت "

⑤ مؤطا[2] امام مالک اور بخاری[3] میں روایت ہے کہ ایک عورت نے اپنے نفس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کیا، آپ نے سکوت فرمایا اور ایک صحابیؓ کی درخواست پر ان سے نکاح کردیا، اس واقعہ میں عورت کا کوئی ولی موجود نہ تھا۔

⑥ طحاوی میں حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے : " قالت : دخل علی رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد وفاة أبي سلمة فخطبني إلى نفسي ، فقلت : يا رسول الله ! إنه ليس أحد من أوليائي شاهدا ، فقال : إنه ليس منهم شاهد ولا غائب يكره ذلك ، قالت : قم يا عمر (ابن أبي سلمة) فزوج النبي صلى الله عليه وسلم فتزوجها[4] " یہ نکاح بھی بغیر ولی ہوا ، کیونکہ حضرت عمر بن ابی سلمہ نابالغ تھے[5] اس لئے ان کا نکاح کرانا شرعاً معتبر نہیں لہٰذا ان کو نکاح کے لئے کہنا محض مزاحاً تھا ، اور یہ کہنا کہ یہ نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولایتِ عامّہ کے تحت ہوا ، بعید ہے کیونکہ ولایتِ عامّہ کو اس موقعہ پر استعمال کیا جاتا ہے جبکہ نسبی اولیاء زندہ نہ ہوں۔

⑦ صحاح کی معروف روایت ہے : " عن ابن عباسؓ أن النبي صلى الله عليه وسلم

---

[1] کتاب الطلاق ، عدة المتوفى عنها زوجها إذا كانت حاملاً - نیز دیکھئے سنن نسائی (ج ۲ ص۱۱۲) طلاق ، باب عدة الحامل المتوفى عنها زوجها ، ۱۲ م

[2] (ص۲۹۸، ۲۹۹) ما جاء في الصداق والحباء ۱۲ م

[3] (ج ۲ ص۷۶۴) باب عرض المرأة نفسها على الرجل الصالح ۱۲ م

[4] طحاوی (ج ۲ ص۸) باب النكاح بغير ولي عصبة ، نیز دیکھئے نسائی (ج ۲ ص۷۱) إنكاح الابن أمه ۱۲ م

[5] چنانچہ امام طحاویؒ فرماتے ہیں : " وهو يومئذ طفل صغير غير بالغ " طحاوی (ج ۲ ص۸) ۱۲ م

قال: الأيم أحق بنفسها من وليها، والبكر تستأذن في نفسها، وإذنها صماتها"[1] "اَیِّم" کے معنی بے شوہر عورت کے ہیں، حنفیہ کے نزدیک یہ لفظ باکرہ اور ثیبہ دونوں کو شامل ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک اس سے مراد صرف ثیبہ ہے[2]۔ اگر علی سبیل التنزل امام شافعیؒ کی تفسیر کو اختیار کرلیا جائے اور اس سے صرف ثیبہ مراد لی جائے تب بھی زیر بحث مسئلہ میں اس سے حنفیہ کا استدلال درست ہے، کیونکہ کم از کم ثیبہ کے بارے میں اس سے یہ ثابت ہوا کہ وہ اپنے نکاح کی ولی سے زیادہ حقدار ہے۔

⑧ طحاوی[3] میں روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اپنی بھتیجی حفصہ بنت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کا نکاح ان کے والد کی غیر موجودگی میں منذر بن زبیر کے ساتھ کر دیا تھا، یہ نکاح بھی بغیر ولی تھا۔

⑨ کنز العمال میں روایت ہے کہ حضرت علیؓ بغیر ولی کے نکاح کرنے سے بتاکید منع فرمایا کرتے تھے[4] لیکن اگر کوئی ایسا نکاح ہوجاتا تو اسے نافذ قرار دیدیتے تھے[5]۔

---

[1] أخرجه مسلم واللفظ له (ج ۱ ص۴۵۵) باب استيذان الثيب في النكاح بالنطق والبكر بالسكوت، والنسائي (ج ۲ ص۷۶) استيذان البكر في نفسها، وأبو داود (ج ۱ ص۲۸۶) باب في الثيب والترمذي (ج ۱ ص۱۳۴) باب ما جاء في إستيمار البكر والثيب، وانظر الموطا (ص۴۹۵) باب استيذان البكر والأيم في أنفسهما۔ ۱۲ مرتب

[2] چنانچہ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: قال العلماء: الأيم هنا الثيب الخ شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۵۵) ۱۲ م

[3] (ج ۲ ص۷) باب النكاح بغير ولي عصبة۔ ۱۲ م

[4] چنانچہ علامہ شعبیؒ فرماتے ہیں: "ما كان أحد من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم أشد في النكاح بغير ولي من علي بن أبي طالبؓ حتى كان يضرب فيه۔ کنز العمال (ج ۱۶ ص۵۳۱ رقم ۴۵۵۰۰؟) الأولياء ۱۲ مرتب

[5] عن الحكم قال: كان علي إذا رفع إليه رجل تزوج امرأة بغير ولي فدخل بها أمضاه۔ کنز (ج ۱۶ ص۵۳۲، رقم ۴۵۵۰۰) نیز دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ (ج ۲/۴ ص۱۳۴) من أجازه بغير ولي ولم يفرق۔

عن أبي قيس الأزدي عمن حدثه أن امرأة زوجتها أمها برضاها فرفع ذلك إلى علي، فقال: أليس قد دخل بها؟ فالنكاح جائز" (کنز ج ۱۶ ص۵۳۱، رقم ۴۵۵۰۲)

عن أبي القيس الأزدي عمن أخبره عن علي أنه أجاز نكاح امرأة زوجتها أمها برضاها۔ کنز (ج ۱۶ ص۵۳۲، رقم ۴۴۷۳۲) ۱۲ مرتب

(۱۰) ”عن سعید بن المسیب قال : قال عمر بن الخطاب : لا تنکح المرأۃ إلا بإذن ولیها أو ذی الرأی من اهلها أو السلطان“[۱] اس طرح انہوں نے نکاح بغیر ولی کی اجازت دیدی، بشرطیکہ ذی رائے اقارب کی اجازت سے ہو اگرچہ وہ غیر ولی ہوں۔

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ

جہاں تک حضرت ابوموسیٰ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کی احادیثِ باب کا تعلق ہے ان کا بعض حنفیہ نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ دونوں حدیثیں سنداً ضعیف ہیں، حضرت ابوموسیٰ کی حدیث اضطراب[۲] کی بناء پر ضعیف ہے اور حضرت عائشہ رضی کی روایت اس بناء پر کہ وہ ”ابن جریج عن سلیمان بن موسیٰ عن الزهری“ کے طریق سے مروی ہے اور خود ابن جریج

---

[۱] کنز العمال (ج ۱۶، ص ۵۳۰، رقم ۴۵۷۶۲) الأولیاء ۱۲ م

[۲] چنانچہ خود امام ترمذیؒ فرماتے ہیں : وحدیث أبی موسیٰ فیه اختلاف ” اضطراب کی تفصیل یہ ہے کہ یہ کئی طرق سے مروی ہے :

(۱) اس کو اسرائیل، شریک بن عبداللہ، ابوعوانہ، زہیر بن معاویہ اور قیس بن الربیع ” أبو اسحٰق عن أبی بردۃ عن أبی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق سے روایت کرتے ہیں۔

(۲) اسباط بن محمد اور زید بن حباب اس کو یونس بن ابی اسحاق عن ابی بردۃؓ عن ابی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق سے روایت کرتے ہیں۔ نیز ابو عبیدۃ الحداد بھی اسی طریق سے روایت کرتے ہیں یعنی ابو اسحاق کے واسطہ کے بغیر

(۳) یونس بن اسحاق اس کو ابو اسحاق کے واسطہ کے ساتھ بھی ”عن أبی بردۃؓ عن أبی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ کے طریق سے نقل کرتے ہیں۔

(۴) شعبہ اور سفیان ثوری اس کو ”ابو اسحاق عن ابی بردہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ کے طریق سے روایت کرتے ہیں۔

(۵) بعض اصحاب سفیان نے اس کو ”عن سفیان عن أبی اسحاق عن أبی بردہ عن أبی موسیٰ“ کے طریق سے نقل کیا ہے، لیکن اس پر امام ترمذیؒ نے ” ولا یصح “ کا حکم لگایا ہے اس لئے ان کی وہی روایت راجح ہے جو شعبہ کے موافق ہے۔

اس تفصیل سے کئی وجوہ سے ـــــ اس کا اضطراب واضح ہے، چنانچہ ملا علی قاریؒ اس کے بارے میں فرماتے ہیں : ” فإنه ضعیف مضطرب فی إسناده وفی وصله وانقطاعه وإرساله “ مرقاۃ المفاتیح (ج ۶ ص ۲۰۱) باب الولی فی النکاح واستیذان المرأۃ۔ الفصل الثانی۔ ۱۲ مرتب عفی عنہ

فرماتے ہیں "ثم لقیت الزہری فسألته فأنکرہ، کما نقل الترمذیؒ فی الباب[1]۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان اعتراضات کی وجہ سے ان حدیثوں کو بالکلیہ رد نہیں کیا جاسکتا جہاں تک حضرت ابو موسیٰؓ کی حدیث کے اضطراب کا تعلق ہے سو امام ترمذیؒ نے متعدد طرق میں سے اسرائیل بن یونسؒ کے طریق کو راجح قرار دیا ہے[2]، اس طرح اضطراب رفع ہو جاتا ہے اور حضرت عائشہؓ کی روایت پر ابن جریجؒ کے جس مقولہ کی وجہ سے اعتراض کیا گیا ہے اس کے جواب میں امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ ابن جریجؒ کا یہ جملہ سوائے اسماعیل بن ابراہیم کے کوئی اور روایت نہیں کرتا اور اسماعیل بن ابراہیم کا سماع ابن جریج سے درست نہیں۔ چنانچہ یحییٰ بن معینؒ نے ابن جریجؒ سے ان کی روایات کو ضعیف قرار دیا ہے، لہٰذا ان کے مقولہ کی بناء پر حدیثِ باب کو ضعیف کہنا مشکل ہے۔

لہٰذا ان روایات کا احناف کی جانب سے صحیح جواب یہ ہے کہ یا تو یہ اس صورت پر محمول ہیں جبکہ عورت نے ولی کے بغیر غیر کفو میں نکاح کر لیا ہو اور حسنؒ بن زیاد کی روایت کے مطابق امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بھی اس صورت میں نکاح باطل ہے اسی روایت پر فتویٰ بھی ہے[3]۔

---

[1] نیز امام طحاویؒ نے بھی اس کو حضرت عائشہؓ کی روایت کے جواب کے طور پر نقل کیا ہے۔ دیکھئے طحاوی (ج ۲ ص۶)

[2] اس مقام پر امام ترمذیؒ کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ شعبہؒ اور سفیان ثوریؒ تمام رواۃ کے مقابلہ میں "احفظ" اور "اثبت" ہیں لیکن ان کے مقابلہ میں اسرائیل وغیرہ کی روایت اس لئے راجح ہے کہ ان رُواۃ نے یہ روایت ابو اسحاقؒ سے متفرق اوقات میں سنی سب ہی اسے "ابو بردہؓ عن ابی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے طریق سے نقل کرتے ہیں۔ جبکہ شعبہؒ اور سفیانؒ نے ابو اسحاقؒ سے یہ روایت ایک مجلس میں سنی ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ شعبہ کہتے ہیں، "سمعت سفیان الثوری یسأل أبا إسحاق أسمعت أبا بردۃ یقول: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا نکاح إلا بولی، فقال: نعم!"۔ نیز اسرائیل ابو اسحاق سے روایت کرتے ہیں زیادہ معتمد علیہ ہیں، چنانچہ عبد الرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں: "ما فاتنی من حدیث الثوری عن أبی إسحاق الذی فاتنی، إلا لما اتکلت به علی إسرائیل، لأنه کان یأتی به أتم۔ مرتب

[3] حوالہ پیچھے حاشیہ میں گزر چکا ہے ۱۲ م

یا پھر "لانکاح إلا بولی" میں نفی سے نفی کمال مراد ہے[1] اور حضرت عائشہؓ کی روایت میں "فنکاحہا باطل" کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نکاح فائدہ مند نہیں ہوتا[2]۔ اس کے علاوہ اس روایت میں "نکحت نفسہا بغیر إذن ولیہا" کے الفاظ آئے ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر اجازت لے لی تو عورت کی عبارت سے نکاح منعقد ہو جائے گا۔

مذکورہ بالا توجیہات اگرچہ غیر متبادر ہیں لیکن تحریر کردہ دس دلائل کی موجودگی میں ان کے بغیر چارہ نہیں اور اس باب کی دونوں روایتوں کو ان کے مطابق بنانا ناگزیر ہے، خاص طور سے اس لئے بھی کہ حضرت عائشہؓ جو اس باب کی دوسری حدیث کی راوی ہیں وہ خود نکاح بغیر الولی کے جواز کی قائل ہیں، کما مرّ عن الطحاوی۔ نیز امام زہریؒ جو خود بھی حضرت عائشہؓ والی روایت کے راوی ہیں ان کا مذہب بھی حنفیہ کے مطابق ہے[3]۔ واللہ سبحانہ اعلم

باب ماجاء لانکاح الا ببیّنة

عن[4] ابن عباسؓ أنّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: "البغایا اللاتی ینکحن أنفسهنّ

---

[1] وقد زیّف بعض اهل العلم هذا التأویل وقال: إنما یتأتی ذلک فی العبادات والقرب التی لها جهتان فی الجواز من ناقص وکامل، وأما المعاملات التی لها جهة واحدة فان النفی یوجب فیها الفساد، أو کلاماً هذا معناه، قلت: إن هذا القائل قصد بنفی الکمال ارتهان العقد بما عسی أن ینقضه بعد الإبرام من اعتراض الولی فماله فیه حق الاعتراض، فإذا عقد برضاه انتفی منه هذه النقیمة وهذا کلام صحیح اهـ کذا فی التعلیق الصبیح (ج ۴ ص ۸ وص ۹) باب الولی فی النکاح الخ الفصل الثانی - ۱۲ مرتب

[2] باری تعالیٰ کے فرمان: "ربّنا ما خلقت هذا باطلاً (سورۂ آل عمران آیت ۱۹۱) میں لفظ "باطل" اسی معنی میں آیا ہے۔

نیز "فنکاحہا باطل" کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ایسا نکاح ناپائیدار ہوتا ہے (کہ عدم کفاءت اور مہر مثل سے کمی کی صورت میں ولی کے مطالبہ پر ختم کیا جا سکتا ہے) لفظ "باطل" فانی اور ناپائیدار کے معنی میں لبید کے شعر میں بھی آیا ہے ع

ألا کل شیء ما خلا اللہ باطل - أی فان وزائل ۱۲ مرتب

[3] چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ (ج ۴ ص ۱۳۳، من أجازه بغیر ولی ولم یفرق) میں معمر سے مروی ہے قال سألت الزهری عن امرأة تزوج بغیر ولی فقال: إن کان کفواً جاز " ۱۲ م

[4] الحدیث لم یخرجه أحد من اصحاب الکتب الستة سوی الترمذی، قال الشیخ محمد فؤاد عبد الباقی - ترمذی (ج ۳ ص ۴۱۱، رقم ۱۱۰۳) ۱۲ م

اس حدیث کی بناء پر جمہور کا مسلک یہ ہے کہ بغیر گواہوں کے نکاح منعقد نہیں ہوتا، البتہ امام مالکؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ صرف اعلان کو کافی سمجھتے ہیں[1]۔ لیکن یہ حدیث ان کے خلاف حجت ہے[2]۔

امام ترمذیؒ نے امام مالکؒ کے مذہب کی تشریح اس طرح کی ہے کہ وہ بیک وقت دو گواہوں کی موجودگی کو ضروری نہیں سمجھتے بلکہ اگر یکے بعد دیگرے دو گواہوں کے سامنے نکاح ہوجائے تو بھی ان کے نزدیک درست ہے۔

پھر یہاں حنفیہ کے اصول پر ایک مشہور اشکال ہے کہ آیتِ قرآنی "فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ"[3] میں بیّنہ کا کوئی ذکر نہیں، لہٰذا خبرِ واحد کی بناء پر اس پر کیسے زیادتی کی جاسکتی ہے؟
فخر الاسلام بزدویؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اشتراطِ بیّنہ کی حدیث مشہور ہے جس سے کتاب اللہ پر زیادتی درست ہے۔

---

[1] دیکھئے بدائع الصنائع (ج ۲ ص۲۵۲) نکاح، فصل ومنها الشهادة۔ علامہ کاسانیؒ اس مقام پر امام مالکؒ کا مذہب نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "وقال مالك، ليست (الشهادة) بشرط وإنما الشرط هو الإعلان حتى لو عقد النكاح وشرط الإعلان جاز وإن لم يحضره شهود، ولو حضرته شهود وشرط عليهم الكتمان لم يجز"۔ ۱۲ مرتب

[2] جبکہ امام مالکؒ کی دلیل یہ ہے کہ زنا سرّاً ہوتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ نکاح علانیہ ہو تاکہ دونوں میں امتیاز ہوجائے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سرّاً نکاح کی ممانعت ثابت ہے، حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں: "أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن نكاح السر" مجمع الزوائد (ج ۴ ص۲۸۵) باب نكاح السر بحوالہ معجم طبرانی اوسط۔ نیز ترمذی (ج ۱ ص۱۶۱) ماجاء في إعلان النكاح میں پیچھے روایت گذرچکی ہے اعلنوا هذا النكاح الخ۔
حنفیہ کی دلیل حدیثِ باب کے علاوہ وہ روایات ہیں جن میں گواہوں کو نکاح کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ دیکھئے مجمع الزوائد (ج ۴ ص۲۸۵ تا ص۲۸۶) باب ماجاء في الولي والشهود۔
جہاں تک "نهى عن نكاح السر" والی روایت کا تعلق ہے اس کا جواب یہ ہے کہ نکاح السر کا مصداق وہ نکاح ہے جس میں گواہ موجود نہ ہوں، اور جس نکاح میں گواہ موجود ہوں وہ نکاحِ علانیہ ہے، نہ کہ نکاحِ سر، إذ السر إذا جاوز اثنين خرج من أن يكون سرًّا، قال الشاعر:

وسرك ما كان عند امرئ   وسر الثلاثة غير الخفي

كما في البدائع للكاساني (ج ۲ ص۲۵۳) ۱۲ مرتب عفی عنہ

[3] سورۂ نساء آیت ۳ پ ۴ ۱۲ م

لیکن شیخ ابن ہمامؒ نے اس جواب کو رد کرتے ہوئے ابن حبانؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس باب میں سوائے حضرت عائشہؓ کی ایک مرفوع حدیث کے جو "لانکاح إلا بولی وشاهدی عدل" کے الفاظ ساتھ مروی ہے[1] کوئی اور حدیث صحیح نہیں۔

خود شیخ ابن ہمامؒ نے اس کا ایک جواب یہ ذکر کیا ہے کہ "فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ" عام خص منہ البعض ہے اس لئے کہ اس کے عموم سے محرمات کی تخصیص خود کتاب اللہ میں ہو چکی ہے[2] لہٰذا اب خبر واحد سے اس میں مزید تخصیص کی جا سکتی ہے[3]۔

نکاح کا نصاب شہادت

وقال بعض أهل العلم، یجوز شهادة رجل وامرأتین فی النکاح - یہ حنفیہ کا مسلک ہے یعنی نکاح جس طرح دو مردوں کی شہادت سے منعقد ہو جاتا ہے اسی طرح ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے بھی ہو جاتا ہے[4]، امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے[5] جبکہ امام شافعیؒ کے نزدیک نکاح میں دو مردوں کی گواہی ضروری ہے اور عورتوں کی گواہی اس باب میں معتبر نہیں[6]۔

امام شافعیؒ کا استدلال "شاهدی عدل" والی روایت سے ہے کہ اس میں مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، لیکن اس استدلال کا ضعف محتاج بیان نہیں اس لئے کہ عرفاً "شاهدین" کے مفہوم میں وہ تمام لوگ آجاتے ہیں جو نصاب شہادت کو پورا کرتے ہوں اور نصاب شہادت بنص قرآنی یہ ہے "وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَإِنْ لَّمْ يَكُونَا

---

[1] دیکھئے موارد الظمآن إلی زوائد ابن حبان (ص۳۰۵، رقم ۱۲۴۷) باب ماجاء فی الولی والشهود نیز دیکھئے الإحسان بترتیب صحیح ابن حبان (ج ۶ ص۱۵۲، رقم ۴۰۶۳) ذکر نفی إجازة عقد النکاح بغیر ولی وشاهدی عدل، باب الولی ۱۲ مرتب

[2] یعنی حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ الآیة (سورۂ نساء، آیت ۲۳ پ۴) سے ۱۲ م

[3] کما فی فتح القدیر (ج ۳ ص۱۱۱) کتاب النکاح ۱۲ م

[4] کما فی الهدایة مع فتح القدیر (ج ۳ ص۱۱۱) نکاح و (ج ۶ ص۹) کتاب الشهادات ۱۲ م

[5] کما نقله الترمذی فی الباب، جبکہ المغنی (ج ۶ ص۴۵۵، فصل ولا ینعقد بشهادة رجل وامرأتین) سے معلوم ہوتا ہے کہ امام احمدؒ کی اصل روایت شافعیہ کے مطابق ہے۔ ابن قدامہ نے امام احمدؒ کی ایک روایت کے حنفیہ کے مطابق ہونے کا امکان بھی ذکر کیا ہے۔ ۱۲ مرتب

[6] المغنی (ج ۶ ص۴۵۵) ۱۲ م

رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتَانِ[۱] الآیہ   واللہ اعلم

باب ماجاء فی خطبۃ النکاح

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ: عَلَّمَنَا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم التشھد ....

ویقرأ ثلاث آیات »

(۱) وَاتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ[۳]

(۲) یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا[۴]

(۳) اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا[۵]

ان تین آیات میں سے کسی میں بھی نکاح کا مقصود ذکر موجود نہیں، حالانکہ قرآن کریم میں ایسی متعدد آیات موجود ہیں جو نکاح سے متعلق ہیں لیکن انہیں چھوڑ کر مذکورہ تین آیات کو اختیار کیا گیا، اس کی وجہ کہیں صراحۃً نظر سے نہیں گذری لیکن حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی حکمت یہ بتائی کہ ان تینوں آیات میں تقویٰ کا حکم مشترک ہے اور نکاح ایک ایسا معاملہ ہے کہ اس میں زوجین کے تعلقات کی خوشگواری اور باہمی حقوق کی ادائیگی بغیر تقویٰ کے ممکن نہیں۔[۶] واللہ اعلم

---

[۱] سورہ بقرہ آیت ۲۸۲، پ۳۔ امام شافعیؒ وغیرہ کا ایک استدلال زہریؒ کی ایک روایت سے ہے « قال: مضت السنۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن لا یجوز شہادۃ النساء فی الحدود ولا فی النکاح ولا فی الطلاق، رواہ أبو عبید فی الأموال »۔ لیکن اول تو یہ خبر واحد ہے جو کتاب اللہ کا معارضہ نہیں کر سکتی، اس کے علاوہ اس میں انقطاع بھی ہے۔ ۱۲ مرتب

[۲] الحدیث لم یخرجہ من أصحاب الکتب الستۃ أحد سوی الترمذی، قالہ الشیخ محمد فؤاد عبد الباقی، سنن ترمذی (ج ۳ ص ۴۱۳، رقم ۱۱۰۵) ۱۲م

[۳] سورۃ آل عمران، آیت ۱۰۲، پ۴۔ ۱۲م

[۴] سورۂ نساء، آیت ۱، پ۴۔ ۱۲م

[۵] سورۂ احزاب، آیت ۷۰، پ۲۲۔ ۱۲م

[۶] الفاظ کے فرق کے ساتھ یہ مضمون معارف القرآن (ج ۲ ص ۲۷۵) سے ماخوذ ہے۔ ۱۲م

باب ماجاء فی استئمار البکر والثیب

اس باب میں "ولایتِ اجبار" کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک "ولایتِ اجبار" کا مدار عورت کے باکرہ اور ثیبہ ہونے پر ہے یعنی باکرہ پر ولی کو ولایتِ اجبار حاصل ہے خواہ وہ صغیرہ ہو یا کبیرہ اور ثیبہ پر ولایتِ اجبار نہیں خواہ وہ صغیرہ ہو یا کبیرہ۔

اس کے برعکس ہمارے نزدیک ولایتِ اجبار کا مدار صغر اور کبر پر ہے۔ لہٰذا صغیرہ پر ولایتِ اجبار ہے اور کبیرہ پر نہیں خواہ وہ باکرہ ہو یا ثیبہ، گویا صغیرہ باکرہ پر بالاتفاق ولایتِ اجبار ہے اور کبیرہ ثیبہ پر بالاتفاق ولایتِ اجبار نہیں اور کبیرہ باکرہ پر شافعیہ کے نزدیک ولایتِ اجبار ہے، ہمارے نزدیک نہیں، اور صغیرہ ثیبہ پر ہمارے نزدیک ولایتِ اجبار ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک نہیں۔ حاصل یہ کہ چار صورتوں میں سے دو صورتیں اتفاقی ہیں اور دو صورتیں اختلافی[1]۔

امام شافعیؒ کا استدلال اس باب میں حضرت ابن عباسؓ کی معروف روایت سے ہے "أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الأيم أحق بنفسها من وليها[2]، الحديث وہ فرماتے ہیں کہ یہاں "ایم" سے مراد ثیبہ ہے کیونکہ باکرہ کا ذکر اس روایت میں آگے مستقلاً آیا ہے یعنی "والبكر تستأذن في نفسها وإذنها صماتها" اور جب "ایم" سے ثیبہ مراد ہوئی تو اس کا مفہوم مخالف یہ ہوا "البكر ليست احق بنفسها من وليها" اور مفہوم مخالف ان کے نزدیک حجت ہے۔

جبکہ حنفیہ کے دلائل درج ذیل ہیں:

① حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع حدیثِ باب "لا تنكح الثيب حتى تستأمر[3] ولا تنكح

---

[1] بدائع الصنائع (ج ۲ ص ۲۴۲) فصل وأما الذى يرجع إلى المولى عليه، فتح القدير (ج ۳ ص ۱۶۱) باب الأولياء والأكفاء ۱۲ م

[2] یہ روایت ترمذی کے علاوہ سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۲۸۶) باب فی الثیب میں بھی آئی ہے۔ نیز دیکھئے سنن ابن ماجہ (ص ۱۳۴) باب استئمار البکر والثیب ۱۲ م

[3] الفاظ کے فرق کے ساتھ یہ روایت صحیح بخاری (ج ۲ ص ۱۰۳۰) کتاب الحیل، باب فی النکاح میں بھی آئی ہے۔ نیز دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۵۵) باب استئذان الثیب فی النکاح الخ ۱۲ مرتب

البکر حتی تُستأذن و إذنها الصموت " اس میں ثیبہ اور باکرہ دونوں کا ایک حکم بیان کیا گیا ہے فرق صرف طریق اجازت میں ہے۔

(۲) سنن نسائیؒ میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے " أن فتاة دخلت علیها فقالت: إنّ أبی زوجنی ابن أخیه لیرفع بی خسیسته وأنا کارهة، فقالت: اجلسی حتی یأتی النبی صلی الله علیه وسلم، فجاء رسول الله صلی الله علیه وسلم فأخبرته، فأرسل إلی أبیها فدعاه فجعل الأمر إلیها فقالت: یارسول الله! قد أجزتُ ماصنع أبی ولکن أردتُ أن أعلم أللنساء من الأمر شیئ — اور سنن ابن ماجہ میں انکے یہ الفاظ مروی ہیں " فقالت: قد أجزتُ ماصنع أبی ولکن اردت أن تعلم النساء أن لیس إلی الآباء من الأمر شیئ "۔ بعض شافعیہ نے اس میں یہ تاویل کی ہے کہ یہ عورت ثیبہ تھی لیکن اول تو روایت میں اس پر کوئی دلیل نہیں، دوسرے اس عورت نے یہ کہا کہ میرا مقصد اس مسئلہ کا اعلان تھا کہ آباء کو عورتوں پر ولایتِ اجبار نہیں، اور اس نے یہ اعلان مطلق الفاظ میں کیا جس میں باکرہ اور ثیبہ کی کوئی تفریق نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی۔

(۳) سنن ابی داوٗدؒ اور سنن ابن ماجہ میں " جریر بن حازم عن أیوب عن عکرمة " کے طریق سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت مروی ہے " أن جاریة بکرا أتت النبی صلی الله علیه وسلم فذکرت أن أباها زوّجها وهی کارهة فخیّرها النبی صلی الله علیه وسلم "۔ یہ روایت حنفیہ کے مسلک پر صریح ہونے کے ساتھ صحیح بھی ہے، یحیی بن سعید القطانؒ نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے[۵] اور حافظ ابن حجرؒ نے بھی اس کی صحت کا اعتراف کیا ہے[۶] لیکن پھر انہوں نے اس روایت

---

[۱] (ج ۲ ص۷۵) البکر یزوّجها أبوها وهی کارهة ۱۲ م

[۲] (ص۱۳۴ و ۱۳۵) من زوّج ابنته وهی کارهة ۱۲ م

[۳] (ج ۱ ص۲۸۵ و ۲۸۶) باب فی البکر یزوّجها أبوها ولا یستأمرها ۱۲ م

[۴] (ص۱۳۵) باب من زوّج ابنته وهی کارهة ۱۲ م

[۵] چنانچہ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: " رواه أبو داوٗد باسناده علی شرط الصحیحین وقال أبو داوٗد: والصحیح مرسل وقال أبوحاتم: رفعه خطأ، وقال ابن حزم: صحیح فی غایة الصحة ولا معارض له وابن القطان صححه " عمدة القاری (ج ۲۰ ص۱۳۰) باب إذا زوّج ابنته وهی کارهة فنکاحها مردود ۱۲ مرتب

[۶] چنانچہ فرماتے ہیں " ورجاله ثقات " فتح الباری (ج ۹ ص۱۶۱) باب إذا زوّج الرجل ابنته وهی کارهة الخ ۱۲ م

کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ روایت نکاح فی غیر کفو پر محمول ہے[1] لیکن یہ جواب وہی مفید نہیں، اس لئے کہ یہ روایت کفو اور غیر کفو کے بیان سے خالی ہے، نہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے دریافت فرمایا کہ "هل زوجت فی الكفو أم فی غير الكفو" لہٰذا غیر کفو کا امکان احتمالِ ناشی من غیر دلیل ہے، اس کے علاوہ روایت میں "وهی کارهة" کا لفظ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ تخییر کراہت کی وجہ سے تھی نہ کہ عدم کفارت کی وجہ سے۔

جہاں تک حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں "الأيّم أحق بنفسها من وليها" سے شافعیہ کے استدلال کا تعلق ہے اس کا جواب یہ ہے کہ "أيّم" سے مراد بے شوہر عورت ہے اور اس کا اطلاق باکرہ اور ثیبہ دونوں پر ہوتا ہے[2] البتہ "بکر" کا ذکر الگ سے اس لئے فرمایا گیا کہ اس کا طریقۂ اجازت دوسرا تھا اور اگر بالفرض "أيّم" سے مراد "ثیب" ہی لی جائے تب بھی مفہومِ مخالف[3] سے استدلال ہمارے نزدیک درست نہیں، بالخصوص جب کہ وہ منطوق کے خلاف ہو اور منطوق یہ ہے "البكر تستأذن فی نفسها" واللہ أعلم

باب ماجاء فی إكراه اليتيمة على التزويج

عن[4] أبی هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "اليتيمة تستأمر فی نفسها فإن صمتت فهو إذنها وإن أبت فلا جواز عليها"

یتیمہ کا اطلاق صغیرہ اور کبیرہ دونوں پر ہوتا ہے، اگر یہاں کبیرہ مراد ہو تب تو حدیث کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوگا اور اگر صغیرہ مراد ہو تو اشکال

---

[1] حافظؒ نے یہ جواب بیہقی کے حوالہ سے ذکر کیا ہے "فتح" (ج ۹ ص۱۹۹) نیز دیکھئے سنن کبریٰ بیہقی (ج ۷، ص۱۱۸) باب ماجاء فی إنكاح الآباء الأبكار ۱۲ م

[2] کما فی لسان العرب (ج ۱۲ ص۳۹) ۱۲ م

[3] والأصل فيه أن ما يفهم من اللفظ أما أن يفهم من صريح اللفظ وهو المنطوق أولا وهو المفهوم، والمفهوم نوعان مفهوم موافقة وهو أن يفهم من اللفظ حال المسكوت عنه على وفق المنطوق، ومفهوم مخالفة وهو أن يفهم منه حاله خلاف ما فهم من المنطوق. نور الانوار (ص۱۵۳) مبحث الوجوه الفاسدة، فصل التنصيص على الشئ باسمه العلم ۱۲ مرتب

[4] الحديث أخرجه أبوداؤد فی سننه (ج ۱ ص۲۸۵) باب فی الاستيمار ۱۲ م

ہو سکتا ہے کہ اس کا "استیمار" تو شرعاً کالعدم ہے۔ اس کا جواب حنفیہ یہ دیتے ہیں کہ اس کے حق میں استیمار سے مراد خیارِ بلوغ ہے یعنی اس کا استیمار بلوغ کے وقت ہوگا۔

جبکہ امام شافعی فرماتے ہیں کہ یتیمہ صغیرہ کا نکاح ہو ہی نہیں سکتا تاوقتیکہ وہ بالغ نہ ہوجائے وہ نکاح میں خیار کے بھی قائل نہیں[2]، وہ فرماتے ہیں کہ صغیرہ ہونے کی بناء پر یتیمہ کی اجازت معتبر نہیں اور باپ دادا کی غیر موجودگی میں کسی کو اس پر ولایتِ اجبار بھی حاصل نہیں[2]۔

حاصل یہ کہ شافعیہ کے نزدیک اس روایت کو کبیرہ پر محمول کیا جائیگا۔

حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ روایت میں "یتیمہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو صغیرہ اور کبیرہ دونوں پر بولا جاتا ہے بالخصوص صغیرہ پر اس کا اطلاق زیادہ ہوتا ہے[3] لہٰذا صغیرہ کو حدیث کے مفہوم سے خارج کرنا درست نہیں، اور جو اشکال امام شافعیؒ نے بیان کی ہے اس کا حل خیارِ بلوغ میں موجود ہے۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی مھور النساء

مہر کی مقدار کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

امام شافعیؒ، امام احمدؒ، سفیان ثوریؒ، امام اسحاقؒ وغیرہ کے نزدیک مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں بلکہ ہر وہ چیز جو مال ہو اور بیع میں ثمن بن سکتی ہو وہ نکاح میں مہر بن سکتی ہے[4]۔

علامہ ابن حزمؒ کے نزدیک تقریباً ہر چیز مہر بن سکتی ہے، حتی کہ پانی، کتا، بلی وغیرہ بھی[5]۔

---

[1] مذاہب کی یہ تفصیل اسی باب میں امام ترمذیؒ کے کلام سے ماخوذ ہے ۱۲ م

[2] فتح القدیر مع الہدایہ (ج ۳ ص ۱۸۲ و ۱۸۳) باب الأولیاء والأکفاء ۱۲ م

[3] بلکہ یہ صغیرہ کے معنی میں حقیقت اور کبیرہ کے معنی میں مجاز ہے، چنانچہ علامہ ابن الاثیرؒ فرماتے ہیں: فإذا بلغا (الیتیم والیتیمة) زال عنهما اسم الیتم حقیقة، وقد یطلق علیهما مجازاً بعد البلوغ. کذا فی النہایة (ج ۵ ط ۲۹ و ص ۲۹۲) ۱۲ مرتب

[4] المجموع شرح المهذب (ج ۱۵ ص ۳۸۲) کتاب الصداق، مسئلة ولیس لأقل صداق حد، المغنی (ج ۶ ص ۶۸۰) کتاب الصداق ۱۲ م

[5] قال ابن حزمؒ: وکل ما جاز أن یتملک بالهبة أو بالمیراث فجائز أن یکون صداقا وان یخالع به وأن یواجر به سواء حل بیعه أو لم یحل کالماء والکلب والسنور والثمرة التی لم یبد صلاحها والسنبل قبل أن یشتد لأن النکاح لیس بیعا۔ وقال: وجائز أن یکون صداقا کل ماله نصف قل أو کثر ولو أنه حبة بر أو حبة شعیر أو غیر ذلک وکذلک کل عمل حلال موصوف کتعلیم شیٔ من القرآن أو من العلم أو البناء أو الخیاطة أو غیر ذلک إذا تراضیا بذلک۔ المحلّٰی (ج ۹ ص ۴۹۴) مسألة ۱۸۲۶ و ۱۸۲۴۔ ۱۲ مرتب عفی عنہ

امام مالکؒ کے نزدیک مہر کی کم سے کم مقدار چوتھائی دینار یا تین درہم ہے[1]۔ وہ اس کو "اقل ما یقطع بہ ید السارق" پر قیاس کرتے ہیں کیونکہ وہاں بھی ان کے نزدیک ربع دینار کے بدلے میں ایک عضو کاٹا گیا اور یہاں اس کے بدلے میں ایک عضو کی ملکیت حاصل ہوئی[2]۔

جبکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اقلِ مہر دس دراہم ہے[3]۔

شافعیہ اور حنابلہ کا استدلال عامر بن ربیعہ کی حدیثِ باب سے ہے "أن امرأة من بني فزارة تزوجت على نعلين فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أرضيت من نفسك ومالك بنعلين قالت نعم قال فأجازه[4]" نیز ان کا ایک استدلال اگلے باب میں حضرت سہلؓ بن سعد ساعدی کی روایت سے ہے جس میں آپؐ نے ایک مرد سے فرمایا "فالتمس ولو خاتمًا من حديد[5]" ان دو روایتوں کے علاوہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی روایت سے بھی ان کا استدلال ہے "أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من أعطى في الصداق امرأة ملأ كفيه سويقًا أو تمرًا فقد استحل" اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا واقعہ بھی ان کی دلیل ہے جس میں انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے نکاح کی خبر دی تو آپؐ نے پوچھا "ما أصدقتها؟" اس پر انہوں نے جواب دیا "وزن[6] نواة[7] من ذهب"۔

---

[1] بداية المجتهد (ج ۲ ص ۱۴) کتاب النکاح، الباب الثانی، الفصل الثالث فی الصداق ۱۲ م

[2] المجموع (ج ۱۵ ص ۲۸۷) ۱۲ م

[3] حنفیہ کے نزدیک بھی کسی قدر فرق کے ساتھ نصابِ سرقہ ہی کا اعتبار ہے جو ان کے نزدیک دس درہم ہے، علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں "أقل المهر عشرة دراهم سواء كانت مضروبة أو غير مضروبة حتى يجوز وزن عشرة تبرا وإن كانت قيمته أقل بخلاف نصاب السرقة"۔ تبیین الحقائق (ج ۲ ص ۱۳۶) باب المہر ۱۲ مرتب

[4] یہ روایت ترمذی کے علاوہ سنن ابن ماجہ (ص ۱۳۶) باب صداق النساء میں بھی آئی ہے ۱۲ م

[5] بخاری کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں "أنظر ولو خاتمًا من حديد" دیکھئے (ج ۲ ص ۷۷۲) باب تزویج المعسر، نیز دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۵۷) باب صداق الخ ۱۲ مرتب

[6] سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۲۸۷) باب قلة المہر، نیز دیکھئے سنن ترمذی (ج ۱ ص ۱۶۲) باب ما جاء فی الولیمة، اور سنن ابن ماجہ (ص ۱۳۷) باب الولیمة ۱۲ مرتب

[7] قال ابن الاثیر: في حديث عبد الرحمن بن عوف تزوجت الخ النواة اسم لخمسة دراهم وقيل أراد قدر نواة من ذهب كان قيمتها خمسة دراهم ولم يكن ثم ذهب وأنكره أبو عبيد قال الأزهري لفظ الحديث يدل على أنه تزوج المرأة على ذهب قيمته خمسة دراهم ألا تراه قال "نواة من ذهب" ولست أدري لم أنكره أبو عبيد النهاية (ج ۵ ص ۱۳۱ و ۱۳۲) ۱۲ مرتب

حنفیہ کا استدلال سننِ کبریٰ بیہقی اور سننِ دارقطنی میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی روایت سے ہے "قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا ینکح النساء إلا الأکفاء ولا یزوجھن إلا الأولیاء ولا مھر دون عشرۃ دراھم[1]" اس روایت پر مبشر بن عبید اور حجاج بن ارطاۃ کی وجہ سے ضعف کا حکم لگایا گیا ہے[2]۔

لیکن محقق ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ابن ابی حاتمؒ نے روایت کیا ہے[3] اور اس کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں "إنه بھٰذا الإسناد حسن ولا أقل منه[4]"

نیز حضرت جابرؓ کی روایت کی تائید حضرت علیؓ کے اثر سے بھی ہوتی ہے کہ "لا مھر أقل من عشرۃ دراھم[5]"۔

اس کے علاوہ حضرت جابرؓ کی روایت کی تائید قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے "قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ[6]" اس میں لفظ "فرض" اس بات پر دلالت کر رہا

---

[1] اللفظ للبیہقی (ج ۷ ص ۲۴۰) کتاب الصداق باب ما یجوز أن یکون مھرا، نیز دیکھئے سنن دارقطنی (ج ۳ ص ۲۴۵) باب المھر رقم ۱۱ ۱۲ م

[2] علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں: لکنّ البیہقی رواہ من طرق وضعفھا (فی سننه الکبری ج ۷ ص ۲۴۰ -م) والضعیف إذا روی من طرق یصیر فی حد ادما یحتج به ذکرہ النووی فی شرح المھذب۔ فتح الملھم (ج ۳ ص ۴۷۹) باب الصداق۔

واضح رہے کہ سنن دارقطنی میں بھی یہ روایت دو طریق سے آئی ہے دیکھئے (ج ۳ ص ۲۴۴ و ۲۴۵، رقم ۱۱ و ۱۲) باب المھر ۱۲ مرتب

[3] روایت اور سند اس طرح ہے ابن ابی حاتم فرماتے ہیں: حدّثنا عمرو بن عبد اللہ الأودی حدّثنا وکیع عن عبّاد بن منصور قال حدّثنا القاسم بن محمّد قال سمعتُ جابرًا رضی اللہ عنه یقول قال سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول ولا مھر أقلّ من عشرۃ، من الحدیث الطویل کذا نقل فی فتح القدیر (ج ۳ ص ۱۸۶) فصل فی الکفاءۃ ۱۲ مرتب

[4] وقد حسّنه المحقق ابن أمیر الحاج فی شرح التحریر کما نقل فی فتح الملھم (ج ۳ ص ۴۸۰) باب الصداق الخ ۱۲ م

[5] سنن دارقطنی (ج ۳ ص ۲۴۵ تا ۲۴۷، رقم ۱۳ و ۱۴ و ۱۶ و ۲۰) باب المھر۔ حضرت علیؓ کا یہ اثر سنن کبریٰ بیہقی میں بھی متعدد طرق سے مروی ہے دیکھئے (ج ۷ ص ۲۴۰)۔

یہ اثر جن طرق سے مروی ہے ان میں سے بعض درجۂ حسن سے کم نہیں کما فی إعلاء السنن (ج ۱۱ ص ۸۰ و ۸۱) باب لا مھر الخ اس کے علاوہ کثرتِ طرق کی بنا پر بھی اس میں قوت آجاتی ہے کما فی شرح النقایة لعلی بن محمد القاری (ج ۱ ص ۵۷۹) فصل فی المھر وأحکامه ۱۲ مرتب

[6] سورۂ احزاب آیت ۵۰ پ ۲۲ ۱۲ م

ہے کہ مہر کی مقدار شرعاً مقرر ہے اس لئے کہ "فرض" کے معنی مقرر کرنے کے آتے ہیں لیکن قرآن وحدیث کے پورے ذخیرہ میں حضرت جابرؓ کی مذکورہ حدیث کے علاوہ کسی بھی حدیث میں مہر کی کوئی مقدار مروی نہیں لہٰذا یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیت بیانِ مقدار میں مجمل ہے اور حضرت جابرؓ کی روایت اس کے لئے بیان کی حیثیت رکھتی ہے،

اس کے علاوہ حضرت جابرؓ کی حدیث ایک اصلِ کلی کو بیان کرتی ہے جبکہ شافعیہ کے مستدلات محض واقعاتِ جزئیہ ہیں، مزید یہ کہ مہر جن مصالح کی بنا پر شروع کیا گیا ہے ان کا تقاضا یہ ہے کہ مہر میں مال کی اتنی مقدار ہو جس کی کچھ اہمیت بھی جائے۔

جہاں تک شافعیہ کے مستدلات کا تعلق ہے سو اوّل تو ان میں سے اکثر کو ضعیف کہا گیا ہے چنانچہ عامر بن ربیعہ کی حدیثِ باب (جس میں "نعلین" پر نکاح کا ذکر ہے) عاصم بن عبید اللہ کی وجہ سے ضعیف ہے[1] اور سنن[2] أبی داؤد میں حضرت جابرؓ کی روایت (جس میں "من أعطی فی الصداق امرأة ملأ کفیه سویقاً أو تمراً فقد استحل" کے الفاظ آئے ہیں) اسحاق بن جبرئیل اور مسلم بن رومان کی وجہ سے ضعیف ہے[3]، اسی طرح دوسری روایات بھی ضعیف ہیں[4]۔

البتہ شافعیہ کے تمام مستدلات میں دو روایتیں سنداً قوی ہیں ایک عبدالرحمن بن عوفؓ کا واقعہ اور دوسرے حضرت سہل بن سعدؓ کی روایت، جہاں تک حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کے واقعہ کا تعلق ہے سو اس میں کھجور کی گٹھلی کے برابر سونے کا ذکر ہے، ممکن ہے کہ اس سونے

---

[1] اس روایت کی امام ترمذیؒ نے اگرچہ تصحیح وتحسین کی ہے لیکن راجح یہ ہے کہ یہ ضعیف ہے اس لئے کہ عاصم بن عبید اللہ کے ضعف پر اکثر محدثین کا اتفاق ہے چنانچہ یحییٰؒ، امام احمدؒ، ابن عیینہؒ، ابوزرعہؒ، ابوحاتمؒ، ابن خزیمہؒ، امام دارقطنیؒ اور امام نسائیؒ نے ان کی تضعیف کی ہے اور ابن حبانؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: کثیر الوهم فاحش الخطاء فترك۔ اور شعبہؒ فرماتے ہیں: لو قلت له من بنی مسجد البصرة لقال حدثنا فلان عن فلان أن رسول الله صلى الله عليه وسلم بناه۔ میزان الاعتدال (ج ۲ ص۳۵۳و۳۵۴، رقم ۴۰۵۶) ۱۲ مرتب

[2] (ج ۱ ص۲۸۶) باب قلة المهر ۱۲ م

[3] فتح القدیر (ج ۳ ص۲۰۷) باب المهر ۱۲ م

[4] مثلاً سنن دارقطنی (ج ۳ ص۲۴۴، عـ۱۰) میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أنكحوا الأيامىٰ ثلاثاً قيل ما العلائق بينهم يا رسول الله؟ قال: ما تراضىٰ عليه الأهلون ولو قضيب من اراك۔ یہ روایت محمد بن عبدالرحمن البیلمانی کی وجہ سے معلول ہے کما فی نصب الرایہ (ج ۳ ص۲۰۰) باب المهر ۱۲ مرتب

کی قیمت دس درہم کے برابر ہو، رہا حضرت سہل بن سعدؓ کا واقعہ سو وہ بلاشبہ سنداً صحیح ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں آپؐ نے "خاتم حدید" کا مطالبہ بطور مہر کامل نہیں بلکہ بطور مہر معجل کیا تھا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اہل عرب میں یہ معمول تھا کہ رخصتی کے موقع پر شوہر بیوی کو نقدی وغیرہ کوئی نہ کوئی چیز دیا کرتا تھا، یہ چیز یا بطور تحفہ ہوتی تھی اور مہر میں شمار نہ کی جاتی تھی یا مہر ہی کا حصہ ہوتی تھی اس "تحفہ" یا "مہر معجل" کے بغیر "رخصتی" کو معیوب سمجھا جاتا تھا، اس کی تائید سنن ابی داؤد[1] کی روایت سے ہوتی ہے " أن علياً رضي الله عنه لما تزوّج فاطمة بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم رضي الله عنها أراد أن يدخل بها فمنعه[2] رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى يعطيها شيئاً، فقال: "يا رسول الله! ليس لي شيءٌ" فقال له النبي صلى الله عليه وسلم: "أعطها درعك" فأعطاها درعه ثم دخل بها" اس روایت میں جس زرہ کے دیئے جانے کا ذکر ہے وہ یقیناً مہر معجل کے طور پر دی گئی تھی، اس لئے کہ یہ امر طے شدہ ہے کہ حضرت فاطمہؓ کا مہر اس سے زیادہ تھا۔[3]

---

[1] (ج ۱ ص۲۸۹ و۲۹۰) باب في الرجل يدخل بامرأته قبل أن ينقدها۔ ۱۲ م

[2] حدیث کا یہ جملہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ دخول سے قبل کچھ دینا ضروری ہے جبکہ سنن ابی داؤد ہی میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے " أمرني رسول الله صلى الله عليه وسلم أن أدخِلَ امرأةً على زوجها قبل أن يعطيها شيئاً" دیکھئے (ج ۱ ص۲۹۰) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دخول سے قبل کچھ دینا ضروری نہیں جس سے بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے علامہ عثمانیؒ ان دونوں میں تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ پہلی والی روایت استحباب تعجیل پر اور دوسری روایت جوازِ تاخیر پر محمول ہے لہذا کوئی تعارض نہیں، دیکھئے إعلاء السنن (ج ۱۱ ص۸۰) باب استحباب تعجيل شيء من المهر عند الدخول ۱۲ مرتب

[3] مذکورہ تشریح سے معلوم ہو کہ حضرت فاطمہؓ کو زرہ صرف بطور مہر معجل دی گئی تھی جبکہ ان کا کل مہر اس سے زائد تھا لیکن روایات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ زرہ مہر معجل ہونے کے ساتھ ان کا کل مہر بھی تھی۔

جس کی تفصیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی صاحبزادی کا مہر بارہ اوقیہ (۴۸۰ درہم) سے زائد مقرر نہیں کیا کما هو مصرح في رواية النسائي (ج ۲ ص۸۵) القسط في الأصدقة وأبي داؤد (ج ۱ ص۲۸۷) باب الصداق اور حضرت علیؓ کی زرہ بھی اسی قدر مالیت میں فروخت کی گئی تھی چنانچہ خود حضرت علیؓ فرماتے ہیں "فبعتها بأثنتي عشرة أوقية فكان ذلك مهر فاطمة" رواه أبو يعلى كذا في مجمع الزوائد (ج ٤ ص۲۸۳، باب الصداق)۔

معلوم ہوا کہ زرہ محض مہر معجل نہ تھی بلکہ کل مہر بھی تھی۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بالکل اسی طرح شافعیہ کے تمام مستدلات بھی مہرِ معجل یا تحفہ پر محمول ہیں[1] واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم وعلمہ أتم وأحکم۔

بابٌ منه

عن سهل بن ساعد الساعدی أن رسول الله صلى الله عليه وسلم جاءته امرأة ...
...... قالَ: فالتمس ولو خاتماً من حديد۔

خاتمِ حدید کے استعمال کا حکم حدیثِ باب سے بعض شافعیہ نے اس پر استدلال کیا ہے کہ خاتمِ حدید کا استعمال جائز ہے بشرطیکہ اس پر چاندی چڑھی ہوئی ہو[3]

بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ

پھر جس طرح سے روایت کو بطورِ تائید پیش کیا گیا ہے اس سے بظاہر یہ بتلانا مقصود ہے کہ جس طرح اس واقعہ میں مہر کا کچھ حصہ دیا گیا تھا اور رخصتی کے وقت اس کے دینے کو ضروری سمجھا گیا تھا بالکل اسی نوعیت پر وہ روایات بھی محمول ہیں جو شافعیہ کا مستدل ہیں جن سے مہر کی مقدار دس درہم سے کم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ہماری مذکورہ تشریح کے بعد یہ طرز استدلال درست نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ زرہ کا کلِ مہر ہونا معلوم ہوچکا۔ البتہ زیرِ بحث روایت کو اس حیثیت سے اب بھی بطورِ تائید پیش کیا جاسکتا ہے کہ رخصتی سے قبل کچھ دیئے بغیر حضرت علیؓ کو بناء کی اجازت نہ دی گئی گو حضرت علیؓ نے اس کی تعمیل میں کل مہر ہی ادا کردیا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا حضرت فاطمہؓ کے حق میں کل مہر کا مطالبہ نہ تھا بلکہ عرب کے عرف کے مطابق بناء سے قبل کچھ نہ کچھ دینے کا مطالبہ تھا، دس درہم سے کم پر دال تمام روایات بھی اسی پر محمول ہیں کہ عرب کے رواج کے مطابق شروع میں کچھ دیا گیا اور مہر کی بعد میں تکمیل کی گئی واللہ اعلم ۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ

(حاشیہ صفحۂ ھذا)

[1] مذکورہ تفصیل کسی قدر تغییر اور اضافہ کے ساتھ فتح القدیر (ج ۳ ص ۲۰۱، باب المہر) سے ماخوذ ہے ۱۲ م

[2] الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحه (ج ۲ ص ۷۷۱) باب تزویج المعسر ومسلم فی صحیحه (ج ۱ ص ۴۵۷) باب الصداق الخ ۱۲ م

[3] چنانچہ حافظ ابن حجرؒ کے کلام سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے دیکھئے فتح الباری (ج ۱۰ ص ۳۲۲ و ۳۲۳) باب فص الخاتم وباب خاتم الحدید، کتاب اللباس۔ لیکن علامہ نوویؒ کے کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خالص لوہے کی انگوٹھی کو بھی بلاکراہت جائز قرار دیتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں: "وقال صاحب التتمة: لا یکره الخاتم من حدید أو رصاص للحدیث فی الصحیحین أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال للذی خطب الواهبة نفسها "أطلب ولو خاتماً من حدید" قال ولو کان فیه کراهة لم یأذن فیه به، وفی سنن أبی داؤد باسناد جید

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جبکہ حنفیہ کے نزدیک لوہے، پیتل وغیرہ کی انگوٹھی حرام ہے خواہ اس میں چاندی ملی ہوئی ہو[۱]
حنفیہ کا استدلال سننِ ابی داؤد[۲] میں حضرت بریدہؓ کی روایت سے ہے جس میں ذکر ہے کہ
ایک شخص لوہے کی انگوٹھی پہن کر آیا تو آپؐ نے اس سے فرمایا "مالی أری علیك حلیة اهل النار" اس پر

بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ

عن معیقیب الصحابی رضی اللہ عنہ وکان علی خاتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال "کان خاتم النبیؐ من حدید ملوی علیہ فضة" فالمختار أنہ لایکرہ لهذین الحدیثین، وضعف الأول۔ المجموع شرح المهذب (ج ۴ ص۳۴۴) باب مایکرہ لبسہ ومالایکرہ فصل فی مسائل تتعلق باللباس۔ ۱۲ مرتب عفی عنہ

چاندی چڑھی ہونے کی شرط سنن نسائی میں حضرت معیقیب کی روایت کی بناء پر ہے قال: کان خاتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم حدید املوی علیہ فضة قال وربما کان فی یدی، فکان معیقیب علی خاتم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (أی أمینا علیہ) دیکھئے (ج ۲ ص۲۸۹) کتاب الزینة، لبس خاتم حدید ملوی علیہ بفضة، نیز دیکھئے سنن ابی داؤد (ج ۲ ص۵۸۰) کتاب الخاتم باب ماجاء فی خاتم الحدید ۱۲ مرتب

(حاشیۂ صفحۂ هٰذا)

[۱] لوہے، پتھر، پیتل کی انگوٹھی وغیرہ کے حرام ہونے کی تصریح تو کتبِ حنفیہ میں موجود ہے مثلاً دیکھئے البحر الرائق (ج ۸ ص۱۹۱) کتاب الکراهیة، فصل فی اللبس، فتح القدیر (ج ۸ ص۴۵۷) کتاب الکراهیة، فصل فی اللبس اور الجامع الصغیر (ص۳۹۱) باب الکراهیة فی اللبس، جس میں یہ الفاظ آئے ہیں "ولا تختم إلا بالفضة"۔

جہاں تک چاندی چڑھی ہوئی لوہے کی انگوٹھی کا تعلق ہے اس کی ممانعت کی تصریح احقر کو کتبِ حنفیہ میں نہ مل سکی، البتہ چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی کے بارے میں چاندی کے ہونے کی تصریح روایات میں موجود ہے مثلاً بخاری میں حضرت انسؓ کی روایت میں، دیکھئے (ج ۲ ص۸۷۲) باب فص الخاتم۔ جبکہ پچھلے حاشیہ میں "خاتم حدید ملوی" کی روایت گذر چکی ہے، اس طرح روایات میں تعارض ہوجاتا ہے، علامہ عینیؒ تعارض کو رفع کرتے ہوئے فرماتے ہیں "أجیب عنہ بأوجہ: الأول أن لا مانع أن یکون لہ خاتم من فضة وخاتم من حدید ملوی" الثانی أنہ یحتمل أن یکون خاتم الحدید الملوی بفضة کان لہ قبل أن یُنھیٰ عن خاتم الحدید (جس کا مطلب یہ کہ چاندی چڑھی ہوئی لوہے کی انگوٹھی بھی جائز نہیں، جیسا کہ اصل تقریر میں یہی بات مذکور ہے) الثالث أنہ لما کان خاتم الحدید قد لوی علی ظاهرہ فضة صار لایری منہ إلا الظاهر فظن أنہ کلہ فضة۔ (اس آخری توجیہ کا حاصل یہ ہے کہ "خاتم حدید ملوی" جائز ہے) دیکھئے عمدة القاری (ج ۲۲ ص۳۱) باب فص الخاتم۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں "لا بأس بأن یتخذ خاتم حدید قد لوی علیہ فضة وألبس بفضة حتی لا یری" رد المحتار (ج ۵ ص۲۳۱) کتاب الحظر والإباحة، فصل فی اللبس طبع بولاق۔ مرتب

[۲] (ج ۲ ص۵۸۰) باب ماجاء فی خاتم الحدید ۱۲ م

اس شخص نے وہ انگوٹھی اتار دی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں کس چیز کی انگوٹھی بنواؤں، آپ نے ارشاد فرمایا " اتخذہ من ورق ولا تتمہ مثقالاً[۱] "

جہاں تک حدیثِ باب کے جملہ " فالتمس ولو خاتماً من حدید " کا تعلق ہے اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس سے انگوٹھی پہننے کی اجازت معلوم نہیں ہوتی، لیکن یہ جواب خلافِ ظاہر ہے[۲]۔ لہٰذا صحیح جواب یہ ہے کہ جب " حلیۃ أھل النار " والی روایت سے اس کا تعارض ہوگیا اور تاریخ کا علم نہیں تو احتیاط اسی میں ہے کہ حرمت والی روایت کو ترجیح دی جائے۔

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زوجتکھا بما معک من القرآن

تعلیمِ قرآن کو مہر بنانا حدیث باب کے مذکورہ جملہ سے استدلال کرکے شافعیہ تعلیم قرآن کے مہر بنانے کو جائز قرار دیتے ہیں[۳]۔

جمہور کے نزدیک تعلیم قرآن کو مہر بنانا جائز نہیں[۴]، ان کا استدلال " وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ[۵] " سے ہے کہ اس میں ابتغاء بالمال کا حکم دیا گیا ہے جس کا

---

[۱] لیکن اس روایت کی سند میں ایک راوی ابوطیبہ عبد اللہ بن مسلم مروزی ہیں جن کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: قال ابوحاتم الرازی : یکتب حدیثہ ولا یحتج بہ، وقال ابن حبان فی الثقات : یخطئ ویخالف، فإن کان محفوظاً حمل المنع علی ما کان حدیدا صرفاً۔ فتح الباری (ج ۱۰ ص ۳۲۳) باب خاتم الحدید۔ لیکن علامہ عینیؒ فرماتے ہیں : أخرج ابن حبّان حدیثہ وصححہ، علامہ عینی نے اس مقام پر بعض دوسری روایات بھی زیر بحث روایت کی تائید میں ذکر کی ہیں، دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۲۲ ص ۳۳) ۱۲ مرتب

[۲] اس لئے کہ ظاہر یہی ہے کہ جب آپ نے " التمس " کا حکم دیا تو پہننے کی بھی اجازت ہوگی۔ لیکن حافظ ابن حجرؒ جو خود بھی خاتم حدید کے جواز کے قائل ہیں " التمس " والی روایت سے خاتم حدید کے جواز پر استدلال کو درست نہیں قرار دیتے چنانچہ فرماتے ہیں : " ولا حجۃ فیہ لأنہ لا یلزم من جواز الاتخاذ جواز اللبس فیحتمل أنہ أراد وجودہ لتنتفع المرأۃ بقیمتہ، فتح الباری (ج ۱۰ ص ۳۲۳) ۱۲ مرتب

[۳] المجموع شرح المہذب (ج ۱۵ ص ۳۸۶) کتاب الصداق، مسألۃ اذا تزوجھا وأصدقھا تعلیم القرآن ۱۲ م

[۴] چنانچہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، لیثؒ، مکحولؒ اور اسحاق بن راہویہ کا یہی مسلک ہے جبکہ امام احمدؒ کی ایک روایت کراہت کی اور دوسری روایت جواز کی ہے۔ دیکھئے المغنی (ج ۶ ص ۶۸۳ و ۶۸۴) کتاب الصداق، فصل فأما تعلیم القرآن ۱۲ م

[۵] سورۂ نساء آیت ۲۴، پ ۵ — اس کے علاوہ اس آیت سے بھی جمہور کا استدلال ہے " وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْکُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْکِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ " (سورہ نساء آیت ۲۵ پ ۵) والطول المال کما فی المغنی (ج ۶ ص ۶۸۵) ۱۲ مرتب

مطلب یہ ہے کہ جو مال نہ ہو وہ مہر نہیں بن سکتا اور تعلیم قرآن بھی مال نہیں، اور خبر واحد سے آیت کا نسخ درست نہیں، لہٰذا " زوجتکھا بما معك من القرآن " کا ایسا مطلب مراد لیا جائے گا جو آیت کے مطابق ہو، وہ یہ کہ اسمیں باء معاوضہ کی نہیں بلکہ سببیت کے لئے ہے اور مطلب یہ ہے کہ " زوجتکھا لأنك من أھل القرآن " یعنی تمہارے علم قرآن کے سبب تم پر مہر معجّل ضروری قرار نہیں دیا جاتا البتہ مہر مؤجّل قواعد کے مطابق واجب ہوگا[۱]۔ واللہ اعلم

باب مَاجَاءَ فِي الرَّجُلِ يُعتِقُ الأَمَةَ ثُمَّ يَتَزَوَّجُهَا

" عن[۲] أنس بن مالك رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم أعتق صفية رضی اللہ عنہا وجعل عتقها صداقها " اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے امام احمدؒ " عتق " کے مہر بنانے کو جائز قرار دیتے ہیں[۳]، جبکہ جمہور کے نزدیک یہ درست نہیں[۴]، اور حدیثِ باب کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو پہلے آزاد کر دیا پھر ان سے بغیر مہر کے نکاح کر لیا جو آپؐ کے لئے جائز تھا[۵] راوی نے اسی کو " جعل عتقها صداقها "

---

[۱] حدیثِ باب کا ایک جواب یہ ہے کہ تعلیم قرآن کو مہر بنانا متعلقہ صحابیؓ کی خصوصیت تھی اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے " أن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم زوج رجلاً علی سورة من القرآن ثم قال لا تکون لأحد بعدك مهراً۔ رواہ النجاد باسنادہ کذا فی المغنی (ج ۶ ص ۶۸۳) ۱۲ مرتب

[۲] الحدیث أخرجه البخاری (ج ۲ ص ۷۶۰) النکاح، باب من جعل عتق الأمة صداقها، ومسلم (ج ۱ ص ۴۵۹) النکاح۔ باب فضیلة إعتاقه أمته ثم یتزوجها ۱۲ م

[۳] المغنی (ج ۶ ص ۵۲۴) النکاح، من جعل عتق أمته صداقها ۱۲ م

[۴] دیکھئے بدایة المجتهد (ج ۲ ص ۱۱) النکاح، الباب الثانی فی موجبات صحة النکاح، الفصل الثالث۔ وانظر لتفصیل المسئلة عمدة القاری (ج ۲۰ ص ۸) باب من جعل عتق الأمة صداقها ۱۲ مرتب

[۵] امام طحاویؒ فرماتے ہیں: وخالفهم فی ذلك آخرون فقالوا لیس لأحد غیر رسول اللہ علیه وسلم أن یفعل هذا فیتم له النکاح بغیر صداق سوی العتاق، وإنما کان ذلك لرسول اللہ صلی اللہ علیه وعلی آله وسلم خاصًا لأن اللہ عزوجل جعل له ان یتزوج بغیر صداق ولم یجعل ذلك لأحد من المؤمنین غیره، قال اللہ عزوجل: وَامْرَأَةً مُّؤْمِنَةً إِن وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَن يَسْتَنكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ (سورۂ احزاب آیت نمبر ۵۰ پ ۲۲) فلما أباح اللہ عزوجل لنبیه أن یتزوج بغیر صداق کان له أن یتزوج علی العتاق الذی لیس بصداق، ومن لم یبح اللہ له أن یتزوج علی غیر صداق لم یکن له أن یتزوج علی العتاق الذی لیس بصداق۔ شرح معانی الآثار (ج ۲ ص ۱۱) باب الرجل یعتق أمته علی أن عتقها صداقها ۱۲ مرتب

سے تعبیر کر دیا، وھٰذا کقولہ تعالیٰ: "وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ"[1] ۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے انہیں عوض مقرر کر کے آزاد کیا ہو اور پھر عوض کو مہر بنا دیا ہو اور یہ صورت سب کے نزدیک جائز ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس باب میں امام ترمذیؒ نے امام شافعیؒ کا مسلک امام احمدؒ کے ساتھ ذکر کیا ہے لیکن یہ درست نہیں چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تردید کی ہے[2]۔ واللہ أعلم

باب ماجاء فی المحلّ والمحلّل له[3]

"عن الشعبی عن جابر بن عبد اللہ وعن الحارث عن علی قالا: إنّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعن المحلّ والمحلّل لہ[4]"

اس حدیث کی بناء پر نکاح بشرط التحلیل بالاتفاق ناجائز ہے[5]، البتہ اگر عقد

---

[1] (سورۂ واقعہ آیت ۸۲ پ۲۷) ۔ نیز حافظ ابن صلاحؒ فرماتے ہیں: معناہ (أی معنی الحدیث) أن العتق یحل محل الصداق وإن لم یکن صداقاً قال: وھٰذا کقولھم "الجوع زاد من لا زاد لہ"۔ فتح الباری (ج ۹ ص۱۲۹) باب من جعل عتق الأمۃ صداقھا ۱۲ مرتب

[2] دیکھئے فتح الباری (ج ۹ ص۱۲۹ و ص۱۳۰) ۱۲ م

[3] الزوج الثانی بقصد الطلاق أو علی شرطہ والمحلّل لہ بفتح اللام أی الزوج الأول ھو المطلّق ثلاثاً، مرقاۃ (ج ۶ ص۲۹۶) باب المطلّقۃ ثلاثاً الفصل الثانی ۱۲ م

[4] الحدیث أخرجہ أبوداؤد فی سننہ (ج ۱ ص۲۸۳) باب فی التحلیل وابن ماجۃ فی سننہ (ص۱۳۹) باب المحلّل والمحلّل لہٗ ۱۲ م

[5] وإنما لعنھما لما فی ذلک من ھتک المروأۃ وقلّۃ الحمیۃ والدلالۃ علی خسّۃ النفس وسقوطھا، أمّا بالنسبۃ إلی المحلّل لہٗ فظاھر، وأما بالنسبۃ إلی المحلّل فلأنہ یعیر نفسہ بالوطی لغرض الغیر فإنّہ إنّما یطؤھا لیعرضھا لوطی المحلّل لہٗ ولذلک مثلہ صلی اللہ علیہ وسلم بالتیس المستعار۔ مرقاۃ (ج ۶ ص۲۹۶) ۱۲ مرتب

[6] علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں: إن نکاح المحلّل حرام باطل فی قول عامۃ أھل العلم منھم الحسنؒ والنخعیؒ وقتادۃؒ ومالکؒ واللیثؒ والثوریؒ وابن المبارکؒ والشافعیؒ، وسواء قال زوجتکھا إلی أن

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں تحلیل کی شرط نہ لگائی گئی ہو لیکن دل میں یہ نیت ہو کہ کچھ دن اپنے پاس رکھ کر چھوڑ دوں گا تو حنفیہ کے نزدیک یہ صورت جائز ہے[1] بلکہ امام ابو ثورؒ کا قول ہے کہ ایسا کرنے والا ماجور ہوگا[2]۔ امام احمدؒ کے نزدیک یہ صورت بھی ناجائز اور باطل ہے[3]، وہ حدیثِ باب کے اطلاق سے استدلال کرتے ہیں کہ اس میں محلل پر مطلقاً لعنت کی گئی ہے اور تخصیص کی کوئی دلیل نہیں،

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

نطأها أو شرط أنه إذا أحلها فلا نكاح بينهما أو أنه إذا أحلها للأول طلقها. المغنی (ج ۶ ص ۶۴۲) کتاب النکاح إن شرط عليه أن يحلها لزوج۔

جبکہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نکاح بشرط التحلیل مکروہ ہے (یعنی مکروہ تحریمی کما صرح بہ صاحب البحر۔ ج ۴ ص ۵۸۔ کتاب الطلاق، فصل فیما تحل به المطلقة) اور "لعن اللہ" والی روایت کا یہی محمل ہے، البتہ ان کے نزدیک نکاح درست ہو جاتا ہے "إذ هو لا يبطل بالشرط" اور زوجِ اول کے لئے حلت بھی ثابت ہو جاتی ہے۔

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک نکاح بشرط التحلیل فاسد ہے، لأنه في معنى الموقت فيه ولا يحلها على الأول لفساده۔

امام محمدؒ کے نزدیک نکاح درست ہے، اس لئے کہ نکاح شرطِ فاسد سے فاسد نہیں ہوتا البتہ وہ عورت زوجِ اول کے لئے حلال نہ ہوگی لأنه (الزوج الأول) استعجل ما أخره الشرع فيجازى بمنع مقصوده كما في قتل المورث۔

دیکھئے ہدایہ مع فتح القدیر (ج ۴ ص ۳۴ و ۳۵) کتاب الطلاق، فصل فیما تحل به المطلقة ۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ

(حاشیہ صفحۂ ھذا)

[1] بلکہ کتبِ احناف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ماجور بھی ہوگا چنانچہ شیخ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: أما لو نوياه ولم يقولاه فلا عبرة به ويكون الرجل مأجوراً لقصده الإصلاح۔ فتح القدیر (ج ۴ ص ۳۴) باب الرجعة فصل فیما تحل به المطلقة، نیز دیکھئے البحر الرائق (ج ۴ ص ۵۸)

واضح رہے کہ اس مسئلہ میں شافعیہ کے ہاں تفصیل ہے، دو صورتوں میں نکاح ناجائز اور باطل ہے: ایک یہ کہ اس شرط کے ساتھ نکاح کرے کہ جب صحبت کرلے گا تو دونوں کے درمیان نکاح باقی نہ رہے گا، دوسری صورت یہ کہ اس شرط کے ساتھ نکاح کرے کہ اس عورت کو زوجِ اول کے لئے حلال کردے گا۔

ایک صورت یہ ہے کہ اس شرط کے ساتھ نکاح کرے کہ صحبت کے بعد اس کو طلاق دے دیگا، اس تیسری صورت

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہم یہ کہتے ہیں کہ تخصیص تو آپ نے بھی کی ہے وہ اس طرح کہ حدیثِ باب کے اطلاق کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اگر نکاح نہ بشرط التحلیل ہو اور نہ بنیۃ التحلیل ہو پھر بھی اگر زوج ثانی طلاق دے کر اس کو زوج اول کے لئے حلال کر دے تو بھی ناجائز ہو کیونکہ محلّل کا لفظ اس پر بھی صادق آتا ہے حالانکہ ایسا شخص کسی کے نزدیک بھی ملعون نہیں۔

پھر نکاح بشرط التحلیل امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک متحقق ہی نہیں ہوتا اور نہ اس سے عورت زوجِ اوّل کے لئے حلال ہوتی ہے جبکہ ہمارے نزدیک ایسا کرنا اگرچہ حرام ہے لیکن اگر کوئی شخص اس کا ارتکاب کرلے گا تو نکاح منعقد ہو جائیگا اور عورت زوجِ اوّل کے لئے حلال ہو جائے گی[1]۔

ان حضرات کا استدلال حدیثِ باب سے ہے، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت میں نہی عن التحلیل ہے نفی نکاح نہیں، اور نہی عن الافعال الشرعیۃ اصل فعل کی مشروعیت کا تقاضا کرتی ہے کما تقرر فی أصول الفقہ۔

شافعیہ کے مسلک پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک روایت سے بھی استدلال[2] کیا گیا ہے

"عن عمر بن نافع عن أبیہ أنہ قال: جاء رجل إلی ابن عمر رضی اللہ عنہما فسألہ عن رجل طلق امرأتہ ثلاثاً فتزوجھا أخ لہ من غیر مؤامرۃ منہ لیحلھا لأخیہ ھل تحل للأوّل؟ قال: لا إلا نکاح رغبۃ کنا نعد ھٰذا سفاحاً علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ

کے بارے میں شافعیہ کے ہاں دو قول ہیں، ایک یہ کہ نکاح اس صورت میں بھی باطل ہے، دوسرا یہ کہ شرط باطل ہے اور عقد صحیح ہے۔

ایک چوتھی صورت یہ ہے کہ اس ارادہ سے نکاح کرے کہ صحبت کے بعد طلاق دیدیگا، شرط کا کوئی ذکر نہ ہو اس صورت میں نکاح کراہت کے ساتھ درست ہے، دیکھئے المجموع شرح المہذب (ج ۱۵ ص ۲۰۵ و ۲۰۶) باب ما یحرم من النکاح وما لا یحرم، فصل ولا یجوز نکاح المحلّل، اور المغنی (ج ۶ ص ۶۴۶) — رشید اشرف عفی عنہ

[2] کما فی تعلیقات الشیخ الکاندھلوی علی الکوکب الدری (ج ۲ ص ۲۳۳) ۱۲ م

[3] المغنی (ج ۶ ص ۶۴۶ و ۶۴۷) فصل فإن شرط علیہ التحلیل الخ ـ ۱۲ م

حاشیہ صفحۂ ھٰذا

[1] مذاہب کی تفصیل پیچھے باحوالہ گذر گئی ۱۲ م

[2] کما فی التلخیص الحبیر (ج ۳ ص ۱۷۱) باب موانع النکاح، تحت رقم ۱۵۳۰ ـ و تحفۃ الأحوذی (ج ۲ ص ۱۸۵) ۱۲ م

اس روایت کو امام حاکمؒ نے اپنی مستدرک میں ذکر کیا ہے اور صحیح علی شرط الشیخین قرار دیا ہے[1] اور حافظ ذہبیؒ نے بھی اس پر سکوت کیا ہے۔

اس استدلال کا کوئی جواب احقر کی نظر سے نہیں گذرا البتہ اس کا یہ جواب سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن کریم کی آیت "حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ"[2] میں مطلق نکاح کا ذکر ہے خواہ شرط تحلیل کے ساتھ ہو یا بغیر شرط تحلیل کے، اس پر خبرِ واحد سے زیادتی نہیں کی جا سکتی۔

اس کے علاوہ حضرت ابن عمرؓ کے قول میں زنا کے ساتھ اس عمل کی تشبیہ صرف حرمت میں ہے، عدم انعقاد میں نہیں جس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے اس معاملہ میں زوجین کو تفریق کا کوئی حکم نہیں دیا۔

نکاح بشرط التحلیل ناجائز ہونے کے باوجود منعقد ہو جاتا ہے اس پر حنفیہ کی دلیل مصنف[3] عبد الرزاق میں حضرت عمرؓ کا ایک فتویٰ ہے "عن ابن سیرین قال: أرسلت امرأة إلى رجل فزوجته نفسها ليحلها لزوجها، فأمره عمرؓ أن يقيم عليها ولا يطلقها وأوعده بعاقبة إن طلقها" معلوم ہوا کہ انہوں نے اس نکاح کو منعقد شمار کیا، واللہ سبحانہ أعلم

باب ماجاء فى نكاح المتعة

عن[4] علي بن أبي طالبؓ أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن متعة النساء وعن لحوم الحمر الأهلية زمن خيبر "۔

متعہ کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص[5] کسی عورت سے کہے " أتمتع بك كذا مدة بكذا من المال " اور وہ عورت اس کو قبول کرلے، اس میں نہ لفظ نکاح استعمال ہوتا ہے اور نہ دو گواہوں کی موجودگی ضروری ہوتی ہے، بخلاف نکاح موقت کے کہ اس میں لفظ نکاح بھی ہوتا ہے اور دو گواہ بھی ہوتے ہیں البتہ مدت متعین ہوتی ہے[6]۔

---

[1] مستدرک حاکم (ج ۲ ص ۱۹۹) کتاب الطلاق، لعن الله المحلل والمحلل له ۱۲ م

[2] سورۂ بقرہ آیت ۲۳۰، پ ۲ ۱۲ م

[3] (ج ۶ ص ۲۶۶) کتاب النکاح، باب التحلیل ۱۲ م

[4] الحديث أخرجه البخاري (ج ۲ ص ۶۰۶) کتاب المغازی، باب غزوة خيبر، ومسلم (ج ۲ ص ۱۴۹) کتاب الصيد والذبائح، باب تحريم أكل لحم الحمر الإنسية ۱۲ م

[5] هدایہ (ج ۲ ص ۳۱۲) فصل فی بیان المحرمات۔ ۱۲ م

[6] هدایہ (ج ۲ ص ۳۱۳) ۱۲ م

حرمتِ متعہ متعہ کی حرمت پر امت کا اجماع ہے اور سوائے روافض کے کوئی اس کی حلت کا قائل نہیں[1] اور ان کی مخالفت کا کوئی اعتبار نہیں، البتہ صرف حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اس کا جواز منقول ہے[2]، وہ بھی محض اضطرار کے موقعہ پر جواز کے قائل تھے[3] پھر اس سے بھی رجوع کرلیا تھا[4] چنانچہ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں "وإنما روی عن ابن عباسؓ شیٔ من الرخصة فی المتعة، ثم رجع عن قوله حیث أخبر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم"۔

البتہ یہاں دو بحثیں قابلِ غور ہیں:

حرمتِ متعہ کی مستدل آیت پر اشکال اور اس کا جواب پہلی بحث یہ ہے کہ متعہ کی حرمت پر عموماً اس آیتِ قرآنی سے استدلال کیا جاتا ہے "وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ[5]"

لیکن اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ یہ آیت مکی ہے اس لئے کہ قرآن کریم میں یہ آیت دو مقام پر آئی ہے ایک سورہ مومنون میں دوسرے سورۂ معارج میں، اور یہ دونوں سورتیں مکی ہیں[6]، جبکہ متعہ

---

[1] فتح القدیر (ج ۳ ص۱۵۱ و ص۱۵۲) فصل فی بیان المحرمات ۱۲ م

[2] دیکھئے شرح معانی الآثار (ج ۲ ص۱۶) باب نکاح المتعة ۱۲ م

[3] حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں: "قلت لابن عباس: لقد سارت بفتیاك الرکبان وقالت فیها الشعراء، قال: وما قالوا؟ قلت: قالوا:

قد قلت للشیخ لما طال مجلسه   یا صاح هل لك فی فتیا ابن عباس

هل لك فی رخصة الأطراف آنسة   تکون مثواك حتی مصدر الناس

فقال: سبحان اللہ واللہ ما بهذا أفتیت وما هی إلا کالمیتة والدم ولحم الخنزیر لا تحل إلا للمضطر۔ نصب الرایہ (ج ۳ ص۱۸۱) فصل فی بیان المحرمات ۱۲ مرتب عفی عنہ

[4] ابن جریرؒ فرماتے ہیں: "وأما ما یحکی فیها عن ابن عباس فانه کان یتأول إباحتها للمضطر إلیها بطول الغربة وقلة الیسار والجدة ثم توقف وأمسك عن الفتوی بها۔ حوالۂ بالا۔

ابن جریرؒ کے اس مقولہ سے اضطرار کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے اور حضرت ابن عباسؓ کا رجوع بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ ۱۲ مرتب

[5] سورۂ مومنون آیت ۵ و ۶ پ۱۸، اور سورۂ معارج آیت ۲۹ و ۳۰ پ۲۹ ۱۲ م

[6] چنانچہ سورۂ مومنون کے بارے میں علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: "مکیة کلها فی قول الجمیع" دیکھئے تفسیر قرطبی (ج ۱۲ ص۱۰۲) اور سورۂ معارج کے بارے میں فرماتے ہیں: "وهی مکیة باتفاق" تفسیر قرطبی (ج ۱۸ ص۲۷۸) ۱۲ مرتب

کی حلت وحرمت کی تمام روایات اس پر دال ہیں کہ متعہ ہجرت کے بعد حرام ہوا اور وہ ایک سے زائد غزوات میں حلال تھا[1]، پھر یہ آیت متعہ کے حق میں کیسے محرّم ہوسکتی ہے ؟

اس کے جواب میں شراحِ حدیث وتفسیر کافی سرگردان رہے ہیں لیکن اطمینان بخش جوابات کم دیئے گئے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے فتاوٰی عزیزیہ[2] میں یہ دعویٰ فرمایا کہ متعہ بالمعنی المعروف اسلام میں کبھی حلال نہیں ہوا اور اس کو مذکورہ آیت نے شروع ہی میں حرام کردیا تھا البتہ مختلف غزوات کے موقعہ پر جس متعہ کی اجازت احادیث میں مروی ہے اس سے مراد نکاحِ موقت ہے لہذا یہ آیت شروع ہی سے حرمتِ متعہ پر دلالت کررہی ہے۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فیض الباری[3] میں اسی کے قریب قریب یہ قول اختیار کیا ہے کہ متعہ بالمعنی المعروف تو ہمیشہ سے حرام تھا البتہ جس چیز کی اجازت دی گئی تھی اس سے مراد "نکاح باضمار نیۃ الفرقۃ" تھا، یہ نکاح پہلے قضاءً اور دیانۃً دونوں طرح جائز تھا، بعد میں اگرچہ قضاءً جائز ہی رہا لیکن دیانۃً اسے ناجائز قرار دیدیا گیا۔

اسی بات کو احادیث میں ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا کہ متعہ کی شروع میں اجازت دی گئی تھی، بعد میں اسے ناجائز کردیا گیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے اس دعویٰ پر ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ کی روایتِ باب سے استدلال کیا ہے "قال: إنما كانت المتعة في أول الإسلام كان الرجل يقدم البلدة ليس له بها معرفة فيتزوج المرأة بقدر ما يرى أنه يقيم فتحفظ له متاعه وتصلح له شيئه حتى إذا نزلت الآية: "إِلَّا عَلَىٰٓ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ" قال ابن عباس فكل فرج سوى هذين فهو حرام[4]"

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور حضرت شاہ صاحب رحمہا اللہ کے مذکورہ دونوں جوابات اگر دلائل سے ان کی تائید ہورہی ہوتی تو خاصے قوی ہوتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ

---

[1] روایات کے لئے دیکھئے نصب الرایہ (ج ۳ ص۱۷۷ تا ص۱۸۱) فصل فی بیان المحرمات ۱۲ م

[2] (ج ۲ ص۲۹۰) حکم حرمتِ متعہ، مطبع مجیدی کانپور ۱۲ م

[3] (ج ۴ ص۱۳۷و۱۳۸) کتاب المغازی تحت قولہ نہی عن متعۃ النساء یوم خیبر ۱۲ م

[4] لم یخرجہ أحد من أصحاب الکتب الستۃ سوی الترمذی، قالہ الشیخ محمد فؤاد عبدالباقی، سنن الترمذی (ج ۳ ص۴۳۰، رقم ۱۱۲۲) ۱۲ م

دونوں جوابات محض دعوٰی ہیں اور ان تمام احادیث کا ظاہر جن میں لفظ متعہ آیا ہے ان جوابات کی تردید کر رہا ہے بالخصوص حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق پر متعدد اشکالات وارد ہوتے ہیں:

اوّلاً یہ کہ یہ روایت موسیٰ بن عبیدہ[1] کی وجہ سے متکلم فیہ ہے۔

دوسرے یہ کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے متعہ کی جو تشریح کی ہے وہ ان کی مستدل روایت کے الفاظ سے پوری طرح واضح نہیں ہوتی بلکہ اس روایت کو بھی متعہ بالمعنی المعروف پر بآسانی محمول کیا جاسکتا ہے۔

تیسرے اس روایت کے آخر میں یہ تصریح ہے کہ آیتِ قرآنی "اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ" نے متعہ کو منسوخ کردیا، اب اگر متعہ سے وہی معنی مراد لئے جائیں جو حضرت شاہ صاحبؒ نے لئے ہیں تب بھی اصل اعتراض لوٹ آتا ہے کہ یہ آیت مکی ہے اور حلّتِ متعہ کی روایات مدنی ہیں۔

احقر کے نزدیک اس اعتراض کا صحیح جواب یہ ہے کہ متعہ بالمعنی المعروف کو مذکورہ آیتِ قرآنی نے مکہ مکرمہ ہی میں حرام کردیا تھا اور وہ بدستور حرام ہی رہا البتہ بعض غزوات کے موقع پر ضرورتِ شدیدہ کی وجہ سے ایک محدود مدت کے لئے اس کی اجازت دی گئی جو رخصت تھی، حلّت نہیں جیسے لحم خنزیر حرام ہے لیکن اضطرار کے موقع پر اس کا کھانا جائز ہوجاتا ہے، نہ اس لئے کہ وہ حلال ہوگیا بلکہ اس لئے کہ خاص حالات کی وجہ سے شریعت نے ایک محدود رخصت عطا فرمادی، حاصل یہ کہ ایسی رخصت حرمت کے ساتھ جمع ہوجاتی ہے اور اس رخصت کی وجہ سے یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ حرمت منسوخ ہوگئی۔

اس جواب کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اجازتِ متعہ کی تقریباً تمام روایات میں رخصت کا لفظ استعمال ہوا ہے نہ کہ حلّت کا[2]۔

---

[1] موسیٰ بن عبیدہ [ت، ق] الربذی ... قال احمد: "لا یکتب حدیثہ" وقال النسائی وغیرہ: "ضعیف" وقال ابن عدی: "الضعف علی روایاتہ بیّن" وقال ابن المعین: "لیس بشئ"، وقال مرۃ: "لا یحتج بحدیثہ" وقال یحیی بن سعید: "کنا نتقی حدیثہ" وقال ابن سعد: "ثقۃ ولیس بحجۃ" وقال یعقوب بن شیبۃ: "صدوق ضعیف الحدیث جداً"، میزان الاعتدال (ج ۴ ص ۲۱۳، رقم ۸۸۹۵) ۱۲ مرتب

[2] چنانچہ بیشتر روایات میں "رخصت" اور "اذن" کے الفاظ آئے ہیں، بعض میں استمتاع کے الفاظ بھی آئے ہیں، روایات کے لئے دیکھئے جامع الاصول (ج ۱۱ ص ۴۴۳ تا ۴۵۱) رقم الحدیث ۸۹۸۶ تا ۸۹۹۳، الفرع الأول فی نکاح المتعۃ۔ نیز دیکھئے مجمع الزوائد (ج ۴ ص ۲۶۴ تا ۲۶۶) باب نکاح المتعۃ۔ مزید دیکھئے کنز العمال (ج ۱۶ ص ۳۲۸) نکاح المتعۃ اور (ج ۱۶ ص ۵۱۸ تا ص ۵۲۴) رقم ۴۵۷۱۲ تا ۴۵۷۵۱، المتعۃ، النکاح۔
حلّت کا لفظ کسی روایت میں بندہ کو نہیں مل سکا، البتہ حسن بصریؒ کی ایک مرسل روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے "ما حلّت المتعۃ قط إلا فی عمرۃ القضاء ثلاثۃ أیام ما حلّت قبلہا ولا بعدہا" کنز العمال (ج ۱۶ ص ۵۲۴، رقم ۴۵۷۴۹) ۱۲ مرتب عفی عنہ

اصل اعتراض کا ایک دوسرا جواب بھی دیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ آیت "وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ" میں ازواج سے مراد وہ عورتیں ہیں جو عقد مشروع کے ذریعے حلال کی گئی ہوں اور ابتداء اسلام میں عقد مشروع چونکہ صرف نکاح تھا اس لئے آیت حرمتِ متعہ پر بھی دال تھی، پھر بعد میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ عرصہ کے لئے متعہ کی اجازت دی تو متعہ بھی عقدِ مشروع کے تحت آگیا اور ایسی تمام عورتیں جن کے ساتھ متعہ کیا گیا "ازواج" کے تحت داخل ہوگئیں اس لئے نہ آیت کی مخالفت ہوئی، نہ آیت کو منسوخ کیا گیا، پھر بعد میں جب دوبارہ متعہ کو ممنوع کردیا گیا تو وہ عقد مشروع نہ رہا اور ایسی عورتیں "ازواج" کے مفہوم سے خارج ہوگئیں، اس لئے اب یہ آیت ہمیشہ کے لئے حرمتِ متعہ پر دال ہے۔ واللہ سبحانہٗ اعلم۔

حرمتِ متعہ کے زمانہ سے متعلق روایات میں تعارض اور ان میں تطبیق

دوسری بحث یہ ہے کہ متعہ کی حرمت کس وقت ہوئی؟ اس بارے میں روایات میں شدید تعارض پایا جاتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیثِ باب "أنّ النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم نهٰی عن متعة النساء وعن لحوم الحمر الأهلية زمن خيبر" سے معلوم ہوتا ہے کہ متعہ غزوۂ خیبر کے موقع پر حرام ہوا، بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ[1] کے موقع پر حرام ہوا، بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ حنین[2] کے موقع پر، بعض سے غزوۂ اوطاس[3] کے موقعہ پر اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حرمت غزوۂ تبوک[4] کے موقعہ پر ہوئی[5]۔

---

[1] چنانچہ حضرت سبرہؓ سے مروی ہے "أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نهٰی عن متعة النساء يوم الفتح۔" کنز العمال (ج ۱۶، ص ۵۲۵، رقم ۴۵۸۳۷) المتعة، نیز دیکھئے صحیح مسلم (ج ۲ ص ۴۵۱) باب نکاح المتعة ۱۲ مرتب

[2] امام نسائیؒ حضرت علیؓ کی روایت کے ایک طریق کے بارے فرماتے ہیں: "قال ابن المثنّیؒ: "يوم حنين" وقال: هكذا حدثنا عبد الوهاب من كتابه" سنن نسائی (ج ۲ ص ۸۹) تحریم المتعة۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری (ج ۹ ص ۱۶۸) کتاب النکاح، باب نهی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن نکاح المتعة أخیراً۔ ۱۲ مرتب

[3] چنانچہ حضرت سلمۃ بن الاکوعؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: "رخّص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام أوطاس فی المتعة ثلاثاً ثم نهی عنها" صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۵۱) باب نکاح المتعة ۱۲ مرتب

[4] حازمی نے اپنی کتاب "الاعتبار فی الناسخ والمنسوخ من الآثار" میں حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ کی روایت ذکر کی ہے فرماتے ہیں: "خرجنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إلی غزوة تبوك حتی إذا کنا عند العقبة

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس تعارض کو رفع کرنے کے لئے بعض حضرات نے فرمایا کہ حرمتِ متعہ تو ایک مرتبہ ہو چکی تھی لیکن اس کا اعلان بار بار مختلف غزوات میں کیا گیا اور جن لوگوں نے جس غزوہ میں یہ حکم پہلی بار سنا، انہوں نے حرمتِ متعہ کو اسی غزوہ سے منسوب کر دیا۔[۱]
لیکن یہ جواب اطمینان بخش نہیں کیونکہ روایات کے الفاظ اس کی تائید نہیں کرتے۔[۲]
حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ جواب دیا کہ جس روایت میں غزوۂ تبوک کا ذکر ہے اس میں کسی راوی سے وہم ہوا ہے[۳] اور حضرت علیؓ کی "نهى عن متعة النساء وعن لحوم الحمر الأهلية زمن خيبر

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

مما يلي الشام جاءت نسوة فذكرنا تمتعنا وهن تطفن فى رحالنا فجاءنا رسول الله صلى الله عليه وسلم فنظر إليهن وقال: "من هؤلاء النسوة؟ فقلنا: يا رسول الله! نسوة تمتعنا منهن" قال: " فغضب رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى احمرت وجنتاه وتمعر وجهه وقام فينا خطيبا فحمد الله وأثنى عليه ثم نهى عن المتعة فتوادعنا يومئذ الرجال والنساء ولم نعد ولا نعود لها أبدًا، فبها سميت يومئذ ثنية الوداع"
دیکھئے نصب الرایہ (ج ۳ ص ۱۷۹) فصل فى بيان المحرمات ۱۲ مرتب

۵ نیز ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریمِ متعہ عمرۃ القضاء کے موقعہ پر ہوئی چنانچہ حضرت حسن بصریؒ کی روایت ہے "ماحلت المتعة قط إلا فى عمرة القضاء ثلاثة أيام ما حلت قبلها ولا بعدها" کنز العمال (ج ۱۶ ص ۵۲۷، رقم ۴۵۷۴۹) برمز (عب)۔

نیز ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ متعہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر حرام ہوا چنانچہ حضرت سبرۃؓ فرماتے ہیں "سمعت النبي صلى الله عليه وسلم ينهى عن متعة النساء فى حجة الوداع۔ کنز (ج ۱۶ ص ۵۱۵، رقم ۴۵۷۳۸) بحوالہ ابن جریر۔ ۱۲ مرتب عفی عنہ

حاشیہ صفحۂ ھٰذا

[۱] علامہ نوویؒ نے مذکورہ جواب قاضی عیاضؒ کی نسبت سے ذکر کیا ہے، دیکھئے شرح نووی علیٰ صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۵۰) باب نکاح المتعۃ ۱۲ مرتب

[۲] اس لئے کہ متعدد روایات میں مختلف غزوات کے موقعہ پر رخصتِ متعہ پھر بعد میں اس کی ممانعت کا ذکر ہے، اگر تحریمِ متعہ محض ایک ہی موقع پر ہوئی ہوتی اور دوسرے مواقع پر اس کی تاکید ہوتی تو دوسرے مواقع پر "رخصت" اور "اذن" کا ذکر نہ ہوتا جبکہ دوسرے مقامات پر بھی "رخصت" اور "اذن" کا ذکر ہے، معلوم ہوا کہ حرمتِ متعہ کو محض ایک مرتبہ قرار دینا صحیح نہیں۔ ۱۲ مرتب

[۳] علامہ نوویؒ نے بھی تبوک کی طرف نسبت کو غلط قرار دیا ہے دیکھئے شرح نووی علیٰ صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۵۰) ۱۲ م

والی روایت میں "زمن خیبر" کا تعلق صرف "لحوم الحمر الأھلیۃ" سے ہے یعنی "لحوم حمر" کو غزوۂ خیبر میں حرام قرار دیا گیا، اور "نہی عن متعۃ النساء" ایک جملہ ہے جس کا "زمن خیبر" سے کوئی تعلق نہیں[1]، ورنہ دراصل فتح مکہ کے موقع پر متعہ کی اجازت دی گئی تھی پھر اسے حرام کر دیا گیا تھا لیکن چونکہ فتح مکہ، غزوۂ حنین واوطاس ایک ہی سفر میں پیش آئے تھے اس لئے کسی نے اس کی نسبت فتح مکہ کی طرف کر دی اور کسی نے حنین یا اوطاس کی طرف[2]۔

---

[1] حاصل یہ کہ "زمن خیبر" دونوں کا ظرف نہیں بلکہ صرف "وعن لحوم الحمر الأھلیۃ" کا ظرف ہے۔

لیکن اس پر اشکال ہو سکتا ہے کہ ترمذی کی مذکورہ حدیث باب میں تو آپ کی تاویل چل سکتی ہے جس میں "زمن خیبر" دونوں کے بعد آیا ہے، لیکن صحیحین میں یہ روایت اس طرح آئی ہے "عن علی بن أبی طالب أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن متعۃ النساء یوم خیبر وعن أکل الحمر الانسیۃ" بخاری (ج ۲ ص ۶۰۶) کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر۔ مسلم میں بھی یہ روایت اسی طرح آئی ہے دیکھئے (ج ۱ ص ۴۵۲) باب نکاح المتعۃ۔

ان دونوں طرق میں "زمن خیبر" کا لفظ صراحۃً "نہی عن متعۃ النساء" کا ظرف بن رہا ہے جس کا مطلب واضح ہے کہ حرمت متعہ خیبر کے زمانہ میں ہوئی۔

اس اشکال کا جواب علامہ ابن القیم نے یہ نقل کیا ہے کہ اس میں راوی کو وہم ہوا ہے ورنہ اصل روایت وہی ہے جس میں "زمن خیبر" کو دونوں کے بعد لایا گیا ہے۔ (لیکن اس جواب کا ضعف اور تکلف ظاہر ہے) نیز علامہ ابن القیم فرماتے ہیں کہ خیبر کے زمانے میں متعہ کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اس زمانہ میں حرام کرنا پڑے اس لئے کہ خیبر میں تمام عورتیں یہودی تھیں اور ان سے متعہ کا امکان نہ تھا اس لئے کہ اس وقت کتابیہ عورت سے نکاح جائز نہ تھا متعہ کیسے درست ہو سکتا تھا، اس لئے کہ کتابیہ سے نکاح اس آیت کے نازل ہونے سے جائز ہوا "اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ وَطَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّھُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ" یہ آیت سورۂ مائدہ سے تعلق رکھتی ہے جو بالکل آخری سورتوں میں سے ہے، دیکھئے زاد المعاد (ج ۳ ص ۴۶۰) تحریم متعۃ النساء عام الفتح۔

حافظ ابن حجرؒ نے مذکورہ اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ فتح مکہ کے موقعہ پر متعہ کے سلسلہ میں جو رخصت دی گئی تھی اس کا حضرت علیؓ کو علم نہ تھا صرف خیبر کے موقعہ پر اس کی حرمت کا علم تھا کما فی فتح الباری (ج ۹ ص ۱۶۹) باب نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن نکاح المتعۃ أخیرا ۱۲ مرتب عفی عنہ

[2] حضرت شاہ صاحبؒ نے حجۃ الوداع والی روایت کا یہ جواب دیا ہے کہ اس میں متعہ سے مراد "متعۃ الحج" ہے نہ کہ "متعۃ النکاح"۔ عمرۃ القضاء والی روایت سے حضرت شاہ صاحبؒ نے کوئی تعرض نہیں کیا، نیز اوطاس وحنین والی روایات کا جواب بھی صراحۃً ذکر نہیں کیا، دیکھئے فیض الباری (ج ۴ ص ۱۳۵ وص ۱۳۶) مغازی ۱۲ مرتب

لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ جواب بھی تکلّف سے خالی نہیں، احقر کے نزدیک سب سے بہتر جواب علامہ طیبیؒ کا ہے کہ ایک مرتبہ غزوۂ خیبر کے موقعہ پر متعہ حرام ہو گیا تھا پھر فتح مکہ کے موقعہ پر ایک محدود وقت کے لئے دوبارہ اس کی رخصت دی گئی اس کے بعد ہمیشہ کے لئے اس کی حرمت کا اعلان کر دیا گیا[1]، و به یجمع الروایات ان شاء اللہ تعالیٰ[2]۔

متعہ کی حلّت پر روافض نے اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے: "فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً[3]"

لیکن اس آیت میں استمتاع کے لغوی معنی مراد ہیں متعہ اصطلاحی نہیں[4] اور "منھن" وغیرہ کی ضمیر منکوحہ عورتوں کی طرف لوٹ رہی ہے کما یدل علیه السیاق، لہٰذا اس سے استدلال درست

---

[1] کما فی حاشیۃ سنن الترمذی للشیخ أحمد علی السہارنفوری رحمہ اللہ (ج ۱ ص ۱۶۶)

نیز علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں: "وقال الشافعیؒ: "لا أعلم شیئاً أحلّه اللہ ثم حرّمه ثم أحلّه ثم حرّمه إلا المتعة" فحمل الأمر علی ظاهره وأن النبی صلی اللہ علیه وسلم حرّمها یوم خیبر ثم أباحها فی حجّة الوداع ثلاثة أیام ثم حرّمها، المغنی (ج ۶ ص ۶۴۵) جواز المتعة ۱۲ مرتب

[2] اس صورت میں بھی "عمرۃ القضاء" والی روایت کا کوئی صحیح محمل نہیں اور تبوک والی روایت کو وہم پر محمول کرنا ضروری ہوگا، شاید یہی وجہ ہو کہ سہیلی فرماتے ہیں: "وقد اختلف فی وقت تحریم نکاح المتعة فأغرب ما روی فی ذلک روایة من قال: فی غزوة تبوک ثم روایة الحسن أن ذلک کان فی عمرة القضاء" کما فی فتح الباری (ج ۹ ص ۱۶۹) باب نهی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم عن نکاح المتعة أخیراً ۔ ۱۲ مرتب

[3] سورۂ نساء آیت ۲۴ پ ۵ ۱۲ م

[4] علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں: "المراد بالاستمتاع هو الوطء والدخول لا الاستمتاع بمعنی المتعة التی یقول بها الشیعة ۔ روح المعانی (ج ۳ ص ۵، جزء خامس)

علامہ قرطبیؒ نے "فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ" کا ایک مطلب "نکاح المتعة الذی کان فی صدر الاسلام" بیان کیا ہے اور اسے جمہور کا قول قرار دیا ہے اور تائید میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، ابی بن کعبؓ اور سعید بن جبیرؒ کی نسبت ایک قراءت کو پیش کیا ہے "فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ" ۔ پھر جواب میں فرماتے ہیں کہ اس متعہ سے بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا تھا، (گویا یہ حکم منسوخ ہو گیا) (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نہیں۔ واللہ اعلم۔

باب ماجاء فی النھی عن نکاح الشغار

"عن[1] عمران بن حصین عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لاجلب و لاجنب"

جلب وجنب کا ایک مطلب "باب زکوٰۃ" سے متعلق ہے، اس وقت "جلب" کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "مصدق" ہر شخص کے پاس جاکر زکوٰۃ وصول کرنے کے بجائے کسی ایک جگہ بیٹھ جائے اور لوگوں کو وہاں آکر زکوٰۃ دینے پر مجبور کرے اور "جنب" کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والا اپنا مال لیکر کہیں دور چلا جائے جہاں "مصدق" کو پہنچنے میں دشواری ہو[2]، یہ دونوں ممنوع ہیں،

"جلب" و "جنب" کا دوسرا مطلب "باب سباق" سے متعلق ہے، اس صورت میں "جلب" کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک شہسوار اپنے پیچھے کسی آدمی کو مقرر کردے تاکہ وہ شور مچائے جس سے گھوڑا تیز بھاگے، یہ صورت ممنوع ہے اس لئے کہ اس میں دوسرے مسابقین کا ضرر ہے، اور "جنب" کا مطلب یہ ہے کہ دوڑ کے وقت ایک خالی گھوڑا ساتھ رکھے تاکہ مرکوب کے تھک جانے کی صورت میں اس پر سوار ہوسکے[3]، یہ صورت ممنوع ہے۔

حاشیہ صفحہ گذشتہ

اور حضرت سعید بن المسیبؒ فرماتے ہیں: "نسختھا آیۃ المیراث اذ کانت المتعۃ لا میراث فیھا" اور حضرت عائشہؓ اور قاسم بن محمدؒ فرماتے ہیں: "تحریمھا ونسخھا فی القرآن و ذلک فی قولہ تعالیٰ: "وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَاِنَّھُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ" ولیست المتعۃ نکاحاً ولا ملک یمین۔ دیکھئے تفسیر قرطبی (ج ۵ ص ۱۳۱) ۱۲ مرتب عفی عنہ

حاشیہ صفحہ ھٰذا

[1] الحدیث أخرجہ النسائی (ج۲ ص۸۴ و۸۵) کتاب النکاح، باب الشغار۔ وأبو داؤد مختصراً (ج۲ ص۳۴۸) کتاب الجہاد، باب الجلب علی الخیل فی السباق ۱۲ م

[2] نہایہ (ج ۱ ص۳۰۳) میں "جنب" کی اس تشریح کو "قیل" کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جبکہ "جنب" کا باب زکوٰۃ سے متعلق اصل مطلب اس طرح بیان کیا گیا ہے "أن ینزل العامل بأقصی مواضع أصحاب الصدقۃ ثم یأمر بالأموال أن تجنب إلیہ، ای تحضر" اس مطلب کی صورت میں "جلب" اور "جنب" دونوں کا حاصل ایک ہوگا ۱۲ مرتب

[3] "جلب" اور "جنب" کے مذکورہ مطالب کے لئے دیکھئے النہایہ لابن الأثیر (ج ۱ ص۲۸۱ و ص۳۰۳) اور مجمع بحار الانوار (ج ۱ ص۳۷۰ و ص۳۹۶ و ۳۹۹) ۱۲ مرتب

" ولا شغار[1] فی الإسلام " شغار یعنی " آنٹے سانٹے " کا نکاح یعنی کوئی اپنی بیٹی یا بہن کا نکاح دوسرے آدمی کے ساتھ کردے اس معاملہ پر کہ وہ دوسرا آدمی اپنی بیٹی یا بہن کا نکاح اس کے ساتھ کردے اور " احد العقدین " دوسرے کا عوض ہوجائے اور اس کے علاوہ کوئی اور مہر نہ ہو[2]۔

حنفیہ کے نزدیک شغار اگرچہ جائز نہیں لیکن اگر کیا جائے تو نکاح منعقد ہوجاتا ہے اور مہر مثل واجب ہوتا ہے، جبکہ امام شافعیؒ کے نزدیک اس صورت میں نکاح ہی منعقد نہیں ہوتا، ان کا استدلال حدیث باب سے ہے کہ نکاح شغار منہی عنہ ہے، والنہی یوجب فساد المنہی عنہ[3]

حنفیہ کے نزدیک " نہی عن الأفعال الشرعیۃ " " منہی عنہ " کی مشروعیت کا تقاضا کرتی ہے لہٰذا نکاح درست ہے[4]۔ واللہ اعلم

---

[1] وهو نكاح معروف في الجاهلية، كأن يقول الرجل للرجل: شاغرني أي زوجني أختك أو بنتك أو من تلي أمرها حتى أزوجك أختي، أو بنتي، أو من إلي أمرها، ولا يكون بينهما مهر ويكون بضع كل واحد منهما في مقابلة بضع الأخرى، وقيل له " شغار " لارتفاع المهر بينهما، من " شغر الكلب " إذا رفع إحدى رجليه ليبول، وقيل: الشغر: البعد، وقيل: الاتساع - كذا في النهاية لابن الأثير (ج ۲ ص ۴۸۲) ۱۲ مرتب

[2] شغار کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ کوئی شخص اپنے لڑکے کا نکاح دوسرے کی لڑکی سے اس شرط پر کرے کہ دوسرا اپنے لڑکے کا نکاح اس کی لڑکی سے کردے اور احد العقدین دوسرے کا عوض ہو۔ دیکھئے فتاویٰ دار العلوم دیوبند (ج ۸ ص ۲۹) ۱۲ مرتب

[3] شافعیہ نے اپنے مسلک پر ایک دلیل عقلی بھی بیان کی ہے کہ شغار کی صورت میں لازم آتا ہے کہ ہر ایک عورت کا بضع مہر بھی ہو اور منکوحہ بھی اور یہ درست نہیں۔

حنفیہ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک شغار کی صورت میں اعتبار مہر مثل کا ہے، لہٰذا ہر عورت کا بضع محض منکوحہ کی حیثیت رکھتا ہے، نہ کہ مہر اور منکوحہ دونوں کی۔ دیکھئے فتح القدیر (ج ۳ ص ۲۲۲) باب المہر ۱۲ مرتب

[4] حنفیہ کے مذہب کی مزید وضاحت یہ ہے کہ شغار کی صورت میں " أحد البضعین " کو جو دوسرے کا صداق ٹھہرایا گیا ہے یہ تسمیہ فاسد ہے، اس لئے کہ بضع مال نہیں، اس لئے مہر نہیں بن سکتا، لہٰذا ایسی صورت میں ہر ایک عورت مہر مثل کی مستحق ہوگی، حاصل یہ کہ بضع کو مہر قرار دینا شرط فاسد ہے اور نکاح شرط فاسد سے باطل نہیں ہوتا " کما إذا تزوجها على أن يطلقها وعلى أن ينقلها من منزلها ونحو ذلك "

جہاں تک حدیث باب کا تعلق ہے وہ ہمارے نزدیک ممانعت پر محمول ہے نہ کہ ابطال پر۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے بدائع الصنائع (ج ۲ ص ۲۷۸) فصل و أما بيان ما يصح تسميته مهراً۔ اور فتح القدیر (ج ۳ ص ۲۲۲)

مرتب عفی عنہ

باب ماجاء لا تنکح المرأة علی عمتها ولا علی خالتها

"عن ابن عباسؓ أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی أن تزوج المرأۃ علی عمتہا أو علی خالتہا" پھوپھی اور بھتیجی، خالہ اور بھانجی کو ایک وقت میں نکاح میں جمع کرنا اس حدیث کی رو سے ممنوع ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔[2]

لیکن یہاں حنفیہ کے اصول پر اشکال ہوتا ہے کہ "أحل لکم ما وراء ذلکم" عام ہے جس کے عموم میں مذکورہ صورت بھی داخل ہے لہٰذا حدیث باب جو خبر واحد ہے اس سے کتاب اللہ کے عام میں کیسے تخصیص کی جا سکتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ آیت میں "ولا تنکحوا المشرکٰت حتی یؤمن"[3] سے ایک مرتبہ تخصیص ہو چکی ہے اور عام خص عنہ البعض میں مزید تخصیص خبر واحد اور قیاس سے بھی ہو سکتی ہے[4] کما ھو محقق فی أصول الفقہ۔ واللہ أعلم

باب ماجاء فی الشرط عند عقدۃ النکاح

عن عقبۃ بن عامر الجہنی قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "إن أحق

---

[1] الحدیث لم یخرجہ أحد من أصحاب الکتب الستۃ سوی الترمذی، قالہ الشیخ محمد فؤاد عبد الباقی، سنن ترمذی (ج ۳ ص ۴۳۲) ۱۲ م

[2] قال ابن المنذرؒ: "أجمع أہل العلم علی القول بہ ولیس فیہ بحمد اللہ اختلاف إلا أن بعض أہل البدع ممن لا تعد مخالفتہ خلافا وہم الرافضۃ والخوارج لم یحرموا ذلک"۔
کذا فی المغنی (ج ۶ ص ۵۷۳) الجمع بین المرأۃ وعمتہا وخالتہا ۱۲ مرتب

[3] سورۃ بقرہ آیت ۲۲۱، پ ۲ ۱۲ م

[4] یہ سارا جواب حدیث باب کے خبر واحد ہونے کی تقدیر پر ہے جبکہ صاحب ہدایہؒ نے جمع "بین العمۃ وابنۃ أخیہا" اور "بین الخالۃ وابنۃ أختہا" کی حرمت پر "لا تنکح المرأۃ علی عمتہا" الحدیث سے استدلال کیا ہے اور اسے خبر مشہور قرار دیکر فرمایا ہے "تجوز الزیادۃ علی الکتاب بمثلہ"
اور شیخ ابن ہمامؒ اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں "أعنی الحدیث المذکور ثابت فی صحیحی مسلمؒ وابن حبانؒ ورواہ أبو داؤدؒ والترمذیؒ والنسائیؒ، وتلقاہ الصدر الأول (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

الشروط أن یوفی بها ما استحللتم به الفروج " یعنی پوری کرنے کے اعتبار سے لائق تر وہ شرط ہے جس کے ذریعہ تم نے شرمگاہوں کو حلال کیا۔

عقدِ نکاح میں جو شرائط لگائی جاتی ہیں ان کی تین قسمیں ہیں:

(۱) جو زواج کی وجہ سے واجب ہوتی ہیں، یعنی مقتضاء عقد کے مطابق ہوتی ہیں جیسے نفقہ، کسوہ اور سکنیٰ وغیرہ۔

ان کا پورا کرنا بالاتفاق واجب ہے۔ اگرچہ ان کی تصریح نہ کی گئی ہو۔

(۲) جو مقتضاء عقد کے خلاف ہوں، جیسے دوسری بیوی کو طلاق دینے کی شرط، عدم انفاق اور عدمِ سکنیٰ کی شرط۔

اس قسم کا حکم یہ ہے کہ شرط باطل ہوجائے گی اور نکاح درست ہوجائیگا۔[1]

(۳) "وما لیس من القسمین" مثلاً دوسری عورت سے نکاح نہ کرنے کی شرط یا دوسرے گھر نہ لیجانے کی شرط[2] یا اس جیسی دوسری مباح شرائط۔

اس تیسری نوع کا حکم مختلف فیہ ہے:

امام احمدؒ، امام اسحاقؒ اور امام اوزاعیؒ وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ شرط کے مطابق عمل

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

بالقبول من الصحابة والتابعين، ورواه الجمّ الغفير، منهم ابوهريرة وجابر وابن عباس وابن عمر وابن مسعود وابو سعيد الخدری رضی الله عنهم۔ هدايه مع فتح القدير (ج ۳ ص۲۲۲ و ۲۵۹) فصل فی بيان المحرمات ۱۲ مرتب عفا الله عنه

[شه] شرح از مرتب عفا الله عنه ۱۲

[له] الحديث أخرجه البخاری (ج ۲ ص۷۷۳) باب الشروط فی النكاح، ومسلم (ج ۳ ص۴۵۵) باب الوفاء بالشروط فی النكاح۔ ۱۲ م

(حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] قال الحافظ فی فتح الباری (ج ۹ ص۲۱۸) باب الشروط فی النكاح وأما شرط ينافی مقتضى النكاح كأن لا يقسم لها أو لا يتسرى عليها أو لا ينفق أو نحو ذلك فلا يجب الوفاء به، بل إن وقع فی صلب العقد كفى وصح النكاح بمهر المثل، وفی وجه يجب المسمى ولا أثر للشرط، وفی قول للشافعیؒ يبطل النكاح۔ ۱۲ مرتب

[2] اس مثال کو الکوکب الدری (ج ۲ ص۲۳۳) میں دوسری قسم کی مثال میں بیان کیا گیا ہے لیکن علامہ عینیؒ نے اس کو تیسری قسم میں شمار کیا ہے کما نقلنا ۱۲ م

کرنا واجب ہے، اگر شرط کو پورا نہ کرے تو عورت کو نکاح فسخ کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور سفیانِ ثوریؒ کے نزدیک شروط کی اس تیسری نوع کو پورا کرنا قضاءً ضروری نہیں البتہ دیانۃً ضروری ہے۔

امام ترمذیؒ نے امام شافعیؒ کا مسلک امام احمدؒ کے مطابق ذکر کیا ہے لیکن درست یہ ہے کہ وہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے ساتھ ہیں، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ امام ترمذیؒ کا قول نقل کرکے فرماتے ہیں: "والنقل فی هذا عن الشافعی غریب بل الحدیث عندهم محمول علی الشروط التی لا تنافی مقتضی النکاح بل تکون من مقتضیاته ومقاصده[1]" علامہ نوویؒ[2] اور علامہ ابن قدامہؒ[3] نے بھی امام شافعیؒ کا مسلک امام ابوحنیفہؒ کے مطابق ذکر کیا ہے۔

امام احمدؒ حدیثِ باب سے استدلال کرتے ہیں، جبکہ حنفیہ کہتے ہیں کہ مقتضاءِ عقد کے خلاف شروط کو پورا کرنا تو آپ کے نزدیک بھی لازم نہیں اور جن شروط کا عقد تقاضا کرتا ہو وہ سب کے نزدیک لازم ہیں اور ان کے علاوہ جو شروط ہیں ان کا پورا کرنا دیانۃً ہمارے نزدیک بھی ضروری ہے، اس لئے کہ مؤمن کی شان یہی ہے کہ وعدہ کرے تو پورا کرے اور فرمانِ باری تعالیٰ[4] "وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا" کا تقاضا بھی یہی ہے لیکن اگر کوئی ان شروط کو پورا نہ کرے تو نکاح کے لئے مضر ہوگا یا نہیں حدیثِ باب اس سے ساکت ہے لہٰذا یہ روایت ہمارے خلاف حجت نہیں[5]۔ واللہ اعلم

شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ

باب ما جاء فی الرجل یسلم وعنده عشر نسوة

عن[6] ابن عمرؓ أن غیلان بن سلمة الثقفی أسلم وله عشر نسوة فی الجاهلیة فأسلمن معه، فأمره النبی صلی اللہ علیہ وسلم أن یتخیر أربعًا منهن۔

---

[1] فتح الباری (ج ۹ ص۱۸۱) باب الشروط فی النکاح ۱۲م

[2] شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۵۵) باب الوفاء بالشروط فی النکاح ۱۲م

[3] المغنی (ج ۶ ص۵۴۹) مسألۃ قال: وإذا تزوجها وشرط لها أن لا یخرجها الخ ۱۲م

[4] سورہ اسراء آیت ۳۴ پ ۱۵ ۱۲م

[5] اس باب سے متعلقہ شرح کے لئے مذکورہ بالا کتبِ حدیث وفقہ کے علاوہ دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۲۰ ص۱۴۰) باب الشروط فی النکاح۔ اور گوہر محمودی (افاداتِ شیخ الهندؒ ص۲۰۱) ۱۲ مرتب

[6] الحدیث أخرجه ابن ماجه فی سننه (ص۱۴۱) باب الرجل یسلم وعنده أکثر من أربع نسوة - ۱۲م

اس حدیث سے استدلال کرکے ائمہ ثلاثہؒ یہ کہتے ہیں کہ "کثیر الازواج کافر" اگر اسلام لائے تو ان میں سے چار کا انتخاب کرکے بقیہ کو جدا کردے[1]، جبکہ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک انتخاب کا حق نہیں بلکہ جن چار بیویوں سے پہلے نکاح کیا ہوگا ان کا نکاح برقرار رہے گا[2] بقیہ کا خود بخود فسخ ہو جائے گا۔

امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کی بنیاد ابراہیم نخعیؒ کے قول پر ہے[3] اور حدیثِ باب کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اس میں "تخییر" سے اختیار مراد نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس کے پاس کل چار عورتیں باقی رہیں گی[4]۔

اگرچہ شیخینؒ کا مسلک اوفق بالقیاس ہے لیکن ائمہ ثلاثہؒ کا مسلک اوفق بالحدیث ہے اور بلاشبہ حدیثِ باب کے ظاہر سے ائمہ ثلاثہؒ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے[5]۔ امام ابو حنیفہؒ کی جانب سے اس کا کوئی تسلی بخش جواب نظر سے نہیں گذرا، نیز حدیث باب کے علاوہ بعض دوسری روایات[6] سے بھی ائمہ ثلاثہؒ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے، شاید اسی لئے امام محمدؒ نے بھی اس مسئلہ میں

---

[1] یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ یہ ازواج اپنے زمانۂ عدت میں اسلام لے آئیں یا یہ "ازواج" اہل کتاب میں سے ہوں ورنہ بصورتِ دیگر اختلافِ دین کی وجہ سے خود بخود نکاح ختم ہو جائیگا، دیکھئے المغنی (ج ۶ ص ۶۲۱) لونکح أکثر من أربع ۱۲ مرتب

[2] ان چار کا بھی نکاح جب برقرار رہیگا جب "ازواج" کے ساتھ نکاح متفرق عقود میں ہوا ہو لیکن اگر ایک ہی عقد میں جملہ ازواج سے نکاح ہوا تھا تو ان چار سمیت تمام ازواج کا نکاح فسخ ہو جائیگا کما هو مصرح في المغني (ج ۶ ص ۶۲۱) وراجع لتفصيل هذه المسألة والمبسوط للسرخسي (ج ۵ ص ۵۳ و ۵۴) باب نکاح اهل الحرب ۱۲ مرتب

[3] موطأ امام محمدؒ (ص ۲۴۵) باب الرجل يكون عنده أكثر من أربع نسوة فيريد أن يتزوج - ۱۲ م

[4] بعض روایات میں "تخییر" کے بجائے "أمسك منهن أربعا" کے الفاظ آئے ہیں کما فی موطأ امام محمد (ص ۲۴۴) اور بعض میں "خذ منهن أربعا" کے الفاظ آئے ہیں کما فی رواية الدارقطني (ج ۳ ص ۲۶۹، رقم ۹۴) باب المهر ۱۲ مرتب

[5] بلکہ سنن دارقطنی (ج ۳ ص ۲۷۱، رقم ۱۰۱) میں قیس بن الحارث کی ایک روایت انتخاب کا حق ملنے کے بارے میں اس اعتبار سے زیادہ صریح ہے کہ اس میں حدیثِ باب کا مذکورہ بالا جواب بھی نہیں چل سکتا، فرماتے ہیں: "أن رجلا من بني أسد أسلم وعنده ثمان نسوة، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: اختر منهن أربعا" فجعل يقول: أقبلي يا فلان مرتين، أدبري يا فلانة، أدبري يا فلانة، ۱۲ مرتب

[6] دیکھئے سنن دارقطنی (ج ۳ ص ۲۶۹ تا ص ۲۷۳، رقم ۹۳ تا ۱۰۴) ۱۲ م

ائمہ ثلاثہؒ کا مسلک اختیار کیا ہے[1] اور سفیان ثوریؒ کا بھی یہی مسلک ہے[2]۔

سمعت محمد بن اسماعیل یقول : " ھذا حدیث غیر محفوظ " الخ

امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ غیلان بن سلمہؓ کی مذکورہ حدیث باب جو معمرؒ نے زھری عن سالم بن عبداللہ عن ابن عمرؓ " کی سند سے ذکر کی ہے یہ روایت اس سند سے مروی نہیں بلکہ دراصل یہ روایت " زھری قال : حُدِّثت عن محمد بن سوید الثقفی " کے طریق سے مروی ہے " کما روی شعیب بن ابی حمزۃ وغیرہ عن الزھری " معمرؒ نے مذکورہ روایت کی جو سند ذکر کی ہے وہ دراصل غیلان بن سلمہؓ ہی کے دوسرے واقعہ کی ہے " ان رجلاً من ثقیف طلق نساءہ ، فقال لہ عمر : لتراجعن نساءك أو لأرجمن قبرك كما رجم قبر أبي رغال[3] "

---

[1] موطا امام محمدؒ (ص۲۴۴) ۱۲ م

[2] کما فی المغنی (ج ۶ ص۶۱۵) ۱۲ م

[3] لیکن مسند احمد (ج ۲ ص۱۴ مسند عبداللہ بن عمرؓ) میں روایت اس طرح آئی ہے " حدثنا عبداللہ حدثنی أبی ، ثنا اسماعیل ومحمد بن جعفر قالا : ثنا معمر عن الزھری ، قال ابن جعفر فی حدیثہ : أنا ابن شھاب عن سالم ، عن ابیہ أن غیلان ابن سلمۃ الثقفی اسلم وتحتہ عشر نسوۃ ، فقال لہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم : اختر منھن أربعا ، فلما کان فی عھد عمر طلق نساءہ وقسم مالہ بین بنیہ ، فبلغ ذلك عمر ، فقال : إنی لأظن الشیطان فیما یسترق من السمع سمع بموتك فقذفہ فی نفسك ، ولعلك أن لا تمكث (وفی التلخیص (ج ۳ ص۱۶۹) نقلاً عن مسند وأعلمك أنك لا تمكث) إلا قلیلاً ، وایم اللہ لتراجعن نساءك ولترجعن فی مالك أو لأورثھن منك ، ولآمرن بقبرك فیرجم كما رجم قبر أبي رغال۔

اس سے معلوم ہوا کہ معمر " زھری عن سالم عن أبیہ " کی سند سے غیلان بن سلمہؓ کے دونوں واقعوں کے راوی ہیں ، لہٰذا معمر کی طرف خطا کی نسبت مشکل ہے ، سنن دارقطنی (ج ۳ ص۲۷۱ تا ص۲۷۳ ، رقم ۱۰۱) باب المہر میں یہ روایت " ایوب عن نافع وسالم عن ابن عمرؓ کی طریق سے آئی ہے اس میں بھی دونوں واقعوں کا ذکر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یحییٰ بن سعید القطان نے معمر کی روایت کو درست قرار دیا ہے ، تفصیل کے لئے دیکھئے تعلیقات الشیخ أحمد محمد شاکر علی المسند للإمام أحمد (ج ۶ ص۲۷۷ و ۲۷۸) اور التلخیص الحبیر (ج ۳ ص۱۶۸ تا ۱۷۰ ، رقم ۱۵۲۶) باب موانع النکاح ۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ

فقال له عمر : " لتراجعن نساءك " غیلان بن سلمہ ثقفی رضؓ کی طلاق چونکہ طلاق "فار"[1] کے درجہ میں تھی جو ممنوع ہے اس لئے حضرت عمرؓ نے سخت تنبیہ فرمائی، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے مواقع پر امام کو چاہیئے کہ وہ تنبیہ کرتا رہے۔

" أو لأرجمنّ[2] قبرك كما رجم قبر أبي رغال " ابو رغال کی تشریح میں مختلف اقوال ہیں[3]، راجح قول[4] یہ ہے کہ ابو رغال قوم ثمود کا ایک فرد تھا جس وقت قوم ثمود پر عذاب آیا اس وقت اس کو

---

[1] هو أن يطلق امرأته طلاقاً بائناً في مرض موته بغير رضاها ثم تموت وهي في العدة ۔ القاموس الفقهي لغة واصطلاحاً (ص۲۳۱) ۱۲ م

[2] ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں : ولأمرن بقبرك فيرجم الخ جیسا کہ پیچھے حاشیہ میں یہ روایت گذر چکی ہے۔ ۱۲ م

[3] جن میں سے چند درج ذیل ہیں :

(۱) یہ حضرت شعیب علیہ السلام کا غلام تھا اور عشر وغیرہ لینے پر مقرر تھا اور اس کی وصول یابی میں لوگوں پر ظلم کیا کرتا تھا۔

صاحب "قاموس" نے اس قول کو "ابن سیدہ" کی طرف منسوب کیا ہے اور اسے "غیر جید" قرار دیکر رد کیا ہے۔

(۲) ابرہہ (جو شاہِ حبشہ کی جانب سے یمن کا حاکم تھا) کی قیادت میں جو لشکر بیت اللہ شریف کو ڈھا دینے کے ناپاک ارادے سے آیا تھا ابو رغال اس کا رہبر تھا، ابو رغال راستہ میں مر گیا تھا۔

صاحبؒ "قاموس" نے اس قول کو جوہری کی طرف منسوب کرتے ہوئے اس کو بھی رد کیا ہے۔

(۳) ابو رغال جس کا نام زید بن مخلف تھا یہ حضرت صالح علیہ السلام کا غلام تھا، انہوں نے اس کو "مصدق" بنا کر بھیجا تھا، یہ صدقات وغیرہ وصول کرنے کے لئے ایک ایسی قوم کے پاس پہنچا جن کے پاس دودھ دینے والی صرف ایک ہی بکری تھی، قوم میں ایک بچہ ایسا تھا جس کی ماں مر چکی تھی لوگ اس بکری کے دودھ سے اس بچہ کی پرورش کر رہے تھے، ابو رغال نے اسی بکری کے لینے پر اصرار کیا جبکہ لوگ اس بچہ کی وجہ سے وہ بکری دینا نہ چاہتے تھے، کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر ابو رغال پر آسمان سے عذاب نازل ہوا اور وہ ہلاک ہو گیا، ایک قول یہ ہے کہ خود بکری کے مالک نے اسے قتل کر دیا، حضرت صالح علیہ السلام کو جب اس کے بارے میں پتہ چلا تو آپ نے اس پر لعنت بھیجی۔ دیکھئے لسان العرب (ج ۱۱ ص ۲۹۱) تحت کلمۃ " رغل " اور القاموس المحیط (ج ۳ ص ۳۸۵ و ۳۸۶) تحت کلمۃ "الرغل" بالضم ۱۲ مرتب عفی عنہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

عذاب سے اس لئے مستثنیٰ کر دیا گیا کہ یہ حرم کی حفاظت کرتا تھا، بعد میں جب یہ وہاں سے چلا آیا تو اس پر بھی وہی عذاب نازل ہوا جو اس کی قوم پر نازل ہوا تھا اور یہ طائف کے قریب دفن کیا گیا، لوگ اس کی قبر پر پتھر مارا کرتے تھے [۱]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ اگر تم نے اپنی ازواج کی طرف رجوع نہ کیا تو میں تمہیں سخت سزا دوں گا اور تمہارا انجام ایسا ہی عبرت ناک ہوگا جیسا ابورغال کا ہوا۔

نیز لغت میں "رجم القبر" علامت کے طور پر قبر پر پتھر لگانے کے معنی میں بھی آتا ہے [۲]، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ میں تمہاری قبر پر علامت لگوا دوں گا تاکہ لوگ جان لیں کہ یہ اس شخص کی قبر ہے جس نے اپنی بیویوں پر ظلم کیا تھا۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی الرجل یسبی الأمة ولها زوج هل يحل له ان يطأها

عن [۳] أبي سعيد الخدري قال أصبنا سبايا يوم أوطاس ولهن أزواج في

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

[۳] سنن ابی داود (ج ۲ ص ۴۳۳، کتاب الخراج الخ، باب نبش القبور العادية) میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے یہ جواب متعین ہو جاتا ہے، فرماتے ہیں: "سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول حين خرجنا معه إلى الطائف فمررنا بقبر، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: هذا قبر أبي رغال وكان بهذا الحرم يدفع عنه، فلما خرج أصابته النقمة التي اصابت قومه بهذا المكان، فدفن فيه، وآية ذلك أنه دفن معه غصن من ذهب، إن انتم نبشتم عنه أصبتموه معه، فابتدره الناس فاستخرجوا الغصن" ۱۲ مرتب۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ هذا)

[۱] مشہور شاعر جریر کہتا ہے ؎ اذا مات الفرزدق فارجموه كما ترمون قبر أبي رغال
لسان العرب (ج ۱۱ ص ۲۹۱) ۱۲ مرتب

[۲] كما في لسان العرب (ج ۱۲ ص ۲۲۸) ۱۲ م

[۳] الحديث أخرجه مسلم (ج ۱ ص ۴۷۰) باب جواز وطئ المسبية بعد الاستبراء، وإن كان لها زوج انفسخ نكاحه بالسبي - كتاب الرضاع - وأبوداود (ج ۱ ص ۲۹۳) باب في وطئ السبايا، كتاب النكاح ۱۲ م

قومهن، فذكروا ذلك لرسول الله صلى الله عليه وسلم، فنزلت : وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ »۔

یہ بات متفق علیہ ہے کہ " ذوات الازواج " جب اپنے شوہروں کے بغیر گرفتار کی جائیں تو اپنے ازواج سے ان کا نکاح ختم ہوجاتا ہے[1]، اور مالک کے لئے ان سے صحبت کرنا حلال ہوجاتا ہے۔

لیکن پھر سبب فسخِ نکاح میں اختلاف ہے :

ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک سببِ فسخ " سبی " یعنی گرفتار کرلینا ہے، جبکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سببِ فسخ " اختلافِ دارین " ہے[2]۔

ان حضرات کا استدلال حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے ہے کہ غزوۂ اوطاس کے موقع پر جو عورتیں گرفتار کی گئی تھیں ان کے شوہران کے ساتھ تھے اس لئے " تباینِ دارین " نہ ہوا تھا[3]۔

---

[1] البتہ وثنیہ کا نکاح عطاءؒ اور عمرو بن دینارؒ کے نزدیک ایسی صورت میں ختم نہ ہوگا (جب وثنیہ کا یہ حکم ہے تو مجوسیہ کا بھی یہی حکم ہوگا) دیکھئے عارضۃ الاحوذی (ج ۵ ص ۶۶) ۱۲ مرتب

[2] ھدایہ مع فتح القدیر (ج ۳ ص ۲۹۱) باب نکاح أھل الشرک۔

مذکورہ اختلاف پر یہ اختلاف بھی متفرع ہوتا ہے کہ زوجین اگر ایک ساتھ گرفتار کئے جائیں تو ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک نکاح فسخ ہوجائے گا اس لئے کہ سببِ فسخ یعنی " سبی " کا تحقق ہوگیا،

جبکہ احناف کے نزدیک نکاح برقرار رہے گا اس لئے کہ " تباینِ دارین " نہیں پایا گیا۔

ان کے مقابلہ میں اوزاعیؒ اور لیث بن سعدؒ کا مسلک یہ ہے کہ اس صورت میں " زوجین " جب مالِ غنیمت کے طور پر تقسیم کردئے گئے اس وقت تو نکاح برقرار رہے گا البتہ مالک کے فروخت کردینے کی صورت میں مشتری کو اختیار ہوگا کہ خواہ ان کے نکاح کو برقرار رکھے یا چاہے تو دونوں کے درمیان تفریق کرکے اس کو اپنے لئے مخصوص کرلے یا کسی دوسرے کے ساتھ نکاح کردے، آخری دونوں صورتوں میں استبراء بحیضۃ ضروری ہے۔

دیکھئے احکام القرآن للجصاص (ج ۲ ص ۱۳۷) باب تحریم نکاح ذوات الازواج، مطلب فی حکم الزوجین الحربیین اذا سبیا معًا ۱۲ مرتب عفی عنہ

[3] فتح القدیر (ج ۳ ص ۲۹۲) ۱۲ م

غالباً ان حضرات کا استدلال "مسلم" کی روایت ملحوظ رکھتے ہوئے ہے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں "أصابوا سبیاً یوم أوطاس لهن أزواج، فتخوفوا، فانزلت هذه الآیة، وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ"

لیکن حضرت ابوسعید خدریؓ کی ترمذی والی حدیثِ باب سے حنفیہ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے اس لئے کہ اس میں یہ الفاظ آئے ہیں "ولهن ازواج فی قومهن" جس سے مترشح ہے کہ وہ ازواج ان "سبایا" کے ساتھ نہ تھے[2]۔

اس کے علاوہ ابوبکر جصاصؒ نے محمد بن علی کی روایت "قال: لما کان یوم أوطاس لحقت الرجال بالجبال وأخذت النساء، فقال المسلمون: کیف نصنع ولهن أزواج؟ فأنزل الله تعالیٰ: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ" سے اس پر استدلال کیا ہے کہ وہ عورتیں بغیر ازواج کے گرفتار کی گئی تھیں لہٰذا "تباینِ دارین" متحقق ہوگیا تھا[3]۔ واللہ اعلم

تم شرح الباب بتغیر و زیادة من المرتب[4]۔

باب[5] ماجاء فی کراهیة مهر البغی

"عن[6] أبی مسعود الأنصاری قال: نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن ثمن الکلب"

ثمن کلب سے متعلق تفصیلی بحث ان شاء اللہ تعالیٰ ابواب البیوع، باب ماجاء فی ثمن الکلب کے تحت آئے گی۔

"ومهر البغی" بغی بکسر الغین بروزن "قوی" زانیہ کے معنی میں ہے، اس کی جمع "بغایا"

---

[1] حوالہ پیچھے حاشیہ میں گذر گیا ۱۲ مرتب

[2] چنانچہ شیخ ابن ہمامؒ نے ترمذی کی روایت کے الفاظ کو حنفیہ کی تائید میں پیش کیا ہے، دیکھئے فتح القدیر (ج ۳ ص ۲۹۲) ۱۲ م

[3] احکام القرآن للجصاص (ج ۲ ص ۱۳۷) باب تحریم نکاح ذوات الأزواج۔ وراجع للتفصیل، وتکملة فتح الملهم (ج ۱ ص ۶۳ تا ۶۵) باب جواز وطء المسبیة الخ ۱۲ م

[4] شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲ م

[5] الحدیث أخرجه البخاری (ج ۱ ص ۲۹۸) کتاب البیوع، باب ثمن الکلب ومسلم (ج ۲ ص ۱۹) کتاب المساقاة والمزارعة، باب تحریم ثمن الکلب الخ ۱۲ م

آتی ہے، "بَغِی" بسکون الغین وتخفیف الیاء۔ زنا کے معنی میں آتا ہے۔

مہر البغی سے مراد اجرتِ زنا ہے اور اس اجرت پر مہر کا اطلاق مجازاً ہے[۱]۔ "مہر بغی" کا حرام ہونا ظاہر اور متفق علیہ ہے[۲]۔

" وحلوان الکاھن[۳] " یعنی " أجرۃ الکاھن " حلوان کا لفظ اگر مطلق بھی بولا جائے تو اس سے " اجرۃ الکاھن " مراد ہوتی ہے[۴]۔

اہل عرب کاھن کا اطلاق ہر اس شخص پر کرتے ہیں جو غیب کی خبریں جاننے کا دعویٰ کرتا ہو۔

" کاھن " اور " عرّاف " میں فرق یہ ہے کہ کاھن مستقبل سے متعلق خبریں دیتا ہے اور عرّاف " مستور موجود " کے بارے میں بتلاتا ہے جیسے گشدہ سامان اور شئ مسروق کے بارے میں بتلانا، کبھی عرّاف کو بھی کاھن کہدیا جاتا ہے[۵]۔

حدیثِ باب کی رو سے کہانت کی اجرت بھی حرام ہے جو متفق علیہ ہے[۶]۔ واللہ اعلم

شرحِ باب از مرتب

---

[۱] عمدۃ القاری (ج ۱۲ ص ۵۸) باب ثمن الکلب، کتاب البیوع ۱۲ م

[۲] شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۲ ص ۱۹) ۱۲ م

[۳] حلوان غفران کی طرح مصدر ہے، یہ حلاوۃ سے ماخوذ ہے، اس کا نون زائد ہے، کہا جاتا ہے: حلوتُه، یعنی أطعمتہ الحلو۔

کاھن کی اجرت پر حلوان کا اطلاق اس لئے ہے کہ وہ اس کو سہولت کے ساتھ بغیر کسی مشقت کے حاصل ہو جاتی ہے۔

لفظ حلوان رشوت کے معنی میں بھی آتا ہے، نیز اس کے ایک معنی " أخذ الرجل مھر ابنتہ لنفسہ " کے بھی آتے ہیں۔ دیکھئے النھایہ (ج ۱ ص ۴۳۵) اور فتح الباری (ج ۴ ص ۴۲۷) ۱۲ مرتب عفی عنہ

[۴] البتہ ابو علی فرماتے ہیں کہ حلوان کا اطلاق کبھی محض اجرت کے معنی میں بھی ہو جاتا ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے تکملہ فتح الملہم (ج ۱ ص ۵۳۲) ۱۲ م

[۵] دیکھئے شرح نووی علی مسلم (ج ۲ ص ۱۹) اور فتح الباری (ج ۱۰ ص ۲۱۶ و ۲۱۷) کتاب الطب، باب الکہانۃ ۱۲ م

[۶] شرح نووی (ج ۲ ص ۱۹) ۱۲ م

باب ماجاء أن لا يخطب الرجل على خطبة أخيه

عن أبي هريرةؓ ..... لا يبيع الرجل على بيع أخيه ۔ "بیع علی بیع اخیہ" کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کوئی سامان خریدے اور اپنے لئے "خیار" رکھ لے، پھر کوئی آدمی اس مشتری سے کہے کہ شراء کے اس معاملہ کو ختم کردو، میں تمہیں یہی چیز (یعنی اس کی نظیر) اس سے کم پیسوں میں دیدوں گا۔

اسی کے مثل ایک دوسری صورت ہے یعنی "شراء علی شراء اخیہ" اس کی صورت یہ ہے کہ خیارِ شرط بائع کو حاصل ہو، اب کوئی دوسرا آدمی بائع سے کہے کہ اس بیع کو ختم کردو، میں وہی چیز تم سے زائد ثمن دے کر خرید لیتا ہوں۔

یہ دونوں صورتیں حدیثِ باب کی رُو سے ممنوع ہیں۔

ایک اور صورت "سوم علی سوم اخیہ" کی ہے کہ بائع اور مشتری کسی ثمن پر متفق ہو جائیں اور بیع کی طرف مائل ہو جائیں، اتنے میں کوئی تیسرا آدمی آکر بائع سے کہے کہ تم سے یہ چیز میں خرید لیتا ہوں، یہ صورت بھی حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع روایت "أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نهى أن يستام الرجل على سوم أخيه[۲]" کی رُو سے ممنوع ہے[۳]۔

بعض[۴] کے نزدیک حدیثِ باب میں "بیع علیٰ بیع أخیہ" سے "سوم علی سوم اخیہ" مراد ہے[۵]

[۱] الحديث أخرجه البخاري في صحيحه (ج ۱ ص۲۸۷) كتاب البيوع، باب لا يبيع على بيع اخيه الخ ومسلم (ج ۱ ص۴۵۴) كتاب النكاح، باب تحريم الخِطبة على خِطبة أخيه الخ ۱۲ م

[۲] صحيح مسلم (ج ۲ ص۳) كتاب البيوع باب تحريم بيع الرجل على بيع أخيه الخ ۱۲ م

[۳] تفصیل کے لئے دیکھئے تکملہ فتح الملہم (ج ۱ ص۳۲۳ تا ۳۲۵) ۱۲ م

[۴] چنانچہ صاحب عارضۃ الاحوذی فرماتے ہیں کہ بیع سے مراد "سوم" ہے "لأن البيع لو تم لم يتصور آخر غيره- دیکھئے (ج ۵ ص۳)۔

لیکن یہ دلیل وزنی نہیں اور "بیع علی بیع أخیہ" خیارِ شرط کے ساتھ ممکن ہے جیسا کہ اس کی صورت کا ذکر تقریر میں آچکا ہے ۱۲ مرتب

[۵] باب کے شروع سے یہاں تک کی شرح مرتب کا اضافہ ہے ۱۲ م

" ولا یخطب علی خطبۃ أخیہ " یہ ممانعت اس صورت میں ہے جب عورت کا میلان دوسرے کی طرف ظاہر ہوگیا ہو، لیکن اگر کسی کی طرف اس کا میلان نہ ہوا ہو تو خِطبہ علی الخِطبہ جائز ہے جیساکہ فاطمہ بنت قیسؓ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے جو امام ترمذیؒ نے اسی باب میں ذکر کی ہے۔[۱]

" و أمّا معاویۃ فصعلوك لامال له " صعلوک فقیر کو کہتے ہیں[۲] جیساکہ یہ مفہوم خود روایت کے الفاظ سے بھی واضح ہے۔

---

[۱] مخطوبہ کی تین حالتیں ہیں:

(۱) خاطب کے پیغام کو خود قبول کرے یا ولی کو قبول کرنے یا نکاح کردینے کی اجازت دیدے

اس صورت میں خِطبہ علی الخِطبہ بالاتفاق ناجائز ہے، لأنّ فی ذلك إفساداً علی الخاطب الأوّل و إیقاع العداوۃ بین الناس۔

(۲) خاطب کے پیغام کو رد کردے یا اس کی طرف مائل نہ ہو۔

اس صورت میں خِطبہ علی الخِطبہ بالاتفاق جائز ہے۔

(۳) خاطب کے پیغام کی طرف اشارۃً میلان ظاہر کردے۔

اس تیسری صورت کے بارے میں اختلاف ہے،

امام شافعیؒ کی اس صورت میں دو روایتیں ہیں، ایک یہ کہ اس صورت میں بھی خِطبہ کی ممانعت ہے کما نقل الترمذی فی الباب، جبکہ ان کی دوسری روایت اس صورت میں حلت کی ہے، علامہ نوویؒ نے اس روایت کو اصح قرار دیا ہے۔

قاضی عیاضؒ نے اس صورت میں اباحتِ خطبہ کو ظاہر کلام احمدؒ قرار دیا ہے، جبکہ علامہ ابن قدامہؒ نے اس صورت میں بھی ممانعت کو امام احمدؒ کا ظاہر کلام قرار دیا ہے۔

جبکہ حنفیہ اور مالکیہ کا مسلک یہ نقل کیا گیا ہے کہ اجابت بالتعریض کی صورت میں خِطبہ علی خِطبۃ اخیہ کا جواز ہے، مثلاً عورت خاطب سے کہے " لا رغبۃ عنك "

دیکھئے المغنی (ج ۶ ص۶۰۴ تا ۶۰۶، من خطب امرأۃ فلم تسکن الیہ) شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ا ص۴۵۴، باب تحریم الخطبۃ الخ) اور فتح الباری (ج ۹ ص۱۹۹، باب لایخطب الخ)

جہاں تک " ولا یخطب علی خِطبۃ أخیہ " کے تحت حضرت استاذِ محترم دام اقبالہم کی مذکورہ تشریح کا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پھر جس سے نکاح کے سلسلہ میں مشورہ کیا جارہا ہو تو اس کو چاہئے کہ جس بات کو درست سمجھتا ہو اسے دیانت کے ساتھ ظاہر کر دے اگرچہ اس میں متعلقہ شخص کی غیبت اور اس کے عیب کا اظہار ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ یہ بات فاطمہ بنت قیسؓ کی روایت سے مترشح ہے۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی العزل

عن جابرؓ قال: قلنا: یا رسول اللہ، إنا کنا نعزل فزعمت الیہود أنہا الموءودة الصغریٰ، فقال: کذبت الیہود، إن اللہ إذا أراد أن یخلقہ فلم یمنعہ۔

عزل کے بارے میں احادیث مختلف ہیں،

بعض روایات سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے، مثلاً حضرت جابرؓ کی مذکورہ حدیث، اور حضرت جابرؓ ہی کی دوسری حدیثِ باب "قال: کنا نعزل والقرآن ینزل"[1]

اور بعض روایات سے اس کا عدمِ جواز معلوم ہوتا ہے، مثلاً صحیح مسلم میں حضرت جذامہ بنت وہب اسدیؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عزل کے بارے میں فرمایا "ذلك الوأد الخفي"[2]

اور بعض روایات سے اس عمل کا بے فائدہ ہونا معلوم ہوتا ہے، چنانچہ اگلے باب (فی کراهية العزل) میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت میں عزل کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ آئے ہیں "لِمَ یفعل ذٰلك أحدکم؟" نیز ان کی ہی ایک روایت میں آپؐ کے یہ الفاظ آئے ہیں "لا علیکم أن لا تفعلوا ما کتب اللہ خلق نسمة هی کائنة

بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ

تعلق ہے وہ امام ترمذیؒ کے کلام سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے جو انہوں نے امام شافعیؒ کے قول کے طور پر ذکر کی ہے، حنفیہ کی نسبت سے یہ بات احقر کو تلاش کے باوجود نہ مل سکی واللہ اعلم ۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ

[1] مجمع بحار الانوار (ج ۳ ص ۳۲۳) ۱۲ م

(حاشیہ صفحۂ ھذا)

[1] لم یخرجہ أحد من أصحاب الکتب الستة سوی الترمذی، قالہ الشیخ محمد فؤاد عبد الباقیؒ، سنن ترمذی (ج ۳ ص ۴۴۲) ۱۲ م

[2] أخرجہ الشیخانؒ، أنظر الصحیح للبخاری (ج ۲ ص ۷۸۴) باب العزل، والصحیح لمسلم (ج ۱ ص ۴۶۵) باب حکم العزل ۱۲

[3] (ج ۱ ص ۴۶۶) ۱۲ م

إلى يوم القيامة إلا ستكون[1]۔

ان روایات میں تطبیق اس طرح ہے کہ عزل اگر کسی غرضِ صحیح سے ہو تو جائز ہے، حرّہ کے ساتھ اس کی اجازت[2] سے، اس لئے کہ وطی اس کا حق ہے اور باندی کے ساتھ[3] مطلقاً، احادیث جواز اسی صورت پر محمول ہیں، لیکن یہ اس وقت ہے جب کوئی شخص اس کام کو انفرادی طور پر انجام دے، اور اگر کسی شخص کی عزل سے غرض فاسد ہو، مثلاً مفلسی کا اندیشہ یا لڑکی ہونے سے بدنامی کا خیال تو ایسی صورت میں عزل ناجائز ہے، روایاتِ ممانعت اسی پر محمول ہیں[4]۔

ضبطِ ولادت یا خاندانی منصوبہ بندی

ہمارے زمانہ میں خاندانی منصوبہ بندی یا "برتھ کنٹرول" کے نام سے جو تحریک چلی ہے اس کے عدم جواز میں شبہ نہیں، اول تو اس لئے کہ ضبطِ ولادت کی اجازت جن مقامات پر ثابت ہے ان کا حاصل انفرادی طور پر ضبطِ ولادت کرنا ہے لیکن اس کو ایک عام عالمگیر تحریک بنا لینا درست نہیں، دوسرے اس تحریک کی غرض بھی فاسد ہے کیونکہ اس کا منشا "خشیتِ إملاق" ہے اور یہ منشا بنصِ قرآنی فاسد ہے چنانچہ ارشاد ہے "وَلَا تَقْتُلُوٓا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ[5]" اس میں یہ سمجھنا غلط ہے کہ یہ حکم قتلِ اولاد کے ساتھ ہی مخصوص ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے "خشیۃ إملاق" کے الفاظ سے اس فعل کی شناعت کا ایک عام حکم بھی بیان فرما دیا ہے،

---

[1] مسلم (ج ۱ ص۴۶۶) ۱۲ م

[2] جیساکہ مسند احمد (ج ۱ ص۳۱، مسند عمر بن الخطابؓ) میں حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے حضرت عمرؓ سے نقل کی ہے "أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نهى عن العزل عن الحرة إلا بإذنها" نیز دیکھئے سنن ابن ماجہ (ص۱۳۸) باب العزل اور سنن بیہقی (ج ۷، ص۲۳۱) باب من قال یعزل عن الحرة بإذنها الخ ۱۲ مرتب

[3] چنانچہ مسلم (ج ۱ ص۴۶۵) میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے جس میں وہ باندی کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں "أعزل عنها إن شئت فإنه سيأتيها ما قدر لها" ۱۲ مرتب

[4] پھر روایات میں عقیدہ میں پختگی کا یہ درس بھی دیا گیا ہے کہ غرض صحیح ہو یا فاسد، اللہ تعالیٰ جس جان کو پیدا کرنا چاہیں گے وہ پیدا ہو کر رہے گی جیساکہ "ما كتب الله خلق نسمة هي كائنة إلى يوم القيامة إلا ستكون" وغیرہ الفاظ سے واضح ہے ۱۲ مرتب

[5] سورۃ الاسراء، آیت ۳۱ پ ۱۵ ۱۲ م

کہ ہر وہ عمل جس سے بخوفِ مفلسی تحدیدِ نسل ہوتی ہو وہ ناجائز ہے۔

دراصل یہ تحریک باری تعالیٰ کے نظامِ ربوبیت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے مترادف ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا"[1] اور قانونِ قدرت یہ ہے کہ ہر زمانہ میں پیداوار کی مقدار اس دور کی ضروریات کے مطابق ہوتی ہے، مثلاً پرانے زمانے میں تمام سفر گھوڑوں وغیرہ پر ہوتے تھے، اس دور میں اس قسم کے سفر میں کام آنے والے جانوروں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی اور اب چونکہ سفر دوسری گاڑیوں پر ہونے لگے ان کی نسل بھی کم ہوگئی، اسی طرح پہلے زمانہ میں پٹرول وغیرہ کی ضروریات محدود تھیں مثلاً اس کا استعمال خارش زدہ اونٹ کے جسم پر بطور علاج کیا جاتا تھا اس دور میں اس کی پیداوار بھی کم تھی اور اب تمام زندگی پٹرول کے گرد گھوم رہی ہے تو زمین نے بھی اس کے خزانے اُگل دیئے ہیں، اسی حقیقت کو اللہ جل شانہ نے اس آیت میں واضح فرمایا ہے "وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ"[2] اور "اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ"[3] نیز ارشاد ہے "وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَلٰكِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ"[4]

تاریخ اس کی گواہ ہے کہ ضروریات کے مطابق وسائل کی پیداوار کا نظام قدرت ہی کی طرف سے ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ضبطِ ولادت کی یہ تحریک کسی بھی معقول بنیاد پر قائم نہیں بلکہ محض ایک سیاسی فریب ہے۔

اب تو رفتہ رفتہ ماہرینِ معاشیات بھی اسی نتیجہ کی طرف آرہے ہیں کہ خاندانی منصوبہ بندی کی یہ تحریک نہایت مضرت رساں ہے اور معاشی طور پر اس کی کوئی ضرورت نہیں، اس مسئلہ کی مزید تفصیل احقر کے رسالہ "ضبطِ ولادت کی عقلی اور شرعی حیثیت"[5] میں موجود ہے۔

واللہ أعلم

---

[1] سورۂ ہود آیت ۶ پ ۱۲ ۱۲ م

[2] سورۂ حجر آیت ۲۱ پ ۱۴ ۱۲ م

[3] سورۂ قمر آیت ۴۹ پ ۲۷ ۱۲ م

[4] سورۂ شوریٰ آیت ۲۷ پ ۲۵ ۱۲ م

[5] یہ رسالہ دارالاشاعت کراچی سے شائع ہوچکا ہے، اس کے دو حصے ہیں، ایک "ضبطِ ولادت کی شرعی حیثیت" یہ حصہ حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا تالیف کردہ ہے، دوسرا حصہ "ضبطِ ولادت کی عقلی واقتصادی حیثیت" جو حضرت استاذ دام اقبالہم کا تحریر کردہ ہے اور رسالہ کا بیشتر حصہ اسی پر مشتمل ہے ۱۲ مرتب

باب ماجاء فی القسمۃ للبکر والثیّب

عن ابی قلابة عن انس بن مالکؓ قال لو شئت ان اقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولکنہ قال: السنة إذا تزوج الرجل البکر علی امرأتہ "اقام عندھا سبعاً" وإذا تزوج الثیب علی امرأتہ اقام عندھا ثلاثاً۔

اس حدیث کی بناء پر ائمہ ثلاثہؒ امام اسحاقؒ اور ابوثورؒ وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ دوسرا نکاح کرنے والا نئی بیوی کے پاس اگر وہ باکرہ ہو تو سات دن اور اگر ثیبہ ہو تو تین دن ٹھہر سکتا ہے اور یہ مدت باری سے خارج ہوگی[۲]

جبکہ امام ابوحنیفہؒ، حمادؒ وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ یہ ایام قسم سے خارج نہیں بلکہ یہ بھی باری میں محسوب ہوں گے[۳]

امام ابوحنیفہؒ کا استدلال ان آیات سے ہے جن میں قسم کو فرض قرار دیا گیا ہے، مثلاً "فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ"[۴] اور "وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ"[۵] ان آیات میں زوجات کے درمیان عدل کو واجب قرار دیا گیا ہے اور ابتدائی اور انتہائی ایام کی کوئی تفریق نہیں کی گئی۔

نیز اگلے باب (فی التسویة بین الضرائر) میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت آرہی ہے

---

[۱] الحدیث أخرجہ البخاری فی صحیحہ (ج ۲ ص۷۸۵) باب اذا تزوج البکر علی الثیب، ومسلم (ج ۱ ص۴۷۳) باب قدر ما تستحقہ البکر والثیب من إقامة الزوج الخ ۱۲ م

[۲] علامہ نوویؒ نے ائمہ ثلاثہؒ کے مذہب میں ثیبہ کی صورت میں یہ تفصیل ذکر کی ہے کہ ثیبہ کو اختیار ہے کہ خواہ زوج اس کے پاس تین دن ٹھہر جائے اور یہ تین دن باری سے خارج ہوں یا سات دن ٹھہرے اور یہ سات دن باری میں شمار ہوں گے، دیکھئے شرح نووی (ج ۱ ص۴۷۳) باب قدر ما تستحقہ البکر الخ ۱۲ مرتب

[۳] دیکھئے فتح القدیر (ج ۳ ص۳۰۱) باب القسم ۱۲ م

[۴] سورۂ نساء آیت ۳ پ۴ ۱۲ م

[۵] سورہ نساء آیت ۱۲۹ پ۵ ۱۲ م

عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم قال: اذا كان عند الرجل امرأتان فلم يعدل بينهما جاء يوم القيامة وشقه ساقط[1]"

حنفیہ کی جانب سے حدیثِ باب کی توجیہ یہ ہے کہ قسم تو ہر حال میں واجب ہے لیکن باکرہ سے نکاح کے وقت ابتدائی ایام میں باری کا طریقہ بدل دیا جائیگا اور ایک دن کے بجائے باکرہ کے لئے سات دن اور ثیبہ کے لئے تین دن کی باری مقرر کی جائے گی۔

اس توجیہ کی تائید سنن ابی داؤد[2] میں حضرت ام سلمہؓ کی روایت سے ہوتی ہے "أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما تزوج أم سلمةؓ أقام عندها ثلاثا، ثم قال، ليس بكِ على أهلكِ هوان إن شئتِ سبعتُ لك، وإن سبعتُ لك سبعتُ لنسائي[3]۔

ایک اشکال اور اس کے جوابات یہاں یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ سنن دارقطنی[4] میں حضرت ام سلمہؓ کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں "ليس بك هوان على أهلك، إن شئت أقمتُ معك ثلاثا خالصة لك، وإن شئت سبعتُ لك ثم سبعتُ لنسائي، فقالت: تقيم معي ثلاثا خالصة۔

اس کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں:

① یہ روایت واقدی کے طریق سے ہے جو ضعیف ہے۔

② خود واقدی سے سنن[5] دارقطنی ہی میں حضرت عائشہؓ کی مرفوع روایت آئی ہے

---

[1] نیز اسی باب میں حضرت عائشہؓ کی روایت بھی حنفیہ کی دلیل ہے "أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم كان يقسم بين نسائه فيعدل ويقول: اللهم هذه قسمتي فيما أملك فلا تلمني فيما تملك ولا أملك" ۱۲ م

[2] (ج ۱ ص ۲۸۹) باب فی المقام عند البکر ۱۲ م

[3] اور مسلم کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں "إن شئت سبعت عندك وإن شئت ثلثتُ ثم دُرتُ، قالت: ثلث۔

نیز مسلم ہی کی ایک دوسری روایت اس طرح مروی ہے "أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حين تزوج أم سلمة فدخل عليها فأراد أن يخرج أخذت بثوبه، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: إن شئتِ زدتكِ وحاسبتكِ به، للبكر سبع وللثيب ثلاث۔

دیکھئے (ج ۱ ص ۴۷۳) باب قدر ما تستحقه البكر الخ ۱۲ مرتب

[4] (ج ۳ ص ۲۸۳) باب المهر، رقم ۱۴۳ ۱۲ م

[5] حوالہ بالا رقم ۱۴۴ ۱۲ م

«البکر إذا نکحها رجل ولہ نساء لہا ثلاث لیال و للثیب لیلتان» اسطرح اس روایت میں اور پچھلی روایت میں تعارض ہوگیا فتساقطتا۔

③ ابن ابی حاتمؒ نے اپنی «علل[1]» میں «أبو قتیبۃ عن اسرائیل عن أبی اسحاق عن أبی سلمۃ بن عبدالرحمٰن عن ام سلمۃ» کے طریق سے روایت ذکر کی ہے «أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم لما خطبہا قال لہا: إن شئت سبعتُ لكِ، وإن سبعتُ لكِ سبعت لنسائی، وإن شئت زدت فی مھرك وزدت فی مھورھن» اس روایت کے تمام رجال ثقہ ہیں[2]۔

اس میں «لما خطبہا قال لہا» کے الفاظ اس پر دال ہیں کہ آپؐ قبل التزوج بھی ازواج کے سلسلہ میں برابری کی رعایت رکھتے تھے یہاں تک کہ مہر میں بھی برابری کا اہتمام فرماتے تھے، لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ حضرت ام سلمہؓ کے پاس شروع میں اس طرح تین دن رہے ہوں کہ وہ تین ایام انہی کے ساتھ خاص ہوں اور باری میں محسوب نہ ہوں۔

④ اگر تین دن خالص حضرت ام سلمہؓ کا حق تھے تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ اگر آپ تسبیع پر عمل کرتے اور حضرت ام سلمہؓ کے پاس سات دن رہتے تو تین دن ان کے حق میں محسوب نہ ہوتے اور تمام ازواج کے لئے چار چار دن کی باری ہوتی۔

جہاں تک واقدی کے علاوہ دوسروں کی روایات کا تعلق ہے سو ایسی روایات (مثلاً «وإذا تزوج الثیب فثلاث ثم یقسم[3] للبکر سبعۃ أیام وللثیب ثلاثۃ أیام، ثم یعود إلی نسائہ[4]» اور «وإلا فثلثت ثم أدور[5]») اس بارے میں صریح نہیں کہ اگر باکرہ کے پاس سات دن رہے گا تو دوسری ازواج کے پاس سات دن نہ رہیگا اور اگر ثیبہ کے پاس تین دن رہے گا تو بقیہ کے حق میں تثلیث نہ کریگا، بلکہ روایات میں حنفیہ کے بیان کردہ مطلب کا بھی امکان ہے جو حنفیہ کے مذکورہ بالا دلائل کی بناء پر قوی ہوجاتا ہے[6]۔

---

[1] (ج ۱ ص ۴۰۵) علل أخبار رویت فی النکاح، رقم ۱۲۱۳ ۱۲ م

[2] کما قال العلامۃ العثمانی فی إعلاء السنن (ج ۱۱ ص ۱۱۴) ۱۲ م

[3] طحاوی (ج ۲ ص ۱۱) باب مقدار ما یقیم الرجل عند الثیب أو البکر الخ بروایۃ أنسؓ ۱۲ م

[4] سنن دارقطنی (ج ۳ ص ۲۸۳)، رقم ۱۴۱ بروایۃ انسؓ ۱۲ م

[5] طحاوی (ج ۲ ص ۱۱) بروایۃ عبدالملک بن ابی بکر بن عبدالرحمٰن ۱۲ م

[6] اشکال اور اس کے جوابات سے متعلق مذکورہ بحث اعلاء السنن (ج ۱۱ ص ۱۱۴ و ۱۱۵) باب وجوب العدل بین الازواج فیما یطاق سے ماخوذ ہے۔ نیز دیکھئے کتاب الحجۃ علی أھل المدینۃ (ج ۳ ص ۲۴۹ تا ص ۲۵۲) باب القسم بین النساء ۱۲

حدیثِ باب کا بعض احناف نے ایک دوسرے طرز سے جواب دیا ہے کہ وجوب قسم نص قرآنی سے ثابت ہے جو «عام» ہے۔

اور حدیثِ باب خبرِ واحد ہے جس سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں، لیکن یہ جواب تسلی بخش نہیں اس لئے کہ سفر میں سقوطِ قسم کے حنفیہ بھی قائل ہیں[1] اور اس کا ثبوت بھی اخبارِ آحاد سے ہے[2]، معلوم ہوا کہ «عدل بین النساء» کی آیات عام نہیں کہ اخبارِ آحاد سے ان میں تخصیص جاری نہ ہوسکے، بلکہ یہ آیات «مجمل» ہیں اور اخبارِ آحاد ان کے لئے مفسّر بن سکتی ہیں لہذا حدیثِ باب بھی آیاتِ عدل کے لئے تفسیر بن سکتی ہے لہذا یہ جواب درست نہیں۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی الزوجین المشرکین یسلم احدھما

عن[3] عمرو بن شعیب عن أبیه عن جدہ أن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ردّ ابنته زینب علی أبی العاص بن الربیع بمهرٍ جدید ونکاحٍ جدید»

عن[4] ابن عباس قال ردّ النبی صلی اللہ علیه وسلم ابنته زینب علی أبی العاص بن الربیع بعد ستّ سنین بالنکاح الاول ولم یحدث نکاحًا۔

پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اگر بیوی مسلمان ہوجائے اور شوہر کافر ہو تو امام شافعیؒ کے نزدیک بیوی کے مجرّد اسلام سے نکاح فسخ ہوجائیگا البتہ اگر عورت مدخول بہا ہو اور شوہر عدت کے دوران اسلام لے آئے تو سابقہ نکاح لوٹ آئیگا، جبکہ حنفیہ کے نزدیک مجرّد اسلام سے فرقت واقع نہیں ہوتی بلکہ شوہر پر اسلام پیش کیا جائے گا اگر وہ اسلام قبول کرلے تو بیوی اسی کی ہے اور اگر

---

[1] دیکھئے ہدایہ مع فتح القدیر (ج ۳ ص ۳۰۲) باب القسم ۱۲ م

[2] مثلاً حضرت عائشہؓ کی روایت «کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم إذا أراد سفرًا أقرع بین نسائه فأیّتهن خرج سهمها خرج بها معه» الحدیث۔ سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۲۹۱) باب فی القسم بین النساء، کتاب النکاح ۱۲ مرتب

[3] الحدیث أخرجه ابن ماجه فی سننه (ص ۱۴۴ و ۱۴۵) باب الزوجین یسلم أحدهما قبل الآخر، لکن لیس فیه «بمهر جدید» ۱۲ م

[4] الحدیث أخرجه ابوداؤد (ج ۱ ص ۳۰۴) باب إلی متی تردّ علیه امرأته إذا أسلم بعدها، کتاب الطلاق ۱۲ م

انکار کردے تو اس کے انکار کے سبب نکاح فسخ ہو جائیگا۔[1]

اس بارہ میں حنفیہ کی دلیل مصنف[2] ابن ابی شیبہ میں یزید بن علقمہ کی روایت ہے "أن رجلاً من بنی تغلب یقال لہ عباد بن النعمان فکان تحتہ امرأۃ من بنی تمیم فأسلمت، فدعاہ عمرؓ، فقال: "إمّا ان تسلم و إما أن أنزعها منك" فأبی أن یسلم، فنزعها منه عمر"

نیز کتاب الحجۃ[3] میں امام محمدؒ نے داؤد بن کردوس کی روایت ذکر کی ہے فرماتے ہیں: "أسلمت امرأۃ نصرانی، فقال لہ عمر رضی اللہ عنہ: لتسلمنّ أولأ فرق بینکما قال لا تحدّث العرب أنی أسلمت من أجل بضع امرأۃ، ففرق بینهما عمر رضی اللہ عنہ۔ علامہ ابن القیمؒ نے بھی یہ واقعہ زاد المعاد میں ذکر کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے[4]

اس تمہید کے بعد یہاں دو بحثیں ہیں:

پہلی بحث یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیثِ باب میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو ان کے شوہر ابو العاصؓ کے پاس چھ سال کے بعد لوٹایا جبکہ بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چار سال بعد لوٹایا[5] اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سال بعد لوٹایا[6]، اس طرح روایات میں تعارض ہو جاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے ان روایات کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے فرمایا کہ دراصل

---

[1] دیکھئے ھدایہ مع فتح القدیر (ج ۳ ص۲۸۵) باب نکاح أهل الشرك۔

واضح رہے کہ تقریر میں مذکور احناف کا مسلک اس تقدیر پر ہے جبکہ زوجین دار الاسلام میں ہوں لیکن اگر دونوں دار الحرب میں ہوں تو فرقت عدت کے گزرنے پر موقوف رہے گی کما فی المغنی (ج ۶ ص۶۱۳) باب نکاح أهل الشرك۔

نیز یہ بھی واضح رہے کہ دار الاسلام میں عرض اسلام کے بعد انکار کی صورت میں جب فرقت واقع ہو جائے گی پھر اگر شوہر عدت ہی کے دوران اسلام قبول کرلے تب بھی نکاح سابق لوٹ کر نہ آئیگا بلکہ نکاحِ جدید کی حاجت ہوگی کما فی کتاب الحجۃ (ج ۴ ص۱) باب النصرانی تکون تحتہ نصرانیۃ فتسلم النصرانیۃ والزوج غائب ثم یسلم الخ ۱۲ مرتب

[2] (ج ۵ ص۹۱) ما قالوا فی المرأۃ تسلم قبل زوجها، من قال یفرّق بینهما، کتاب الطلاق ۱۲ م

[3] (ج ۴ ص۲) ۱۲ م

[4] زاد المعاد (ج ۵ ص۱۳۹) فصل فی حکمه صلی اللہ علیه وسلم فی الزوجین یسلم أحدهما قبل الآخر۔ ۱۲ م

[5] چار سال والی روایت مرتب کو تلاش کے باوجود نہ مل سکی ۱۲ م

[6] دیکھئے سنن ابی داؤد (ج ۱ ص۳۰۴) اور سنن ابن ماجہ (ص۱۴۵) ۱۲ م

ابوالعاصؓ غزوۂ بدر کے موقع پر قیدی بناکر لائے گئے یعنی ہجرت کے دو سال بعد اور اس وعدے پر چھوڑے گئے کہ جاکر حضرت زینبؓ کو مکہ مکرمہ سے بھیج دیں گے[1] چنانچہ ابوالعاصؓ نے واپس جاکر حسبِ وعدہ حضرت زینبؓ کو بھیج دیا، پھر ہجرت کے چار سال بعد ابوالعاصؓ دوبارہ پکڑے گئے جس کا واقعہ یہ ہوا کہ وہ قریش کے اموالِ تجارت لیکر شام گئے، تجارتی سفر سے واپسی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سریّہ سے سامنا ہوا جس نے ان کا سامانِ تجارت اپنے قبضہ میں لے لیا، انہوں نے رات کے وقت بھاگ کر حضرت زینبؓ کے پاس پناہ لی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امان کو باقی رکھا، پھر آپؐ کی خواہش پر مسلمانوں نے ان کا سارا مال انکو واپس کردیا، یہ مکہ مکرمہ چلے آئے قریش کو ان کی امانتیں لوٹادیں پھر مکہ ہی میں مشرف باسلام ہوئے اور سنہ میں ہجرت کی[2]، اس موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی کو ان کے حوالہ کردیا۔

اب روایات میں تطبیق اس طرح ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں چھ سال کی مدت سے مراد ہجرت کے بعد ابوالعاص کے اسلام لانے اور ہجرت کرنے تک کا زمانہ ہے، اور جس روایت میں چار سال کا ذکر ہے اس میں "بدر" سے ان کی ہجرت تک کا زمانہ مراد ہے اور جس روایت میں دو سال کا ذکر ہے اس میں ابوالعاصؓ کے دوسری مرتبہ گرفتار ہونے سے لیکر ان کی ہجرت تک کا زمانہ مراد ہے[3]۔

دوسری بحث یہ ہے کہ عمرو بن شعیب کی حدیثِ باب میں "مہرِ جدید" اور "نکاحِ جدید" کے ساتھ لوٹائے جانے کا ذکر ہے جبکہ حضرت ابن عباسؓ کی روایتِ باب میں "نکاحِ اول" کے ساتھ لوٹانے کا ذکر ہے اور ان دونوں میں تعارض واضح ہے۔

اکثر محدثین نے اس طرح تعارض رفع کیا کہ عمرو بن شعیب کی حدیث کو حجاج[4] بن ارطاۃ کی

---

[1] حضرت زینبؓ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی صاحبزادی ہیں ہجرت سے پہلے اسلام لے آئی تھیں ان کے شوہر ابوالعاص ابن ربیع ان کے خالہ زاد بھائی تھے، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی تو حضرت زینبؓ مکہ میں ہی رہ گئی تھیں، بدر کے موقع پر جب ابوالعاصؓ گرفتار کئے گئے اور اہل مکہ نے اپنے اپنے قیدیوں کا فدیہ روانہ کیا تو حضرت زینبؓ نے ابوالعاص کے فدیہ میں اپنا وہ ہار بھیجا جو حضرت خدیجہؓ نے شادی کے وقت ان کو دیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس ہار کو دیکھ کر آبدیدہ ہوگئے اور صحابہ کرام رضہ سے فرمایا اگر مناسب سمجھو تو اس ہار کو واپس کردو اور اس قیدی کو چھوڑ دو، تسلیم وانقیاد کی گردنیں فوراً ہی خم ہوگئیں، قیدی بھی رہا کردیا گیا اور ہار بھی واپس ہوگیا۔ دیکھئے سیرۃ مصطفیٰ (ج ۲ ص ۱۳۳ وج ۳ ص ۳۶۵) ۱۲ مرتب

[2] سیرۃ ابن ھشام (ج ۲ ص ۸) ۱۲ م

[3] دیکھئے العرف الشذی (ص ۳۶۴) ۱۲ م

[4] کثیر الخطاء والتدلیس قالہ الحافظ فی التقریب (ج ۱ ص ۱۵۲) ۱۲ م

وجہ سے ضعیف قرار دیا اور روایت ابن عباسؓ کو صحیح اور راجح قرار دیا، لیکن اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ چھ سال بعد نکاح اول کے ساتھ لوٹانا کیسے ممکن ہے جبکہ ظاہر یہی ہے کہ اس عرصہ میں اس کی عدّت پوری ہو چکی ہوگی، اور فرقت کے بعد عدّت گزرنے پر لوٹانے کا کوئی سوال نہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ حضرت زینبؓ ممتدۃ الطہر تھیں اس لئے اس مدت میں ان کی عدّت گزری نہ تھی، لہذا ابوالعاصؓ کی طرف لوٹایا جانا اثناء عدّت میں اس وقت متحقق ہوا جب ابوالعاصؓ اسلام لا چکے تھے، اس لئے نکاحِ ثانی کی بھی حاجت پیش نہ آئی، ولا مانع من ذلك من حيث العادة فضلاً عن مطلق الجواز[۱]

لیکن حافظؒ کی یہ تاویل جہاں خلافِ ظاہر ہے وہاں علامہ سہیلیؒ کی ذکر کردہ روایت سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے کہ حضرت زینبؓ جب ہجرت کے ارادہ سے مکہ سے مدینہ روانہ ہوئیں تو ھبار بن الاسود نے انھیں ڈرایا دھمکایا جس سے ان کا حمل ساقط ہو کر ضائع ہو گیا[۲]، اس وقت سے حضرت زینب کو مسلسل خون آتا رہا یہاں تک کہ انھوں نے وفات پائی[۳]، لہذا ان کے حق میں یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ممتدۃ الطہر ہوں؟۔

حنفیہ نے بھی عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کو قوتِ سند کی بناء پر ترجیح دیکر تعارض رفع کیا، پھر یہ اشکال کہ چھ سال کے طویل عرصہ بعد نکاحِ اول کے ساتھ لوٹانا کیسے ممکن ہے؟ حنفیہ کے مسلک پر وارد ہی نہیں ہوتا اس لئے کہ احد الزوجین کے محض اسلام لانے سے ان کے نزدیک فرقت واقع نہیں ہوتی بلکہ فرقت کے لئے عرضِ اسلام اور اس کے بعد اباء ضروری ہے، اور ابوالعاصؓ پر عرضِ اسلام سنہ ھ میں ہوا اور وہ اسلام لے آئے اس لئے نکاح کے فسخ ہونے کا سوال نہیں۔

اشکال کا ایک جواب یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ مسلمان عورتوں کے مشرکین کے ساتھ نکاح کی حرمت اس آیت سے ہوئی ہے «لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ»[۴] اور یہ آیت

---

[۱] فتح الباری (ج ۹ ص ۴۲۳) کتاب الطلاق، باب إذا أسلمت المشركة أو النصرانية الخ ۱۲ م

[۲] اس واقعہ سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے سیرت مصطفیٰ (ج ۲ ص ۱۲۴ و ۱۲۵) ۱۲ م

[۳] الروض الأنف (ج ۲ ص ۸۱) فصل فی خبر خروج زینب الخ ۱۲ م

[۴] سورۃ الممتحنہ، آیت (۱۰) پ ۲۸ ۱۲ م

مدنی ہے سنہ ۶ھ میں نازل ہوئی[1]، گویا حضرت زینبؓ کا ابو العاصؓ کی طرف لوٹایا جانا اس آیت کے نزول سے پہلے تھا یا نزول کے متصل بعد تھا لیکن عدت کے دوران تھا[2]۔

علامہ سہیلیؒ نے الروض الانف میں[3] "عمرو بن شعیب" اور حضرت ابن عباسؓ کی دونوں روایتوں میں تطبیق کے طریقہ کو اختیار کرتے ہوئے یہ تاویل کی ہے کہ ابن عباسؓ کی روایت میں "بالنکاح الاول" سے مراد "بمثل النکاح الأول" ہے یعنی "ردّھا بمثل النکاح الأوّل فی الصداق والحباء[4] لم یحدث زیادۃ علی ذٰلک من شرط و لا غیرہ" لیکن یہ تاویل بھی خلافِ ظاہر اور تکلف سے خالی نہیں۔

والعمل علی حدیث عمرو بن شعیب "، شوافع وغیرہ کے نزدیک عمرو بن شعیب کی روایت معمول بہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ احد الزوجین کے اسلام کے بعد عدت گزرنے پر فرقت واقع ہو جائیگی، اس جملہ سے یہ وہم نہ کیا جائے کہ حضرت زینبؓ ابو العاصؓ کی طرف "نکاحِ جدید کے ساتھ لوٹائی گئیں، بلکہ اس واقعہ میں حنفیہ سمیت اکثر حضرات کے نزدیک حقیقت یہی ہے کہ حضرت زینبؓ نکاحِ اول کے ساتھ لوٹائی گئیں کما مرّ تحقیقہ، واللہ أعلم۔

---

[1] اس لئے کہ یہ آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی جو کہ سنہ ۶ھ میں ہوئی دیکھئے تفسیر قرطبی (ج ۱۸ ص۶۱) اور سیرۃ المصطفیٰ (ج ۲ ص۳۶۵) ۱۲ مرتب

[2] لیکن اس جواب کی تقدیر پر یہ اشکال پھر بھی باقی رہیگا کہ جب ابو العاصؓ دوسری مرتبہ گرفتار کئے گئے اور حضرت زینبؓ نے ان کو پناہ دی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پناہ کو برقرار رکھا اس وقت آپؐ نے حضرت زینبؓ سے فرمایا تھا "أی بنیۃ أکرمی مثواہ ولا یخلصن إلیک، فإنک لا تحلین لہ" سیرت ابن ہشام بہامش الروض الأنف (ج ۲ ص۸۳) جس کا مطلب یہ کہ دوسری مرتبہ گرفتاری کے وقت حرمت کا حکم آچکا تھا لہٰذا یہ کہنا کہ حضرت زینبؓ کا لوٹایا جانا حرمت کا حکم آنے سے پہلے اس کے متصل بعد تھا کیسے درست ہو سکتا ہے؟ نیز ابو العاصؓ کے سفرِ شام پر جانے کے بارے میں محمد بن اسحٰق کی روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے "حتی إذا کان قبیل الفتح خرج أبو العاص تاجراً إلی الشام ... فلما فرغ من تجارتہ وأقبل قافلاً لقیتہ سریۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ" سیرت ابن ہشام بہامش الروض الأنف (ج ۲ ص۸۲) جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ردِّ فتح مکہ کے قریب ہوا جبکہ حرمت سے متعلقہ آیت کافی پہلے سنہ ۶ھ میں نازل ہوئی، اس صورت میں بھی نہ صرف یہ کہ مذکورہ جواب درست نہیں رہتا بلکہ اصل اعتراض بھی لوٹ آتا ہے کہ جب حرمت کا حکم سنہ ۶ھ میں آچکا تھا تو فتح مکہ (جو رمضان سنہ ۸ھ میں ہوا) کے قریب کس طرح رد ہوا جبکہ درمیان میں کافی وقت ہے؟ لہٰذا حنفیہ کا عرضِ اسلام والا جواب ہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔

واللہ أعلم مرتب عفا اللہ عنہ۔

[3] (ج ۲ ص۸۳) ۱۲ م

[4] عطیہ، مہر ۱۲ م

باب ماجاء في الرجل يتزوّج المرأة فيموت عنها قبل أن يفرض لها،

عن ابن مسعودؓ أنه سئل عن رجل تزوّج امرأة و لم يفرض لها صداقًا و لم يدخل بها حتى مات، فقال ابن مسعودؓ: لها مثل صداق نسائها لا وكس و لا شطط[۲] و عليها العدة و لها الميراث، فقال معقل بن سنان الأشجعي فقال: قضى رسول الله صلى الله عليه وسلم في بروع بنت واشق امرأة منا مثل الذي قضيت، ففرح بها ابن مسعودؓ"[۱]۔

اگر احد الزوجین اس حال میں مرجائے کہ نہ بیوی کا مہر مقرر کیا گیا ہو اور نہ اس کے ساتھ صحبت کی گئی ہو تو حنفیہ کے نزدیک ایسی صورت پورا مہرِ مثل دیا جائیگا، سفیان ثوریؒ، امام احمدؒ اور امام اسحٰقؒ کا بھی یہی مسلک ہے اور امام شافعیؒ کا بھی قولِ جدید اسی کے مطابق ہے۔

جبکہ امام مالکؒ کے نزدیک ایسی صورت میں کچھ واجب نہ ہوگا، امام شافعیؒ کا قولِ قدیم بھی یہی ہے[۳]۔

حنفیہ وغیرہ کا استدلال حدیثِ باب سے ہے لیکن اس پر مالکیہ وغیرہ کی جانب سے روایت کے مضطرب ہونے کا اعتراض کیا گیا ہے[۴] کہ بعض روایات میں بروع بنت واشق کے واقعہ کو نقل کرنے والے صحابی کا نام معقل بن سنان آیا ہے کما فی حدیث الباب، بعض میں "معقل بن یسار"، بعض میں "رجل من اشجع"، اور بعض میں "ناس من أشجع" آیا ہے[۵] لہٰذا روایت سے استدلال درست نہیں۔

لیکن یہ اعتراض درست نہیں، اول تو اس لئے کہ معقل بن سنانؓ والی روایت کو امام ترمذیؒ نے حسن صحیح قرار دیا ہے، اس طرح اضطراب دور ہو جاتا ہے[۶]۔

---

[۱] الحديث أخرجه أبو داود (ج ۱ ص ۲۸۸) باب فيمن تزوّج ولم يسم صداقًا حتى مات، والنسائي (ج ۲ ص ۸۸) إباحة التزويج بغير صداق ۱۲ م

[۲] الوكس: النقص والشطط: الجور كما في النهاية (ج ۵ ص ۲۱۹) یعنی اس میں نہ کوئی کمی ہوگی اور نہ ہی زیادتی ۱۲ مرتب

[۳] مذاہب کی کسی قدر تفصیل خود امام ترمذیؒ نے بیان کی ہے۔ نیز دیکھئے ہدایہ مع فتح القدیر (ج ۳ ص ۲۱ و ص ۲۲) باب المهر ۱۲ مرتب

[۴] بذل المجهود (ج ۱ ص ۱۳۳) باب فيمن تزوّج ولم يسم صداقًا الخ ۱۲ م

[۵] ان تمام روایات کے لئے دیکھئے سنن کبریٰ بیہقی (ج ۷ ص ۲۴۵ و ۲۴۶) کتاب الصداق، باب أحد الزوجين يموت ولم يفرض لها صداقًا ولم يدخل بها ۱۲ مرتب

[۶] بلکہ خود امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ "هذا الاختلاف في تسمية من روى قصة بروع بنت واشق عن النبي صلى الله عليه وسلم لا يوهن الحديث فإن جميع هذه الروايات أسانيدها صحاح وفي بعضها ما دلّ على أن جماعة من أشجع شهدوا بذلك فكأن بعض الرواة سمّى منهم واحدا وبعضهم سمّى اثنين وبعضهم أطلق ولم يسم، ومثله لا يرد الحديث ولولا ثقة من رواه عن النبي صلى الله عليه وسلم لما كان لفرح عبد الله بن مسعودؓ بروايته معنى والله أعلم" سنن کبریٰ بیہقی (ج ۷ ص ۲۴۶) ۱۲ مرتب

اس کے علاوہ اگر اضطراب مانا بھی جائے تب بھی یہ اضطراب صحابی کی تعیین میں ہے اور یہ امر روایت کی صحت سے مانع نہیں، اس لئے صحابۂ کرام تمام کے تمام عدول ہیں، شاید اسی وجہ سے امام شافعیؒ نے قولِ قدیم سے قولِ جدید کی طرف رجوع کر لیا تھا کما نقلہ الترمذیؒ۔

واللہ أعلم و علمہ أتم و أحکم

تمت أبواب النکاح فللہ الحمد فی الأولیٰ والآخرة

أبواب الرّضاع

باب ماجاء يحرم من الرّضاع مايحرم من النسب

عن[1] علي بن أبي طالبؓ قال قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم ان الله حرم من الرضاع ماحرم من النسب۔ اس حدیث پر متفق علیہ طور پر عمل ہے کہ جو رشتہ نسب میں حرام ہے وہ رشتہ رضاعت میں بھی حرام ہے۔ البتہ کتبِ حنفیہ میں متعدد رشتوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے[2]۔

ایک سوال اور اس کا جواب اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حدیث کے الفاظ مطلق ہیں پھر ان رشتوں کو کیوں مستثنیٰ کیا گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت یہ تمام مستثنیات استثناء منقطع کی قبیل سے ہیں، یعنی شروع ہی سے یہ حدیث کے الفاظ کے دائرہ میں نہ تھے محض ظاہری صورت کے اعتبار سے انہیں مستثنیٰ قرار دیا گیا، وجہ یہ ہے کہ حرمتِ رضاعت اس وقت ثابت ہوتی ہے جبکہ رضاعت کا رشتہ اسی حیثیت سے پایا جارہا ہو جس حیثیت سے وہ نسب میں حرام ہے، حیثیت کے بدل جائے کی صورت میں حرمت نہیں رہتی، فقہاء نے جو مستثنیات بیان کئے ہیں ان میں حرمت نہ ہونے کی وجہ یہی ہے کہ ان میں حیثیت بدل گئی ہے، مثلاً فقہاء نے اُخِ رضاعی کی نسبی بہن کو مستثنیٰ قرار دیا ہے، دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ نسبی رشتوں میں "أخت الأخ" کے حرام ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ "أخت الأخ" ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ وہ "اخت نسبی" ہے اور رضاعت میں یہ بات نہیں پائی جاتی کیونکہ اُخِ رضاعی کی بہن سے براہ راست نہ کوئی نسبی تعلق ہے نہ رضاعی، لہذا یہ صورت حدیث کے تحت ابتداء ہی سے داخل نہیں، البتہ چونکہ صورۃً داخل معلوم ہوتی ہے اس لئے اس پر مستثنیٰ کا اطلاق کردیا گیا۔

ایک اشکال اور اس کا جواب یہاں ایک اور مسئلہ بہت اہم ہے اور وہ یہ کہ بعض فقہاء

---

[1] الحديث أخرجه النسائي عن عائشةؓ (ج ۲ ص۸۵) مايحرم من الرضاع ۱۲ م

[2] علامہ ابن نجیمؒ نے ان مستثنیات کی اکاسی (۸۱) صورتیں بیان کی ہیں دیکھئے البحر الرائق (ج ۳ ص۲۲۳ و ص۲۲۴) کتاب الرضاع ۱۲ مرتب

نے رضاعت کے ذریعہ بعض صہری رشتوں کو بھی حرام قرار دیا ہے مثلاً ابن رضاعی کی بیوی بالاتفاق حرام ہے۔

اس پر شیخ ابن ہمامؒ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کی حرمت کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی اسلئے کہ اس حکم کی تائید نہ قرآن کریم سے ہوتی ہے نہ حدیث سے، قرآن سے تو اس لئے نہیں کہ وہاں "حلائل ابنائکم" کے ساتھ "الذین من اصلابکم" کی قید لگی ہوئی ہے[۱]، اور حدیث سے اس لئے نہیں کہ "یحرم من الرضاع" کے ساتھ "مایحرم من النسب" کی قید موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رضاعت میں صرف نسبی رشتے حرام ہوتے ہیں صہری حرام نہیں ہوتے اور "حلیلۃ الابن" کا رشتہ صہری ہے نہ کہ نسبی، لہٰذا وہ رضاعت میں حرام نہ ہونا چاہیئے[۲]۔

یہ اعتراض فقہاء کے درمیان لاینحل مسئلہ بنا رہا ہے، علامہ شامیؒ نے بھی اس اعتراض کو نقل کر کے اس کا کوئی جواب نہیں دیا[۳]، حالانکہ "حلیلۃ الابن الرضاعی" کی حرمت متفق علیہ ہے حتیٰ کہ تفسیر مظہری[۴] اور تفسیر قرطبی[۵] میں اس پر اجماع ذکر کیا گیا ہے، حافظ ابن کثیرؒ نے اگرچہ اس حکم کو قولِ جمہور قرار دیا ہے لیکن انہوں نے بھی بعض لوگوں کی روایت سے اس بارے میں اجماع نقل کیا ہے[۶]، اس لئے "حلیلۃ الابن الرضاعی" کی حلت کا قائل ہونا قریب قریب خرقِ اجماع کے مرادف ہے[۷]، جس کی وجہ سے اعتراضِ مذکور کا جواب ضروری ہو جاتا ہے۔

جہاں تک شیخ ابن ہمامؒ کا تعلق ہے سو اوّل تو ان کا یہ اعتراض بطورِ فتویٰ نہیں پھر اگر فتویٰ ہی ہو تب بھی ان کا تفرد ہے اور ان کے شاگردِ خاص علامہ قاسم بن قطلوبغاؒ فرماتے ہیں "لا تقبل تفردات

---

[۱] سورۂ نساء آیت (۲۳) پ ۴ ۱۲ م

[۲] فتح القدیر (ج ۳ ص ۴۴۸ و ص ۴۴۹) کتاب الرضاع ۱۲ م

[۳] ردّ المحتار (ج ۲ ص ۴۰۵) باب الرضاع ۱۲ م

[۴] (ج ۲ ص ۲۶۴) تحت قولہ تعالیٰ: وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الخ ۱۲ م

[۵] (ج ۵ ص ۱۱۶) ۱۲

[۶] تفسیر القرآن العظیم (ج ۱ ص ۴۷۲) ۱۲

[۷] البتہ حافظ ابن قیمؒ اس مسئلہ میں علامہ ابن تیمیہؒ کے بارے میں لکھتے ہیں: وتوقف فیہ شیخنا وقال: إن کان قد قال أحد بعدم التحریم فھو أقوی۔ زاد المعاد (ج ۵ ص ۵۵۵) ذکر حکم رسول اللہ علیہ وسلم فی الرضاعۃ الخ ۱۲

مرتب عفی عنہ

شیغنا[۱]»۔ لہٰذا ان کی عبارت کی بناء پر امت کے خلاف فتویٰ دینا مشکل ہے۔

احقر کو عرصہ تک شیخ ابن ہمامؒ کے ذکر کردہ اعتراض کے جواب کی تلاش رہی لیکن کامیابی نہ ہو سکی، پھر باری تعالیٰ کی توفیق سے یہ جواب سمجھ میں آیا کہ حدیث "یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب[۲]" میں "من" سببیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ جن رشتوں کی حرمت کا سبب فی الجملہ نسب ہو وہ رضاع میں بھی حرام ہیں، اور نسب جس طرح نسبی رشتوں میں حرمت کا سبب ہوتا ہے اسی طرح مصاہرت کے رشتوں میں بھی نسب فی الجملہ سببِ حرمت ہوتا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ صہر دو چیزوں سے مرکب ہے ایک نسب، دوسرے زواج، اگر ان میں سے ایک بھی مفقود ہو تو صہر ثابت نہیں ہوتا، بیٹے کی بیوی اس لئے حرام ہے کہ وہ جس کی بیوی ہے وہ اپنا بیٹا ہے لہٰذا بیٹے کے ساتھ جو نسبی تعلق ہے وہ بھی اس کی بیوی کے حرام ہونے کا ایک سبب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام صہری رشتوں میں نسب بھی فی الجملہ سببِ حرمت ہوتا ہے اور اتنی بات حدیث کے تحت آنے کے لئے کافی ہے،

یہ جواب سمجھ میں تو آیا تھا لیکن کہیں منقول نہ دیکھا تھا بالآخر البحر الرائق[۳] میں علامہ ابن نجیمؒ کی ایک تصریح نظر سے گذری جس میں انہوں نے مذکورہ حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس حدیث میں نسب سے مراد قرابت اور صہریت دونوں ہیں، اس سے اپنے اس جواب کی تائید ملی، پھر العرف الشذی[۴] میں بھی اس اعتراض کا یہی جواب مل گیا، فللّٰہ الحمد۔

رہی آیت سو اس کا جواب واضح ہے کہ مفہوم مخالف حجت نہیں، نیز صاحبِ ہدایہؒ نے تصریح کی ہے کہ "الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِکُمْ" کی قید متبنیٰ کو خارج کرنے کے لئے ہے[۵] یعنی حلیلۃ المتبنیٰ حرام نہیں واللہ أعلم

---

[۱] کما ذکر الشیخ البنوری رحمہ اللہ فی معارف السنن (ج ۱ ص ۵۵) باب فی التسمیۃ عند الوضوء ۱۲ مرتب

[۲] أخرجہ ابن ماجہ فی سننہ (ص ۱۳۹) باب یحرم من الرضاع الخ عن عائشۃ رض ۱۲ م

[۳] (ج ۳ ص ۲۲۲) کتاب الرضاع ۱۲ م

[۴] (ص ۳۶۸) باب ماجاء یحرم من الرضاع الخ ۱۲ م

[۵] ہدایہ مع فتح القدیر (ج ۳ ص ۲۱۲) الرضاع ۱۲ م

باب ماجاء فی لبن الفحل

لبن الفحل ایک فقہی اصطلاحی ہے یعنی وہ حرمتِ رضاعت جو " اب رضاعی " کے واسطہ سے ثابت ہوتی ہے جیسے رضاعی پھوپھی رضاعی چچا اور رضاعی دادا دادی۔

اس مسئلہ میں صدرِ اول میں کچھ اختلاف رہا ہے، بعض حضرات صحابہ کرام مثلاً ابن عمرؓ، جابرؓ، رافع بن خدیجؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور بعض تابعین کرام وغیرہ مثلاً سعید بن المسیبؒ، ابو سلمہؒ بن عبدالرحمٰن، سلیمانؒ بن یسار، عطاء بن یسارؒ، مکحولؒ، ابراہیم نخعیؒ، ابو قلابہؒ، ایاسؒ بن معاویہ، قاسمؒ بن محمد، سالمؒ، حسن بصریؒ، ابراھیمؒ بن علیہ، اس کے قائل تھے کہ یہ رشتے حرام نہیں، حضرت عائشہؓ شعبیؒ اور داؤد ظاھریؒ سے بھی ایک ایک روایت اسی کے مطابق ہے جبکہ ان کی دوسری روایت ائمہ اربعہؒ اور جمہور کے مطابق ان رشتوں کی حرمت کی ہے۔[1]

عدم حرمت کے قائلین کی دلیل " وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىْۤ اَرْضَعْنَكُمْ "[2] ہے کہ اس میں "ام" کا تو ذکر ہے لیکن عمّہ وغیرہ کا ذکر نہیں جبکہ نسبی رشتوں میں ان کا بھی ذکر ہے، معلوم ہوا یہ رشتے حرام نہیں،

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ استدلال تخصیص الشئ بالذکر کی قبیل سے ہے جو ماعدا سے حکم کی نفی پر دلالت نہیں کرتا، لہٰذا یہ حجت نہیں[3]،

قائلینِ حرمت کی دلیل اس باب میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے رضاعی چچا کو ان کے سامنے آنے کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا " فلیلج علیکِ فانہ عمکِ "[4] نیز قائلینِ حرمت کا استدلال حضرت ابن عباسؓ کی حدیثِ باب

---

[1] دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۲۰ ص ۹۵) باب لبن الفحل، کتاب النکاح ۱۲ م

[2] سورۂ نساء، آیت ۲۳ پ ۴ ۱۲م

[3] واحتج بعضھم (علی عدم الحرمۃ) من حیث النظر بأن اللبن لا ینفصل من الرجل وإنما ینفصل من المرأۃ فکیف تنتشر الحرمۃ الی الرجل، والجواب أنہ قیاس فی مقابلۃ النص فلا یلتفت إلیہ۔

أنظر لمزید التفصیل فتح الباری (ج ۹ ص ۱۵۱) باب لبن الفحل ۱۲ مرتب

[4] یہ روایت الفاظ کے فرق کے ساتھ صحیحین میں بھی آئی ہے دیکھئے بخاری (ج ۲ ص ۷۶۴) باب لبن الفحل اور مسلم (ج ۱ ص ۴۶۷) کتاب الرضاع ۱۲ مرتب

بھی ہے " أنّه سئل عن رجل له جاريتان أرضعت إحداهما جارية والأخرى غلامًا أيحل للغلام أن يتزوج بالجارية؟ فقال: لا اللقاح واحد۔

یہ اختلاف صدر اول میں تھا، بعد میں اس پر اجماع ہوگیا کہ یہ رشتے حرام ہیں۔ واللہ أعلم

تم شرح الباب بزيادة من المرتب

باب ماجاء لاتحرم المصّة ولا المصّتان

عن عائشة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال لا تحرم المصة ولا المصتان۔

ایک روایت میں "ولا الإملاجة ولا الإملاجتان" کی زیادتی بھی آئی ہے، مصّہ اسم مرّہ ہے جو مصّ یمصّ سے ماخوذ ہے یعنی چوسنا جو بچہ کا فعل ہے، جبکہ "إملاج" ادخال کے معنی میں ہے جو مرضعہ کا فعل ہے یعنی مرضعہ کا پستان کو بچہ کے منہ میں دینا۔

۱ھ هو بالفتح اسم ماء الفحل، أراد أن اللبن الذى أرضعت كل واحدة منهما كان أصله ماء الفحل۔ النهاية (ج ٤ ص٢٦٢) بتغير يسير ۱۲ مرتب

۲ھ لبن الفحل یعنی ان رشتوں کی حرمت پر اجماع کا قول احقر کو نہ مل سکا، بظاہر درست یہی معلوم ہوتا ہے کہ حرمت اگرچہ جمہور کا قول ہے لیکن اس پر اجماع نہیں، چنانچہ حافظؒ نے بھی اسے جمہور کا قول قرار دیا ہے، دیکھئے فتح الباری (ج ۹ ص۱۵۱)، علامہ عینیؒ نے بھی اس مسئلہ میں اختلاف ذکر کیا ہے اور بعد میں اتفاق نقل نہیں کیا، دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۲۰ ص۹۴)، نیز علامہ ابن حزمؒ اپنی کتاب مراتب الاجماع (ص۶۰) میں لکھتے ہیں "واختلفوا فی رضاع الفحل" ۱۲ مرتب عفی عنہ

۳ھ الحديث أخرجه مسلم (ج ۱ ص۴۶۸) فصل لا تحرم المصة ولا المصتان الخ وابوداؤد (ج ۱ ص۲۸۲) باب هل يحرم مادون خمس رضعات ۱۲ م

۴ھ صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۶۸ و ۴۶۹) "مصّتان" والی روایت (بروایت عائشہؓ) مستقل طور پر اور "إملاجتان" والی روایت (بروایت ام فضل) مستقل طور پر آئی ہے جبکہ صحیح ابن حبان (النوع ۳۱ من القسم الثالث) میں دونوں الفاظ ایک روایت میں جمع ہیں جو "عبداللہ بن زبیر عن ابیہ" کے طریق سے مروی ہے، لیکن امام ترمذیؒ نے اس کو "غیر محفوظ" قرار دیا ہے، دیکھئے نصب الرایہ (ج ۳ ص۲۱۷ و ۲۱۸) کتاب الرضاع ۱۲ مرتب

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ رضاعت کی کتنی مقدار محرّم ہوتی ہے ؟ اس مسئلہ میں چار مذاہب ہیں:

پہلا مذہب یہ ہے کہ رضاعت کی ہر مقدار محرّم ہے قلیل ہو یا کثیر، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب، سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ، لیث بن سعدؒ، حکمؒ، طاؤسؒ، مکحولؒ، عطاءؒ، سعید بن المسیبؒ اور حسن بصریؒ کا یہی مسلک ہے، امام احمدؒ کی مشہور روایت بھی اس کے مطابق ہے، نیز حضرات صحابۂ کرامؓ میں سے حضرت علی، ابن مسعود، ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کا بھی یہی قول ہے۔

دوسرا مذہب یہ ہے کہ حرمت کم از کم تین رضعات سے ثابت ہوتی ہے، ابوعبیدؒ، اسحاقؒ، ابوثورؒ، ابن المنذرؒ، داؤد ظاہریؒ وغیرہ کا یہی قول ہے، امام احمدؒ کی ایک روایت بھی اسی کے مطابق ہے[1]
ان حضرات کا استدلال حدیثِ باب سے ہے جس میں مصّۃ اور مصّتین کو غیر محرّم قرار دیا گیا ہے جس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ تین رضعات محرّم ہیں[1]۔

تیسرا مذہب یہ ہے کہ پانچ رضعات سے کم میں حرمت نہیں ہوتی، یہ پانچ رضعات بھی متفرق اوقات میں ہونی چاہئیں اور ان میں سے ہر ایک کا مُشبع ہونا بھی ضروری ہے۔ امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے اور امام احمدؒ کی بھی دوسری روایت اس کے مطابق ہے[2]

ان کا استدلال حضرت عائشہؓ کی دوسری حدیثِ باب سے ہے فرماتی ہیں «أنزل في القرآن عشر رضع معلومات، فَنُسِخ من ذلك خمس وصار إلى خمس رضعات معلومات، فتوفي رسول الله صلى الله عليه وسلم والأمر على ذلك» یہ روایت صحیح مسلم میں بھی آئی ہے[3]۔

چوتھا مذہب یہ ہے کہ دس رضعات سے کم میں حرمت ثابت نہیں ہوتی، یہ حضرت حفصہؓ کا مسلک ہے[4]، نیز حضرت عائشہؓ سے بھی مروی ہے[5]۔

---

[1] ان دونوں مذاہب کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۲۰ ص ۹۶) باب من قال لا رضاع بعد الحولین ۔ ۱۲ م

[2] فتح القدیر (ج ۳ ص ۳۰۵) کتاب الرضاع ۱۲ م

[3] دیکھئے مسلم (ج ۱ ص ۴۶۹) فصل لا تحرم المصّۃ الخ ۔ ۱۲ م

[4] جیسا کہ موطا امام مالکؒ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے «مالك عن نافع أن صفية بنت أبي عبيد أخبرته أن حفصة أم المؤمنين أرسلت بعاصم بن عبد الله ابن سعد إلى أختها فاطمة بنت عمر بن الخطاب ترضعه عشر رضعات ليدخل عليها وهو صغير يرضع، ففعلت، فكان يدخل عليها» (ص ۵۳۶) باب رضاعۃ الصغیر ۱۲ مرتب

[5] حضرت عائشہؓ سے اس مسئلہ میں تین قول مروی ہیں، ایک عشر رضعات کا، دوسرا سبع رضعات کا، تیسرا خمس رضعات کا، دیکھئے عمدہ (ج ۲۰ ص ۹۶) باب من قال لا رضاع بعد حولین ۔ ۱۲ مرتب

جمہور کے دلائل درج ذیل ہیں

(۱) باری تعالیٰ کا فرمان "وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَكُمْ"[۱] اس میں مطلق رضاعت کو سبب تحریم قرار دیا گیا ہے، قلیل وکثیر کی کوئی تفریق نہیں کی گئی اور کتاب اللہ پر خبرِ واحد سے تقیید و تخصیص کے ذریعہ کوئی زیادتی نہیں کی جاسکتی۔

اس آیت سے جمہور کے استدلال اور اس پر وارد ہونے والے شبہات کو امام ابوبکر جصاصؒ نے احکام القرآن میں مفصل بیان کیا ہے[۲]۔

(۲) نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "یحرم من الرضاع مایحرم من النسب"[۳] اس میں بھی مطلق رضاعت کو محرّم قرار دیا گیا ہے قلیل وکثیر کی کوئی تحدید نہیں کی گئی۔

(۳) مذکورہ روایت کو امام ابوحنیفہؒ نے "حکم بن عتیبہ عن القاسم بن مخیمرہ عن شریح بن ھانئ عن علیؓ بن ابی طالب" کے طریق سے اس طرح مرفوعاً روایت کیا ہے "یحرم من الرضاع مایحرم من النسب قلیلہ وکثیرہ"[۴] یہ روایت جہاں جمہور کے مسلک پر صریح ہے وہاں اس کے رجال بھی ثقات واثبات ہیں اور امام ابوحنیفہؒ کے سوا سب صحیح مسلم کے رجال ہیں۔

(۴) سنن نسائی[۵] میں قتادہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں "کتبنا إلی إبراھیم بن یزید النخعی نسأله عن الرضاع، فکتب أنّ شریحاً حدّثنا أنّ علیاً وابن مسعودؓ کانا یقولان: یحرم من الرضاع مایحرم من النسب قلیله وکثیره"

(۵) مؤطا امام محمد[۶] میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں "ماکان من الحولین وإن کانت مصّة واحدة فھی تحرم"

---

[۱] سورۂ نساء آیت ۲۳ پ ۴ ۱۲ م

[۲] دیکھئے (ج ۲ ص ۱۲۳ تا ص ۱۲۶) مطلب اختلاف السلف فی التحریم بقلیل الرضاع ۱۲ م

[۳] سنن نسائی (ج ۲ ص ۸۱) مایحرم من الرضاع ۱۲ م

[۴] جامع المسانید للخوارزمی (ج ۲ ص ۹۰) الباب الثالث والعشرون فی النکاح، نیز دیکھئے عقود الجواھر المنیفة (ج ۱ ص ۱۵۹) باب الرضاع ۱۲ م

[۵] (ج ۲ ص ۸۲) القدر الذی یحرم من الرضاعة ۱۲ م

[۶] (ص ۲۷۶) باب الرضاع ۱۲

(۶) مصنف[1] عبدالرزاق میں بھی حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایک روایت ایسی مروی ہے جس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رضاعت کی چھوٹی بڑی ہر مقدار محرّم ہے۔

(۷) اگلے باب (فی شہادۃ المرأۃ الواحدۃ فی الرضاع) میں حضرت عقبہ بن حارثؓ کی حدیث آرہی ہے جو صحیح بخاری[2] میں بھی ہے جس میں آپ نے صرف "انی قد ارضعتکما" سنکر "دعہا عنک" کا حکم دیدیا اور یہ سوال نہیں فرمایا کہ رضاعت کتنی مرتبہ ہوئی۔

(۸) مصنف[3] عبدالرزاق میں متعدد آثار ایسے مروی ہیں جو ہر قلیل وکثیر مقدار کے محرّم ہونے پر دال ہیں۔

جہاں تک حدیثِ باب کا تعلق ہے وہ حضرت علیؓ کی مذکورہ بالا روایت سے منسوخ ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ امام جصاصؒ نے احکام القرآن[4] میں اپنی سند سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا اثر روایت کیا ہے کہ کسی نے ان کے سامنے "لا تحرم الرضعۃ ولا الرضعتان" کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا "قد کان ذلک فأما الیوم فالرضعۃ الواحدۃ تحرم"

نسخ کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ صحیح مسلم[5] میں حضرت عائشہؓ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ "کان فیما أنزل من القرآن عشر رضعات معلومات یحرمن، ثم نسخن بخمس معلومات، فتوفی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وھی فیما یقرأ من القرآن" حالانکہ مصاحف عثمانیہ میں کہیں بھی خمس رضعات کے الفاظ موجود نہیں جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ الفاظ بھی بعد میں منسوخ ہو گئے تھے۔

رہے اس حدیث کے یہ الفاظ کہ "فتوفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھی فیما یقرأ من القرآن" سو ان کے بارے میں امام طحاویؒ نے مشکل الآثار میں فرمایا کہ یہ زیادتی عبداللہ

---

[1] (ج ۷، ص۴۶۶، رقم ۱۳۹۱۱ باب القلیل من الرضاع ۱۲ م

[2] (ج ۲ ص۷۶۵ و ۷۶۶) کتاب النکاح، باب شہادۃ المرضعۃ ۱۲ م

[3] دیکھئے (ج ۷، ص۴۶۶ تا ۴۷۰) ۱۲

[4] (ج ۲ ص۱۲۵ مطلب اختلف السلف فی التحریم بقلیل الرضاع ۱۲ م

[5] (ج ۱ ص۴۶۹).

بن ابی بکرؒ کا تفرد ہے اور عمرہ کے دوسرے شاگرد یحییٰ[1] بن سعید انصاری اور قاسم[2] بن محمد جو عبداللہ بن أبی بکر سے زیادہ احفظ ہیں اس کو روایت نہیں کرتے لہٰذا یہ عبداللہ بن أبی بکر کا وہم ہے[3]۔

اور اگر بالفرض اس کو صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی "وھی فیما یقرأ من القرآن" کا مطلب کسی کے نزدیک بھی یہ نہیں ہے کہ یہ خمس رضعات آخر وقت تک قرآن کریم کا جز تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے چند ہی دن پہلے منسوخ ہوئے اس لئے بعض صحابہ کرام کو ان کے نسخ کا پتہ نہ چل سکا، چنانچہ بعض صحابہ آپؐ کی وفات تک بطور قرآن ان الفاظ کی تلاوت کرتے رہے، علامہ نوویؒ نے اس کے یہی معنیٰ بیان کئے ہیں[4]، حضرت شیخ الہندؒ نے بھی اس کا یہی مطلب بیان کیا ہے[5]، ورنہ ظاہر ہے کہ اگر حضرت عائشہؓ کا منشأ یہ ہوتا کہ یہ الفاظ غیر منسوخ ہیں تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ان کو مصحف میں شامل کرانے کی کوشش نہ کرتیں؟

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ بالکل آخری عہد نبوی میں نسخ کی وجہ سے خود حضرت عائشہؓ کو نسخ کا علم نہ ہو سکا ہو اور یہ کوئی بعید نہیں۔

بعض شافعیہ اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ ان الفاظ کا منسوخ ہونا تو مسلّم ہے لیکن یہ صرف منسوخ التلاوۃ ہیں منسوخ الحکم نہیں۔

لیکن علامہ ابن ہمامؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ نسخ میں اصل یہ ہے کہ الفاظ کے ساتھ حکم بھی منسوخ ہو، الفاظ کے منسوخ ہونے کے بعد حکم کا منسوخ نہ ہونا کوئی دلیل

---

[1] یحییٰ بن سعید کی روایت کے لئے دیکھئے مسلم (ج ۱ ص ۴۶۹) ۱۲ م

[2] قاسم بن محمد کی روایت کے لئے دیکھئے مشکل الآثار للطحاوی (ج ۳ ص ۶) کذا فی تکملۃ فتح الملہم (ج ۱ ص ۵۰) ۱۲ مرتب

[3] دیکھئے المعتصر من المختصر من مشکل الآثار (ج ۱ ص ۲۲۱) و فیہ: مع أنہ (أی کون خمس رضعات من القرآن) محال لأنہ یلزم أن یکون بقی من القرآن مالم یجمعہ الراشدون المھدیون، ولو جاز ذلک لاحتمل ان یکون ما أثبتوہ فیہ منسوخاً وما قصروا عنہ ناسخاً، فیرتفع فرض العمل بہ، ونعوذ باللہ من ھذا القول وقائلیہ ۱۲ مرتب

[4] دیکھئے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۶۸) ۱۲ م

[5] دیکھئے انوار المحمود للنجیب آبادی (ج ۲ ص ۹، مطبوعہ دہلی ۱۳۵۶ھ) ۱۲

چاہتا ہے[1]، اور دلیل یہاں موجود نہیں، بلکہ اس کے خلاف دلائل موجود ہیں کما مرت۔ واللہ اعلم

باب ما جاء فی شهادة المرأة الواحدة فی الرضاع

عن عقبة بن الحارث قال: تزوجت امرأة فجاءتنا امرأة سوداء فقالت: إني قد أرضعتكما، فأتيت النبي صلى الله عليه وسلم فقلت: تزوجت فلانة بنت فلان فجاءتنا امرأة سوداء، فقالت: إني قد أرضعتكما وهي كاذبة، قال: فأعرض عني قال: فأتيته من قبل وجهه فأعرض عني بوجهه، فقلت: إنها كاذبة، قال: وكيف بها وقد زعمت أنها قد أرضعتكما دعها عنك"

اس حدیث کی بنا پر امام احمدؒ، امام اسحاقؒ اور امام اوزاعیؒ وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ رضاعت میں ایک عورت کی شہادت کافی ہے جبکہ وہ عورت خود مرضعہ ہو۔

جمہور کے نزدیک ایک عورت کی شہادت کافی نہیں، پھر مالکیہ کے نزدیک دو عورتوں کی شہادت کافی ہے، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نصابِ شہادت یعنی دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کا ہونا ضروری ہے، جبکہ امام شافعیؒ کے نزدیک چار عورتوں کی گواہی ضروری ہے شعبیؒ اور عطاءؒ کا بھی یہی مسلک ہے[2]۔

حنفیہ کی دلیل باری تعالیٰ کا فرمان ہے "فَإِنْ لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ"[3]۔

اور حدیثِ باب کا جواب یہ ہے کہ یہاں آپؐ نے بطور احتیاط علیحدگی کا حکم دیا، چنانچہ بخاری کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ "کیف وقد قیل دعها عنك[4]" یعنی جب ایک بات کہہ کر شبہ پیدا کر دیا گیا تو اب بیوی کو نکاح میں کیسے رکھو گے، کیونکہ شبہ کی کیفیت میں خوشگواری پیدا نہ ہوگی، اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آپؐ نے پہلی بار حضرت عقبہؓ کی بات سنکر اس پر فیصلہ نہیں

---

[1] فتح القدیر (ج ۳ ص ۳۰۶) کتاب الرضاع ۱۲ م

[2] دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۲۰ ص ۹۹) کتاب النکاح، باب شہادۃ المرضعۃ، اور فتح الباری (ج ۵ ص ۲۶۸ و ص ۲۶۹) کتاب الشہادات، باب شہادۃ المرضعۃ ۱۲ مرتب

[3] سورۂ بقرہ آیت (۲۸۲) پ ۳ ۱۲ م

[4] صحیح بخاری (ج ۱ ص ۳۶۳) کتاب الشہادات، باب شہادۃ المرضعۃ ۱۲ م

فرمایا بلکہ اعراض کیا، اگر ایک عورت کی شہادت کافی ہوتی تو آپؐ اسی وقت حرمت کا حکم دیدیتے۔
نیز شمس الائمہ سرخسیؒ نے مبسوط میں فرمایا کہ اس عورت کی یہ شہادت کسی کے مذہب میں بھی قانوناً قابلِ قبول نہیں تھی کیونکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عقبہ بن حارثؓ سے اس عورت کی کوئی رنجش پیدا ہوگئی تھی اور اس رنجش کے پیدا ہوتے ہی اس نے یہ شہادت دی، ظاہر ہے کہ یہ "شہادت الضغن" تھی جو کسی کے نزدیک بھی مقبول نہیں[1]، لہذا یہ حدیث حنابلہ کے نزدیک بھی واجب التاویل ہے اور احتیاط کے سوا اس کا کوئی محمل نہیں، چنانچہ امام بخاریؒ نے بھی یہ حدیث کتاب البیوع باب تفسیر المشتبہات میں ذکر کی ہے[2] جو احتیاط پر عمل کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے واللہ أعلم۔

باب ماجاء ما ذكر أنّ الرّضاعة لا تحرّم إلّا في الصغر دون الحولين

عن[3] أمّ سلمةؓ قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم "لا يحرم من الرضاعة إلّا ما فتق[4] الأمعاء في الثدي وكان قبل الفطام" مطلب یہ کہ حرمت رضاعت اس دودھ سے ثابت ہوتی ہے جو بچہ کے لئے باقاعدہ غذا ہو کہ اسکی موجودگی میں کسی دوسری غذا کی حاجت نہ ہو۔

---

[1] مبسوط سرخسی (ج ۵ ص۱۳۸) کتاب النکاح، باب الرضاع، اثبات الرضاع بشهادة النساء۔ فرماتے ہیں: والدليل عليه أن تلك الشهادة كانت عن ضغن فانه قال: جاءت امرأة سوداء تستطعمنا فأبينا أن نطعمها فجاءت تشهد على الرضاع، وبالإجماع بمثل هذه الشهادة لا تثبت الحرمة، فعرفنا أن ذلك كان احتياطاً على وجه التنزه۔ ۱۲ مرتب

[2] صحیح بخاری (ج ۱ ص۲۷۶ و ۲۷۵) ۱۲ م

[3] الحديث لم يخرجه من أصحاب الكتب الستة أحد سوى الترمذيؒ قاله الشيخ محمد فؤاد عبد الباقیؒ۔
سنن ترمذی (ج ۳ ص۴۵۸، تحت رقم ۱۱۵۲) ۱۲ مرتب

[4] من فتقه، شققته، أي ما وقع موقع الغذاء بأن يكون في أوان الرضاع، قوله في الثدي۔ حال من فاعل فتق أي فاتقاً منها ولا يشترط كونه من الثدي، فإن إيجار الصبي محرم۔ مجمع بحار الأنوار (ج ۴ ص۹۹) ۱۲ مرتب

یہ حدیث اس پر صراحۃً دال ہے کہ حرمتِ رضاعت مدّتِ رضاعت میں ثابت ہوتی ہے نہ کہ بعد میں، یہی جمہور کا قول ہے۔

البتہ علامہ ابن حزمؒ کا مسلک یہ ہے کہ رضاعت کی کوئی مدت متعین نہیں ہے بلکہ رضاعت صغر میں ہو یا بڑے ہونے کے بعد، ہر حال میں محرِّم ہے[1]، نیز ان کے نزدیک راضع کے لئے ضروری ہے کہ وہ براہِ راست منہ سے چوسے، چنانچہ برتن وغیرہ میں نکالے ہوئے دودھ سے ان کے نزدیک حرمتِ رضاعت ثابت نہ ہوگی[2]۔

ان کا استدلال حضرت عائشہؓ کی روایت سے ہے "أنّ[3] سالماً مولیٰ أبی حذیفۃ کان مع أبی حذیفۃ وأھلہ فی بیتھم، فأتت یعنی بنت سھیل النبی صلی اللہ علیہ وسلم، فقالت: إن سالما قد بلغ ما یبلغ الرجال وعقل ما عقلوا وإنہ یدخل علینا وإنی أظن أن فی نفس أبی حذیفۃ من ذلک شیئا، فقال لھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم: أرضعیہ تحرمی علیہ ویذھب الذی فی نفس أبی حذیفۃ، فرجعت إلیہ، فقالت: إنی قد أرضعتہ، فذھب الذی فی نفس أبی حذیفۃ"

لیکن طبقات ابن سعد میں واقدی کی ایک روایت میں اس کی تصریح ہے کہ حضرت سہلہ بنت سہیلؓ ایک برتن میں اپنا دودھ نکال لیتی تھیں جس کو "سالم" پی لیتے تھے "وکان بعد یدخل علیھا وھی حاسر، رخصۃ من رسول اللہ لسھلۃ بنت سھیل[4]"

اس تصریح سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ حضرت سہلہؓ نے براہِ راست دودھ نہ پلایا تھا وہاں یہ بھی پتہ چلا کہ بڑے ہونے کے بعد حرمت کا ثابت ہونا حضرت سہلہؓ کی خصوصیت تھی، دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے "واقعۃ حال لا عموم لھا" جبکہ حدیثِ باب جو جمہور کا مستدل ہے قاعدۂ کلیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

مدت رضاع سے متعلق اقوالِ فقہاء | پھر جمہور کا مدتِ رضاع کی تحدید میں اختلاف ہے۔

---

[1] المحلّٰی (ج ۱۰ ص ۱۹) رضاع الکبیر محرِّم مسئلہ ۱۸۶۹ ۱۲ م

[2] حوالۂ بالا (ج ۱۰ ص ۷) صفۃ الرضاع المحرّم مسئلہ ۱۸۶۶ ۱۲ م

[3] صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۶۹) ۱۲ م

[4] طبقات ابن سعد (ج ۸ ص ۲۷۱) فی تسمیۃ النساء المسلمات المبایعات من قریش وترجمۃ سھلۃ، نیز حافظ ابن حجرؒ نے بھی الإصابہ (ج ۴ ص ۳۳۹) میں حضرت سہلہؓ کے ترجمہ میں یہ بات ذکر کی ہے۔ کذا فی تکملۃ فتح الملہم (ج ۱ ص ۴۹) باب رضاعۃ الکبیر ۱۲ مرتب

جمہور کا مسلک یہ ہے کہ کل مدتِ رضاعت دو سال ہے، صاحبین کا بھی یہی مسلک ہے۔
امام مالکؒ کے نزدیک دو سال دو ماہ ہے[1]۔
امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مدتِ رضاعت ڈھائی سال ہے۔
امام زفرؒ کے نزدیک کل مدتِ رضاعت تین سال ہے[2]۔

جمہور کا استدلال فرمانِ باری تعالیٰ "وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ[3]" سے ہے، نیز حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے فرماتے ہیں "قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لا رضاع إلا ما كان في الحولين[4]"

امام ابو حنیفہؒ "وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ" سے جمہور کے استدلال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ "حولین" کے ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ حولین کے بعد رضاع درست نہ ہو بلکہ آگے "فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا" میں "فَاِنْ" کی فا تعقیب کے لئے ہے جو اس پر دال ہے کہ "فصال" بعد الحولین ہوگا جس سے معلوم ہوا کہ حولین کے بعد بھی رضاع پایا جاسکتا ہے، معلوم ہوا کہ یہ آیت مدتِ رضاعت کی تحدید کے لئے نہیں آئی بلکہ اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ "مولود له" یعنی اب کے ذمہ مرضعہ کا نفقہ دو سال کے دائرہ میں لازم ہے اس سے زائد میں نہیں[5]۔

---

[1] امام مالکؒ کی اس بارے میں متعدد روایتیں ہیں، ایک جمہور کے مطابق، دوسری "حولان وشہر" تیسری وہ جو تقریر میں مذکور ہے، چوتھی امام ابو حنیفہؒ کے مطابق، پانچویں یہ کہ دو سال اور مزید اتنی مدت جس میں بچہ دوسری غذا کا عادی ہو سکے۔ کذا فی فتح القدیر (ج ۳ ص۳۰۸) نیز دیکھئے فتح الباری (ج ۹ ص۱۴۶) باب من قال لا رضاع بعد حولین۔ ۱۲ مرتب

[2] مذکورہ مذاہب کے لئے دیکھئے فتح القدیر (ج ۳ ص۳۰۸) کتاب الرضاع ۱۲ م

[3] سورۂ بقرہ آیت ۲۳۳ پ ۲ ۱۲ م

[4] رواه الدارقطني في سننه (ج ۴ ص۱۷۴، رقم ۱۰، الرضاع) وقال: لم يسنده عن ابن عيينةؒ غير الهيثم بن جميل وهو ثقة حافظ"۔

امام نسائیؒ فرماتے ہیں والهيثم بن جميل وثقه الإمام أحمد والعجلي وابن حبان وغير واحد وكان من الحفاظ إلا أنه وهم في رفع هذا الحديث والصحيح وقفه على ابن عباسؓ" كذا في نصب الراية (ج ۳ ص۲۱۹)، وراجع لطرقه الموقوفة۔ ۱۲ مرتب عفی عنہ

[5] اس جواب کے لئے دیکھئے فتح القدیر (ج ۳ ص۳۰۹) اور تکملہ فتح الملہم (ج ۱ ص۵۳-۵۴) مسألة مدة الرضاع ۱۲ مرتب

جمہور کا ایک استدلال اس آیت سے بھی ہے "وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا"[1] کہ اقلِ مدتِ حمل چھ ماہ ہے فبقی للفصال حولان[2]۔

امام ابو حنیفہؒ کا استدلال بھی اسی آیت سے ہے صاحب ہدایہؒ نے اس استدلال کو اس طرح بیان کیا ہے کہ باری تعالیٰ نے اس آیت میں دو چیزوں کا ذکر کرکے ان کی مدت بیان کی ہے، جس کا تقاضا یہ تھا کہ حمل اور رضاعت ہر ایک کے لئے تیس[30] ماہ کی مدت ہوتی "کالأجل المضروب للدینین" لیکن حمل کے حق میں ایک منقِّص پایا گیا یعنی حضرت عائشہؓ کی روایت "لا یکون الحمل أکثر من سنتین قدر ما یتحول ظل المغزل"[3] اس لئے اکثر مدتِ حمل دو سال ہوئی[4]۔

لیکن حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں "وما أجاب به صاحب الهداية ههنا فهو رکیک جدا" اس لئے کہ اس میں حضرت عائشہؓ کے اثر سے آیت کا منسوخ ہونا لازم آرہا ہے[5] جو درست نہیں۔

لہٰذا صحیح جواب وہ ہے جو علامہ نسفیؒ نے دیا ہے کہ "حملہ" کا مطلب "حمل علی الأیدی" ہے، گویا آیت میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ مدتِ رضاعت ڈھائی سال ہے جو عادۃً بچہ کو گود میں اٹھانے کا بھی زمانہ ہے[6]۔

---

[1] سورۂ احقاف آیت (۱۵) پ ۲۶ ۱۲م

[2] فتح القدیر (ج ۳ ص ۳۰۹) ۱۲م

[3] سنن دارقطنی (ج ۳ ص ۳۲۲، رقم ۲۸۰) باب المهر۔ نیز دیکھئے سنن کبریٰ بیہقی (ج ۷ ص ۴۴۳) کتاب العدد، باب ماجاء فی أکثر الحمل۔ حضرت عائشہؓ کا یہ اثر اگرچہ موقوف ہے لیکن غیر مدرک بالقیاس ہونے کی وجہ سے مرفوع کے حکم میں ہے ۱۲ مرتب

[4] دیکھئے ہدایہ مع فتح القدیر (ج ۳ ص ۳۰۸) کتاب الرضاع ۱۲م

[5] اس پر اگر کوئی کہے کہ حضرت عائشہؓ کا اثر ناسخ نہیں بلکہ مخصِّص ہے تو اس کو ہم یہ جواب دیں گے کہ تخصیص عام میں ہوتی ہے جبکہ آیت میں عدد کا ذکر ہے جو خاص کی قبیل سے ہے لہٰذا اثر ناسخ ہی بنے گا مخصِّص نہیں۔ کذا فی فیض الباری (ج ۴ ص ۲۷۸) باب من قال لا رضاع بعد الحولین۔ ۱۲ مرتب

[6] علامہ نسفیؒ نے یہ جواب امام ابو حنیفہؒ کی طرف منسوب کرتے ہوئے ذکر کیا ہے۔ دیکھئے تفسیر مدارک (ج ۵ ص ۲۵) جبکہ فیض الباری (ج ۴ ص ۲۷۸) میں اس جواب کو زمخشری کی طرف منسوب کیا گیا ہے، لیکن زمخشری کی کشاف میں یہ جواب نہ مل سکا ۱۲ مرتب

اس پر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ آیت "حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا"[1] میں ظاہر ہے کہ حمل سے مراد حمل فی البطن ہے نہ کہ "حمل علی الأیدی والأکف" جس کا تقاضا یہ ہے کہ "وحمله وفصاله" میں بھی حمل فی البطن ہی مراد ہو، تو ہم اس کا یہ جواب دیں گے کہ دراصل اس آیت میں بچہ کی خاطر ماں کے مشقت اٹھانے کے مختلف مراحل کو بیان کیا گیا ہے یعنی:

(۱) حملته أمه کرها أی فی البطن (۲) ووضعته کرها (۳) وحمله أی علی الأیدی (۴) وفصاله۔

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ جمہور اور صاحبینؒ کا مسلک دلائل کی رُو سے نہایت قوی اور راجح ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں[2]: "ولایخفی قوۃ دلیلهما" اس لئے کہ آیت "وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ" میں آگے "لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ" کے الفاظ اس پر دال ہیں کہ حولین کے تام ہونے کے بعد رضاعت نہیں

اس پر اگر کوئی شبہ کرے کہ "فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا" کے الفاظ اس پر دال ہیں کہ حولین کے بعد فصال رضامندی اور مشورہ پر موقوف ہے معلوم ہوا کہ رضامندی نہ ہو تو حولین کے بعد بھی دودھ پلایا جاسکتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تراضی اور تشاور حولین کے اندر اندر ہے، حولین کے بعد ان کی حاجت ہی نہیں بلکہ دودھ نہ پلانا متعین ہے واللہ اعلم

تم شرح الباب بزیادات من المرتب۔

باب ماجاء فی الأمة تعتق ولها زوج

باندی کی آزادی کے وقت اگر اس کا شوہر غلام ہو تو بالاتفاق باندی کو خیار ملتا ہے کہ وہ شوہر کو اختیار کرنا چاہے تو اختیار کرلے اور چھوڑنا چاہے تو چھوڑ دے، اس خیار کو خیارِ عتق کہا جاتا ہے۔

اور اگر باندی کا شوہر آزاد ہو تو باندی کو خیارِ عتق کے ملنے نہ ملنے کے بارے میں اختلاف

---

[1] سورۂ احقاف آیت ۱۵ پ ۲۶۔ ۱۲م

[2] البحرالرائق (ج ۳ ص ۲۲۳) کتاب الرضاع ۱۲م

ہے، حنفیہ کے نزدیک اس صورت میں بھی خیارِ عتق ہے[1] جبکہ ائمہ ثلاثہ اس صورت میں خیارِ عتق کے قائل نہیں[2]۔

حنفیہ کا استدلال حضرت بریرہؓ کی آزادی کے واقعہ سے ہے "عن الأسود عن عائشة قالت کان زوج بریرة حرًا فخیّرها رسول الله صلی الله علیه وسلم[3]"

ائمہ ثلاثہؒ کا استدلال بھی حضرت بریرہؓ ہی کے واقعہ سے ہے جو اسی باب میں ھشام بن عروہ عن أبیہ عن عائشہؓ کے طریق سے اس طرح مروی ہے "قالت: کان زوج بریرة عبدًا فخیّرها رسول الله صلی الله علیه وسلم، فاختارت نفسها، ولو کان حرًّا لم یخیّرها۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک "ولو کان حرًّا لم یخیّرها" کے جملہ کا تعلق ہے سو وہ حدیث کا جزء نہیں بلکہ عروہ کا قول ہے چنانچہ نسائی کی روایت میں اس کی تصریح بھی ہے[4] اور یہ قول ان کے اجتہاد کی حیثیت رکھتا ہے جو مجتہد پر حجت نہیں۔

اور جہاں تک روایت میں زوجِ بریرہ کے عبد ہونے کی تصریح کا تعلق ہے اس کا حضرت عائشہؓ کی روایت کے اس طریق سے تعارض ہے جو حنفیہ کا مستدل ہے اب یا تو ان دونوں میں ترجیح کا طریقہ اختیار کیا جائے گا یا تطبیق کا۔

اگر ترجیح کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اسود کی روایت راجح ہے، جس کی تحقیق علامہ ابن القیمؒ کے بیان کے مطابق اس طرح ہے کہ یہ واقعہ حضرت عائشہؓ سے تین راویوں نے روایت کیا ہے، اسود، عروہ اور قاسم بن محمد۔

ان میں سے عروہ سے دو صحیح متعارض روایات مروی ہیں: ایک زوجِ بریرہؓ کے آزاد ہونے

---

[1] طاؤسؒ، ابن سیرینؒ، مجاہدؒ، ابراہیم نخعیؒ، حمادؒ اور سفیان ثوریؒ کا بھی یہی مسلک ہے دیکھئے المغنی (ج ۶ ص ۶۵۹) کتاب النکاح، عتق الأمة و زوجها عبد أو حر۔ ۱۲ مرتب

[2] عبد اللہ بن عمرؓ، عبد اللہ بن عباسؓ، سعید بن المسیبؒ، حسن بصریؒ، عطاءؒ، سلیمان بن یسارؒ، ابو قلابہؒ، ابن ابی لیلیؒ، اوزاعیؒ اور امام اسحاقؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ حوالۂ بالا۔ ۱۲ مرتب

[3] أخرجه الترمذی فی الباب وأبوداود فی سننه (ج ۱ ص ۳۰۲) کتاب الطلاق، باب من قال کان حرًّا، والنسائی فی سننه (ج ۱ ص ۳۶۶) کتاب الزکوٰة، إذا تحولت الصدقة ۱۲ مرتب

[4] چنانچہ نسائی میں یہ الفاظ آئے ہیں "قال عروة: فلو کان حرًّا ما خیّرها رسول الله صلی الله علیه وسلم" دیکھئے (ج ۲ ص ۱۰۰) کتاب الطلاق، باب خیار الأمة تعتق وزوجها مملوك ۱۲ مرتب

کی[1] اور دوسرے ان کے غلام ہونے کی[2]، قاسم بن محمد سے بھی دو روایتیں مروی ہیں ایک حر ہونے کی[3] جبکہ دوسری روایت میں حر یا عبد ہونے میں شک ہے[4]، ان دونوں کے مقابلہ میں اسود کی روایت میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ اس میں زوجِ بریرہ کے صرف حر ہونے کا ذکر ہے[5]، لہٰذا اسود کی حر ہونے سے متعلقہ روایت راجح ہے[6]، اس کے علاوہ اسود کی روایت کو مثبتِ زیادت ہونے کی بناء پر بھی ترجیح ہے۔

اور اگر تطبیق کا طریقہ اختیار کیا جائے تو علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ رواۃ کا ایسی دو صفتوں میں اختلاف ہے جو بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں یعنی حریت اور عبدیت، اس لئے ہم ان دونوں صفتوں کو دو علیحدہ علیحدہ حالتوں میں مانیں گے اور کہیں گے کہ "إنہ کان عبداً فی حالۃٍ، حرّاً فی حالۃٍ أخریٰ" اس صورت میں یقیناً ایک حالت مقدم ہوگی اور دوسری مؤخر، اور یہ امر متعین ہے کہ رقیت کے بعد حریت آسکتی ہے لیکن حریت کے بعد رقیت نہیں آسکتی جس کا تقاضا یہ ہے کہ رقیت مقدم ہو اور حریت مؤخر، ثابت ہوا کہ جس وقت حضرت بریرہؓ کو خیار ملا اس وقت ان کے شوہر آزاد تھے اور اس سے قبل غلام[7]۔

علامہ عینیؒ کے کلام کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو حافظؒ نے الإصابہ میں مغیث کے ترجمہ کے تحت ذکر کی ہے اس میں یہ الفاظ آئے ہیں "وکان اسم زوجہا مغیثاً وکان مولی، فخیّرہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" اس روایت میں لفظ "مولیٰ" صراحۃً آیا ہے[8]

---

[1] عروہ کی یہ روایت تلاش کے باوجود نہ مل سکی ۱۲ م

[2] دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۹۴) کتاب العتق، باب بیان الولاء لمن اعتق ۱۲ م

[3] یہ روایت بھی نہ مل سکی، البتہ قاسم بن محمد کی زوجِ بریرہ کے عبد ہونے سے متعلق روایت ملی، دیکھئے سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۳۰۴) کتاب الطلاق، باب فی المملوکۃ تعتق وھی تحت حرٍّ أو عبد ۱۲ م

[4] دیکھئے مسلم (ج ۱ ص ۴۹۴) ۱۲ م

[5] یہ روایت ترمذی کے زیرِ بحث باب کے علاوہ سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۳۰۴) باب من قال کان حرّاً، میں بھی آئی ہے ۱۲ م

[6] مذکورہ تفصیل بذل المجہود (ج ۱ ص ۲۲۱) باب فی المملوکۃ الخ سے ماخوذ ہے بحوالہ الہدیٰ لابن القیمؒ ۱۲ مرتب

[7] مذکورہ تفصیل کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۲۰ ص ۲۶۹) کتاب الطلاق، باب خیار الأمۃ تحت العبد ۱۲ مرتب

[8] حافظؒ نے یہ الفاظ اسود کی روایت میں امام ترمذیؒ کے حوالہ سے نقل کئے ہیں (لیکن سنن ترمذی میں یہ روایت احقر کو نہ مل سکی) دیکھئے الاصابہ (ج ۳ ص ۴۵۲، رقم ۸۱۶۲) ۱۲ مرتب

جو آزاد کردہ کے لئے استعمال ہوتا ہے، عین ممکن ہے کہ جن روایات میں لفظ "عبد" آیا ہے وہ "مولی" کے معنی میں ہو، لہٰذا روایات میں نہ کوئی تعارض ہے اور نہ ہی حنفیہ کے مسلک پر کوئی اشکال۔

البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ "عبدیت" کی روایت اسی باب میں حضرت ابن عباسؓ کی اگلی حدیث سے مؤید ہے "أن زوج بريرة كان عبدا أسود لبني المغيرة يوم اعتقت بريرة" اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کو حریت کا علم نہ ہوا ہوگا اور ان کا بیان حضرت عائشہؓ کے بیان کا معارضہ نہیں کر سکتا، اس لئے کہ وہ بریرہؓ کی معتقہ اور صاحبِ معاملہ تھیں۔

پھر واضح رہے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مغیث حضرت بریرہؓ کی آزادی کے وقت غلام تھے تب بھی اس سے حنفیہ کی تردید نہیں ہوتی، کیونکہ اس صورت میں حنفیہ کا مسلک قیاس سے ثابت ہوگا، اور وہ اس طرح کہ حضرت بریرہؓ کو اختیار دینے کی علت یہ تھی کہ نکاح کے وقت ان کی مرضی عقد میں مؤثر نہ تھی بلکہ مولیٰ کی مرضی سے نکاح ہوا تھا، آزادی کے وقت ان کو اپنی مرضی استعمال کرنے کا حق دیا گیا، اور یہ علت اس صورت میں بھی پائی جاتی ہے جبکہ زوج حر ہو۔ واللہ اعلم

باب ما جاء أن الولد للفراش

"عن أبي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الولد للفراش وللعاهر الحجر[1]"

یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے اور اکثر محدثین کے نزدیک متواتر ہے[2] چنانچہ یہ روایت بیس[20] سے زائد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے[3]،

---

[1] ترجمہ: بچہ فراش کی طرف منسوب ہوگا اور زانی کے لئے پتھر ہیں ۱۲ م

[2] چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اس کو احادیثِ متواترہ میں سے شمار کیا ہے، دیکھئے تکملۂ فتح الملہم (ج ۱ ص ۸۵) قبیل باب العمل بالحاق القائف الولد، کتاب الرضاع بحوالۂ تکملۂ شرح المہذب للمطیعی (ج ۱۶ ص ۲۱۶)۔

اور علامہ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں: حدیث "الولد للفراش" هو من أصح ما يروى عن النبي صلى الله عليه وسلم جاء عن بضعة وعشرين من الصحابة۔ كذا في العمدة (ج ۲۳ ص ۲۵۱) کتاب الفرائض، باب الولد للفراش الخ والفتح للحافظؒ (ج ۱۲ ص ۳۹) ۱۲ مرتب

[3] رواۃ صحابۂ کرام اور ان کی روایات کا اجمالی خاکہ حسب ذیل ہے: (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

(۱) روایتِ حضرت عمر فاروقؓ، مسند احمد (ج ۱ ص ۲۵) مسند عمرؓ۔

(۲) " حضرت عثمان غنیؓ، مسند احمد (ج ۱ ص ۵۹ و ۶۵ و ۱۰۴) مسند عثمان رضؓ۔

(۳) " حضرت عائشہؓ، بخاری (ج ۱ ص ۲۷۶) کتاب البیوع، باب تفسیر المشبہات،

(۴) " حضرت ابوامامہ باہلیؓ، مسند احمد (ج ۵ ص ۲۶۷) مسند ابوامامہ۔

(۵) " حضرت ابوہریرہؓ، ترمذی کی مذکورہ حدیثِ باب۔

(۶) " حضرت عمرو بن خارجہؓ، سنن ابن ماجہ (ص ۱۹۴) ابواب الوصایا، باب لاوصیۃ لوارث۔

(۷) " حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، سنن نسائی (ج ۲ ص ۱۱۰) کتاب الطلاق، باب الحاق الولد بالفراش۔

(۸) " حضرت علی رضؓ، مسند احمد و مسند بزار۔

(۹) " حضرت عبداللہ بن عمرؓ، مسند بزار۔

(۱۰) " حضرت معاویہؓ، مسند ابویعلیٰ۔

(۱۱) " حضرت عبداللہ بن عباسؓ، معجم طبرانی۔

(۱۲) " حضرت براء بن عازبؓ، معجم طبرانی۔

(۱۳) " حضرت زید بن ارقمؓ، معجم طبرانی۔

(۱۴) " حضرت عبادۃ بن الصامتؓ، معجم طبرانی و مسند احمد۔

(۱۵) " حضرت ابومسعودؓ، معجم طبرانی۔

(۱۶) " حضرت واثلۃ بن الاسقعؓ، معجم طبرانی۔

(۱۷) " حضرت ابو وائلؓ، معجم طبرانی۔

مذکورہ حوالوں میں ۸ تا ۱۷ کل دس روایتوں کے لئے دیکھئے مجمع الزوائد (ج ۵ ص ۱۳ تا ۱۵) کتاب الطلاق، باب الولد للفراش۔

(۱۸) روایت حضرت عبداللہ بن عمروؓ، سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۳۱۰) کتاب الطلاق، باب الولد للفراش۔

(۱۹) " حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، سنن نسائی (ج ۲ ص ۱۱۰) کتاب الطلاق باب الحاق الولد بالفراش الخ

نسائی میں یہ روایت ابن مسعود کی تصریح کے بغیر آئی ہے، البتہ علامہ عینیؒ نے ابن مسعودؓ کی روایت کے لئے نسائی ہی کا حوالہ دیا ہے۔

(۲۰) روایت حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، مسند بزار۔

(۲۱) " حضرت حسین بن علی رضؓ، معجم طبرانی، آخری دونوں روایتوں میں حدیث کا صرف پہلا جملہ روی ہے

دیکھئے مجمع الزوائد (ج ۵ ص ۱۳ و ص ۱۵) ۱۲ مرتب عفی عنہ

اس روایت میں "حجر" سے کیا مراد ہے؟ بعض حضرات نے "حجر" سے خیبت کے معنی مراد لئے ہیں یعنی "حرمان الولد الذی یدّعیہ" اور بعض نے "حجر" سے رجم کے معنی مراد لئے ہیں، حافظؒ نے پہلے معنی کو راجح قرار دیا ہے[1]۔

احقر عرض کرتا ہے کہ اگرچہ سیاقِ حدیث سے پہلے معنی راجح معلوم ہوتے ہیں لیکن رجم کے معنی کی طرف بھی اشارہ مقصود ہے "ومثل ذلک کثیر فی کلام البلغاء"۔

پھر احناف کے نزدیک فراش کی تین قسمیں ہیں:

(۱) فراشِ قوی، جو منکوحہ کا فراش ہے جس میں نسب بغیر دعویٰ نسب ثابت ہو جاتا ہے اور انکار سے منتفی نہیں ہوتا الّا یہ کہ شوہر لعان کرے۔

(۲) فراشِ متوسط، جو امّ ولد کا فراش ہے اس کے دوسرے بچہ سے نسب بغیر دعوہ ثابت ہو جاتا ہے، یعنی مولیٰ کا سکوت ثبوتِ نسب کے لئے کافی ہے البتہ نسب کی نفی سے نسب منتفی ہو جاتا ہے لعان کی حاجت نہیں ہوتی۔

(۳) فراشِ ضعیف، جو عام باندیوں کا فراش ہے جس میں ثبوتِ نسب کے لئے دعویٰ ضروری ہے البتہ مولیٰ پر دیانۃً دعویٰ نسب لازم ہے[2]۔

حدیثِ باب کی بناء پر کتبِ حنفیہ میں یہ مسئلہ لکھا گیا ہے کہ اگر شوہر مشرق میں ہو اور بیوی مغرب میں، اور بیوی کے اولاد ہو جائے تب بھی نسب ثابت ہو جاتا ہے خواہ کئی سال سے ملاقات ثابت نہ ہو، کیونکہ یہ فراشِ قوی ہے[3] "والولد للفراش"۔

اس پر شافعیہ وغیرہ نے اعتراض کیا ہے کہ یہ مسئلہ بالکل غیر معقول ہے اور الفاظِ حدیث پر غیر معمولی جمود ہے[4]۔

حضرت شاہ صاحبؒ جواب میں فرماتے ہیں کہ مسئلہ معقول ہے اس لئے کہ اگر بچہ فی الواقع

---

[1] فتح الباری (ج ۱۲ ص ۳۶ و ص ۳۷) کتاب الفرائض، باب الولد للفراش الخ وراجعہ لمزید التفصیل ۱۲ م

[2] دیکھئے فیض الباری (ج ۳ ص ۱۸۹) کتاب البیوع، باب تفسیر المشبّہات ۱۲ م

[3] البحر الرائق (ج ۴ ص ۱۵۵) باب ثبوت النسب ۱۲ م

[4] فتح الباری (ج ۱۲ ص ۳۵) کتاب الفرائض، باب الولد للفراش، اور شرح نووی علیٰ صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۷۰) باب الولد للفراش، کتاب الرضاع ۱۲ مرتّب

شوہر کانہ ہو تو شوہر پر لعان کرنا واجب ہے اور ترکِ لعان حرام، جب خود شوہر اس واجب پر عمل نہیں کررہا تو یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ دونوں کے درمیان کوئی ملاقات ہوئی ہے[1] اور وہ ملاقات ممکن بھی ہے خواہ کرامۃً ہی کیوں نہ ہو، اور پھر ہمارے زمانہ میں جبکہ تیز رفتار سواریاں ایجاد ہوچکی ہیں اس میں زیادہ استبعاد بھی باقی نہیں رہتا۔

اس کے علاوہ اگر حدیثِ باب کے الفاظ کو دقّتِ نظر سے دیکھا جائے تو مسلکِ احناف کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے، اس لئے کہ "الولد للفراش" کے بعد "وللعاهر الحجر" کا اضافہ اس بات کی طرف اشارہ کررہا ہے کہ حدیث اس صورت سے بحث کررہی ہے جب ظاہرِ حالات سے زنا کا ارتکاب نظر آتا ہو کہ اس صورت میں بھی ولد کی نسبت فراش ہی کی طرف ہوگی "فتبيّن أن الأمر يدور مع الفراش لامع حقيقة العلوق، فإن العلوق امر مخفي لاسبيل إلى القطع به"

حقیقت یہ ہے کہ شریعت نے ثبوتِ نسب کے معاملہ میں انتہائی احتیاط سے کام لیا ہے اور حتی الإمکان انساب کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی حکمت یہ ہے کہ غیر ثابت النسب ہونے سے ایک شخص کی زندگی اس کے کسی جرم کے بغیر برباد ہوجاتی ہے، اگرچہ شریعت نے اپنے احکام میں ولد الزنا کے ساتھ کوئی خاص امتیاز نہیں برتا لیکن یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ ولد الزنا کو معاشرہ میں وہ مقام دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا جو ایک ثابت النسب شخص کو حاصل ہوتا ہے۔

دوسری طرف نفس الامری طور پر نسب کا ثبوت ایک ایسا معاملہ ہے جس کی تحقیق سوائے ماں کے اور کسی کو نہیں ہوسکتی یہاں تک کہ باپ کو بھی نہیں، اس لئے اس مسئلہ کا مدار اس کی ظاہری علامت یعنی فراش کو بنایا گیا ہے، اب جہاں فراش پایا جائیگا وہاں ثبوتِ نسب

---

[1] فیض الباری (ج ۳ ص ۱۸۹ و ۱۹۰) ۔ وفيه: ولكنهم شرطوا (اى الشافعية) إمكان الوطء أيضاً بعد ثبوت الفراش، (وعند الحنفية ليس بشرط بل يكفي ثبوت الفراش)..... ثم إنه ماذا يكون باشتراط الإمكان؟ لاحتمال أن يكون التقيا في محل ثم لم يجامعها الزوج وأتت بولد في تلك المدة أو جامعها ولم تحمل منه و زنت ۔ والعياذ بالله ۔ وعلقت منه فهذه الاحتمالات لاتنقطع أبداً وإن تفاوتت قوةً وضعفاً، فالذي يدور عليه امر النسب هو الفراش، وليس على القاضي أن يتجسس سرائر الناس ۱۲ مرتب

ہو جائے گا بشرطیکہ کوئی عقلی استحالہ یا شرعی محظور لازم نہ آئے، اور زیر بحث صورت میں نہ عقلی استحالہ ہے نہ شرعی محظور اس لئے بچہ کی زندگی درست کرنے کے لئے اسے ثابت النسب قرار دینا ضروری ہے اور لعان کی صورت میں شوہر کے حق کی رعایت بھی موجود ہے۔

واللہ أعلم وعلمہ أتم وأحکم۔

باب[1] ماجاء فی کراهیة أن تسافر المرأة وحدها

عن[2] أبی سعید الخدری قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یحل لامرأة تؤمن باللہ والیوم الآخر أن تسافر سفرًا یکون ثلاثة أیام فصاعدًا إلا ومعها أبوها أو أخوها أو زوجها أو ابنها أو ذو محرم منها۔

عورت اگر مکہ مکرمہ سے مسافت سفر کے فاصلہ پر ہو تو امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ وغیرہ کے نزدیک سفرِ حج میں زوج یا محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے اور اس شرط کے بغیر ان کے نزدیک وجوبِ حج نہ ہوگا بلکہ سفرِ حج جائز بھی نہ ہوگا،

جبکہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک زوج یا محرم کا ساتھ ہونا "وجوب حج علی المرأة" کی شرط نہیں بلکہ اس کے بغیر بھی حج لازم ہو جائیگا بشرطیکہ یہ سفرِ حج ایسے مامون رفقاء کے ساتھ ہو جن میں قابلِ اعتماد عورتیں بھی ہوں[3]،

مالکیہ اور شافعیہ کا استدلال فرضیتِ حج سے متعلقہ عمومی نصوص سے ہے جو اس لحاظ سے مطلق بھی ہیں کہ ان میں محرم ہونے کی کوئی شرط نہیں۔ مثلاً "وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا[4]" اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "أیها الناس قد فرض علیکم الحج فحجوا[5]"، نیز عدی بن حاتمؓ کی روایت میں

---

[1] شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲ م

[2] الحدیث أخرجہ البخاری (ج ۱ ص ۲۵۱) أبواب العمرة، باب حج النساء، ومسلم (ج ۱ ص ۴۳۳) کتاب الحج، باب سفر المرأة مع محرم الخ ۱۲ م

[3] دیکھئے بدایة المجتہد (ج ۱ ص ۲۳۵) کتاب الحج، الجنس الأول، اور فتح القدیر (ج ۲ ص ۱۳۰) کتاب الحج ۱۲ مرتب

[4] سورۂ آل عمران آیت (۹۷) پ ۴ ۱۲ م

[5] صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۳۲) باب فرض الحج مرة فی العمر ۱۲ م

آپ کا فرمان ہے "والذی نفسی بیدہ لَیُتِمَّنَّ اللہ ھٰذا الأمرحتی تخرج الظعینۃ من الحِیْرۃ فتطوف بالبیت فی غیرجوار أحدٍ[1]"

حنفیہ اور حنابلہ کا استدلال درج ذیل دلائل سے ہے:

(۱) حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیثِ باب۔

(۲) حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "ولا تحجن امرأۃ إلا ومعھا ذو محرم[2]"۔

(۳) حضرت ابوامامہ باہلیؓ کی روایت قال: سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: "لا یحل لامرأۃ مسلمۃ أن تحج إلا مع زوج أو ذی محرم[3]"

(۴) عقلی دلیل سے بھی احناف کے مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ محرم کے بغیر سفر میں فتنہ کا اندیشہ ہے "وتزداد بانضمام غیرھا إلیھا" یہی وجہ ہے کہ خلوت بالاجنبیہ حرام ہے اگرچہ کوئی دوسری عورت بھی موجود ہو[4]۔

جہاں تک ان دلائل کا تعلق ہے جن کے عموم سے شافعیہ اور مالکیہ نے استدلال کیا ہے وہ حجت نہیں اس لئے کہ یہ دلائل اپنے عموم اور اطلاق پر نہیں بلکہ بالاجماع بعض شرائط کے ساتھ مقید ہیں جیسے راستہ کے مامون ہونے کی شرط، لہٰذا مذکورہ دلائل کی بناء پر مزید تقیید وتخصیص کی جائے گی اور کہا جائیگا کہ بغیر زوج یا محرم کے عورت پر نہ حج لازم ہے اور نہ ہی سفرِ حج جائز، کذا قال الشیخ ابن الھمامؒ۔ واللہ أعلم

شرحِ باب از مرتب عفا اللہ عنہ

---

[1] مسند احمد (ج ۴ ص ۲۵۷) نیز دیکھئے (ج ۴ ص ۳۷۸) ۱۲ م

[2] سنن دارقطنی (ج ۲ ص ۲۲۳، رقم نمبر ۳۰) کتاب الحج ۱۲ م

[3] التعلیق المغنی علی سنن الدارقطنی (ج ۲ ص ۲۲۳ تحت رقم ۳۱) ۱۲ م

[4] فتح القدیر (ج ۲ ص ۳۳۳) ۱۲ م

أبوابُ الطلاق واللّعان
عَن رَّسُولِ اللّٰہ صَلَّی اللّٰہ عَلَیہ وَسَلّم

طلاق کے لغوی معنی چھوڑنے کے ہیں اور اصطلاحِ شرع میں رشتۂ نکاح ختم کرنے کو کہتے ہیں[1]

اللہ تعالیٰ نے اسلام میں طلاق کا جو نظام مقرر فرمایا ہے اس کی حکمتوں کا کسی قدر اندازہ دوسرے مذاہب کے ساتھ موازنہ سے ہو سکتا ہے

طلاق دینِ یہود میں یہود کے اصلِ دین میں طلاق کی کھلی اجازت تھی اور اس کا اختیار صرف شوہر کو تھا، لیکن ان کے نزدیک طلاق صرف تحریراً واقع ہو سکتی تھی، نیز طلاق دینے والے شخص کے لئے وہ مطلقہ زوجِ ثانی سے نکاح و طلاق کے بعد بھی حلال نہ ہو سکتی تھی[2]، مزید کوئی پابندی شوہر پر نہ تھی بلکہ اس کو مکمل آزادی حاصل تھی کہ جب اور جس طرح چاہے طلاق دے، لیکن یہودیوں نے بعد میں طلاق پر بہت سی پابندیاں عائد کر دیں، حتی أصبح الطلاق شاذًا في القرن الحادی عشر المیلادی

طلاق دینِ نصاریٰ میں یہود کے برخلاف اصل عیسائی مذہب میں طلاق دینا حرام اور سخت گناہ تھا اور سوائے عورت کے زانیہ ہونے کے اور کسی صورت میں طلاق کی اجازت نہ تھی، چنانچہ انجیل مرقس[3] میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ مقولہ نقل کیا گیا ہے کہ "جس شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر کسی دوسری عورت سے نکاح کیا اس نے زنا کیا، اور اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کو طلاق دیکر کسی اور سے نکاح کیا تو اس نے زنا کیا" اور انجیل لوقا[4] میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام

---

[1] دیکھئے قواعد الفقہ ص۳۶۲) ۱۲ مرتب

[2] مذکورہ تفصیل سفر التثنیۃ (۲۴: ۱-۳) سفر أرمیا علیہ السلام (۳: ۱) سے ماخوذ ہے، تکملہ فتح الملہم (ج ۱ ص۱۳۰) وراجعہ للتفصیل ۱۲ مرتب

[3] (۱۰: ۱۱-۱۲) تکملہ (ج ۱ ص۱۳۱) ۱۲ م

[4] (۱۶: ۱۸) تکملہ ۱۲ م

کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ جس شخص نے کسی آدمی کی مطلقہ سے نکاح کیا اس نے زنا کیا۔

بہرحال طلاق دینِ نصاریٰ میں شجرِ ممنوعہ تھی، دوسری طرف تعددِ ازدواج ممنوع تھا[1] جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر غلطی سے دو ناموافق انسانوں میں رشتۂ نکاح قائم ہو گیا تو دونوں کی زندگی مستقل جہنم بنی رہتی تھی جس سے خلاصی کا کوئی راستہ نہ تھا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات چلنے والی نہ تھی، اگرچہ جب اسلام میں طلاق کی اجازت دی گئی تو بعض نصاریٰ نے اسلام کے اس حکم پر بھی اعتراض کیا لیکن چونکہ طلاق کی اجازت نہ دینا ایک غیر فطری حکم تھا اس لئے بعد میں خود نصاریٰ اس پر عمل نہ کر سکے، اور رفتہ رفتہ طلاق پر عائد شدہ پابندیاں ڈھیلی ہونی شروع ہوئیں اور زنا کے علاوہ بعض دوسری خرابیوں کی بناء پر طلاق کی اجازت خود کلیسا نے دیدی، پھر لوگوں کے دباؤ پر کلیسا ان اعذار میں اضافہ کرتا چلا گیا، اس کے باوجود طلاق کے اعذار پھر بھی محدود تھے اور طلاق دینے کا اختیار صرف کلیسا کی عدالتوں کو تھا، شوہر یا بیوی کو کسی قسم کا اختیار نہ تھا، وہ ضرورت پڑنے پر کلیسا سے رجوع کرتے تھے جو تحقیق کے بعد اپنی صوابدید پر طلاق کا حکم جاری کرتا تھا، لیکن چونکہ کلیسا کی عدالتیں حتی الامکان بائبل کی ہدایات پر عمل کی کوشش کرتی تھیں اس لئے ان کی طرف سے طلاق کے فیصلے کم ہوتے تھے۔

یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے بعد عوام میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ طلاق کی ان ناروا پابندیوں کو اٹھایا جائے، بالآخر ایک انقلابی قدم اٹھایا گیا اور طلاق کا اختیار کلیسا کی عدالتوں سے اٹھا کے عام ملکی عدالتوں کی طرف منتقل کر دیا گیا، اور طلاق کے اعذار کی فہرست انتہائی طویل بنا دی گئی اور طرّہ یہ کہ مرد کے علاوہ عورت کو بھی عدالت سے رجوع کر کے طلاق کا اختیار دیدیا گیا اور فریقین کے لئے محض ناپسندیدگی بھی طلاق کا قانونی جواز قرار پا گئی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب یورپ میں طلاقوں کی جتنی کثرت ہے اس کا مشرقی ممالک کے لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے، اور رشتۂ نکاح ہر وقت علیٰ شرف الزوال رہتا ہے۔

طلاق دینِ ہنود میں ہندو مذہب میں بھی طلاق ممنوع رہی ہے، حتیٰ کہ اگر عورت زنا کی مرتکب ہو جاتی تو اپنے مذہب سے خارج شمار کی جاتی لیکن طلاق کی کوئی صورت نہ ہوتی، لیکن جب ہندوؤں نے اس حکم میں تنگی محسوس کی تو ان کے بعض فرقوں نے اس کی اجازت دی کہ ضرورت پڑنے پر شوہر اپنے پنڈت اور پروہت وغیرہ سے طلاق کے لئے رجوع کر سکتا ہے، چنانچہ جنوبی ہندوستان

---

[1] سیرت مصطفیٰ (ج ۳ ص ۲۵۳) ۱۲ م

میں اب اکثر فرقوں کے نزدیک طلاق کا سلسلہ ہے جبکہ شمالی ھند میں اب بھی سوائے چند نیچ فرقوں کے طلاق کا رواج نہیں اور شرفاء کے نزدیک اس کو اب تک ناجائز سمجھا جاتا ہے۔[۱]

طلاق دینِ اسلام میں اسلام نے طلاق کا جو عادلانہ نظام مقرر کیا ہے وہ اس افراط وتفریط سے پاک ہے جو دوسرے مذاہب میں پایا جاتا ہے

اسلام نے طلاق کو نہ بالکل حرام قرار دیا نہ اس کی بے لگام اجازت دی، دراصل اسلامی تعلیمات کا منشا یہ ہے کہ رشتۂ نکاح پائیدار اور خوشگوار ہو، اور بوقتِ مجبوری طلاق کی بھی گنجائش ہو، جس کا کسی قدر اندازہ درج ذیل احکام سے لگایا جا سکتا ہے۔

(۱) نکاح سے قبل مرد کو اس کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنی مخطوبہ کو دیکھ لے تاکہ وہ بصیرت کے ساتھ رشتۂ نکاح قائم کرے اور بعد میں بدصورتی وغیرہ کی بناء پر رد کرنے کی نوبت نہ آئے،

(۲) معمولی معمولی باتوں پر طلاق کو پسند نہیں کیا گیا بلکہ شوہر کو یہ تاکید کی گئی کہ اگر بیوی کی طرف سے کوئی ناگوار بات پیش آئے تو وہ اس کی خوبیوں کا تصور کرے چنانچہ ارشاد ہے "فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا"[۲] نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "لا یفرك مؤمن مومنة، إن كره منها خلقاً رضي منها آخر أو قال غيره"[۳]

(۳) پھر اگر کوئی بات شوہر کے لئے ناقابلِ برداشت ہونے لگے تو بھی طلاق کے بجائے مرد کو اس کی تاکید کی گئی ہے کہ وہ بتدریج اس کی اصلاح کی فکر کرے چنانچہ ارشاد ہے: "وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا"[۴][۵]

---

[۱] "طلاق دینِ ہنود میں" کے عنوان کے تحت مذکورہ تشریح مرتب کا اضافہ ہے جو تکملہ فتح الملہم (ج ۱ ص ۱۲۲) سے ماخوذ ہے، بحوالہ دائرۃ المعارف البریطانیہ مادّہ DIVORCE طبع ۱۹۵۰ء (ج ۷، ص ۴۵۳) ۱۲ مرتب عفی عنہ

[۲] سورۂ نساء آیت ۱۹، پ ۴ - ۱۲ م

[۳] صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۷۵) کتاب الرضاع، باب الوصیۃ بالنساء ۱۲ م

[۴] سورۂ نساء، آیت ۳۴، پ ۵ - ۱۲ م

[۵] اس آیت میں اصلاح کے تین مراحل بیان کئے گئے ہیں:

(۱) نصیحت یعنی نرمی سے سمجھانا۔

(۲) سمجھانے سے باز نہ آنے کی صورت میں بستر علیحدہ کر دینا۔

(۳) اگر پھر بھی باز نہ آئے تو بدرجۂ مجبوری معمولی ضرب کی بھی اجازت دی گئی۔ تفصیل کے لئے دیکھئے معارف القرآن (ج ۲ ص ۳۹۹ و ۴۰۰) ۱۲ مرتب

④ پھر اگر زوجین کے درمیان اختلافات شدید ہوں اور اصلاح کے مذکورہ طریقوں سے کام نہ بنے تو زوجین کے اقرباء کو اصلاح کی کوشش کرنے کے لئے کہا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے "وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ یُّرِیْدَاۤ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا"[1]۔ نیز ارشاد ہے "وَالصُّلْحُ خَیْرٌ"[2]

⑤ پھر اگر اصلاح کی یہ کوششیں بھی بار آور نہ ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کی طبائع میں اتنا تضاد ہے کہ اب رشتۂ نکاح کو ان پر مسلط رکھنا بھی ظلم ہے، ایسی صورت میں مرد کو اگرچہ طلاق کی اجازت دی گئی ہے لیکن ساتھ ہی یہ کہہ دیا گیا ہے کہ "أبغض الحلال إلى الله عز وجل الطلاق"[3] جس کا مطلب یہ کہ سوچ سمجھ کر انتہائی مجبوری کی حالت میں دینی چاہئے۔

⑥ پھر طلاق کے لئے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا کہ وہ ایسے طہر میں ہو جس میں صحبت نہ ہوئی ہو تاکہ طلاق کسی وقتی منافرت کے سبب سے نہ دی جائے، اور طلاق کے بعد عدت کا شمار بھی آسان ہو۔

⑦ نیز یہ حکم دیا گیا کہ صرف ایک طلاق دے کر چھوڑ دے تاکہ اگر حالات روبہ صلاح ہونے لگیں تو عدت کے دوران رجوع کرنا ممکن ہو، اور عدّت کے بعد بھی تجدیدِ نکاح کی گنجائش ہو۔

⑧ اگر شوہر یہ چاہتا ہو کہ عورت طلاق کے بعد اس کی طرف لوٹ کر نہ آسکے اور مغلّظہ ہو جائے تب بھی اس کو ایک طہر میں تین طلاقیں دینے سے روکا گیا ہے اور اس کے لئے یہ طریقہ مقرر کیا گیا ہے کہ ہر طہر میں ایک طلاق دے، یہاں تک کہ تین طلاقیں مکمل ہو کر اس کا مقصد پورا ہو جائے، اس طریقہ میں یہ حکمت ہے کہ اس کو اس صورت میں تقریباً دو مہینے سوچ بچار کے مل جائیں گے اس عرصہ میں وہ طلاق کے نتائج کا مشاہدہ کر کے فیصلہ کر سکے گا، اور اگر اس کو عورت کی صلاح محسوس ہونے لگی تو طلقاتِ ثلاث مکمل ہونے سے قبل رجوع کرنے پر قادر ہوگا جبکہ بیک وقت تین طلاق کی صورت میں یہ فائدہ حاصل نہ ہو سکے گا۔

⑨ پھر طلاق کا یہ سارا اختیار مرد کو دیا گیا ہے کیونکہ عورتیں عموماً جذباتی اور عجلت پسند ہوتی ہیں، اس لئے طلاق کے معاملہ میں ان سے متوازن فیصلہ مشکل اور بے اعتدالی کا خطرہ ہے، البتہ چونکہ بعض صورتیں ایسی ہو سکتی ہیں کہ عورت معقول وجوہ کی بناء پر علیحدگی چاہتی ہو تو

---

[1] سورۂ نساء آیت ۳۵، پ ۵ ۱۲ م

[2] سورۂ نساء آیت ۱۲۸ پ ۵ ۱۲ م

[3] فی روایۃ ابن عمرؓ مرفوعاً عند أبی داؤد فی سننہ (ج ۱ ص ۲۹۶) باب فی کراھیۃ الطلاق ۱۲ مرتب

اس کے لئے "خلع" کا راستہ رکھا گیا ہے، نیز خاص خاص حالات میں عدالت کے ذریعہ بھی نکاح فسخ کرا سکتی ہے، مثلاً شوہر مجنون، مفقود، عنّین ہو یا نان نفقہ نہ دیتا ہو یا پھر غائب غیر مفقود ہو اور عورت کو اپنی عصمت کا خطرہ ہو۔

ان احکام کے ذریعہ ان تمام خرابیوں کا سدِّ باب کر دیا گیا ہے جو مذکورہ افراط و تفریط سے پیدا ہو سکتی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر اس نظام پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا جائے تو نکاح و طلاق کے تمام قضیے بہ آسانی نمٹ سکتے ہیں[1]، واللّٰہ أعلم وعلمہ أتم واحکم

باب ماجاء فی طلاق السُّنّة

جمہور کے نزدیک طلاقِ سنّت کا مطلب یہ ہے کہ ایسے طہر میں طلاق دے جس میں صحبت نہ ہو پھر دوسرے اور تیسرے طہر میں بھی اسی طرح طلاق دے،

بعض حضرات صحابہؓ و تابعینؒ نے "طلاق احسن" کو بھی طلاق سنّت سے تعبیر کیا ہے[2]، "طلاق احسن" کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے طہر میں ایک طلاق دے جس میں صحبت نہ ہو پھر مزید طلاق نہ دے بلکہ عدّت گزر جانے دے[3]۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپؐ نے تین متفرق اطہار میں علیحدہ علیحدہ طلاق پر "طلاق سنّت" کا اطلاق کیا، چنانچہ آپؐ نے ایک موقعہ پر حضرت ابن عمرؓ سے فرمایا "ماھکذا أمرك اللّٰہ، إنك قد أخطأت السنّة، والسنّة أن تستقبل الطھر فتطلّق لکل قرء[4]"

لیکن علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ "طلاقِ سنّت" پر "طلاقِ سنّت" کا اطلاق اس حیثیت سے نہیں کہ اس طریقہ سے طلاق دینا پسندیدہ اور قابلِ ثواب ہے بلکہ اس کو سنّت کہنا اس اعتبار سے ہے کہ یہ طریقہ بھی شریعت میں جائز ہے اور ایسا کرنا مستوجبِ عقاب نہیں[5]۔

---

[1] زیرِ بحث موضوع پر مزید تفصیل کے لئے دیکھئے تکملۂ فتح الملہم (ج ۱ ص ۱۳۰ تا ۱۳۴) ۱۲ مرتب

[2] اس کا حوالہ احقر کو نہ مل سکا ۱۲ م

[3] طلاق سنّت اور طلاقِ احسن کی اصطلاح کے لئے دیکھئے فتح القدیر (ج ۳ ص ۳۲۶ و ۳۲۸) باب طلاق السنّة اور البحر الرائق (ج ۳ ص ۲۳۵) کتاب الطلاق ۱۲ مرتب

[4] سنن دارقطنی (ج ۴ ص ۳۱) کتاب الطلاق والخلع الخ رقم ۸۴ ۱۲ مرتب

[5] روح المعانی (ج ۲ ص ۱۳۶) سورۂ بقرہ، اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۱۲ م

بلکہ امام سغدی رحمہ اللہ جو شمس الائمہ سرخسیؒ کے استاذ ہیں انہوں نے اپنے فتاویٰ میں ذکر کیا ہے کہ طلاق سنی کی دو قسمیں ہیں، ایک مستحب، دوسرے مکروہ، مستحب وہی ہے جسے فقہاء "طلاق احسن" کہتے ہیں یعنی ایسے طہر میں ایک طلاق دے جس میں صحبت نہ ہوئی ہو پھر مزید طلاق دینے کے بجائے عدت گزر جانے دے، اور مکروہ یہ ہے کہ ہر طہر میں ایک طلاق دے، یہاں تک کہ تین طلاقیں پوری ہو جائیں، یہ طلاق سنی مکروہ ہے "لأنه لم يترك لإحداث أمر الله موضعاً"[1]۔
امام سغدیؒ کے اس فتویٰ سے معلوم ہوا کہ طلاق سنی پر سنی کا اطلاق طلاقِ بدعی[2] کے مقابلہ میں ہے۔

طلاق ابن عمرؓ فی الحیض

عن یونس بن جبیر قال سألت ابن عمرؓ ..... فإنه طلق امرأته وهي حائض، فسأل عمر النبي صلى الله عليه وسلم، فامره أن يراجعها[3]۔
رجعت کا مذکورہ حکم شوافع کے نزدیک استحبابی ہے جبکہ احناف کی اس بارے میں دو روایتیں ہیں: ایک استحباب کی، دوسری وجوب کی، صاحب ہدایہؒ نے وجوب کی روایت کو اصح قرار دیا ہے[4]۔
قال: (یونس بن جبیر) قلت: فيعتد بتلك التطليقة؟ قال فمه۔ "فمهْ" کی اصل "فما" تھی جس میں ما استفہامیہ ہے، یعنی فما يكون إن لم تحتسب؟ اس تشریح کی بنیاد پر "ہ" وقف کے لئے ہے، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ "فمه" میں "ہ" اصلی ہو، اس صورت

---

[1] دیکھئے النتف فی الفتاویٰ (ج ۱ ص۳۱۹ و ۳۲۰) کتاب الطلاق، أنواع الطلاق السنی ۱۲ م

[2] طلاقِ بدعی کی یہ تعریف کی گئی ہے "ما خالف قسمي السنة (أي الأحسن والحسن) اس تعریف کی رو سے درج ذیل صورتیں طلاق بدعی میں داخل ہوں گی:
(۱) ایک کلمہ سے دو طلاق دینا (۲) الگ الگ کلمہ سے ایک طہر میں دو طلاق دینا (۳) ایسے طہر میں ایک طلاق دینا جس میں جماع کیا ہو (۴) حالتِ حیض میں طلاق دینا (۵) ایک کلمہ سے تین طلاق دینا (۶) ایک طہر میں دو یا تین طلاقیں علیحدہ علیحدہ کلمات سے دینا وغیرہ
دیکھئے البحر الرائق (ج ۳ ص۲۳۹) کتاب الطلاق اور قواعد الفقہ (ص۳۶۳) ۱۲ مرتب

[3] یہ حدیث بخاری میں بھی آئی ہے دیکھئے (ج ۲ ص۷۹۰) باب إذا طلقت الحائض الخ اور مسلم (ج ۱ ص۴۷۶) باب تحريم طلاق الحائض الخ ۱۲ م

[4] هدایہ مع فتح القدیر (ج ۳ ص۳۳۸) کتاب الطلاق، باب طلاق السنة ۱۲ م

میں یہ کلمۂ زجر ہے اور مطلب یہ ہے " کفّ عن هٰذا الکلام، فانّه لابدّ من وقوع الطلاق بذلك "

أرأیت إن عجز واستحمق؟ اس عبارت کے دو مطلب ہوسکتے ہیں:
ایک یہ کہ اگر ابن عمرؓ صحیح طریقہ پر طلاق دینے سے عاجز ہوگیا اور اس نے بحالتِ حیض طلاق دے کر حماقت کا ارتکاب کرلیا تو یہ بات طلاق کے واقع ہونے سے کیسے مانع بن سکتی ہے یقیناً طلاق تو واقع ہو ہی گئی، اس صورت میں جملہ کا مطلب " إن عجز عن إیقاع الطلاق علی وجه وفَعَلَ فعلَ الأحمق فی التطلیق فی حالة الحیض، ألایقع الطلاق؟ " ہوگا۔
دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر ابن عمرؓ اپنی بیوی سے رجوع کرنے سے عاجز ہوجاتا اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل نہ کرکے حماقت کا ارتکاب کرتا تو بھی ظاہر ہے کہ طلاق واقع ہوہی جاتی اس صورت میں جملہ کا مطلب یہ ہوگا " إن عجز ابن عمر عن الرجعة وفعلَ فعل الأحمق بعدم امتثال أمر النبی صلی الله علیه وسلم، أوَلایقع الطلاق؟ "[1]

" مره فلیراجعها ثم لیطلّقها طاهرا أوحاملاً " یہ اسی باب میں حضرت ابن عمرؓ کی دوسری روایت کا ٹکڑا ہے، سنن أبی داؤد[2] میں یہ روایت " مالك عن نافع عن عبدالله بن عمرؓ کے طریق سے آئی ہے، اس میں یہ تفصیل مذکور ہے کہ مره فلیراجعها، ثم لیمسکها حتی تطهر، ثم تحیض، ثم تطهر، ثم إن شاء أمسك بعد ذلك وإن شاء طلّق قبل ان یمسّ۔
اس حدیث کی بناء پر حنفیہ سمیت اکثر فقہاء کے نزدیک طریقہ یہی ہے کہ جس حیض میں پہلے طلاق دی تھی اس کے متصل والے طہر میں طلاق نہ دی جائے بلکہ اگلے طہر میں دیجائے[3] اور اس کی

---

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھئے تکملۂ فتح الملہم (ج ۱ ص۱۲۶ و ۱۲۷) باب تحریم طلاق الحائض الخ ۱۲ م

[2] (ج ۱ ص۲۹٦) باب فی طلاق السنّة - ۱۲ م

[3] پھر اس میں فقہاء کا اختلاف ہے:
امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ دونوں کی اصح روایت یہ ہے کہ جس حیض میں طلاق دی تھی اس کے متصل طہر میں طلاق دینا جائز نہیں، اگرچہ دونوں حضرات کی ایک ایک روایت جواز کی بھی ہے۔
جبکہ امام احمدؒ کے نزدیک دوسرے طہر میں طلاق دینا مستحب ہے، جس کا مطلب یہ کہ طہرِ متصل میں بھی طلاق جائز ہے، وکلام المالکیة یقتضی ذلك۔
مذاہب کی تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری (ج ۹ ص۳۴۹) باب قول الله تعالیٰ: یٰأیّها النّبیّ إذا طلّقتم النّسآء الخ کتاب الطلاق، اور البحر الرائق (ج ۳ ص۲۴۲)
فریقین کے دلائل کے لئے دیکھئے تکملہ فتح الملہم (ج ۱ ص۱۳۷) ۱۲ مرتب عفی عنہ

حکمت بقول علامہ نوویؒ یہ ہے کہ عین ممکن ہے کہ اس عرصہ میں شوہر کی نفرت ختم ہوجائے اور طلاق کی ضرورت ہی پیش نہ آئے[1]۔

حکم الطلاق فی الحیض والاختلاف فیہ

بہرحال حدیثِ باب اس بارے میں حجت ہے کہ حیض میں دیجانے والی طلاق اگرچہ حرام ہے واقع ہوجاتی ہے، اس لئے کہ اس میں ایسی صورت میں رجوع کا حکم دیا گیا ہے اور رجوع ظاہر ہے کہ طلاق کے وقوع کے بعد ہی ہوسکتا ہے ورنہ رجوع کا کوئی مطلب نہیں، چنانچہ ائمۂ اربعہ اور جمہور کا یہی مسلک ہے[2]۔

البتہ علامہ ابن حزمؒ، علامہ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن القیمؒ کا مسلک یہ ہے کہ طلاق فی الحیض واقع نہیں ہوتی[3]۔

حدیثِ باب میں حضرت ابنِ عمرؓ کا قول "فمہ" اور "أرأیت إن عجز واستحمق" بھی جمہور کے قول کی تائید کررہا ہے، جیسا کہ ان دونوں کی تشریح پیچھے گذر چکی ہے[4]۔

---

[1] دیکھئے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۷۵) باب تحریم طلاق الحائض الخ علامہ نوویؒ نے اس مقام پر طہرِ متصل میں طلاق نہ دینے کی چار وجوہ بیان کی ہیں۔ نیز دیکھئے تکملۂ فتح الملہم (ج ۱ ص ۱۳۷ و ۱۳۸) ۱۲ مرتب

[2] دیکھئے بدائع الصنائع (ج ۳ ص ۹۶) فصل وأما حکم طلاق البدعۃ الخ اور المجموع شرح المہذب (ج ۱۶ ص ۸۰) الطلاق فی الحیض یحتسب ۱۲ مرتب

[3] دیکھئے المحلّٰی (ج ۱۰ ص ۱۶۱) لا یحل لرجل أن یطلق امرأتہ فی حیضتہا الخ رقم ۱۹۴۹، فیض الباری (ج ۴ ص ۳۱۰) باب إذا طلقت الحائض الخ اور زاد المعاد (ج ۵ ص ۲۲۱) حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی تحریم طلاق الحائض ۱۲ مرتب

[4] ابن تیمیہؒ "فمہ" کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں "کف" یعنی کف عما تظنّ من کون الطلاق واقعًا۔ اور "إن عجز واستحمق" کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں "بأنّ الشرع لا یتغیّر بتغییرہ، وإذا کان حکم الشرع فیہ أن الطلاق فی الحیض لا یعتبر فہل یمکن تغییرہ واعتبارہ بتطلیقہ وحمقہ" لیکن حضرت کشمیریؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ بعض روایات اس پر صریح ہیں کہ یہ طلاق محسوب کی گئی چنانچہ سالم بن عبداللہؒ فرماتے ہیں: "وکان عبداللہ طلّقہا تطلیقۃ واحدۃ فحسبت من طلاقہا۔" نیز خود حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں: "فراجعتہا وحسبت لہا التطلیقۃ التی طلّقتہا" (یہ دونوں روایتیں مسلم (ج ۱ ص ۴۷۶) باب تحریم طلاق الحائض میں آئی ہیں) مذکورہ جواب کے لئے دیکھئے فیض الباری (ج ۴ ص ۳۱۰) علامہ ابن حزمؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ کے دلائل وجوابات کے لئے دیکھئے تکملۂ فتح الملہم (ج ۱ ص ۱۴۰ و ۱۴۱) ۱۲ مرتب عفی عنہ

باب ماجاء فی الرجل یطلّق امرأته البتّة

عن[1] عبد الله بن یزید بن رکانة عن أبیه عن جدّه قال: أتیتُ النبی صلی الله علیه وسلم، فقلتُ: یا رسول الله! إنی طلّقتُ امرأتی ألبتّة فقال: ما أردتّ بها؟ قلتُ: واحدة، قال: والله؟ قلتُ: والله، قال: فھو ما أردتَ۔

یہاں دو بحثیں ہیں:

پہلی بحث جو اس باب کا اصل مقصود ہے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے "أنت طالق البتّة" کہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

حنفیہ کے نزدیک اس سے ایک طلاق بائن واقع ہوجاتی ہے اگر اس نے ایک طلاق کی نیت کی ہو یا کوئی نیت نہ کی ہو اور اگر تین کی نیت کی تو تین واقع ہوں گی البتہ اگر دو طلاقوں کی نیت کی تو صرف ایک طلاق واقع ہوگی[2]

جبکہ شوافع کے نزدیک ایک کی نیت کریگا تو ایک رجعی، دو کی نیت کریگا تو دو، تین کی نیت کریگا تو تین طلاقیں واقع ہوں گی، اور اگر کوئی نیت نہ کرے تو ایک ہوگی۔

مالکیہ کے نزدیک اگر یہ الفاظ مدخول بہا سے کہے گئے تو تین طلاقیں واقع ہوں گی اگرچہ نیت نہ کرے[3]

حنفیہ کے نزدیک تین کی نیت کرنے پر مذکورہ الفاظ سے تین طلاق کا واقع ہونا اگرچہ کل جنس یا فرد حکمی ہونے کی بناء پر درست ہے، لیکن نیت کرنے کے باوجود دو طلاق واقع نہ ہوں گی،

---

[1] الحدیث أخرجہ أبوداؤد فی سننہ (ج ا ص۳۰۰) باب فی البتّة، وابن ماجہ فی سننہ (ص۱۴۸) باب طلاق البتّة - ۱۲ م

[2] البتہ احناف میں سے امام زفرؒ کے نزدیک دو کی نیت معتبر ہے کما فی المحلّی (ج ۱۰ ص۱۹۱) مسألة ۱۹۵۸ فی الألفاظ التی جاءت فیھا عن رسول الله صلی الله علیہ وسلم الخ ۱۲ مرتب

[3] مذاہب کی مذکورہ تفصیل اسی باب میں امام ترمذیؒ کے کلام سے ماخوذ ہے، البتہ موفقؒ کے کلام سے کسی قدر اضافہ کیا گیا ہے، وقال (الموفق) أکثر الروایات عن أحمد أنہ کرہ الفتیا فی ذلک مع میلہ إلی أنہ ثلاث، وقیل: عنہ روایتان: إحداھما ھذہ، والثانیة ترجع إلی ما نوی، وإن لم ینو شیئا فواحدة - دیکھئے بذل المجہود (ج ۱۰ ص۳۱۱) باب فی ألبتّة - ۱۲ مرتب

اس لئے کہ وہ عدد محض ہے اور یہ الفاظ عدد محض کو محتمل نہیں۔ البتہ اگر زوجہ باندی ہو تو دو کی نیت درست ہے، اس لئے کہ اس کے حق میں دو ہی کل جنس اور فردِ حکمی ہے[1]۔ واللہ اعلم

بحث الطلقات الثلاث

دوسری بحث طلقاتِ ثلاثہ سے متعلق ہے اس بحث کے تحت دو مسئلے ہیں

کیا ایک ساتھ تین طلاقیں دینا جائز ہے؟

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں واقع کرنا جائز ہے یا نہیں؟

امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ یہ حرام اور بدعت ہے، امام احمدؒ کی بھی ایک روایت اسی کے مطابق ہے، حضرات صحابہ کرامؓ میں سے حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ کا بھی یہی مسلک ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک اس طرح طلاق دینا جائز ہے[2]، امام احمدؒ کی بھی دوسری روایت یہی ہے[3]، ابو ثور، داؤد کا بھی یہی مسلک ہے، حسن بن علی اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے بھی یہی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے نور الانوار (ص۳) بحث امر طلقی نفسك ۱۲ مرتب

[2] البتہ ان کے نزدیک بھی مستحب یہ ہے کہ ایک طہر میں تین طلاقوں کو جمع نہ کرے، کما فی المہذب للشیرازی (ج ۲ ص۷۹) دیکھئے تکملہ فتح الملہم (ج ۱ ص۱۵۲) باب طلاق الثلاث ۱۲۔ مرتب

[3] امام شافعیؒ کا استدلال عویمر عجلانی کے قصۂ لعان سے ہے جو بخاری (ج ۲ ص۷۹۱، کتاب الطلاق، باب من أجاز الطلاق الثلاث) میں حضرت سہل بن سعد ساعدی کی روایت سے مروی ہے جس میں ذکر ہے "فلما فرغا (من اللعان) قال عویمر: کذبت علیہا یا رسول اللہ! إن أمسکتُھا، فطلّقھا ثلاثًا۔

اور مسند احمد (ج ۵ ص۳۳۴، حدیث أبی مالک سہل بن سعد الساعدی) میں یہ الفاظ آئے ہیں قال: یا رسول اللہ! ظلمتُھا إن أمسکتُھا، ھی الطلاق، وھی الطلاق، وھی الطلاق۔

لیکن ابوبکر جصاصؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اس واقعہ سے امام شافعیؒ کا تین طلاق کے جواز پر استدلال درست نہیں، اس لئے کہ ان کے مسلک کے مطابق عورت کے لعان سے قبل صرف مرد کے لعان سے فرقت واقع ہو جاتی ہے اور طلاق کا محل باقی نہیں رہتا، لہٰذا تین طلاق دینے کے بارے میں نکیر کی حاجت ہی باقی نہیں رہتی۔

لیکن احناف کے نزدیک چونکہ لعان کے بعد قضاء قاضی سے فرقت (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مروی ہے[1]

حنفیہ کی دلیل سنن نسائی[2] میں محمود بن لبید کی روایت[3] ہے فرماتے ہیں "أخبر رسول الله صلى الله عليه وسلم عن رجل طلّق امرأته ثلاث تطليقات جميعًا، فقام غضبانا أيلعب بكتاب الله وأنا بين أظهركم؟ حتى قام رجل وقال: يا رسول الله، ألا أقتله[4]"

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

واقع ہوتی ہے (کما فی الہدایہ ج ۲ ص۳۴۴) اس لئے ان کے مسلک کے مطابق یہ جواب نہ چل سکے گا۔

اس لئے امام ابوبکر جصاصؒ حنفیہ کی طرف سے جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

جائز أن يكون ذلك قبل أن يسنّ الطلاق للعدّة ومنع الجمع بين التطليقات في طهر واحد، فلذلك لم ينكر عليه الشارع صلى الله عليه وسلم، وجائز أيضًا أن تكون الفرقة لما كانت مستحقة من غير جهة الطلاق لم ينكر عليه إيقاعها بالطلاق۔

دیکھئے احکام القرآن للجصاص (ج ۱ ص۳۸۴) باب عدد الطلاق ۱۲ رشید اشرف نور

(حاشیہ صفحۂ ھٰذا)

[1] مذکورہ مذاہب کے لئے دیکھئے المغنی (ج ۷، ص۳۰۱) مسألة ولو طلّقها ثلاثًا ۱۲ مرتب

[2] (ج ۲ ص۹۹) باب الثلاث المجموعة وما فيه من التغليظ - ۱۲ م

[3] اس روایت کے بارے میں حافظ ابن الترکمانیؒ فرماتے ہیں: "حديث صحيح صريح" الجوہر النقی بذیل سنن الکبریٰ للبیہقی (ج ۷، ص۳۳۳) کتاب الخلع والطلاق، باب الاختیار للزوج أن لا يطلق إلا واحدة، اور خود حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: "ورجاله ثقات" لیکن اس کے بعد حافظؒ نے اعتراض کیا ہے "لكن محمود بن لبيد وُلد في عهد النبي صلى الله عليه وسلم ولم يثبت له منه سماع، وإن ذكره بعضهم في الصحابة فلأجل الرؤية - فتح الباری (ج ۹ ص۳۶۲) باب من جوّز الطلاق الثلاث - لیکن حافظؒ کا یہ اعتراض درست نہیں اس لئے کہ اس صورت میں یہ زیادہ سے زیادہ مرسل صحابی ہوگی جو جمہور کے قول کے مطابق موصول کے حکم میں ہے، کما فی مقدمة فتح الملہم (ج ۱ ص۴۱، المرسل والمنقطع الخ) ۱۲ مرتب

[4] حنفیہ کا ایک استدلال حضرت انسؓ کی روایت سے ہے: أن عمر كان إذا أتي برجل طلّق امرأته ثلاثًا أوجع ظهره - اخرجه سعيد بن منصور، ذكره الحافظ في الفتح، وقال: سنده صحيح، دیکھئے (ج ۹ ص۳۶۲)۔

اگلے مسئلہ (وقوع الطلقات الثلاث) میں بھی متعدد روایات ایسی ذکر ہوں گی جو احناف کے مسلک پر دال ہیں ۱۲ مرتب

طلقات ثلاثہ کے وقوع کا حکم دوسرا مسئلہ جو زیادہ اہم اور معرکۃ الآراء ہے وہ طلقات ثلاثہ کے وقوع کا ہے، یعنی اگر کوئی شخص ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں دے یا ایک مجلس میں تین طلاقیں دے آیا وہ واقع ہو جاتی ہیں یا نہیں؟ ایک واقع ہوتی ہے یا تین؟ اس بارے میں تین مذاہب ہیں:

① پہلا مذہب حضرات ائمہ اربعہ کا ہے کہ اس طرح تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی اور عورت مغلظہ ہو جائیگی، ولا تحل لزوجها الأول حتى تنكح زوجًا غيره، جمہور علماء سلف و خلف کا بھی یہی مسلک ہے[1]۔

② دوسرا مذہب یہ ہے کہ اس طرح ایک بھی طلاق واقع نہ ہوگی، شیعہ جعفریہ کا یہی مسلک ہے[2] حجاج بن ارطاۃ محمد بن اسحاق اور ابن مقاتل کی طرف بھی یہ قول منسوب ہے[3]۔

③ تیسرا مذہب یہ ہے کہ اس طرح ایک طلاق واقع ہوگی اور شوہر کو رجعت کا اختیار ہوگا یہ بعض اہل ظاہر، علامہ ابن تیمیہؒ، علامہ ابن القیمؒ اور عکرمہؒ وغیرہ کا مسلک ہے[4]۔ ہمارے زمانہ کے

---

[1] بظاہر یہ حکم مدخول بہا کی صورت میں ہے ورنہ اگر عورت غیر مدخول بہا ہو تو ایسی صورت میں حنفیہ کے نزدیک تفصیل ہے: اگر ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں دی گئیں مثلاً کہا گیا "أنت طالق ثلاثا" تو اس صورت میں بھی تین طلاقیں اکٹھی واقع ہو جائیں گی۔

البتہ اگر متفرق کلمات کے ساتھ تین طلاقیں دی گئیں خواہ ایک ہی مجلس میں کیوں نہ ہوں مثلاً اگر یوں کہے "أنت طالق وطالق وطالق" ایسی صورت میں صرف ایک طلاق سے بائن ہو کر دوسری دو طلاقوں کے لئے محل ہی باقی نہ رہیگا۔ دیکھئے ہدایہ (ج ۲ ص۳۷۱) فصل فی الطلاق قبل الدخول ۱۲ مرتب

[2] کما جزم به الحلی الشیعی فی شرائع الاسلام (ج ۲ ص۵) کذا فی التکملۃ (ج ۱ ص۱۵۳)۔

وقال الشیخ ابن الہمامؒ: فعن الإمامیة لا یقع بلفظ الثلاث ولا فی حالة الحیض، فتح القدیر (ج ۳ ص۳۲۹) باب طلاق السنة ۱۲ مرتب

[3] کما حکاہ النووی فی شرح مسلم (ج ۱ ص۴۷۸، باب طلاق الثلاث) حجاج بن أرطاۃ اور محمد بن اسحاق کی دوسری روایت تیسرے مذہب کے مطابق ایک طلاق رجعی واقع ہونے کی ہے۔ حوالہ مذکورہ ۱۲ مرتب

[4] ایک چوتھا مذہب بھی ذکر کیا گیا ہے کہ مدخول بہا ہونے کی صورت میں تین طلاقیں اور غیر مدخول بہا ہونے کی صورت ایک طلاق واقع ہوگی کما فی فتح القدیر (ج ۳ ص۳۲۹) اس چوتھے مذہب کو ابن القیمؒ نے بعض اصحاب ابن عباسؓ اور اسحٰق بن راہویہؒ کی طرف منسوب کیا ہے، کما فی زاد المعاد (ج ۵ ص۲۴۱، فصل وأما المسألة الثانية) وراجعهما لتفصیل المذاهب المذكورة، وانظر المغنی (ج ۷، ص۱۰۴ و ۱۰۵، لو طلقها ثلاثا) وشرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۷۸) ۱۲ مرتب عفی عنہ

غیر مقلدین بھی اسی پر مصر ہیں۔

لیکن مذکورہ تینوں مذاہب میں یہ بات مشترک ہے کہ اگر تین طلاقیں تین مختلف طہروں میں دی جائیں تو وہ سب کے نزدیک واقع ہو جائیں گی چنانچہ ایسی عورت کے مغلّظہ ہونے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں حتی کہ اہل ظاہر اور روافض بھی اس کے وقوع کے قائل ہیں۔

لیکن ہمارے ملک میں جو عائلی قوانین نافذ ہیں ان میں یہ کہا گیا ہے کہ تین طہروں پر متفرق کر کے تین طلاقیں دینے سے بھی تین واقع نہ ہوں گی بلکہ ایک ہی واقع ہوگی اور تغلیظ کی صورت ان عائلی قوانین کی رُو سے صرف یہ ہے کہ شوہر ایک طلاق دے کر رجوع کرے پھر طلاق دے پھر رجوع کرے پھر طلاق دے۔

ظاہر ہے کہ مذکورہ صورت امت کے کسی بھی فرد کا مسلک نہیں، لہذا جو لوگ ان عائلی قوانین کی تائید میں ابن تیمیہؒ، ابن القیمؒ یا اہل ظاہر کو پیش کرتے ہیں ان کا یہ عمل کسی طرح درست نہیں۔

جمہور کے دلائل

① سنن نسائی[1] میں شعبیؒ کی روایت ہے، فرماتے ہیں: "حدثتنی فاطمة بنت قيس، قالت: أتيتُ النبي صلى الله عليه وسلم، فقلت: أنا بنت آل خالد وإن زوجي فلانا أرسل إليّ بطلاق، وإني سألتُ أهله النفقة والسكنى فأبوا عليّ، قالوا: يارسول الله إنه أرسل إليها بثلاث تطليقات، فقالت: فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنما النفقة والسكنى للمرأة إذا كان لزوجها عليها الرجعة"۔

اس سے صاف واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاقوں کی صورت میں شوہر کو رجعت کا حق نہیں دیا۔

② عن سويد بن غفلة، قال: كانت عائشة الخثعمية عند الحسن بن علي رضي الله عنه فلما قتل علي رضي الله عنه قالت: لتهنئك الخلافة، قال: بقتل علي تظهرين الشماتة، إذهبي فأنت طالق، يعني ثلاثاً، قال: فتلفعت بثيابها وقعدت حتى قضت عدتها، فبعث إليها ببقية بقيت لها من صداقها وعشرة آلاف صدقة، فلما جاءها

---

[1] (ج ۲ ص۱۱۰) باب الرخصة في ذلك ۱۲ م

الرسول قالت: متاع قليل من حبيب مفارق، فلما بلغه قولها بكى، ثم قال: لولا أني سمعت جدّي، أو حدثني أبي أنه سمع جدّي يقول: أيما رجل طلّق امرأته ثلاثاً عند الأقراء أو ثلاثاً مبهمة لم تحل له حتى تنكح زوجاً غيره لراجعتها۔ رواه البيهقي[1]۔

(۳) عن عائشة أن رجلاً طلّق امرأته ثلاثاً فتزوّجت، فطلّق، فسئل النبي صلى الله عليه وسلم أتحل للأوّل؟ قال: لا، حتى يذوق عسيلتها كما ذاق الأوّل۔ رواه البخاري[2]

(۴) بخاری[3] ہی میں حضرت سہل بن سعد الساعدیؓ کی روایت ہے جس میں وہ عویمر عجلانی کا قصۂ لعان ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عویمر نے لعان سے فارغ ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "کذبتُ علیها یا رسول الله إن أمسکتها فطلقها ثلاثاً قبل أن یأمره رسول الله صلی الله علیه وسلم۔

(۵) معجم طبرانی میں حضرت عبادۃ بن الصامتؓ کی روایت آئی ہے، فرماتے ہیں "طلق بعض آبائی امرأته ألفاً فانطلق بنوه إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم وقالوا یا رسول الله إن أبانا طلّق أمّنا ألفاً فهل له من مخرج قال: إن أباکم لم یتق الله تعالى فيجعل له من أمره مخرجاً بانت منه بثلاث على غير السنة وتسع مائة وسبع و تسعون إثم في عنقه[4]"۔

---

[1] في سننه الكبرى (ج ۷ ص۳۳۶) باب ما جاء في إمضاء الطلاق الثلاث وإن كن مجموعات، كتاب الخلع والطلاق۔ ۱۲م

[2] (ج ۲ ص۷۹۱) باب من أجاز طلاق الثلاث

حافظ ابن حجرؒ کا میلان اس طرف ہے کہ مذکورہ روایت کا واقعہ اور امرأۃ رفاعہ کا واقعہ علیحدہ علیحدہ ہیں، کما في فتح الباري (ج ۹ ص۳۶۷، باب من جوّز الطلاق الثلاث) گویا یہ دونوں واقعے مستقل دلیلیں ہیں۔ ۱۲ مرتب

[3] حوالۂ بالا۔ ۱۲م

[4] قال الهيثمي في مجمع الزوائد (ج ۴ ص۳۳۸، باب فيمن طلّق أكثر من ثلاث) وفيه عبيد الله بن الوليد الوصافي العجلي وهو ضعيف۔

لیکن ان کے بارے میں امام احمدؒ فرماتے ہیں "یکتب حدیثه للمعرفة" کما في میزان الاعتدال (ج ۳ ص۱۷، رقم ۵۴۰۰)۔

لہٰذا ان کی روایت کو تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہ روایت مصنف عبدالرزاق (ج ۶ ص۳۹۳، رقم ۱۱۳۳۹) باب المطلق ثلاثاً۔ میں بھی آئی ہے۔ نیز دیکھئے سنن دارقطنی (ج ۴ ص۲۰، رقم ۵۳) ۱۲ مرتب

(۶) پچھلے مسئلہ کے تحت محمود بن لبید کی روایت گذر چکی ہے جس میں تین طلاق پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اظہارِ ناراضگی بھی طلقاتِ ثلاث کے وقوع پر دال ہے[1]۔

(۷) طبرانی نے حضرت ابن عمرؓ کا واقعہ طلاق فی الحیض ذکر کیا ہے جس کے آخر میں یہ الفاظ آئے ہیں " فقلت یارسول اللہ! لو طلقتها ثلاثا کان لی أن أراجعها قال إذًا بانت منك وكانت معصية[2]"

(۸) سنن[3] دارقطنی میں حضرت علیؓ کی روایت ہے قال سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجلاً طلق البتة فغضب وقال تتخذون آیات اللہ هزوًا أو دین اللہ هزوًا ولعبا من طلق البتة ألزمناه ثلاثًا لا تحل له حتی تنکح زوجًا غيره۔

(۹) مصنف[4] عبدالرزاق میں زید بن وہب کی روایت ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک ایسا آدمی پیش کیا گیا جس نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دی تھیں، دریافت کرنے پر اس نے عذر پیش کیا " إنما کنت ألعب " اس پر حضرت عمرؓ نے اس کو درّہ لگایا اور فرمایا " إنما یکفیك من ذلك ثلاثة[5] "

---

[1] روایت اور اس سے استدلال سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے تکملہ فتح الملہم (ج ۱ ص۱۵۵) ۱۲ م

[2] مجمع الزوائد (ج ۴ ص۳۳۶) باب طلاق السنة وکیف الطلاق۔

علامہ ہیثمیؒ اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں " وفیه علی بن سعید الرازی، قال الدارقطنی لیس بذاك وعظمه غیره وبقیة رجاله ثقات "۔

لیکن علی بن سعید رازی کی تضعیف میں امام دارقطنی متفرد معلوم ہوتے ہیں، ورنہ حافظ ذہبیؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں " حافظ رحال جوّال " اور ابن یونس کا قول نقل کرتے ہیں " کان یفهم ویحفظ "، دیکھئے میزان الاعتدال (ج ۳ ص۱۳۱، رقم ۵۸۵۰) ۱۲ مرتب عفی عنہ

[3] (ج ۴ ص۲۰، رقم ۵۵) کتاب الطلاق۔ ۱۲ م

[4] (ج ۶ ص۳۹۳، رقم ۱۱۳۴۰) باب المطلق ثلاثا۔ ۱۲ م

[5] مذکورہ روایت سفیان ثوری عن سلمة بن کہیل کے طریق سے مروی ہے جبکہ یہی روایت سنن کبریٰ بیہقی میں شعبہ عن سلمة بن کہیل کے طریق سے مروی ہے، دیکھئے (ج ۷، ص۳۳۴) کتاب الخلع والطلاق، باب ما جاء فی امضاء الطلاق الثلاث وإن کن مجموعات۔

وکلا الطریقین رجالهما رجال الجماعة، کما فی التکملة (ج ۱ ص۱۵۶) ۱۲ مرتب

مؤطا امام مالک میں معاویہ بن ابی عیاش انصاری کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں عبداللہ بن زبیرؓ اور عاصم بن عمر کے پاس بیٹھا تھا، اتنے میں ان کے پاس محمد بن ایاس بن بکیر آئے اور کہا کہ ایک اعرابی نے اپنی غیر مدخول بہا بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں، اس مسئلہ میں آپ دونوں کی کیا رائے ہے، اس پر عبداللہ بن زبیرؓ نے جواب دیا: "إن هٰذا الأمر ما بلغ لنا فيه قول فاذهب إلى عبد الله بن عبّاس وأبي هريرة فإني تركتهما عند عائشة فاسألهما، ثم ائتنا فأخبرنا" چنانچہ سائل نے جاکر دونوں حضرات سے دریافت کیا، اس پر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا "أفته يا أبا هريرة فقد جاءتك معضلة" حضرت ابوہریرہؓ نے جواب دیا، "الواحدة تبينها والثلاث تحرّمها حتّٰى تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ" حضرت ابن عباسؓ نے بھی یہی جواب دیا[1] [2] تلك عشرة كاملة

کتب حدیث میں مذکورہ بالا دلائل کے علاوہ اور بھی متعدد دلائل و آثار[3] موجود ہیں جو یک وقت

---

[1] (ص۵۲۱) طلاق البکر ۱۲ م

[2] حضرت استاذ محترم دام اقبالہم اس روایت کے تحت تکملہ (ج ۱ ص۱۵۷، ۱۵۸) میں تحریر فرماتے ہیں:

"وإن هٰذا الحديث يرشدنا إلى أن هؤلاء الخمسة من الصحابة (عبد الله بن زبيرؓ وعاصم بن عمر وأبو هريرةؓ وابن عباسؓ وعائشةؓ) كانوا متفقين على وقوع الطلقات الثلاثة بكلمة واحدة، أما مذهب أبي هريرةؓ وابن عباسؓ فظاهر، وأما عبد الله بن الزبير وعاصم بن عمر فلأنهما استصعبا هٰذه المسئلة في غير المدخول بها، فلو كان عدد الثلاث لغوًا في المدخول بها لما استصعبا ذلك، ولأفتيا بعدم الوقوع في غير المدخول بها بالطريق الأولى، وإنما استصعبا المسألة لأنها كانت في غير المدخول بها، وأما عائشة رضي الله عنها فلأن الظاهر من سياق القصة أنها كانت حاضرة عندما أفتى أبو هريرةؓ وابن عباسؓ بذلك - ۱۲ مرتب

[3] چند کا حوالہ درج ذیل ہے:

(۱) حضرت انس بن مالکؓ کی روایت سے حضرت عمرؓ کا اثر۔ سنن کبریٰ بیہقی (ج۷، ص۳۳۴)

(۲) حضرت عثمان غنی اور حضرت علیؓ کا اثر۔ مصنف عبدالرزاق (ج۶ ص۳۹۴، رقم ۱۱۳۴۱) باب المطلق ثلاثًا۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا اثر۔ مؤطا امام مالک (ص۵۲۱) طلاق البکر۔

(۴) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا اثر۔ مصنف عبدالرزاق (ج۶ ص۳۹۵، رقم ۱۱۳۴۳) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دیجانے والی تین طلاقوں کے وقوع پر دال ہیں، ان تمام دلائل میں گو بعض ضعیف ہوں لیکن ان کا مجموعہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماعی تعامل مسلکِ جمہور کی صحت پر دال ہے۔

فریق مخالف کے دلائل اور ان کے جوابات

مذکورہ صورت میں محض ایک طلاق کے وقوع پر اہلِ ظاہر اور علامہ ابن تیمیہؒ وغیرہ کا استدلال درج ذیل دلائل سے ہے:

① صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت، فرماتے ہیں "کان الطلاق علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وأبی بکرؓ وسنتین من خلافۃ عمرؓ طلاق الثلاث واحدۃ، فقال عمر بن الخطابؓ: إن الناس قد استعجلوا فی أمر کانت لھم فیہ أناۃ فلو أمضیناہ علیھم، فأمضاہ علیھم۔

اس روایت کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں[3]:

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

(۵) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اثر۔ حوالہ بالا رقم ۱۱۳۳۴، نیز دیکھئے بیہقی (ج ۷، ص۳۳۵)۔

(۶) حضرت علیؓ کا ایک اور اثر۔ بیہقی (ج ۷، ص۳۳۴)۔

(۷) حضرت عمران بن حصین اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا اثر۔ بیہقی (ج ۷، ص۳۳۲)۔

(۸) حضرت مسلم بن جعفر الحمسی فرماتے ہیں "قلت لجعفر بن محمد: إن قوماً یزعمون أن من طلق ثلاثاً بجھالۃ رُدّ إلی السنۃ یجعلونھا واحدۃ یروونھا عنکم، قال: معاذ اللہ، ما ھذا من قولنا، من طلّق ثلاثاً فھو کما قال۔ بیہقی (ج ۷، ص۳۴۰) باب من جعل الثلاث واحدۃ وما ورد فی خلاف ذلک۔

مؤخر الذکر روایت اس پر صراحۃً دال ہے کہ اہلِ بیت کا مسلک بھی جمہور کے مطابق ہے۔

مزید آثار کے لئے دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ (ج ۵ ص۱۰ تا ص۱۲) ۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ

(حاشیہ صفحۂ ھذا)

[1] امام طحاوی نے تین طلاقوں کے وقوع پر اجماع ذکر کیا ہے، دیکھئے شرح معانی الآثار (ج ۲ ص۲۹) باب الرجل یطلق امرأتہ ثلاثاً معاً۔

حافظ ابن حجرؒ نے بھی اس پر اجماعِ صحابہؓ ذکر کیا ہے کما فی فتح الباری (ج ۹ ص۳۱۵) باب من جوّز الطلاق الثلاث۔

شیخ ابن ہمامؒ بھی اجماع ذکر کرتے ہیں کما فی فتح القدیر (ج ۳ ص۳۳۰، باب طلاق السنّۃ)۔

حافظ ابن عبد البرؒ نے بھی اجماع نقل کیا ہے کما فی عمدۃ الاثاث (ص۳۶) بحوالہ زرقانی شرح مؤطا (ج ۳ ص۱۶۷)۔

ابوبکر بن العربی اور ابوبکر رازی نے بھی اجماع ذکر کیا ہے، کما فی عمدۃ الاثاث (ص۳۷) بحوالہ اغاثۃ اللہفان (ج ۱ ص۳۲۳) ۱۲ مرتب عفی عنہ

[2] (ج ۱ ص۴۷۷) باب طلاق الثلاث ۱۲ م

[3] جن کو حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری (ج ۹ ص۳۶۳ تا ۳۶۵، باب من جوّز الطلاق الثلاث) میں تفصیل سے ذکر کیا ہے، ان جوابوں کی مجموعی تعداد آٹھ ہے۔ ۱۲ مرتب

(۱) روایت میں مذکور تمام تفصیل غیر مدخول بہا کے بارے میں ہے، دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگ غیر مدخول بہا کو اس طرح طلاق دیتے تھے "أنت طالق، أنت طالق، أنت طالق" اس صورت میں چونکہ پہلی طلاق سے ہی غیر مدخول بہا بائنہ ہوجاتی تھی، اس لئے دوسری طلاقیں واقع نہیں ہوتی تھیں، اس کے برخلاف حضرت عمرؓ کے زمانہ میں لوگوں نے "أنت طالق ثلاثا" کے الفاظ سے طلاق دینی شروع کردی اس لئے حضرت عمرؓ نے تینوں کے وقوع کا حکم لگادیا۔

یہ جواب دراصل امام نسائیؒ سے ماخوذ ہے کیونکہ انہوں نے اپنی سنن[1] میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت پر یہ ترجمۃ الباب قائم کیا ہے "باب طلاق الثلاث المتفرقۃ قبل الدخول بالزوجۃ" امام نسائیؒ نے اس "ترجمہ" میں "قبل الدخول بالزوجۃ" کی جو قید لگائی ہے ظاہر ہے کہ ان کے پاس اس بارے میں کوئی حدیث ہوگی، کیونکہ امام بخاریؒ اور امام نسائیؒ کے تراجم کا یہ معروف طریقہ ہے کہ وہ جس روایت کو اپنی شرائط کے مطابق نہیں پاتے اس کی طرف ترجمۃ الباب میں اشارہ کردیتے ہیں۔

(۲) دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تین مرتبہ الفاظِ طلاق استعمال کرے لیکن اس کا منشا تین طلاقیں دینا نہ ہو بلکہ وہ ایک ہی طلاق کو تاکید کی نیت سے بار بار کہہ رہا ہو تو دیانۃً تین طلاقیں واقع نہیں ہوتیں بلکہ صرف ایک ہوتی ہے۔

عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ کے ابتدائی دور میں چونکہ لوگوں کی دیانت پر اعتماد تھا اور لوگوں سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ جھوٹ بول کر حرام کا ارتکاب کریں گے اس لئے اس دور میں اگر کوئی شخص تین مرتبہ الفاظِ طلاق استعمال کرنے کے بعد یہ بیان کرتا کہ میری نیت تاسیس کے بجائے تاکید کی تھی اس کا قول قضاءً بھی قبول کرلیا جاتا تھا، لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے زمانہ میں یہ محسوس فرمایا کہ دیانت کا معیار روز بروز گھٹ رہا ہے اگر لوگوں کے بیانات کو قضاءً قبول کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہا تو لوگ جھوٹ بول بول کر حرام کا ارتکاب کریں گے، اس لئے انہوں نے یہ اعلان فرمادیا کہ اب اگر کوئی شخص تین مرتبہ الفاظِ طلاق استعمال کریگا تو تاکید کا عذر قبول نہ ہوگا اور ظاہرِ الفاظ پر فیصلہ کرتے ہوئے اس کو تین طلاق شمار کیا جائیگا۔[2]

---

[1] (ج ۲ ص۸۲) وانظر حاشیۃ السندیؒ بہامش النسائی ۱۲ مرتب

[2] اس جواب کو علامہ نوویؒ نے "أصح الأجوبہ" قرار دیا ہے کما فی شرح النووی علی مسلم (ج ۱ ص۴۷۸) علامہ قرطبیؒ نے بھی اسی جواب کو اختیار کیا ہے اور حضرت عمرؓ کے قول ان الناس قد استعجلوا فی أمر الخ کو تائید میں پیش کیا ہے، تفسیر قرطبی (ج ۳ ص۱۳۰) تحت تفسیر "الطلاق مرتان" المسألۃ الخامسۃ۔ ۱۲ مرتب

حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں ہوا اور کسی نے اس پر اعتراض نہ کیا، اور صحابہ کرام اس کے بعد بالاتفاق اسی کے مطابق فیصلے کرنے لگے[1]، یہاں تک کہ خود حضرت عبداللہ بن عباسؓ جن کی مذکورہ روایت پر اہلِ ظواہر کو بڑا ناز ہے[2] ان کا یہ واقعہ امام ابوداؤد نے اپنی سنن[3] میں نقل کیا ہے «عن مجاهد قال كنتُ عند ابن عباسؓ فجاءه رجل فقال انه طلّق امرأته ثلاثًا قال فسكت حتى ظننتُ أنّه رادّها إليه ثم قال ينطلق أحدكم فيركب الحموقة ثم يقول يا ابن عباس! يا ابن عباس! وإن الله قال وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا وإنك لم تتق الله فلا أجد لك مخرجًا عصيت ربّك وبانت منك امرأتك الخ»

حضرت عبداللہ عباسؓ کی روایت میں مذکورہ تاویل اس لئے بھی ضروری ہے کہ اگر اس روایت کو اس کے ظاہر پر محمول کیا جائے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر صورت میں تین طلاقیں ایک شمار کی جائیں اگرچہ تین متفرق طہروں میں دی گئی ہوں، اس لئے کہ «كان الطلاق ..... طلاق الثلاث واحدة» کا جملہ ایک مجلس کی تین طلاقوں اور اطہارِ ثلاثہ کی تین متفرق طلاقوں دونوں کو شامل ہے جبکہ اطہارِ ثلاثہ کی تین متفرق طلاقوں کو علامہ ابن تیمیہؒ وغیرہ بھی تین ہی شمار کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس حدیث کے عموم میں وہ بھی تخصیص کرتے ہوئے کہیں گے کہ یہ اس صورت میں ہے جبکہ ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دیجائیں، جب وہ اس روایت میں تخصیص پر مجبور ہیں تو جمہور کے لئے کیونکر اس کی گنجائش نہ ہوگی کہ وہ اس کو "تاکید" کی صورت کے ساتھ مخصوص کریں۔

(۲) اہلِ ظاہر اور علامہ ابن تیمیہؒ وغیرہ کا دوسرا استدلال مسند احمد[4] میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہی کی دوسری روایت سے ہے فرماتے ہیں «طلّق ركانة بن عبد يزيد أخو بني مطلب امرأته ثلاثًا في مجلس واحد فحزن عليها حزنًا شديدًا، قال: فسأله رسول الله صلى الله عليه وسلم كيف طلّقتها ثلاثًا، قال: فقال: في مجلس واحد؟ قال نعم، قال: فإنّما تلك واحدة فارجعها

---

[1] متعدد فتاویٰ یا انکے حوالجات پیچھے گذر چکے ہیں، نیز سنن دارقطنی (ج ۴ ص ۲۱، رقم ۵۶) میں حبیب بن ابی ثابت کی روایت ہے، فرماتے ہیں: «جاء رجل إلى علي بن أبي طالبؓ فقال: إني طلّقت امرأتي ألفًا، قال علي: يحرمها عليك ثلاث وسائرهن اقسمهن بين نسائك»

اور مصنف ابن ابی شیبہ (ج ۵ ص ۱۳، في الرجل يطلق امرأته مائة الخ) میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کا فتویٰ مذکور ہے «إنه سئل عن رجل طلّق امرأته مائة فقال ثلاث يحرّمنها عليه وسبعة وتسعون فضل» ۔ ۱۲ مرتب عفی عنہ

[2] تفصیل کے لئے عمدة الاثاث (ص ۸، باب دوم) ۱۲ م

[3] (ج ۱ ص ۲۹۹) باب بقية نسخ المراجعة بعد التطليقات الثلاث ۱۲ م

[4] (ج ۱ ص ۲۶۵) مسند عبد الله بن العباسؓ ۱۲ م

إن شئت، قال: فرجعها۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت رکانہؓ کے واقعۂ طلاق کے بارے میں روایات مختلف ہیں، بعض میں "طلق امرأته ثلاثاً" کے الفاظ آئے ہیں کما فی الروایة المذکورة اور بعض میں "طلق امرأته البتة" کے الفاظ آئے ہیں کما فی روایة أبی داؤد[1]، امام ابوداؤدؒ نے "البتة" والی روایت کو دو وجہ سے ترجیح دی ہے، اول تو اس لئے کہ یہ روایت حضرت رکانہؓ کے اہلِ خاندان سے مروی ہے "وھم أعلم به"۔ دوسرے اس لئے کہ "طلق ثلاثاً" والی روایات مضطرب ہیں کیونکہ بعض روایتوں میں طلاق دینے والے کا نام "رکانہ" ذکر کیا گیا ہے (کما فی روایة أحمد) اور بعض میں "ابو رکانہ" آیا ہے[2] جبکہ "البتة" والی روایت اس اضطراب سے خالی ہے اور اس میں صاحبِ واقعہ متعین طور پر حضرت رکانہؓ کو قرار دیا گیا ہے، لہٰذا صحیح یہ ہے کہ حضرت رکانہؓ نے اپنی اہلیہ کو تین طلاقیں نہ دی تھیں بلکہ "أنت طالق البتة" کہا تھا، اور چونکہ قدیم محاورہ میں طلاق البتة کا اطلاق تین طلاقیں دینے پر بھی ہوجاتا تھا (تین کی نیت کرنے کی تقدیر پر) اس لئے بعض راویوں نے روایت بالمعنیٰ کرتے ہوئے "طلق البتة" کو "طلق ثلاثاً" کے الفاظ سے تعبیر کردیا[3]۔

جب یہ ثابت ہوگیا کہ حضرت رکانہؓ نے "أنت طالق البتة" کہا تھا تو ان کی طلاق کو ایک قرار دینا بالکل واضح ہے، چنانچہ اس صورت میں ہمارے نزدیک بھی ایک طلاق بائن واقع ہوتی ہے، کما مرّ تفصیله فی أوّل الباب۔

---

[1] (ج ۱ ص۳۰۰) باب فی البتة۔ نیز حدیثِ باب میں خود حضرت رکانہؓ فرماتے ہیں "إنی طلقت امرأتی البتة" ۱۲ مرتب

[2] کما فی روایة أبی داؤد (ج ۱ ص۲۹۸) باب بقیة نسخ المراجعة بعد التطلیقات الثلاث ۱۲ م

[3] اس کے علاوہ "طلق ثلاثاً" والی روایت کو ضعیف بھی قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

"روایة ضعیفة عن قوم مجهولین" کما فی شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۷۸) باب طلاق الثلاث۔

اور علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں:

وهذا لا یصح لأنه عن غیر مسمّی من بنی أبی رافع ولا حجة فی مجهول، وما نعلم فی بنی أبی رافع من یحتج به إلا عبید الله وحده وسائرهم مجهولون۔ کذا فی المحلّی (ج ۱۰ ص۱۶۸) بیان اختلاف العلماء فی طلاق الثلاث الخ

۱۲ مرتب عفی عنہ

اس کے علاوہ بالفرض اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ حضرت رکانہؓ نے تین طلاقیں دی تھیں تب بھی اس حدیث سے جمہور کے خلاف استدلال نہیں ہوسکتا کیوں کہ اس میں یہ تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک طلاق قرار دینے سے پہلے حضرت رکانہؓ کو قسم دیکر اس بات کا اطمینان فرمالیا تھا کہ حضرت رکانہؓ کی نیت ایک طلاق دینے کی تھی کما فی حدیث الباب، اور یہ پیچھے گزر چکا ہے کہ عہدِ رسالت میں نیتِ تاکید کو قضاءً بھی قبول کرلیا جاتا تھا لیکن فسادِ زمانہ کے بعد اس کو قضاءً قبول کرنے کا سلسلہ حضرت عمرؓ نے ختم فرمادیا، ہاں دیانۃً یہ نیت آج بھی معتبر ہے[1]۔

---

[1] یہ ایک جملہ یا ایک مجلس میں دیجانے والی تین طلاقوں کو ایک شمار کرنے والوں کے دلائل اور ان کے جوابات کا ذکر تھا۔

جہاں تک دوسرے مذہب کا تعلق ہے جو ایسی صورت میں ایک طلاق کے بھی قائل نہیں کما نقلناہ عن بعض الروافض ان کا استدلال قرآن کریم کی اس آیت سے ہے «اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ الآیۃ» سورۂ بقرہ آیت (۲۲۹) پ۲) اسمیں "مرّتٰن" کا لفظ اس پر دال ہے کہ دو طلاقیں بیک وقت نہ دیجائیں گی بلکہ دو دفعہ میں دیجائیں گی جس کا تقاضا یہ ہے کہ تین طلاقیں بھی بیک وقت نہ دیجائیں بلکہ تین دفعوں میں دیجائیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ استدلال درست نہیں، اس لئے کہ اس آیت کا منشا اس غلط طریقہ کا ابطال ہے جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھا کہ لوگ اپنی بیویوں کو ایک طلاق دیکر رجوع کرلیتے پھر جب چاہتے تو دوبارہ طلاق دے کر رجوع کرلیتے اور طلاق و مراجعت کا یہ سلسلہ جاری رہتا، باری تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرماکر واضح طور پر بتلا دیا کہ دو طلاقوں تک رجوع ہوسکتا ہے اور تیسری طلاق کے بعد رجوع کی گنجائش نہیں الّا یہ کہ حلالہ کے بعد دوبارہ نکاح کیا جائے، اس سے کوئی بحث نہیں کہ یہ طلاقیں ایک مرتبہ میں دی گئی ہوں یا دو مرتبہ میں۔

اس کے علاوہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ "مرّتٰن" کا لفظ لاکر یہ بتایا جارہا ہے کہ "طلاق مرّۃً بعد مرّۃٍ" دی جائیگی تب بھی یہ طلاق کے شرعی طریقہ کا بیان ہوگا (چنانچہ طلاق حسن یا طلاقِ سنّی کا یہی طریقہ ہے، کما مرّ تفصیلہٗ) گویا کہ آیت طریقِ ایقاع کو بیان کررہی ہے، لیکن آیت میں اس پر کوئی دلالت نہیں کہ اگر تین طلاقیں بیک وقت دیجائیں گی تو وہ واقع نہ ہوں گی واللہ اعلم۔ دیکھئے شرح وقایہ وعمدۃ الرعایہ (ج ۲ ص۷۱، قبیل باب ایقاع الطلاق)

حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت مسلکِ جمہور کے خلاف نہیں بلکہ خود ان کے مسلک کی دلیل ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے عمدۃ الاثاث (ص۵۱ تا ۵۴)۔

روافض کا دوسرا استدلال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے ہے «من أحدث فی أمرنا ھٰذا ما لیس منہ فھو ردّ» رواہ البخاری فی صحیحہ (ج ۱ ص۳۷۱، کتاب الصلح، باب اذا اصطلحوا علی صلح جور فالصلح مردود) ومسلم فی صحیحہ (ج ۲ ص۷۷، کتاب الأقضیۃ، باب نقض أحکام الباطلۃ) عن عائشۃؓ۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ اس مسئلہ کی حقیقت تھی، اب کچھ عرصہ سے بہت سے اسلامی ممالک کی حکومتیں ایسے قوانین بنا رہی ہیں جن میں بیک وقت دی ہوئی تین طلاقوں کو موجبِ تغلیظ نہیں قرار دیا گیا، اس کی وجہ عموماً یہ بیان کی جاتی ہے کہ لوگ تین طلاقوں کی حقیقت سے بیخبر ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ تین سے کم میں طلاق واقع نہیں ہوتی اس لئے ہمیشہ تین طلاقیں دیتے ہیں، اس طرح خاندان کے خاندان اُجڑ گئے ہیں۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ خرابی قانون کی نہیں بلکہ قانون سے ناواقفیت کی ہے اور اس کا علاج قانون بدلنا نہیں بلکہ عوام کو طلاق کے اسلامی احکام سے باخبر کرنا ہے، جس کا طریقہ یہ ہے کہ نشر و اشاعت کے تمام ذرائع کام میں لاکر اس جہالت کو دور کیا جائے۔

نیز چونکہ تین طلاقیں دینا شرعاً ناجائز اور گناہ ہے اس لئے اسلامی حکومت کیلئے اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ وہ بیک وقت تین طلاقیں دینے کو قابلِ تعزیر جرم قرار دیدے، چنانچہ سعید بن منصور نے حضرت انس رضؓ سے نقل کیا ہے "أن عمر کان إذا أتي برجل طلق امرأته ثلاثا أوجع ظهره[1]"۔

بہرحال جہالت سے پیدا ہونے والی مذکورہ خرابی کی بناء پر شریعت کے احکام کو بدلنے کا کوئی جواز نہیں[2] واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم۔

(بقیہ حاشیۂ صفحۂ گذشتہ) چونکہ اکٹھی تین طلاقیں دینا بدعت اور حرام ہے لہٰذا حدیثِ مذکور کی رُو سے وہ بھی مردود ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ استدلال درست نہیں اس لئے کہ حدیث کا مقصود صرف یہ بتلانا ہے کہ دین میں کوئی ایسی بات شامل کرنا جو دین کا حصہ نہیں وہ مردود ہے۔ چنانچہ اکٹھی تین طلاقیں دینا بھی بدعت ہونے کی حیثیت سے مردود ہے اور شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی، رہا تین اکٹھی طلاقوں کا واقع ہونا یہ دوسری بات ہے جو حدیثِ مذکور کا موضوع نہیں اور متعدد دلائل سے اس کا واقع ہونا ثابت ہے۔ واللہ اعلم ۱۲ رشید اشرف سیفی

(حاشیۂ صفحۂ ھٰذا)

[1] قال الحافظ: وسنده صحیح۔ فتح الباری (ج ۹ ص۳۶۲) باب من جوز الطلاق الثلاث ۔ ۱۲ مرتب

[2] طلقاتِ ثلاثہ سے متعلق تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے تکملۂ فتح الملہم (ج ۱ ص۱۵۲ تا ۱۶۰) باب طلاق الثلاث۔ نیز دیکھئے عمدۃ الاثاث فی حکم طلقات الثلاث، مؤلفہ حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب حفظہ اللہ ورعاہ ۔۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ

باب ماجاء فی امرك بیدك

تفویضِ طلاق اگر "امركِ بیدكِ" کے ذریعہ کی جائے تو وہ مجلس پر منحصر رہتی ہے الّا یہ کہ "متٰی شئتِ" وغیرہ کے الفاظ کے ذریعہ اس کو عام کردیا گیا ہو،

پھر اس میں اختلاف ہے کہ اس سے کتنی طلاقیں واقع ہوتی ہیں، حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ نیت کرنے پر اس سے ایک طلاق بائن واقع ہوتی ہے الّا یہ کہ زوج نے تین کی نیت کی ہو، حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی ان الفاظ سے ایک طلاق کے قائل ہیں۔

امام مالکؒ کے نزدیک عورت کے فیصلہ کا اعتبار ہے یعنی عورت جتنی چاہے طلاقیں واقع کرسکتی ہے، امام احمدؒ کا بھی یہی قول ہے، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ سے بھی یہی مسلک مروی ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک زوج کی نیت کا اعتبار ہے اور دو کی نیت بھی ان کے نزدیک معتبر ہے اور ایسی صورت میں طلاق رجعی واقع ہوگی[1] واللہ اعلم۔

باب ماجاء فی الخیار

"اختاری" کے ذریعہ تفویضِ طلاق بھی مجلس پر منحصر رہتی ہے البتہ اس کے حکم میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔

حنفیہ کے نزدیک اگر عورت اپنے نفس کو اختیار کرے تو ایک طلاق بائن واقع ہوگی، اور اگر زوج کو اختیار کرے تو کوئی طلاق واقع نہ ہوگی، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بھی یہی مسلک ہے[2]۔ نیز تین کی نیت کا زوجین میں سے کسی کی جانب سے بھی اعتبار نہیں۔

---

[1] مذاہب کی مذکورہ تفصیل ترمذی کے زیر بحث باب اور بدایۃ المجتہد (ج ۲ ص۵۳، الباب الخامس فی التخییر والتملیك) اور بذل المجہود (ج ۱۰ ص۳۱۱ و ۳۱۲، باب فی أمرك بیدك) سے ماخوذ ہے، وراجع "البذل" للتفصیل ۱۲ مرتب

[2] البتہ ان دونوں حضرات کی دوسری روایت یہ ہے کہ اپنے نفس کو اختیار کرنے کی صورت میں ایک طلاق رجعی واقع ہوگی کما نقل الترمذی فی الباب ۱۲ مرتب

امام شافعیؒ کے نزدیک عورت کے اپنے آپ کو اختیار کرنے کی صورت میں ایک طلاق رجعی واقع ہوگی اور شوہر کو اختیار کرنے پر حنفیہ کے مسلک کے مطابق کچھ نہ ہوگا۔ اور تین کی نیت کرنے پر تین طلاقیں واقع ہوں گی۔

امام احمدؒ کے نزدیک عورت اگر اپنے نفس کو اختیار کرے تو ایک طلاق بائن واقع ہوگی اور اگر شوہر کو اختیار کرے تو بھی ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگی، حضرت علیؓ سے بھی یہی مروی ہے[1]

حدیثِ باب امام احمدؒ کے خلاف حجت ہے جس میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں «خیّرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاخترناہ أفکان طلاقاً؟» اس میں استفہام انکاری ہے یعنی اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی واللہ أعلم۔

باب ماجاء فی المطلقة ثلاثا لاسکنی لها ولا نفقة

عن الشعبی قال: قالت فاطمة بنت قیس: «طلّقنی زوجی ثلاثا علی عهد النبی صلی اللہ علیہ وسلم، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: «لا سکنی لك ولا نفقة....

قال عمرؓ لا ندع کتاب اللہ وسنة نبیّنا صلی اللہ علیہ وسلم بقول امرأة لا ندری أحفظت أم نسیت۔

اصولِ فقہ کی بعض کتابوں میں «لا ندری أحفظت أم نسیت» کے بجائے «لا ندری أصدقت أم کذبت» کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں[3] جن کو بنیاد بنا کر بعض منکرینِ حدیث نے احادیث میں شک ڈالنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ مصر کے مشہور مغرب زدہ اور تجدد پسند مصنف احمد امین مصری نے اپنی کتاب فجر الاسلام میں یہ الفاظ نقل کر کے اس سے دو

---

[1] مذکورہ تفصیل ترمذی کے زیرِ بحث باب، فتح القدیر (ج ۳ ص ۱۰۷، باب تفویض الطلاق) اور بدایۃ المجتہد (ج ۲ ص ۷۳) سے ماخوذ ہے۔

امام مالکؒ کے نزدیک اگر زوجہ مدخول بہا ہو تو تین طلاقیں واقع ہوں گی اور اگر غیر مدخول بہا ہو تو زوج کی طرف سے ایک کا دعویٰ بھی قبول کیا جائے گا۔ کما فی فتح القدیر (ج ۳ ص ۱۰۷) ۱۲ مرتب

[2] الحدیث أخرجه مسلم (ج ۱ ص ۴۸۵) باب المطلقة البائن لا نفقة لها، وابوداؤد (ج ۱ ص ۳۱۶) باب فی نفقة المبتوتة ۱۲ م

[3] دیکھئے مسلم الثبوت (ج ۲ ص ۱۲۱) مسألة: الأکثر الأصل فی الصحابة العدالة، نیز صاحبِ ہدایہؒ نے بھی یہ الفاظ ذکر کئے ہیں «لا ندری صدقت أم کذبت حفظت أم نسیت» دیکھئے (ج ۲ ص ۴۲۳) باب النفقة ۱۲ مرتب

نتیجے نکالے ہیں، ایک یہ کہ صحابہ بعض اوقات ایک دوسرے کی تکذیب کر دیا کرتے تھے جس سے معلوم ہوا کہ عدالت صحابہ کے مسئلہ کو یقینی سمجھ لینا غلط ہے، دوسرے یہ کہ حضرت عمرؓ نے ایک حدیث کو حجت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ احمد امین مصری صاحب کے یہ دونوں اعتراض بالکل بے بنیاد ہیں، جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے اس کا مدار "اصدقت أم کذبت" کے الفاظ پر ہے، شیخ مصطفی حسنی سبائی نے اپنی کتاب "السُّنّة ومكانتها في التشريع الاسلامي" میں لکھا ہے کہ میں نے اس روایت کو حدیث کی تمام مروجہ کتابوں میں دیکھا لیکن کہیں بھی مجھے "صدقت أم كذبت' کے الفاظ نہیں ملے (۱)، نیز علامہ ابن القیمؒ "لا ندري صدقت أم كذبت' کے بارے میں فرماتے ہیں "غلط ليس في الحديث (۲)" البتہ یہ الفاظ مسند امام ابوحنیفہؒ کی ایک روایت میں موجود ہیں (مسند ابی حنیفہؒ ص: ۱۴۵) اور ان کی توجیہ یہ ہے کہ "صدقت" أصابت کے معنی میں ہے اور كذبت أخطأت کے معنی میں ہے۔ اور کلام عرب میں ایسا استعمال معروف ہے۔ لہٰذا حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ انہوں نے کسی صحابیہ کے بارے میں جان بوجھ کر جھوٹ بولنے کی نسبت کی ہے۔

رہا حضرت عمرؓ کا قول "لاندري احفظت أم نسيت" اس سے نہ کسی کی تکذیب لازم آتی ہے نہ ہی اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہے کہ حضرت عمرؓ نے محض اپنی رائے کی بناء پر روایت کو رد کر دیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس حضرت فاطمہؓ کی روایت کے مقابلہ میں قرآن وحدیث کے مستحکم دلائل موجود تھے، وہ یہ سمجھتے تھے کہ حضرت فاطمہؓ کی روایت مجمل ہے اور اس کا سیاق معلوم نہیں کہ آپ نے کن حالات میں نفقہ اور سکنیٰ دینے سے انکار فرمایا ہے، عین ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جو ان کے لئے نفقہ اور سکنیٰ مقرر نہیں فرمایا وہ کسی ایسے سبب کی بناء پر ہو جو حضرت فاطمہ کے ساتھ خاص ہو، ہو سکتا ہے کہ حضرت فاطمہ کو اس سبب کی طرف توجہ نہ ہو یا وہ سبب انہیں یاد نہ رہا ہو اور انہوں نے عدمِ نفقہ اور عدمِ سکنیٰ کو ایک عام حکم قرار دیدیا ہو،

---

(۱) دیکھئے "دین اسلام میں سنت وحدیث کا مقام" ترجمہ السنۃ ومکانتہا الخ مولانا احمد حسن ٹونکی اصل کتاب احقر کو نہ مل سکی۔ ۱۲ مرتب

(۲) تہذیب الامام ابن القیمؒ بهامش مختصر سنن أبي داؤد (ج: ۳ ص: ۱۹۴، رقم ۲۱۹۶) باب من أنكر ذلك على فاطمة" ۔ ۱۲ مرتب

حضرت عمرؓ کا مذکورہ عمل نہ انکارِ حدیث ہے نہ ہی اس سے انکارِ حدیث پر استدلال کیا جاسکتا ہے، روایات میں اس قسم کی جرح و تنقید کہ ایک روایت کو دوسرے کے ذریعہ مقید یا مخصوص کر دیا جائے ہر دور میں جاری رہا ہے، آگے تحقیق سے یہ بات سامنے آئے گی کہ حضرت عمرؓ کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ حضرت فاطمہؓ کے واقعہ سے جو عموم سمجھا جارہا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عموم کے ساتھ نفقہ اور سکنیٰ کی نفی نہیں فرمائی۔

مسئلة الباب : فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ مطلقہ رجعیہ اور مبتوتہ حاملہ عدت کے دوران نفقہ اور سکنیٰ دونوں کی مستحق ہوتی ہے البتہ مبتوتہ غیر حاملہ کے بارے میں اختلاف ہے، اس بارے میں تین مذاہب ہیں

① امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا مسلک یہ ہے کہ مبتوتہ غیر حاملہ کا نفقہ اور سکنیٰ بھی مطلقاً شوہر پر واجب ہے، حضرت عمر بن الخطابؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بھی یہی مسلک ہے، نیز سفیان ثوریؒ، ابراہیم نخعیؒ، ابن شبرمہؒ، ابن ابی لیلیٰؒ وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

② امام احمدؒ، امام اسحٰقؒ اور اہلِ ظاہر کا مسلک یہ ہے کہ اس کے لئے نفقہ ہے نہ سکنیٰ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت جابرؓ کی طرف بھی یہی قول منسوب ہے، نیز حسن بصریؒ، طاؤسؒ، عطاء بن ابی رباحؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

③ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک سکنیٰ واجب ہے نفقہ واجب نہیں، فقہاء سبعہ اور حضرت عائشہؓ کا بھی یہی مسلک ہے[1]۔

عدمِ نفقہ اور عدمِ سکنیٰ پر امام احمدؒ وغیرہ کا استدلال حضرت فاطمہ بنت قیس کی روایت سے ہے۔

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ عدمِ نفقہ پر حضرت فاطمہؓ ہی کی روایت سے استدلال کرتے ہیں البتہ فرماتے ہیں کہ "أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ[2]" کی آیت سکنیٰ کے بارے میں حضرت فاطمہؓ کی روایت کے معارض ہے لہٰذا

---

[1] مذاہب کی مذکورہ تفصیل عمدۃ القاری (ج ۲۰ ص ۳۰۸ و ۳۰۹، باب قصۃ فاطمۃ بنت قیس) کتاب الطلاق، احکام القرآن للجصاص (ج ۳ ص ۴۵۹، باب السکنیٰ للمطلقۃ) تہذیب الإمام ابن القیم بہامش مختصر سنن ابی داؤد للمنذری (ج ۳ ص ۱۹۰ و ۱۹۱) سے ماخوذ ہے۔ ۱۲ مرتب

[2] سورۂ طلاق آیت (۶) پ ۲۸ ۱۲ م

ہم نے روایت کو ترک کر دیا اور کتاب اللہ کو اختیار کر لیا۔[۱]

حضرات احناف کے دلائل :

(۱) وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ[۲] " اس آیت میں متاع سے نفقہ اور سکنیٰ دونوں مراد ہیں چنانچہ آیت کا سیاق یہی ہے اس لئے کہ اس آیت سے قبل " وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ الآیۃ" کی آیت آئی ہے جس میں " مَتَاعًا " سے بالاتفاق نفقہ اور سکنیٰ دونوں مراد ہیں، پھر چونکہ کسی کو یہ وہم ہو سکتا تھا کہ نفقہ اور سکنیٰ " متوفیٰ عنہا زوجہا " کے ساتھ خاص ہے اس لئے اس وہم کے دفعیہ کے لئے فرمایا گیا وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ " یعنی نفقہ اور سکنیٰ " متوفیٰ عنہا زوجہا " کے ساتھ مطلقات کے لئے بھی ہے اور مطلقات کا لفظ عام ہے جو مطلقہ رجعیہ اور مبتوتہ دونوں کو شامل ہے۔

(۲) " اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ "

امام جصاصؒ نے اس آیت سے تین طریقوں سے مسلکِ احناف کو ثابت کیا ہے۔

(الف) جس طرح سکنیٰ ایک مالی حق ہے اور اس آیت کی رُو سے واجب ہے، اسی طرح نفقہ بھی مالی حق ہونے کی وجہ سے واجب ہوگا

(ب) " وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ " سے مطلقات کو ضرر پہنچانے سے روکا گیا ہے اور ضرر جس طرح عدمِ سکنیٰ سے لاحق ہوتا ہے اسی طرح عدمِ نفقہ سے بھی لاحق ہوتا ہے۔

(ج) " لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ " تنگی اور تضییق جس طرح عدمِ سکنیٰ میں ہے اسی طرح عدمِ نفقہ میں بھی ہے۔

---

[۱] ان حضرات کے استدلال کو ایک دوسرے طرز پر بھی بیان کیا گیا ہے کہ " اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ " سے مطلقاً سکنیٰ کا ثبوت ہوا اور اسی آیت کے اگلے حصہ " وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ " سے معلوم ہو رہا ہے کہ نفقہ بھی واجب ہے البتہ وجوبِ نفقہ حاملہ ہونے کی قید کے ساتھ مقید ہے فظہر اَنّہ لا نفقۃ لہا اِذا لم تکن حاملاً ۔ اس صورت میں ان کا استدلال مفہوم مخالف سے ہوگا جو شوافع وغیرہ کے ہاں حجت ہے دیکھئے فتح الباری (ج ۹ ص ۴۸۱) باب قصۃ فاطمۃ بنت قیس ۱۲ مرتب عفی عنہ

[۲] سورۃ البقرہ آیت (۲۴۱) پ ۲ ع ۱۲

البتہ یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جب ہر مطلقہ کے لئے ایام عدت میں نفقہ اور سکنیٰ واجب ہے پھر آگے "وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ" کے بیان کی کیا حاجت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ "اُولات حمل" کی قید احترازی نہیں ہے، نہ ہی ہمارے نزدیک مفہوم مخالف حجت ہے اور مطلقہ حاملہ کو مستقل طور پر ذکر کرنے میں یہ حکمت ہے کہ حاملہ کی عدت بسا اوقات طویل ہو جاتی ہے ایسی صورت میں شوہر کی جانب سے خدشہ ہو سکتا تھا کہ وہ انفاق کو ترک کر دے اس لئے تنبیہ کی گئی کہ یہ نفقہ وضع حمل تک واجب ہے خواہ کتنا ہی وقت گزر جائے۔[1]

(۳) سنن دارقطنی[2] میں عثمان بن احمد الدقاق نا عبد الملک بن محمد ابو قلابۃ نا أبی نا حرب بن أبی العالیۃ عن ابی الزبیر عن جابرؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: المطلقۃ ثلاثاً لها السکنیٰ والنفقۃ۔

اس حدیث میں دارقطنی کے شیخ اور شیخ الشیخ کے سوا تمام رجال مسلم کے رجال ہیں[3] اور یہ دونوں مختلف فیہ راوی ہیں[4] لہٰذا یہ حدیث حسن سے کم نہیں۔[5]

---

[1] حضرات احناف کے دلائل سے یہاں تک کی بحث تکملۃ فتح الملہم (ج ۱ ص۲۰۲ و ص۲۰۳) اور احکام القرآن للجصاص (ج ۳ ص۴۵۹ و ۴۶۰) باب السکنیٰ للمطلقۃ، سے ماخوذ ہے تعبیر مرتب کی ہے۔

حضرت استاذ محترم دام اقبالہم نے تکملۃ فتح الملہم (ج ۱ ص۲۰۱) میں مذکورہ آیت سے وجوب نفقہ للمبتوتۃ کی ایک اور وجہ بھی ذکر کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں "أن ابن مسعودؓ قرأ هذه الآية أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ وَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ مِنْ وُجْدِكُمْ كما ذكره الآلوسی فی روح المعانی (ج ۲۸ ص۱۳۹) ولا تنزل القراءۃ الشاذۃ عن کونها فی منزلۃ خبر الواحد - ۱۲ مرتب

[2] (ج ۴ ص۲۱، رقم ۵۹) کتاب الطلاق ۱۲ م

[3] کما حقق العلامۃ العثمانی فی إعلاء السنن (ج ۱۱ ص۲۹۵) باب أن المطلقۃ المبتوتۃ لها السکنیٰ والنفقۃ - ۱۲ مرتب

[4] چنانچہ عثمان بن احمد الدقاق کو خود امام دارقطنیؒ نے ثقہ قرار دیا ہے اور حافظ ذہبیؒ نے "صدوق فی نفسہ" کہا ہے، دیکھئے میزان الاعتدال (ج ۳ ص۳۱، رقم ۵۴۸۶)۔

اور عبد الملک بن محمد ابو قلابہ امام ابو داؤد نے انہیں "أمین مأمون" قرار دیا ہے، ابن جریرؒ کہتے ہیں "ما رأیت أحفظ منہ"، اور حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں "مکثر صاحب حدیث وفضل" میزان الاعتدال (ج ۲ ص۶۶۳، رقم ۵۲۴۵) ۱۲ مرتب

[5] اس روایت کے رواۃ سے متعلق مزید تحقیق کے لئے دیکھئے اعلاء السنن (ج ۱۱ ص۲۹۵ و ص۲۹۶) اور تکملۃ فتح الملہم (ج ۱ ص۲۰۴ و ۲۰۵) ۱۲ مرتب

④ طحاوی[1] میں حضرت فاطمہ بنت قیس کے واقعہ کے بارے میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کو سنکر فرمایا "لسنا بتارکی آیۃ من کتاب اللہ تعالیٰ وقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقول امرأۃ لعلّہا أوھمت سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لہا السکنیٰ والنفقۃ[2]" یہ وجوب سکنیٰ و نفقہ کے حق میں صریح حدیث مرفوع ہے۔

البتہ اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ابراھیم نخعیؒ کا سماع حضرت عمرؓ سے نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ابراھیم نخعیؒ کی مراسیل باتفاق جمہور مقبول ہیں چنانچہ حافظ ابن عبد البرؒ التمہید[3] میں فرماتے ہیں "أن مراسیل النخعی صحیحۃ"

اس پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ امام بیہقیؒ نے فرمایا کہ یہ حکم ابراھیم نخعیؒ کی ان مراسیل کا ہے جو حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے مروی ہیں نہ کہ تمام مراسیل کا[4]۔

لیکن امام بیہقیؒ کا یہ قول جمہور محدثین کے خلاف ہے جنہوں نے ابراھیم نخعیؒ کی مراسیل کو علی الاطلاق قبول کیا ہے[5]۔

⑤ پھر مذکورہ بحث تو طحاوی کی مذکورہ بالا روایت کے بارے میں تھی جس میں حضرت عمرؓ کی طرف سے یہ تصریح مروی ہے کہ "سمعتُ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یقول لہا السکنیٰ والنفقۃ" اور حضرت عمر فاروقؓ کے یہ الفاظ تو صحیح مسلم[6] میں مروی ہیں "لا نترك کتاب اللہ و

---

[1] شرح معانی الآثار (ج ۲ ص ۳۵) باب النفقۃ والسکنیٰ للمعتدۃ الطلاق ۱۲ م

[2] اس کو امام طحاویؒ کے علاوہ قاضی اسماعیل نے بھی ذکر کیا ہے کما نقل الماردینیؒ صاحب الجوھر النقی فی ذیل سنن الکبریٰ للبیہقی (ج ۷، ص ۴۷۶) کتاب النفقات، باب من قال لہا النفقۃ۔ نیز علامہ ابن حزمؒ نے بھی اسے المحلیٰ (ج ۱۰ ص ۲۹۷ و ۲۹۸، احکام العدۃ) میں ذکر کیا ہے۔ ۱۲ مرتب

[3] (ج ۱ ص ۳۷ و ۳۸) کذا فی التکملۃ (ج ۱ ص ۲۵) ۱۲ م

[4] کما نقل المبارکفوریؒ فی تحفۃ الأحوذی (ج ۲ ص ۲۱۳) باب زیر بحث - ۱۲ م

[5] چنانچہ خود حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب میں کہا ہے "وجماعۃ من الأئمۃ صححوا مراسیلہ" کذا نقل المبارکفوری فی تحفتہ (ج ۲ ص ۲۱۳)۔

نیز حافظ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں "مراسیلہ عن ابن مسعودؓ وعمر صحاح کلہا وما أرسل منہا أقویٰ من الذی أسند، حکاہ یحیی القطان وغیرہ" کذا فی الجوھر النقی فی ذیل البیہقی (ج ۷، ص ۴۷۶) باب من قال لہا النفقۃ - ۱۲ مرتب

[6] (ج ۱ ص ۴۸۵) ۱۲ م

سنة نبينا صلى الله عليه وسلم لقول امرأة لا ندری لعلها حفظت أو نسيت لها السكنى و النفقة» جس سے اتنی بات واضح ہے کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک فاطمہ بنت قیسؓ کا واقعہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول دونوں کے معارض تھا جس کا مطلب یہ کہ حضرت عمرؓ کے پاس فاطمہ بنت قیس کے واقعہ کے خلاف کوئی صریح حدیث موجود تھی، اور اصولِ حدیث میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ اگر کوئی صحابی «السنة كذا» کہے تو اس کا یہ قول حدیثِ مرفوع کے حکم میں ہے[1]۔

بعض حضرات نے «وسنة نبينا» کی زیادتی کو غیر صحیح قرار دینے کی کوشش کی ہے لیکن مسلم کی صحیح روایت میں ان الفاظ کے آنے کے بعد یہ اعتراض قابلِ اعتنا نہیں[2]۔

رہی فاطمہ بنت قیس کی روایت سو اس کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں۔

سکنیٰ کے باب میں شوافع وغیرہ کی جانب سے یہ جواب دیا گیا ہے کہ فاطمہ بنت قیس اپنے شوہر اور ان کے گھر والوں کے خلاف زبان درازی کیا کرتی تھیں[3] اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شوہر کے گھر سے ہٹا دیا[4]۔

دوسری وجہ صحیحین[5] میں حضرت عائشہؓ وغیرہ سے یہ مروی ہے کہ فاطمہ بنت قیس اپنے

---

[1] دیکھئے فتح الملہم (ج ۱ ص ۱۲)، مقدمہ قول الصحابی أو التابعی من السنة كذا هل هو فی حکم الرفع ۔۱۲ مرتب

[2] مذکورہ اعتراض سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے تہذیب الامام ابن قیم الجوزیۃ بہامش مختصر سنن ابی داؤد للمنذری (ج ۳ ص ۱۹۳)، باب من أنكر ذلك على فاطمة)۔

اس اعتراض کے جواب اور «وسنة نبينا» کی زیادتی کے متعدد شواہد و متابعات کے لئے دیکھئے الجوهر النقی بذیل البیہقی (ج ۷ ص ۴۷۶، باب من قال لها النفقة) ۱۲ مرتب عفی عنہ

[3] چنانچہ مشکوٰۃ میں شرح السنۃ کے حوالہ سے حضرت سعید بن المسیبؒ کا اثر مروی ہے فرماتے ہیں «إنما نقلت فاطمة لطول لسانها على أحمائها» دیکھئے (ج ۲ ص ۹۹۴، رقم ۳۳۲۹) باب العدة ۔۱۲ مرتب

[4] مذکورہ جواب کے لئے دیکھئے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴۸۳) باب المطلقة البائن لا نفقة لها ۔۱۲ م

[5] چنانچہ بخاری (ج ۲ ص ۸۰۲) کتاب الطلاق، باب المطلقة إذا خشی علیها أن یقتحم علیها الخ میں روایت آئی ہے «عن عروة أن عائشة أنكرت ذلك على فاطمة، وزاد ابن ابی الزناد عن هشام عن أبيه عابت عائشة أشد العيب و قالت إن فاطمة كانت فی مكان وحش فخيف على ناحيتها فلذلك أرخص لها النبی صلى الله عليه وسلم»۔

اس روایت سے حضرت عائشہؓ کی فاطمہ بنت قیس پر شدید ناراضگی بھی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شوہر کے گھر میں تنہا ہونے کی وجہ سے وحشت محسوس کرتی تھیں اس لئے آپؐ نے ان کو حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ کے گھر میں عدت گزارنے کی اجازت دی۔

رہا نفقہ کا معاملہ بعض احناف نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ان کے شوہر کے وکیل نے انہیں نفقہ کی ایک مقدار بھیجی تھی لیکن فاطمہ بنت قیس اس کو کم سمجھ رہی تھیں، اور زائد کی طالب تھیں، ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زائد مقدار کو منع فرمایا ہو، لہذا حدیث مذکور میں نفقہ نہ ہونے سے مراد مطلق نفقہ کی نفی نہیں بلکہ اس مطلوب زیادتی کی نفی ہے[1]

دوسرا جواب امام طحاویؒ نے دیا ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں "لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ[2]" کے ساتھ "إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ" کا استثناء آیا ہے اور زبان درازی بھی "فاحشۂ مبینہ" میں داخل ہے اس کی بناء پر فاطمہ بنت قیس سکنیٰ سے محروم رہیں اور جب شوہر کے گھر میں نہ رہیں اور یہ گھر میں نہ رہنا بھی خود انہی کے عمل سے ہوا تو وہ "فاحشۂ مبینہ" کے تحت داخل ہو کر نشوز ہوا اور نشوز کے بعد نفقہ واجب نہیں ہوتا[3]۔ اس مقام پر امام جصاص کے کلام کا حاصل بھی یہی ہے[4]۔

احقر کے نزدیک فاطمہ بنت قیس کے واقعہ کی سب سے بہتر توجیہ یہی ہے کہ جب شوہر کے گھر کی سکونت ختم ہو گئی خواہ فاطمہ بنت قیس کی وحشت کی وجہ سے یا خوف کی وجہ سے یا خود ان کی زبان درازی کی وجہ سے تو ان کا نفقہ بھی ساقط ہو گیا اس لئے کہ نفقہ احتباس کی جزاء ہے اور

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

واضح ہے کہ خصوصی حالات کے تحت دیجانے والی اجازت کو انہوں نے عام الفاظ کے ساتھ بیان کر دیا۔

عبداللہ بن ام مکتوم کے گھر میں رہنے کی اجازت کا ذکر صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۸۴ و ۴۸۵) کی مختلف روایات میں آیا ہے۔

واضح رہے کہ عبداللہ بن ام مکتومؓ اُن کے چچا زاد بھائی تھے جیسا کہ سنن نسائی (ج ۲ ص۱۱۴، الرخصۃ فی خروج المبتوتۃ من بیتہا الخ) کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ ۱۲ مرتب عفی عنہ

(حاشیہ صفحۂ ھٰذا)

[1] یہ جواب مسلم (ج ۱ ص۴۸۳) میں خود حضرت فاطمہ بنت قیس کی روایت سے سمجھ میں آتا ہے۔ ۱۲م

[2] سورۂ طلاق آیت (۱) پ۲۸۔ ۱۲م

[3] شرح معانی الآثار (ج ۲ ص۳۶ و ۳۷) باب المطلقۃ طلاقاً بائناً الخ۔ ۱۲م

[4] دیکھئے احکام القرآن (ج ۳ ص۶۲۲) باب السکنیٰ للمطلقۃ، سورۂ طلاق۔ ۱۲م

احتباس فوت ہوگیا[1]۔

البتہ ان تمام توجیہات پر سنن نسائی[2] کی اس روایت سے اشکال ہوتا ہے جس میں حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ مروی ہیں "انما النفقة والسكنى للمرأة إذا كان لزوجها عليها الرجعة" ان الفاظ کا ظاہر یہ بتلا رہا ہے کہ یہ حکم فاطمہ بنت قیس کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر مبتوتہ کے لئے عام ہے۔

اس روایت کا کوئی تسلی بخش جواب احقر کی نظر سے نہیں گزرا[3] سوائے اس کے کہ یوں کہا جائے کہ یہ الفاظ راوی کا تصرف ہیں[4]۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم۔

باب ماجاء لاطلاق قبل النكاح

عن[5] عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:

---

[1] لیکن مسلم (ج ۱ ص۴۸۵، المطلقة البائن لا نفقة لها) میں عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ کی روایت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ آئے ہیں "لا نفقة لك" اس کے بعد راوی کہتے ہیں "فاستأذنته فى الانتقال فأذن لها" جس کا ظاہر یہ ہے کہ عدم نفقہ کا حکم پہلے لگا اور احتباس بعد میں فوت ہوا، اس صورت میں مذکورہ توجیہ کا انطباق مشکل ہے الا یہ کہ یوں کہا جائے کہ نشوز کی وجہ سے احتباس ختم ہونا متعین ہوچکا تھا اس لئے عدم نفقہ بھی طے ہوگیا تھا اگرچہ اس جیسی روایات میں عدم نفقہ کا ذکر پہلے ہوا ہو اور احتباس کے ختم ہونے کا ذکر بعد میں ہوا ہو۔ ۱۲ مرتب

[2] (ج ۲ ص۱۰۰) باب الرخصة فى ذلك - ۱۲ م

[3] البتہ امام طحاوی نے اس کا تفصیلی جواب دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ روایت کتاب اللہ اور سنت دونوں کے خلاف ہونے کی وجہ سے حجت نہیں، دیکھئے شرح معانی الآثار (ج ۲ ص۳۱) باب المطلقة طلاقا بائنا ماذا لها على زوجها فى عدتها۔ علامہ عینی نے بھی اسی جواب کو نقل کیا ہے، دیکھئے عمدة القاری (ج ۲۰ ص۳۱۱) باب قصة فاطمة بنت قيس - ۱۲ مرتب عفی عنہ

[4] امام طحاوی کے جواب کے بعد روایت کو راوی کے تصرف پر محمول کرنا قرین قیاس ہے - ۱۲ مرتب

[5] الحديث أخرجه أبوداود بتغير وزيادة (ج ۱ ص۲۹۸) باب فى الطلاق قبل النكاح - ۱۲ م

لا نذر لابن آدم فیما لایملك ولا عتق له فیما لا یملك ولا طلاق له فیما لایملك۔

اس حدیث کی وجہ سے اس پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص غیر منکوحہ کو "انت طالق" کہے تو اس پر طلاق واقع نہ ہوگی خواہ بعد میں وہ عورت اس کی منکوحہ بن جائے۔

البتہ اگر طلاق کی نسبت ملک کی طرف کی گئی ہو جیسے "إن نکحتكِ فأنتِ طالق" تو اس کے بارے میں اختلاف ہے۔

حنفیہ کے نزدیک ایسی تعلیق مطلقاً درست ہو جاتی ہے[1]۔

جبکہ شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک علی الاطلاق اس قسم کی تعلیق باطل ہے۔

مالکیہ کے نزدیک اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر تعلیق میں عموم ہو یعنی تعلیق ایسی ہو جس کے بعد کسی بھی عورت سے نکاح کا امکان ہی باقی نہ رہے جیسے "کلما نکحتُ امرأۃ فهی طالق" تو ایسی تعلیق باطل ہے، البتہ اگر کسی خاص عورت یا کسی خاص علاقہ یا خاص قبیلہ اور زمانہ کی نسبت سے تعلیق کی جائے تو ایسی تعلیق درست ہو جاتی ہے مثلاً "إن نکحتُ فلانة" یا "إن نکحتُ من بلدۃ کذا أو من قبیلة کذا" یا "إن نکحتُ فی هذا الشهر" امام اوزاعیؒ، ابن ابی لیلیٰؒ وغیرہ کا بھی یہی مسلک ہے[2] امام ترمذیؒ نے سفیان ثوریؒ کا مسلک بھی یہی نقل کیا ہے۔

عموم کی صورت میں تعلیق کے درست نہ ہونے کی وجہ ان حضرات کے نزدیک یہ ہے کہ یہ ایک حلال چیز یعنی نکاح کو بالکلیہ حرام کر دینے کے مرادف ہے جس کا اختیار کسی انسان کو نہیں ہے[3]۔

---

[1] اسی طرح اگر عتق کو منسوب الی الملک کیا جائے اور کہا جائے "إن ملکتك فأنت حرّ" یا منسوب الی سبب الملک کیا جائے اور کہا جائے "إن اشتریتك فأنت حرّ" تو یہ تعلیق حنفیہ کے نزدیک درست ہے۔ اس اصولی مسئلہ کی تفصیل کے لئے دیکھئے نور الأنوار (ص ۱۵۹) مبحث الوجوہ الفاسدۃ، الوجہ الثانی - ۱۲ مرتب

[2] مذاہب کی تفصیل کے لئے دیکھئے بذل المجہود (ج ۱۰ ص ۲۷۲ و ۲۷۳) باب فی الطلاق قبل النکاح - ۱۲ م

[3] ابراہیم نخعیؒ کا ایک اثر بھی ان کی دلیل ہے، فرماتے ہیں "إذا وقّت امرأۃ أو قبیلة جاز وإذا عمّ کل امرأۃ فلیس بشئ" رواہ عبد الرزاق فی مصنفه (ج ۶ ص ۴۲۱، رقم ۱۱۴۷۱) باب الطلاق قبل النکاح - ۱۲ مرتب

شافعیہ اور حنابلہ کا استدلال حدیثِ باب سے ہے جس میں ارشاد ہے "ولا طلاق له فیما لا یملك"

احناف کی جانب سے اس کا جواب یہ ہے کہ طلاق مضاف الی الملک کو طلاق فی غیر الملک نہیں کہا جا سکتا کیونکہ طلاق کا وقوع حصولِ ملک کے بعد ہوگا، لہٰذا حدیثِ باب سے احناف کے خلاف استدلال درست نہیں، احناف کے نزدیک حدیثِ باب کا محمل طلاقِ تنجیزی یا وہ طلاق ہے جو معلق بغیر الملک ہو۔

اس توجیہ کی تائید مصنفِ[1] عبد الرزاق کے ایک اثر سے بھی ہوتی ہے "عن معمر عن الزهري في رجل قال: كل امرأة أتزوجها فهي طالق وكل أمة أشتريها فهي حرة قال: هو كما قال قال معمر فقلت أوليس قد جاء عن بعضهم أنه قال لا طلاق قبل النكاح ولا عتاقة إلا بعد الملك قال إنما ذلك أن يقول الرجل امرأة فلان طالق وعبد فلان حر۔

حنفیہ کی دلیل مؤطا[2] امام مالکؒ کی روایت ہے "عن سعيد بن عمرو بن سليم الزرقي أنه سأل القاسم بن محمد عن رجل طلق امرأة إن هو تزوجها فقال القاسم بن محمد إن رجلاً جعل امرأة عليه كظهر أمه إن هو تزوجها فأمره عمر بن الخطاب، إن هو تزوجها لا يقربها حتى يكفر كفارة المتظاهر۔

مصنف عبد الرزاق وغیرہ میں اس طرح کے اور بھی آثار صحابۂ کرامؓ سے مروی ہیں[3]۔ واللہ اعلم۔

---

[1] (ج ۶ ص ۴۲۱، رقم ۱۱۴۷۵) ۱۲ م

[2] (ص ۵۱۵) ظہار الحر، کتاب الطلاق۔ ۱۲ م

[3] چنانچہ روایت ہے "عن محمد بن قيس قال سألت إبراهيم والشعبي عن الطلاق قبل النكاح فقالا سمّى الأسود امرأة فوقت إن تزوجها فهي طالق فسأل عن ذلك ابن مسعود فقال قد بانت منه فاخطبها إلى نفسها۔ رقم ۱۱۴۷۰

نیز روایت ہے "عن أبي سلمة بن عبد الرحمن أن رجلاً أتى عمر بن الخطابؓ فقال كل امرأة أتزوجها فهي طالق ثلاثا فقال له عمر فهو كما قلت۔ رقم ۱۱۴۷۴

مصنف عبد الرزاق (ج ۶ ص ۴۲۰ و ۴۲۱) ۔۱۲ مرتب

باب ما جاء ان طلاق الامۃ تطلیقتان

عن[1] عائشۃ أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: طلاق الأمۃ تطلیقتان وعدتہا حیضتان۔

یہ حدیث اس بارے میں احناف کی دلیل ہے کہ عددِ طلاق کے بارے میں بیوی کی حریت اور عدمِ حریت کا اعتبار ہے نہ کہ مرد کی، یعنی باندی دو طلاقوں سے مغلّظہ ہو جائے گی اور حرّۃ تین طلاقوں سے خواہ شوہر کیسا ہی ہو۔

جبکہ امام شافعیؒ کے نزدیک مرد کی حرّیت و عدمِ حرّیت کا اعتبار ہے یعنی مرد اگر حُر ہے تو اس کی بیوی تین سے کم میں مغلّظہ نہ ہوگی اور اگر عبد ہے تو دو میں مغلّظہ ہو جائے گی خواہ بیوی کیسی ہی ہو[2]۔

شافعیہ کا استدلال حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ کی روایت سے ہے "الطلاق بالرجال والعدۃ بالنساء"[3]۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ روایت موقوف ہے[4] دوسرے یہ شافعیہ کے مسلک پر صریح نہیں اس لئے کہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "الطلاق موکول إلی الرجال" یعنی طلاق کا اختیار صرف مَردوں کو ہے۔

شافعیہ کی دلیل کے برعکس حدیثِ باب حنفیہ کے مسلک پر بالکل صریح ہے البتہ اس روایت پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ مظاہر بن اسلم سے مروی ہے جو ضعیف ہیں[5]۔

---

[1] الحدیث أخرجہ ابن ماجہ فی سننہ (ص۱۵۰) باب فی طلاق الأمۃ وعدتہا-۱۲ م

[2] مذاہب کی تفصیل کے لئے دیکھئے ہدایہ مع فتح القدیر (ج ۳ ص۳۳۷) فصل ویقع طلاق کل زوج الخ-۱۲ م

[3] یہ روایت متعدد صحابہ کرام سے موقوفاً مروی ہے۔ دیکھئے سنن کبریٰ بیہقی (ج ۷، ص۳۶۹ وص۳۷۰) باب ما جاء فی عدد طلاق العبد الخ، کتاب الرجعۃ ۱۲ مرتب

[4] چنانچہ حافظ زیلعیؒ فرماتے ہیں "غریب مرفوعاً" نصب الرایہ (ج ۳ ص۲۲۵) اور حافظؒ فرماتے ہیں: لم أجدہ مرفوعاً" الدرایہ (ج ۲ ص۷۰) ۱۲ مرتب

[5] کما قال الحافظؒ فی التقریب (ج ۲ ص۲۵۵، رقم ۱۱۸۴) ۱۲ م

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ایک مختلف فیہ راوی ہیں امام ابن حبان نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے[1] اور شیخ ابن ہمامؒ نقل کرتے ہیں کہ امام حاکمؒ نے "شیخ من أهل البصرة" کہا ہے[2]، اور "شیخ" کا لفظ الفاظِ تعدیل میں سے ہے کما صرح به السیوطی[3]۔ لہٰذا یہ روایت "حسن" سے کم نہیں، بالخصوص اس لئے بھی کہ سنن[4] دارقطنی میں حضرت ابن عمرؓ کی ایک روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے "قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم طلاق الأمة اثنتان وعدتها حیضتان" یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے لیکن تائید وتقویت کے لئے کافی ہے[5]۔ واللہ اعلم۔

باب ماجاء فی الخلع

عن[6] الربیع بنت معوذ بن عفراء أنها اختلعت على عهد النبي صلى الله عليه وسلم فأمرها النبي صلى الله عليه وسلم أو أمرت أن تعتد بحيضة -

---

[1] میزان الاعتدال (ج ۴ ص ۱۳۱، ع ۸۶۳۶) ۱۲ م

[2] فتح القدیر (ج ۳ ص ۳۴۹) فصل ویقع طلاق کل زوج الخ ۱۲ م

[3] دیکھئے تقریب النووی وتدریب (ج ۱ ص ۳۴۵) الثالثة عشرة فی ألفاظ الجرح والتعدیل ۱۲ مرتب

[4] (ج ۴ ص ۳۸، ع ۱۰۳) ۱۲ م

[5] مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے "السنة بالمرأة فی الطلاق أو العدة" دیکھئے (ج ۵ ص ۸۲) باب ما قالوا فی العبد تکون تحته الحرة الخ -

اسی مقام پر حضرت علیؓ کا اثر ہے "الطلاق والعدة بالنساء"

نیز سنن کبریٰ بیہقی (ج ۷، ص ۳۷۰) باب ماجاء فی عدد طلاق العبد الخ میں حضرت ابن عباسؓ کا اثر ہے "السنه بالنساء فی الطلاق والعدة"

یہ تمام آثارِ صحابہ مذہب احناف کو ثابت کرتے ہیں نیز غیر مدرک بالقیاس ہونے کی وجہ سے مرفوع کے حکم میں ہیں، ۱۲ مرتب عفی عنہ

[6] الحدیث أخرجه النسائی (ج ۲ ص ۱۱۲) عدة المختلعة، وابن ماجه (ص ۱۴۸) باب عدة المختلعة - ۱۲ م

اس باب میں پانچ مباحث ہیں :

خلع کے لغوی معنی لفظ "خُلع" خَلعٌ سے نکلا ہے اس کے معنی اتارنے کے ہیں اور مناسبت یہ ہے کہ قرآن کریم نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے ارشاد ہے "هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ" [1] اور خلع کے ذریعہ ایک دوسرے سے علیحدگی لباس اتار دینے کے مرادف ہے [2]۔

چار قریب المعنی الفاظ اور انکے درمیان فرق پھر اس باب میں چار الفاظ قریب المعنی مستعمل ہیں :
(۱) خلع (۲) طلاق علی مال (۳) فدیہ (۴) مبارأۃ۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری [3] میں علامہ قرطبیؒ نے اپنی تفسیر [4] میں اور علامہ ابن رشد نے بدایۃ المجتہد [5] میں ان کے درمیان یہ فرق کیا ہے کہ کل مہر کو بدل مقرر کرلینا "خلع" ہے، اور جزو مہر کو بدل مقرر کرلینا فدیہ ہے اور عورت کا شوہر کے ذمہ سے ہر ایسے حق کو ساقط کردینا جو نکاح کے ساتھ تعلق رکھتا ہو مبارأۃ ہے۔ اور طلاق علی المال واضح ہے یعنی مہر سے قطع نظر مال کی کوئی مقدار مقرر کرکے طلاق دینا۔ هٰذہ خلاصۃ ما قالوا۔

عدۃ المختلعہ حدیثِ باب سے استدلال کرکے امام اسحاقؒ ابن المنذر وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ مختلعہ کی عدت صرف ایک حیض ہے جبکہ جمہور اس کے قائل ہیں کہ مختلعہ کی عدت وہی ہے جو دوسری مطلقات کی ہے یعنی تین حیض [6]۔

---

[1] سورۃ بقرہ آیت (۱۸۷) پ ۲ - ۱۲ م

[2] وشرعاً ازالۃ ملک النکاح المتوقفۃ قبولها بلفظ الخلع أو ما فی معناہ کالمبارأۃ کذا فی قواعد الفقہ (ص ۲۸۱) ۱۲ مرتب

[3] (ج ۹ ص ۳۰۳) باب الخلع وکیف الطلاق فیہ - ۱۲ م

[4] الجامع لاحکام القرآن (ج ۳ ص ۱۳۵ و ۱۳۶) سورۃ بقرہ تحت قولہ تعالیٰ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَأْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ الآیۃ - ۱۲ م

[5] (ج ۲ ص ۸) الباب الثالث فی الخلع - ۱۲ م

[6] مذاہب کی تفصیل کے لئے دیکھئے المغنی (ج ۷ ص ۴۴۹) کتاب العِدد، فصل وکل فرقۃ بین الزوجین فعدتها عدۃ الطلاق - ۱۲ مرتب

جمہور کے نزدیک حدیثِ باب میں "حیضة" سے مراد جنسِ حیض ہے اس پر بعض ان روایات سے اشکال ہوتا ہے جن میں "حیضة" کے ساتھ "واحدة" کی قید مصرح ہے[۱]۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ راوی کا تصرف ہے دراصل اس نے "حیضة" میں "ۃ" کو تاء وحدت سمجھا اور اپنی فہم کے مطابق "حیضة واحدة" روایت کر دیا حالانکہ "حیضة" میں تاء وحدت نہیں بلکہ بیانِ جنس کے لئے "ۃ" لائی گئی ہے۔

نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ روایت جو خبر واحد ہے نصِّ قرآنی "وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ"[۲] کا معارضہ نہیں کر سکتی[۳]۔

خلع فسخ ہے یا طلاق؟ خلع امام احمدؒ کے نزدیک فسخ ہے امام اسحاقؒ اور ابو ثورؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام شافعیؒ کی بھی ایک روایت اسی کے مطابق ہے، نیز حضرت ابن عباسؓ کی طرف بھی یہی منسوب ہے۔

جمہور کے نزدیک خلع طلاق ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے بھی یہی مروی ہے[۴]۔

امام احمدؒ کا استدلال یہ ہے کہ قرآن کریم میں خلع کا ذکر "اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ" کے بعد کیا گیا ہے یعنی "فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ[۵]" اور اس کے بعد اگلی آیت ہے "فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ" جو اس بات کی دلیل ہے کہ خلع ان تین طلاقوں میں شمار نہیں اگر خلع خود طلاق ہوتا تو طلاقیں چار ہو جاتیں جس کا کوئی قائل نہیں۔

---

۱ کما فی روایۃ النسائی (ج ۲ ص ۱۱۲) ۱۲ م

۲ سورۂ بقرہ آیت (۲۲۸) پ ۲ ۔ ۱۲ م

۳ مذکورہ دونوں جوابوں کے لئے دیکھئے الکوکب الدری (ج ۲ ص ۲۶۱) اور بذل المجہود (ج ۱۰ ص ۳۳۲) بیان حکم الخلع ۔ ۱۲ م

۴ مذاہب کی تفصیل کے لئے دیکھئے المغنی (ج ۷ ص ۵۱) مسألۃ قال والخلع فسخ الخ یہاں امام احمدؒ کی ایک روایت جمہور کے مطابق بھی نقل کی گئی ہے ۔ ۱۲ مرتب

۵ سورۂ بقرہ آیت (۲۲۹) پ ۲ ۔ ۱۲ م

اس کے جواب میں جمہور کہتے ہیں کہ سیاقِ قرآن کا مفہوم یہ ہے کہ طلاقِ غیرِ مغلّظ دو ہیں، پھر ان میں دو صورتیں ہیں یا بلا مال ہوں گی یا بمال، «اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ» سے جہاں طلاقِ غیرِ مغلّظ کا دو ہونا معلوم ہو رہا ہے وہاں اس کے اطلاق سے طلاق بلا مال کی صورت بھی سمجھ میں آرہی ہے اور آیتِ خلع سے «طلاق بالمال» کا ذکر ہو رہا ہے لہٰذا خلع «مرّتان» سے خارج نہیں، لہٰذا «فَاِنْ طَلَّقَهَا» سے تیسری طلاق کا ذکر ہوگا اور طلاق کا چار ہونا لازم نہ آئیگا۔[۱]

اس کے علاوہ جمہور کی دلیل یہ بھی ہے کہ جب حضرت ثابت بن قیس کی اہلیہ نے خلع کا مطالبہ کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس سے فرمایا «أقبل الحديقة و طلّقها تطليقة»[۲] اس میں آپؐ نے خلع کو طلاق کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔[۳]

کیا خلع عورت کا حق ہے؟ ہمارے زمانہ میں خلع کے بارے میں ایک اور مسئلہ عہدِ حاضر کے متجدّدین نے پیدا کر دیا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام علماء امت کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ خلع ایک ایسا معاملہ ہے جس میں تراضی طرفین ضروری ہے اور کوئی فریق دوسرے کو اس پر مجبور نہیں کر سکتا، لیکن ان متجددین نے یہ دعویٰ کیا کہ خلع عورت کا ایک حق ہے جسے وہ شوہر کی مرضی کے بغیر بھی عدالت سے وصول کر سکتی ہے۔ یہاں تک کہ پاکستان میں کچھ عرصہ پہلے عدالتِ عالیہ یعنی سپریم کورٹ نے اس کے مطابق فیصلہ دیدیا اور اب تمام عدالتوں میں اسی فیصلہ پر بطورِ قانون عمل ہو رہا ہے حالانکہ یہ فیصلہ قرآن و سنت کے دلائل اور جمہور کے متفقہ فیصلہ کے خلاف ہے۔[۴]

---

[۱] اس مسئلہ سے متعلق مزید تفصیل کے لئے دیکھئے نور الأنوار (ص۲۱ و ۲۲) تحت قوله و لذلك صح ايقاع الطلاق بعد الخلع، حکم الخاص۔ اور معارف القرآن (ج ۱ ص۵۶۱ و ۵۶۲) - ۱۲ مرتب

[۲] صحیح بخاری (ج ۲ ص۷۹۴) باب الخلع و كيف الطلاق فيه - ۱۲ م

[۳] اس سے اُس استدلال کا بھی جواب ہو جاتا ہے جو المغنی میں امام احمدؒ کی جانب سے کیا گیا ہے یعنی «ولأنها (الخلع) فرقة خلت عن صريح الطلاق و نيته فكانت فسخاً كسائر الفسوخ» دیکھئے (ج ۷، ص۵۵) - ۱۲ مرتب

[۴] تراضی طرفین کے ضروری ہونے پر قرآن کریم کی دلیل آگے حضرت استاذِ محترم دام اقبالہم کی تقریر میں آرہی ہے، سنت سے دلیل کے لئے دیکھئے احکام القرآن للجصاص (ج ۱ ص۳۹۵) اور جمہور کے مذہب کے لئے دیکھئے بدایۃ المجتہد (ج ۲ ص۵۱) الباب الثالث في الخلع، الفصل الثاني في شروط وقوعه، المسألة الثالثة - ۱۲ مرتب

ان متجددین کا بنیادی استدلال اس طرح ہے کہ آیتِ خلع اس طرح ہے " فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ " اس میں " فَإِنْ خِفْتُمْ " کا خطاب حکام کو ہے کما صرّح بہ کثیر من المفسرین[1] لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اگر حکام یہ سمجھیں کہ زوجین میں موافقت نہ ہو سکے گی تو وہ اپنی صوابدید کے مطابق نکاح فسخ کر سکتے ہیں خواہ شوہر اس پر راضی ہو یا نہ ہو، ورنہ اگر حکام کو یہ اختیار نہ ہوتا تو ان کو خطاب کرنے کی کیا حاجت تھی ؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیتِ خلع میں کم از کم تین الفاظ ایسے ہیں جو خلع کے لئے تراضیِ طرفین کو شرط قرار دیتے ہیں کیوں کہ پوری آیت اس طرح ہے " وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللهِ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ " اس میں سب سے پہلے " إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللهِ " اس بات کی صریح دلیل ہے کہ گفتگو اس صورت میں ہو رہی ہے جبکہ شوہر اور بیوی دونوں خلع کی ضرورت محسوس کر رہے ہوں یا کم از کم اس پر راضی ہوں۔

دوسرے " فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا " میں صیغۂ تثنیہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ گفتگو تراضیِ طرفین کی صورت میں ہے۔

تیسرے قرآن کریم نے خلع کے لئے لفظ " فدیہ " استعمال کیا ہے جو جنگی قیدیوں کی رہائی کے لئے دی جانے والی رقم کو کہتے ہیں اور اس میں تراضیِ طرفین ضروری ہوتی ہے لہٰذا اس میں بھی ضروری ہوگی، نیز علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ باری تعالےٰ نے خلع کے لئے فدیہ کا لفظ استعمال کیا جو اس پر دال ہے کہ خلع میں معاوضہ کے معنیٰ موجود ہیں لہٰذا اس میں تراضیِ طرفین کا اعتبار ضروری ہے[2]

رہا " فَإِنْ خِفْتُمْ " کا خطاب سو اوّل تو مفسرین کی ایک جماعت کے نزدیک یہ خطاب اہل خاندان کو ہے[3] حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے بھی بیان القرآن[4] میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

---

[1] مثلاً دیکھئے تفسیر قرطبی (ج ۳ ص ۱۳۸)، روح المعانی (ج ۲ ص ۱۳۸) اور تفسیر کبیر (ج ۵ ص ۱۰۶) ۱۲ مرتب

[2] دیکھئے زاد المعاد (ج ۵ ص ۱۹۶) حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الخلع، فصل اول۔ ۱۲ م

[3] احکام القرآن (ج ۱ ص ۳۹۵) میں امام جصاصؒ کے کلام کا حاصل بھی یہی نظر آتا ہے کہ خلع میں تراضیِ طرفین ضروری ہے۔ نیز دیکھئے معارف القرآن للمفتی الاعظمؒ (ج ۱ ص ۵۵۳)، معارف القرآن للشیخ الکاندھلویؒ (ج ۱ ص ۳۳۷) ۱۲ مرتب

[4] (ج ۱ ص ۱۳۳) ۱۲ م

دوسرے اگر خطاب حکام ہی کو ہو تب بھی اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ حکام شوہر کی مرضی کے بغیر خلع کرسکتے ہیں کیونکہ حکام کا کام زوجین کو مشورہ دینا بھی ہوتا ہے لہذا آیت کا حاصل یہ ہے کہ ایسی صورت[1] میں حکام زوجین کو خلع کا مشورہ دیں تاکہ تراضی طرفین متحقق ہو کر خلع ہوسکے۔

متجددین کا دوسرا استدلال حضرت ثابت بن قیس کی اہلیہ حضرت جمیلہ[2] کے واقعہ سے ہے جو ترمذی کے اسی باب میں اختصار کے ساتھ آیا ہے اور بخاری[3] میں اس تفصیل کے ساتھ مذکور ہے "عن ابن عباس أن امرأة ثابت بن قیس أتت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت یا رسول اللہ! ثابت بن قیس ما أعتب علیه فی خلق ولا دین ولکنی أکره الکفر[4] فی الاسلام فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أتردین علیه حدیقته قالت نعم قال رسول اللہ علیہ وسلم أقبل الحدیقة وطلقها تطلیقة" یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت کی مرضی معلوم نہیں کی بلکہ براہ راست ان کو طلاق دینے کا حکم دے دیا۔ واضح رہے کہ حضرت جمیلہ کو حضرت ثابت بن قیس کی نسبت محض یہ شکایت تھی کہ وہ بدصورت ہیں[5]۔

اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ خلع کا یہ فیصلہ حضرت ثابت کی مرضی سے ہوا تھا چنانچہ سنن[6] نسائی میں یہ الفاظ آئے ہیں " فأرسل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی ثابت فقال

---

[1] یعنی جس صورت میں اس بات کا خطرہ ہو کہ حدود اللہ کی رعایت نہ ہوسکیگی ۱۲ مرتب

[2] یہ نام راجح قول کے مطابق ہے ورنہ ان کے نام کے بارے میں مختلف روایات ہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری (ج ۹ ص۳۹۸ و ۳۹۹) ۱۲ مرتب

[3] (ج ۲ ص۷۹۴) باب الخلع وکیف الطلاق فیه ۱۲ م

[4] یعنی "أکره ان أقمت عنده أن أقع فیما یقتضی الکفر" کفر سے اصل کفر بھی مراد ہوسکتا ہے کأنها أشارت إلی أنها قد تحملها شدة کراهتها له علی إظهار الکفر لینفسخ نکاحها منه وهی تعرف أن ذلك حرام لکن خشیت أن یحملها شدة البغض علی الوقوع فیه (والکفر شیء یکره) نیز "کفر" سے کفران عشیر بھی مراد ہوسکتا ہے إذ هو تقصیر المرأة فی حق الزوج۔

تفصیل کے لئے دیکھئے عمدة القاری (ج ۲۰ ص۲۶۳) باب الخلع اور فتح الباری (ج ۹ ص۴۰۰) ۱۲ مرتب

[5] جیساکہ متعدد روایات میں اس کی تصریح آئی ہے، ان روایات کے لئے دیکھئے عمدہ (ج ۲۰ ص۲۶۳) ۱۲ م

[6] (ج ۲ ص۱۱۳) عدة المختلعة ۱۲ م

له خذ الذی لها علیك وخل سبیلها، قال نعم " یہ ان کی منظوری کی صراحت ہے۔

بلکہ علامہ ابوبکر جصاص رحمہ اللہ نے تو حضرت ثابت بن قیس کے واقعہ سے اس بات پر استدلال کیا ہے[1] کہ خلع کا اختیار مرد کو ہے نہ کہ قاضی کو کیونکہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت کو طلاق دینے کے لئے فرمایا اور خود تفریق نہیں فرمائی اگر یہ معاملہ عدالت کے ہاتھ میں ہوتا تو خود تفریق فرما دیتے، جیسا کہ لعان کے واقعہ میں آپؐ سے ثابت ہے[2]۔

پھر متجددین کی مستدل روایت میں " طلّقها " کا امر وجوب کے لئے نہیں بلکہ ارشاد ندب اور مشورہ کے لئے ہے (گویا آپؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جب تمہاری زوجہ کسی صورت تمہارے ساتھ رہنے پر تیار نہیں تو ایسی صورت میں اس کو زبردستی زوجہ بنائے رکھنا تمہارے لئے مناسب نہیں۔ م) کما صرّح به الحافظ فی فتح الباری[3] والعینی فی عمدة القاری[4] والقسطلانی فی إرشاد الساری[5]۔

علاوہ ازیں آیت قرآنی " إِلَّآ أَن يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَا۟ ٱلَّذِى بِيَدِهِۦ عُقْدَةُ ٱلنِّكَاحِ "[6] بھی اس بات کی دلیل ہے کہ خلع شوہر کی مرضی کے بغیر نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہاں حصر کے ساتھ کہا گیا ہے کہ نکاح کی گرہ مرد ہی کے ہاتھ میں ہے لأن التقدیم ما حقه التأخیر یفید الحصر[7]

اس کے جواب میں یہ متجددین یہ کہتے ہیں کہ " ٱلَّذِى بِيَدِهِۦ عُقْدَةُ ٱلنِّكَاحِ " سے زوج مراد نہیں بلکہ " ولی " مراد ہے جیسا کہ متعدد مفسرین نے فرمایا ہے[8]۔

---

[1] احکام القرآن (ج ۱ ص ۳۹۵) ذکر اختلاف السلف وسائر فقہاء الأمصار فیما یحل أخذہ بالخلع ۱۲ م

[2] چنانچہ واقعہ لعان کو نقل کرتے ہوئے حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: " أن رجلا من الأنصار قذف امرأته فأحلفهما النبی صلی اللہ علیه وسلم ثم فرق بینهما۔ صحیح بخاری (ج ۲ ص ۸۰۳) باب إحلاف الملاعن ۱۲ م

[3] (ج ۹ ص ۳۵۰) ۱۲ م

[4] (ج ۲۰ ص ۲۶۳) ۱۲ م

[5] (ج ۸ ص ۱۵۱) ۱۲ م

[6] سورۂ بقرہ آیت (۲۳۷) پ ۲ ۱۲ م

[7] اس لئے کہ اصل عبارت اس طرح تھی " الذی عقدة النکاح بیدہ " اس میں " بیدہ " جو " عقدة النکاح " مبتدا کی خبر ہے اس کو مقدم کرکے " بِيَدِهِۦ عُقْدَةُ ٱلنِّكَاحِ " کہا گیا ۱۲ مرتب

[8] کما فی الکشاف (ج ۱ ص ۲۸۶) والتفسیر الکبیر (ج ۶ ص ۱۵۳ و ۱۵۴) ۱۲ م

اس کا جواب یہ ہے کہ راجح تفسیر یہی ہے کہ یہاں "زوج" مراد ہے چنانچہ حافظ ابن جریر طبریؒ نے اس قول کی تائید میں مفصل دلائل پیش کر کے اس کو راجح قرار دیا ہے[1]۔ نیز تفسیر ابو سعود میں اس قول کی تائید میں ایک لطیف نکتہ بھی بیان کیا گیا ہے[2]۔ واللہ اعلم

باب[3] ما جاء فی مداراة[4] النساء

عن[5] أبی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم إن المرأة کالضلع إن ذهبت تقیمها کسرتها و إن ترکتها استمتعت بها علی عوج "

عورت کی پسلی کے ساتھ تشبیہ ایک بلیغ تشبیہ ہے اور اس میں یہ نکتہ بھی ہے کہ حضرت حوا علیہا السلام حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں جانب کی سب سے اوپر کی پسلی سے پیدا

---

[1] دیکھئے جامع البیان عن تأویل آی القرآن (ج ۲ ص ۵۴۵ تا ۵۵۱)۔

اس کے علاوہ امام رازیؒ اس کے تحت لکھتے ہیں "فی الآیة قولان الأول أنه الزوج وهو قول علی بن أبی طالبؓ وسعید بن المسیبؒ وکثیر من الصحابة والتابعین وهو قول أبی حنیفةؒ۔ تفسیر کبیر (ج ۶ ص ۱۵۲)۔

علامہ آلوسیؒ نے بھی اسی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے، روح المعانی (ج ۲ ص ۱۵۳)۔

نیز حافظ ابن کثیرؒ نے ابن ابی حاتم کے حوالہ سے ایک مرفوع روایت ذکر کی ہے "ولی عقدة النکاح الزوج" یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس کو استشہاداً پیش کیا جاسکتا ہے، دیکھئے تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر (ج ۱ ص ۲۸۹) ۱۲ مرتب عفی عنہ

[2] چنانچہ فرماتے ہیں "أن (القول) الأول (ای کون صاحب عقدة النکاح الزوج) أنسب بقوله تعالیٰ: وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ" إلی آخره فإن إسقاط حق الصغیرة لیس فی شیٔ من التقوی۔ تفسیر ابی السعود (ج ۱ ص ۱۷۰) ۱۲ مرتب

[3] شرح باب از مرتب عافاہ اللہ ۱۲ م

[4] مداراة "بذل الدنیا لإصلاح الدنیا" اور "بذل الدنیا لإصلاح الدین" کو کہا جاتا ہے۔ جبکہ مداہنت "بذل الدین لإصلاح الدنیا" کو کہتے ہیں۔ دیکھئے الکوکب الدری (ج ۲ ص ۱۶۶) ۱۲ مرتب

[5] الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحه (ج ۲ ص ۷۷۹) کتاب النکاح، باب المداراة مع النساء، ومسلم فی صحیحه (ج ۱ ص ۴۷۵) باب الوصیة بالنساء، کتاب الرضاع ۱۲ مرتب

کی گئیں جو تمام پسلیوں میں سب سے چھوٹی اور سب سے ٹیڑھی پسلی ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ عورت کا ٹیڑھا پن اس کا ذاتی ہے۔

اب حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ مرد کو اس کے درپے نہ ہونا چاہئے کہ اس کی کجی کو بالکل ختم کر دے، اس لئے کہ اس قسم کی کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی بلکہ اس میں خدشہ ہے کہ ناموافقت پیدا ہو کر فراق وطلاق تک نوبت نہ پہنچ جائے۔ البتہ یہ امر ممکن ہے کہ میانہ روی کے ساتھ اس کی اصلاح کی فکر کرتا رہے تاکہ اس کے اعوجاج میں مزید اضافہ نہ ہو، اس طرح وہ عورت سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔

اس حدیث میں اس طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت میں کسی قدر ٹیڑھا پن عیب نہیں جیسا کہ پسلی کی کجی بھی اس کا عیب نہیں، لہٰذا مرد کو عورت کے اندر مرد جیسے اوصاف تلاش نہ کرنے چاہئیں فان اللہ تعالیٰ قد خلق کلاً من الصنفین بخصائص لا توجد فی الآخر۔

پھر حدیثِ باب میں "استمتعت بہا علی عوج" سے مداراۃ کی تلقین مقصود ہے نہ کہ مداہنت کی، ظاہر ہے کہ عورت کی کجی کو برداشت کرتے ہوئے مداہنت سے کام لینے کی کوئی گنجائش نہیں، اسی بات کو واضح کرنے کے لئے امام ترمذی نے اس حدیث پر "ماجاء فی مداراۃ النساء" کا ترجمۃ الباب قائم کیا[1] واللہ أعلم

شرح باب ازمرتب

باب[2] ماجاء فی الرجل یسأله أبوه أن یطلق زوجته

عن[3] ابن عمرؓ قال کانت تحتی امرأة أحبها وکان أبی یکرهها فأمرنی أبی أن أطلقها فأبیتُ فذکرتُ ذلك للنبی صلی اللہ علیه وسلم فقال یا عبداللہ ابن عمر طلّق امرأتك"

---

[1] اس باب سے متعلقہ تمام تشریح الکوکب الدری (ج ۲ ص ۲۶۷ و ۲۶۸) اور تکملہ فتح الملہم (ج ۱ ص ۱۲۲ و ۱۲۳) سے ماخوذ ہے ۱۲ مرتب

[2] شرحِ باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲ م

[3] الحدیث أخرجه أبو داود (ج ۲ ص ۶۹۹) باب فی بر الوالدین، کتاب الأدب، وابن ماجه (ص ۱۵۱) باب الرجل یأمره أبوه بطلاق امرأته ۱۲ م

یہاں دو مباحث ہیں، ایک " والدین کے حقوقِ واجبہ وغیر واجبہ میں امتیاز " جو ایک عمومی بحث کی حیثیت رکھتی ہے، دوسری بحث " والدین کے مطالبہ پر طلاق دینے " سے متعلق ہے جو مقصودِ باب ہے۔

کن چیزوں میں والدین کی اطاعت ضروری ہے اور کن میں نہیں

جس طرح بعض لوگ تفریط میں مبتلا ہو کر والدین کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کر کے ان کا وبال اپنے سر لیتے ہیں اسی طرح بعض دیندار افراط کا شکار ہو کر ضرورت سے زیادہ والدین کی اطاعت و فرمانبرداری کر کے دوسرے اصحابِ حق مثلاً بیوی یا اولاد کے حقوق تلف کر دیتے ہیں، جس سے ان نصوص کا نظر انداز کرنا لازم آتا ہے جن میں ان کے حقوق کی نگہداشت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور بعض لوگ کسی صاحبِ حق کا حق تو ضائع نہیں کرتے مگر حقوقِ غیر واجبہ کو واجب سمجھ کر ان کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، پھر چونکہ بعض اوقات ان کا تحمل نہیں ہوتا اس لئے تنگ ہوتے ہیں اور وسوسہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ بعض احکامِ شرعیہ میں ناقابلِ برداشت سختی اور تنگی ہے اور اس سے ایک دوسرے صاحبِ حق یعنی نفس کے حقوق ضائع ہوتے ہیں، ان خرابیوں سے بچنے کے لئے حقوقِ واجبہ وغیر واجبہ میں امتیاز ناگزیر ہے جس کے لئے چند باتوں کا جاننا ضروری ہے

① جو امر شرعاً واجب ہو اور ماں باپ اس سے منع کریں تو اس میں ان کی اطاعت جائز ہی نہیں چہ جائیکہ واجب ہو۔ مثلاً اگر مالی وسعت کم ہے اور ماں باپ کی خدمت کرنے سے بیوی بچوں کو تکلیف ہوگی یعنی ان کے حقوقِ واجبہ ضائع ہوں گے تو بیوی بچوں کو تکلیف دیکر ماں باپ پر خرچ کرنا جائز نہیں۔ یا مثلاً اگر بیوی شوہر کے ماں باپ سے علیحدہ رہنے کا مطالبہ کرے اور ماں باپ اس کو اپنے ساتھ رکھنے کو کہیں تو شوہر کے لئے جائز نہیں کہ اس حالت میں بیوی کو اس کی مرضی کے علی الرغم اپنے والدین کے ساتھ رکھے، یا مثلاً اگر ماں باپ حج فرض یا طلبِ علم بقدرِ فرض کے لئے جانے نہ دیں تو اس میں بھی ان کی اطاعت جائز نہ ہوگی۔

② جو امر شرعاً ناجائز ہو اور ماں باپ اس کے کرنے کا حکم دیں تو اس میں بھی ان کی اطاعت جائز نہیں مثلاً وہ کسی ناجائز ملازمت کا حکم دیں یا رسومِ جاہلیت اختیار کرنے کو کہیں یا اسی طرح کسی اور ناجائز کام کو کہیں تو اس میں ان کی اطاعت جائز نہیں۔

③ جو امر شرعاً نہ واجب ہو نہ ممنوع ہو بلکہ مباح ہو خواہ مستحب ہی کیوں نہ ہو اور ماں باپ اس کے کرنے یا نہ کرنے کو کہیں تو اس میں تفصیل ہے۔

اگر اس امر کی اس شخص کو ایسی ضرورت ہو کہ اس کے بغیر تکلیف ہوگی مثلاً غریب آدمی ہے پیسہ پاس نہیں ہے اور بستی میں کوئی صورت کمائی کی نہیں ہے مگر ماں باپ جانے سے روکتے ہیں تو ایسی صورت میں ماں باپ کی اطاعت ضروری نہیں ہے۔

اور اگر اس درجہ کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے بغیر تکلیف ہوگی تو بھی اس عمل سے باز رہنا ضروری نہیں بلکہ دیکھنا چاہئے کہ اس کام کے کرنے میں اس کو کوئی خطرہ یا ضرر ہے یا نہیں، نیز یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اس شخص کے اس کام میں مشغول ہوجانے سے کوئی خادم یا سامان نہ ہونے کی وجہ سے ماں باپ کے تکلیف اٹھانے کا احتمال قوی ہے یا نہیں۔

(۱) اگر اس کام میں خطرہ ہے یا اس کے غائب ہوجانے سے بے سروسامانی کی وجہ سے ماں باپ کو تکلیف ہوگی تو ان کی مخالفت جائز نہیں مثلاً غیر واجب لڑائی میں جاتا ہے یا سفر کی صورت میں ماں باپ کی خبر گیری کرنے والا بھی کوئی نہیں خادم کا انتظام کرنے کی بھی گنجائش نہیں اور وہ کام اور سفر بھی ضروری نہیں تو اس حالت میں ان کی اطاعت واجب ہوگی۔

(۲) اگر دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہ ہو یعنی نہ اس کام یا سفر میں اس کو کوئی خطرہ ہو اور نہ والدین کی مشقت اور تکلیف ظاہری کا کوئی احتمال قوی ہو تو بلا ضرورت بھی وہ کام یا سفر باوجود ان کی ممانعت کے جائز ہے۔ اگرچہ مستحب یہی ہے کہ اُس وقت بھی ان کی اطاعت کرے[۱]

والدین کے مطالبہ پر بیوی کو طلاق دینے کا حکم

پچھلی بحث کی روشنی میں اب یہ سمجھنا بھی آسان ہے کہ اگر کسی شخص کے والدین کو اس کی بیوی سے ایذاء پہنچتی ہو اور والدین اس سے بیوی کو طلاق دینے کو کہیں تو ایسی صورت میں اس شخص کے ذمہ طلاق دینا واجب ہے[۲] لیکن اگر والدین کو اس کی بیوی سے کوئی واقعی تکلیف نہیں بلکہ والدین خواہ مخواہ اس کو طلاق دینے کو کہہ رہے ہوں تو ایسی صورت میں والدین کے حکم پر عمل اس کے لئے ضروری نہیں بلکہ اس صورت میں طلاق دینا عورت پر ایک طرح کا ظلم کرنا ہے۔ طلاق اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی بُری چیز ہے فقط مجبوری میں جائز رکھی گئی ہے[۳] خواہ مخواہ طلاق دینا ظلم اور مکروہ

---

[۱] مذکورہ بحث تسہیل و تلخیص اور تغیر کے ساتھ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کے رسالہ "تعدیل حقوق الوالدین" سے ماخوذ ہے جو بوادر النوادر میں (صفحہ ۷۸۳ تا ۷۸۸) شامل ہے اور بہشتی گوہر کے ضمیمہ ثانیہ کی حیثیت سے بہشتی زیور کے آخر میں بھی چھپا ہوا ہے نیز امداد الفتاوی جلد چہارم میں بھی موجود ہے، دلائل کی تفصیل بھی ان کتابوں میں موجود ہے حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب مدظلہم نے اپنے رسالہ "حقوق الوالدین" کے آخر میں حضرت تھانویؒ کے رسالہ کی تلخیص و تسہیل بھی کردی ہے ۱۲ مرتب

[۲] المسلک الذکی (ج ۱ ص ۳۲۹) مخطوطہ ۱۲ م

[۳] شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وإيقاع الطلاق مباح وإن كان مبغضاً في الأصل عند عامة العلماء (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تحریمی ہے نکاح تو وصال کے لئے موضوع ہے بلا وجہ فراق کیسے جائز ہوسکتا ہے۔

جہاں تک حضرت ابن عمرؓ کے واقعہ کا تعلق ہے اس میں حضرت عمر فاروقؓ نے جو اپنے صاحبزادہؓ کو طلاق کا حکم دیا اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حکم کی توثیق کرتے ہوئے "طلّق امرأتك" ارشاد فرمایا ظاہر ہے کہ اس کی کوئی معقول وجہ ہوگی ورنہ خواہ مخواہ طلاق دینا ظلم ہے، حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کسی پر ظلم کیسے کرسکتے تھے اور اگر بفرض محال وہ ایسا کرتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیسے گوارا فرماتے؟ اور کیسے ظلم کی اعانت فرما سکتے تھے؟ یقیناً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا پورا اطمینان تھا کہ حضرت عمرؓ نے جو طلاق کا حکم دیا ہے اس کی کوئی صحیح وجہ ہوگی[1] اور ایسی صورت میں والدین کے حکم کی تعمیل ضروری ہے کما مرّ۔

البتہ یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اگر اس صورت میں حضرت ابن عمرؓ کے لئے اپنے والدؓ کے حکم کی تعمیل ضروری تھی تو انھوں نے ابتداءً طلاق دینے سے انکار کیوں فرمایا، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے کی نوبت آئی، اور پھر آپ نے طلاق دینے کا حکم فرمایا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی نظر ایک طرف اپنے والد کے حکم کی طرف تھی تو دوسری جانب طلاق کے مبغوض ہونے کی طرف تھی، گویا والد کی نافرمانی یا ارتکاب مبغوض "بلیتین" میں سے کسی ایک کو وہ "اھون" سمجھ کر ترجیح نہ دے پا رہے تھے، اور طلاق کے جس سببِ صحیح کی طرف حضرت عمر فاروقؓ کی توجہ تھی وہ اہلیہ کی محبت کی وجہ سے ان کی نظروں سے اوجھل تھا اس لئے انھوں نے ابتداءً طلاق دینے سے توقف فرمایا اور بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

ومن الناس من يقول لا يباح إيقاع الطلاق إلا عند الضرورة لقوله صلى الله عليه وسلم: لعن الله كل ذواق مطلاق، وقال صلى الله عليه وسلم أيما امرأة اختلعت من زوجها من نشوز فعليها لعنة الله والملائكة والناس أجمعين" دیکھئے مبسوط سرخسی (ج ۶ ص۲) اول کتاب الطلاق ۱۲ مرتب عفی عنہ

(حاشیہ صفحۂ ھٰذا)

(۱) مذکورہ تفصیل حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے رسالہ "ازالۃ الرین عن حقوق الوالدین ص ۱۳ و ۱۹) سے ماخوذ ہے جو "آدابِ زندگی" اور "اصلاحی نصاب" کا حصہ ہے ۱۲ م

کے فرمان پر طلاق دیدی[1]۔ واللہ أعلم وعلمہ اتم واحکم

شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ

باب[2] ماجاء فی طلاق المعتوہ

عن[3] أبی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: کل طلاق جائز إلا طلاق المعتوه المغلوب علی عقله۔

"کل طلاق" میں حصرِ اضافی ہے ورنہ اگر حصرِ عقلی مانا جائے تو لازم آئے گا کہ بچہ کی طلاق بھی واقع ہو جائے حالانکہ ایسا نہیں ہے اس لئے یہاں حصرِ اضافی قرار دیا جائے گا، گویا باعتبار عاقل کے حصر ہے[4]۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حدیثِ باب میں "معتوہ" سے مراد مجنون ہے معتوہ کے معنیٰ مشہور مراد نہیں یعنی "الذی لیس برشید ولیس له کثیر تجربة وخبرة وبصیرة فی الامور[5] (جسے ناتجربہ کار اور ناسمجھ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے) اس لئے کہ اس کی

---

[1] مذکورہ جواب الکوکب الدری (ج ۲ ص۲۶۸) سے ماخوذ ہے۔

ایک جواب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ چونکہ طلاق کا سببِ صحیح ان کی نظروں سے اوجھل تھا اس لئے بلاوجہ طلاق دینا ان کے نزدیک ویسے بھی درست نہ تھا جبکہ ان کو اہلیہ سے قلبی لگاؤ بھی زیادہ تھا اس لئے انھوں نے ابتداءً طلاق دینے سے انکار کر دیا، پھر بعد میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے اپنے والد کے حکم کی توثیق ہو گئی تو تعمیلِ حکم میں طلاق دیدی واللہ اعلم ۱۲ مرتب۔

[2] شرحِ باب از مرتب ۱۲ م

[3] الحدیث لم یخرجه أحد من أصحاب الکتب الستة سوی الترمذی قاله الشیخ محمد فؤاد عبد الباقی، الجامع الصحیح (ج ۳ ص۴۹۶) ۱۲ م

[4] یہ تشریح المسک الذکی (ج ۱ ص۳۳) مخطوطہ سے ماخوذ ہے ۱۲ م

[5] واضح رہے کہ معتوہ اصطلاحِ فقہ میں "من کان قلیل الفهم مختلط الکلام فاسد التدبیر شبیه بالمجنون وذلك لما یصیبه فساد فی عقله من وقت الولادة" کو کہا جاتا ہے کما فی قواعد الفقه (ص۴۹۴) معتوہ اور مجنون میں محض یہ فرق ہے کہ معتوہ مارتا پیٹتا اور گالی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

طلاق واقع ہوجاتی ہے۔

مجنون و معتوہ کی طلاق کے واقع نہ ہونے پر اجماع ہے حکاہ العینی[1]، پھر عدم وقوع طلاق کا حکم "نائم" اور "مغمیٰ علیہ" یعنی بیہوش وغیرہ کو بھی شامل ہے۔

یہاں یہ وہم ہوسکتا ہے کہ ان مذکورہ معذورین اور سکران میں کوئی فرق نہیں[2] تو جس طرح ان کی طلاق واقع نہیں ہوتی اسی طرح سکران کی بھی طلاق واقع نہ ہونی چاہیئے حالانکہ حنفیہ کے مسلک کے مطابق اس کی طلاق واقع ہوجاتی ہے[3]۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

نہیں دیتا جبکہ مجنون ایسی حرکات میں مبتلا ہوتا ہے کما فی البحر الرائق (ج ۳ ص ۲۴۹)

معتوہ اور مجنون دونوں کی طلاق واقع نہیں ہوتی کما فی بدائع الصنائع (ج ۳ ص ۹۹ و ۱۰۰)

فصل و أما شرائط الرکن فأنواع، کتاب الطلاق۔

حدیثِ باب میں "معتوہ" سے "من فی عقلہ اختلال" مراد ہے جس میں معتوہ اور مجنون دونوں آجاتے ہیں۔ اس تشریح سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حضرت گنگوہی قدس سرہ نے جو معتوہ کے معنی مشہور بیان فرمائے ہیں وہ ایک تیسرے معنیٰ ہیں جو مجنون اور معتوہ اصطلاحی سے مغایر ہیں واللہ أعلم۔ ۱۲ مرتب عافاہ اللہ

(حاشیہ صفحہ ھٰذا)

[1] عمدۃ القاری (ج ۲۰ ص ۲۵۲) باب الطلاق فی الاغلاق والکرہ ۱۲ م

[2] اس لئے کہ ان میں سے کوئی اپنے حواس میں نہیں ہوتا ۱۲ م

[3] **سکران کی طلاق** سکران کی طلاق کے وقوع اور عدم وقوع کے بارے میں اختلاف ہے

حضرت سعید بن المسیبؒ، حسن بصریؒ، ابراہیم نخعیؒ، زہریؒ، شعبیؒ، امام اوزاعیؒ، سفیان ثوریؒ اور امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ یہ حضرات سکران کی طلاق کے وقوع کے قائل ہیں، امام شافعیؒ کا اصح قول بھی اسی کے مطابق ہے، نیز امام احمدؒ کی بھی مرجوح روایت یہی ہے۔

جبکہ ابوالشعثاءؒ، طاؤسؒ، عکرمہؒ، قاسمؒ، عمر بن عبدالعزیزؒ، ربیعہؒ، لیثؒ، امام اسحٰقؒ اور مزنیؒ سکران کی طلاق کے عدم وقوع کے قائل ہیں، امام احمدؒ کی راجح اور امام شافعیؒ کی مرجوح روایت بھی اسی کے مطابق ہے، حنفیہ میں سے امام طحاویؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ دیکھئے فتح الباری (ج ۹ ص ۳۹۱) باب الطلاق فی الاغلاق ۱۲ مرتب عفی عنہ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مجنون و معتوہ کے مغلوب العقل ہونے کا سبب قدرتی اور غیر اختیاری ہے، اسی طرح نائم کی نوم اگرچہ بظاہر اختیاری معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی غیر اختیاری ہے کما یظہر عند التامل، جبکہ سکران کے مغلوب العقل ہونے کا سبب خود اس کا کسب ہے پھر وہ معصیت بھی ہے، لہٰذا اس کی طلاق واقع ہو جائے گی۔

البتہ یہاں یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ مسافر اگرچہ معصیت مثلاً سرقہ وغیرہ کے لئے سفر کر رہا ہو تب بھی اسے رخصتِ سفر حاصل ہو جاتی ہے اور وہ قصر کرتا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ سکران کو بھی عدمِ وقوعِ طلاق کی گنجائش حاصل ہو کہ جس طرح سفرِ معصیت میں معصیت آدمی کی رخصت کو ختم نہیں کرتی اسی طرح سکر کی معصیت سے اس کے مغلوب العقل ہونے کا عذر ختم نہ ہونا چاہئے۔

اس کا جواب[1] یہ دیا گیا ہے کہ رخصتِ سفر کا مدار سفر پر ہے اور وہ معصیت کی حالت میں بھی موجود ہوتا ہے لہٰذا رخصتِ سفر حاصل ہو جاتی ہے "والمؤاخذۃ علی المعصیۃ أمر آخر باقٍ علیہ" جبکہ یہاں طلاق کا دار و مدار الفاظِ طلاق پر ہے اور الفاظِ طلاق موجود ہیں لہٰذا طلاق واقع ہو جائے گی۔[2] فتأمل۔ واللہ أعلم

شرحِ باب از مرتب عفی عنہ

باب[3] (بلا ترجمہ)

عن[4] عائشۃ قالت کان[5] الناس والرجل یطلّق امرأتہ ما شاء أن یطلّقہا وھی

---

[1] لیکن اس جواب پر یہ الجھن پھر بھی باقی رہتی ہے کہ اگر محض الفاظِ طلاق پر مدار ہو تو الفاظِ طلاق تو نائم اور مجنون کی صورت میں بھی پائے جاتے ہیں؟

البتہ یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ طلاق کا مدار الفاظِ طلاق پر ہے بشرطیکہ وہ غیر مغلوب العقل سے صادر ہوئے ہوں، سکران اگرچہ مغلوب العقل ہے لیکن چونکہ اس کا مغلوب العقل ہونا اس کے کسب و اختیار سے ہے اس لئے وہ حکم کے اعتبار سے "غیر مغلوب العقل" میں شمار ہے اس لئے اس کی طلاق واقع ہو جائے گی ۱۲ مرتب

[2] اس باب سے متعلقہ بیشتر تشریح الکوکب الدری (ج ۲ ص ۲۶۹ و ۲۷۰) سے ماخوذ ہے ۱۲ م

[3] شرح باب از مرتب ۱۲ م

[4] الحدیث لم یخرجہ أحد من أصحاب الکتب الستۃ سوی الترمذی قالہ الشیخ محمد فؤاد عبد الباقی رح، الجامع الصحیح للترمذی (ج ۳ ص ۴۹۷) ۱۲ م

[5] "کان الناس" اس کی خبر محذوف ہے یعنی "یطلقون" اور "والرجل یطلق امرأتہ الخ" جملہ حالیہ ہے۔ کذا فی الکوکب (ج ۲ ص ۲۷۰) ۱۲ مرتب۔

امرأته إذا ارتجعها وهي في العدة وإن طلقها مائة مرة أو أكثر......

حتى نزل القرآن اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِإِحْسَانٍ،

قالت عائشة فاستأنف الناس الطلاق مستقبلاً مَنْ كان طلق ومن لم يكن طلق» یعنی زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا عام معمول یہ تھا کہ عورت کو طلاق دے دیا کرتے تھے اور ان کو عدّت میں رجوع کرنے کا اختیار ہوتا تھا رجوع کرنے کی تقدیر پر عورت آدمی کی بیوی شمار ہوتی تھی خواہ کتنی ہی مرتبہ طلاق دیدی جائے اور کتنی ہی مرتبہ رجوع کرلیا جائے۔

پھر جب آیتِ قرآنی "اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ الآیۃ" نازل ہوئی تو اس نے دو مرتبہ رجوع کے معتبر ہونے اور تیسری طلاق کی صورت میں حرمتِ غلیظہ کا حکم لگا دیا۔

اب حضرت عائشہ رضؓ کے مذکورہ جملہ کا مطلب یہ ہے کہ آیتِ قرآنی نازل ہونے کے بعد لوگوں نے تین طلاق کا اعتبار شروع کر دیا اور تین کا عدد پورا ہونے پر حرمتِ غلیظہ کا حکم لگانے لگے البتہ نزولِ آیت سے قبل دیجانے والی ایسی طلاقوں کو کالعدم شمار کیا گیا جن کے بعد رجوع کیا گیا تھا۔

زمانۂ جاہلیت کے تصرفات ہدر ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زمانۂ جاہلیت کے تصرفات ہدر ہیں چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے کسی نو مسلم سے یہ پوچھا ہو کہ اس نے مال کہاں سے کمایا؟ باوجودیکہ ان کے ہاں جوے اور سود وغیرہ کا عام رواج تھا، معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اسلام لے آئے اور اس نے اسلامی لحاظ سے ناجائز ذرائع سے مال کمایا ہو تو ایسا مال اس شخص کے لئے حلال ہوگا اور اس کو اس مال کے لوٹانے یا صدقہ کرنے کا حکم نہ دیا جائے گا بشرطیکہ وہ مال ان کے اپنے سابقہ دین کی رُو سے حلال ہو[1]۔ واللہ اعلم۔ شرح باب از مرتب۔

باب[2] ما جاء في الحامل المتوفى عنها زوجها تضع

عن[3] الأسود عن أبي السنابل بن بعكك قال وضعت سبيعة بعد وفاة زوجها

[1] مذکورہ تشریح الکوکب الدری (ج ۲ ص۲۷) سے ماخوذ ہے۔ ۱۲ م

[2] شرح باب از مرتب عفا اللہ عنہ ۱۲ م

[3] الحدیث أخرجہ النسائی (ج ۲ ص۱۱۳) باب عدۃ الحامل المتوفى عنها زوجها، وابن ماجہ (ص۱۴۶) باب الحامل المتوفى عنها زوجها ۱۲ م

بثلاثة وعشرين أو خمسة وعشرين يومًا فلمّا تعلّت[1] تشوّفت[2] للنكاح فأنكر عليها فذكر ذلك للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال إن تفعل فقد حل أجلها۔

متوفی عنہا زوجہا کی عدت کا بیان اس آیت میں آیا ہے "وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا[3] الآية" اور حاملہ کی عدت کا بیان اس آیت میں آیا ہے[4] "وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ"

ان دونوں آیتوں کی روشنی میں "متوفی عنہا زوجہا غیر حاملہ" کی عدت متعین ہے یعنی چار مہینہ دس دن[5] اور حاملہ غیر متوفی عنہا زوجہا کی عدت بھی متعین ہے یعنی وضع حمل، البتہ ایک صورت میں تعارض پیدا ہو جاتا ہے یعنی "حاملہ متوفی عنہا زوجہا" کی صورت میں، پہلی آیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی عدت چار مہینے دس دن ہو جبکہ دوسری آیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی عدت وضع حمل ہو۔

چنانچہ حضرات صحابۂ کرام میں "حاملہ متوفی عنہا زوجہا" کی عدت کے بارے میں اختلاف رہا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مسلک یہ ہے کہ وضع حمل اور چار مہینے دس دن دونوں کا پایا جانا ضروری ہے جیسا کہ احوط بھی یہی ہے اس مسلک کو یوں بھی تعبیر کیا جاتا ہے کہ ایسی عورت کی عدت أبعد الأجلین ہے، شروع میں حضرت ابن عباسؓ کا مسلک بھی یہی تھا۔ اس صورت میں تعارض کو گویا کہ تطبیق کے طریق سے ختم کیا گیا ہے۔

جبکہ جمہور صحابۂ کرام اور ائمہ اربعہ کے نزدیک ایسی عورت کی عدت متعین طور پر وضع حمل ہے، مذکورہ حدیث باب سے جمہور کے مسلک کی تائید ہوتی ہے، اس روایت پر اگرچہ انقطاع کا اعتراض ہے لیکن اسی باب کی دوسری روایت سے بھی جمہور کا مسلک ثابت ہوتا ہے،

---

[1] ارتفعت وطہرت ۱۲ م

[2] ای مالت إليه ۱۲ م

[3] سورہ بقرہ آیت (۲۳۴) پ۲، ۱۲ م

[4] سورۂ طلاق آیت (۴) پ۲۸، ۱۲ م

[5] بشرطیکہ عدت چاند کی پہلی تاریخ سے شروع ہوئی ہو، ورنہ اگر عدت اسلامی مہینہ کے درمیان شروع ہوئی ہو تو عدت کے ۱۳۰ دن ہوں گے، گویا پہلی صورت میں مہینہ معتبر ہے خواہ انتیس۲۹ دن کا ہو یا تیس۳۰ دن کا، اور دوسری صورت میں ہر مہینہ کے تیس۳۰ دن متعین ہیں، دیکھئے بدائع الصنائع (ج ۳ ص۱۹۵) فصل وأما بیان مقادیر العدة الخ ۱۲ مرتب

سلیمان بن یسار فرماتے ہیں "أن أبا هريرة و ابن عباس و أبا سلمة بن عبد الرحمٰن تذاكروا المتوفى عنها زوجها الحامل تضع عند وفاة زوجها فقال ابن عباسؓ تعتدّ آخر الاجلين وقال أبو سلمة بل تحلّ حين تضع وقال أبو هريرة أنا مع ابن أخي يعني أبا سلمة، فأرسلوا إلى أمّ سلمة زوج النبي صلى الله عليه وسلم فقالت قد وضعت سبيعة الأسلمية بعد وفاة زوجها بيسير فاستفتت رسول الله صلى الله عليه وسلم فأمرها أن تتزوّج" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو "حسن صحیح" قرار دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے روایت سننے کے بعد جمہور کے مسلک کی طرف رجوع کر لیا تھا۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ دوسری آیت یعنی "اولات الاحمال" پہلی آیت یعنی "والذين يتوفون منكم" کے لئے متعارض صورت میں ناسخ ہے جبکہ دو صورتوں میں تو کوئی تعارض ہی نہیں کما مر، جن حضرات نے أبعد الأجلين کا قول اختیار کیا اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کو سبیعہ اسلمیہ والی روایت نہ پہنچی تھی اور أبعد الأجلين کو اختیار کرنے میں احتیاط تھی، دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کو یہ علم نہ تھا کہ کونسی آیت نزول کے اعتبار سے مقدم ہو کر منسوخ ہے اور کونسی آیت مؤخر ہو کر ناسخ ہے۔ جبکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں "من شاء باهلته أن سورة النساء القصرى (سورة الطلاق) نزلت بعد التي في البقرة" نیز حضرت عمرؓ فرماتے ہیں "لو وضعت وزوجها على سريره لانقضت عدّتها ويحلّ لها أن تتزوّج"[1] واللہ اعلم۔ شرح باب از مرتب عافاہ اللہ

باب ما جاء في عدّة المتوفّى عنها زوجها

قالت زينب دخلت على أمّ حبيبة زوج النبي صلى الله عليه وسلم حين توفّي أبوها[2]

---

[1] مذکورہ تشریح کے لئے درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا، فتح القدیر (ج ۴ ص ۱۴۲) باب العدۃ، البحر الرائق (ج ۴ ص ۱۳۳ و ۱۳۴) باب العدۃ۔ اور الکوکب الدری (ج ۲ ص ۲۷۰ و ۲۷۱) ۱۲ مرتب

[2] الحديث أخرجه البخاري (ج ۱ ص ۱۷۱) باب احداد المرأة على غير زوجها، كتاب الجنائز، و مسلم (ج ۱ ص ۴۸۶) باب وجوب الإحداد في عدّة الوفاة وتحريمه في غير ذلك إلّا ثلاثة أيام ۱۲ م

أبو سفيان بن حرب فدعت بطيب فيه صفرة خلوق[1] أو غيره فدهنت به جارية ثم مسّت بعارضيها[2] ثم قالت والله مالي بالطيب من حاجة غير اني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول لا يحل لامرأة تؤمن بالله واليوم الآخر أن تُحِدّ[3] على ميت فوق ثلاثة أيام إلا على زوج أربعة أشهر وعشرا۔

عورتوں کے بناؤ سنگھار اور زیب و زینت کا جواز اور اس کی شرائط

اس روایت میں "مست بعارضیها" کے الفاظ سے معلوم ہوا کہ اگر تطییب یا زینت کے لئے کوئی چیز رخساروں پر لگائی جائے تو جائز ہے۔

عورتوں کے بناؤ سنگھار اور زیب و زینت سے متعلق تفصیلی احکام فقہی کتابوں میں نہیں ملتے، لیکن قرآن و سنت کے مجموعی دلائل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چند شرائط کے ساتھ ہر قسم کا بناؤ سنگھار اور زیب و زینت عورت کے لئے جائز ہے۔

(۱) نامحرم[4] کے لئے نہ ہو (۲) تغییرِ خلق اللہ[5] نہ ہو، یعنی ایسی زینت اور بناؤ سنگھار

---

[1] وهو طيب معروف مركب يتخذ من الزعفران وغيره من أنواع الطيب وتغلب عليه الحمرة والصفرة كذا في النهاية (ج ۲ ص۷۱) ۱۲ مرتب

[2] قال السنوسي هما الوجه فوق الذقن إلى ما دون الأذن وقال الأبي العوارض الأسنان وأطلقت هنا على الخدين مجازاً لأنهما عليهما فهو من مجاز المجاورة أو من تسمية الشئ بما كان من سببه۔ كذا في تكملة فتح الملهم (ج ۱ ص۲۲۴) ۱۲ م

[3] أحدت المرأة على زوجها تحد فهي محد وحدت تحد وتحد فهي حاد إذا حزنت عليه ولبست ثياب الحزن وتركت الزينة۔ النهاية (ج ۱ ص۳۵۲) ۱۲ مرتب

[4] ظاہر ہے کہ جب نامحرم کے سامنے جانا ممنوع ہے تو نامحرم کے لئے زیب و زینت اختیار کرنا کیوں ممنوع نہ ہوگا، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "والمرأة إذا استعطرت فمرت بالمجلس فهي كذا وكذا يعني زانية" سنن ترمذی (ج ۲ ص۱۰۲) باب ماجاء في كراهية خروج المرأة متعطرة، أبواب الاستيذان والآداب ۱۲ مرتب

[5] چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں أن النبي صلى الله عليه وسلم لعن الواشمات (گودنے والیاں) والمستوشمات (گدوانے والیاں) والمتنمصات (چہرے سے بال نوچنے کا حکم دینے والیاں) مبتغيات للحسن متغيرات خلق الله۔ ترمذی (ج ۲ ص۱۰۵) باب ماجاء في الواصلة والمستوصلة الخ ۱۲ مرتب

نہ ہو جو اصل حلیہ بگاڑ کر رکھدے (۳) تشبہ[1] بالکفار نہ ہو[2]۔

مسألة الحداد یعنی سوگ کا حکم[3]

حدیثِ باب سے معلوم ہوا کہ شوہر کے سوا کسی کے لئے تین سے زائد سوگ منانا جائز نہیں البتہ بیوی شوہر کی موت پر چار مہینہ دس دن سوگ منائے گی، جو واجب ہے۔

پھر اس سوگ کے بارے میں اختلاف ہے:

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک یہ سوگ ہر معتدۃ الوفات پر واجب ہے خواہ صغیرہ ہو یا کبیرہ، مسلمہ ہو یا کتابیہ۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک صغیرہ اور کتابیہ پر سوگ واجب نہیں، ابو ثور اور بعض مالکیہ کا بھی یہی مسلک ہے[4]۔

---

[1] چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "لیس منا من تشبہ بغیرنا لا تشبھوا بالیھود ولا بالنصاری الحدیث" اخرجہ الترمذی (ج ۲ ص۹۹) باب ما جاء فی کراھیۃ إشارۃ الید فی السلام ۱۲ مرتب

[2] چند شرائط اور بھی ہیں

(۴) تشبہ بالرجال نہ ہو، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے "لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المتشبہات بالرجال من النساء والمتشبھین بالنساء من الرجال"۔ ترمذی (ج ۲ ص۱۰۲) باب ما جاء فی المتشبہات بالرجال الخ

(۵) بے جا اسراف نہ ہو، ارشادِ باری تعالیٰ ہے "وَلَا تُسْرِفُوْا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ" سورۂ انعام، آیت (۱۴۱) پ،

(۶) فخر و مباہات کے لئے نہ ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "مَنْ لبس ثوب شھرۃ (ثوب تکبر وتفاخر) فی الدنیا ألبسہ اللہ ثوب مذلۃ یوم القیامۃ ثم ألھب فیہ ناراً"۔ بروایۃ ابن عمر، سنن ابن ماجہ (ص۲۵۷) کتاب اللباس، باب من لبس شھرۃ من الثیاب۔

نیز آپؐ کا ارشاد ہے "کلوا واشربوا وتصدقوا والبسوا ما لم یخالطہ إسراف أو مخیلۃ"۔ حوالۂ بالا باب البس ما شئت الخ۔

(۷) حلال مال سے ہو، وھو ظاھر۔

(۸) کسی اور جہت سے اس میں ممانعت نہ ہو، مثلاً بجنے والا زیور نہ ہو کما فی روایۃ أبی داؤد (ج ۲ ص۵۸۱) کتاب الخاتم باب ما جاء فی الجلاجل، اور مثلاً لوہے کا زیور نہ ہو۔ کما فی روایۃ بریدۃ للترمذی (ج ۱ ص۲۱۲) أبواب اللباس، باب بلا ترجمۃ - ۱۲ مرتب عفا اللہ عنہ

[3] یہاں سے لیکر قالت زینب وسمعت أمی أم سلمۃ تقول الخ تک کی تشریح مرتب کی تحریر کردہ ہے ۱۲ رشید

[4] دیکھئے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص۴۸۶) نیز امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک "امۂ منکوحہ" پر بھی سوگ واجب نہیں جبکہ جمہورؒ کے نزدیک واجب ہے، حوالۂ مذکورہ ۱۲ مرتب

حدیثِ باب امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی دلیل ہے کہ اس میں "لایحل لامرأة تؤمن باللہ" کے الفاظ سے بالغہ مؤمنہ کو خطاب کیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "احداد" "مرأۃ" پر واجب ہے نہ کہ صغیرہ پر، اور مؤمنہ پر واجب ہے نہ کہ کافرہ پر[1]

البتہ حدیثِ باب "لایحل لامرأة تؤمن باللہ والیوم الآخر أن تحد علی میت فوق ثلاثة أیام إلا علی زوج أربعة أشهر وعشرا" سے جو وجوبِ احداد پر استدلال کیا گیا ہے اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اس حدیث میں استثناء عدمِ حل سے ہے جو محض حلت اور جواز پر دال ہے لہٰذا اس سے وجوبِ احداد پر کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے؟

حضرت استاذِ محترم دام اقبالہم تکملۃ فتح الملہم میں فرماتے ہیں کہ شراح نے اس اشکال کے جو جوابات دیئے ہیں ان پر قلب مطمئن نہیں ہوتا اور احقر کے نزدیک اس کا بہتر جواب یہ ہے کہ اس مقام پر استثناء "اثباتِ حل" کے لئے ہے اور حل کے دو معنی ہیں،

ایک عدمِ حرمت جو ایک عام معنیٰ ہیں جو وجوب کو بھی شامل ہیں، دوسرے عدمِ حرمت اور عدمِ وجوب جو ایک خاص معنیٰ ہیں۔

اور حدیثِ باب میں دونوں معنی ممکن ہیں لیکن ہمارے نزدیک پہلے معنی جو وجوب کو بھی شامل ہیں متعدد دلائل کی بناء پر راجح ہیں۔

① مسلم[3] میں یحییٰ بن سعید کے طریق سے حضرت حفصہؓ کی روایت میں استثناء زوج کے

---

[1] حضرت استاذ محترم دام اقبالہم تکملۃ فتح الملہم (ج ۱ ص۲۲۵) میں فرماتے ہیں:

وزعم الحافظ فی الفتح (ج ۹ ص۴۸۶، باب تحد المتوفی عنها الخ- مرتب) أن استدلال الحنفیة هذا استدلال بالمفهوم ولکنه لایصح لکون المفهوم لاحجة فیه عند الحنفیة وإنما حاصل دلیلنا أن هذا الحدیث مشتمل علی جزئین الأول حرمة الإحداد علی غیر الزوج فوق ثلاثة أیام، والثانی إیجاب الإحداد علی الزوج والخطاب فی کلا الأمرین من الحرمة والإیجاب إنما وقع للمرأة المؤمنة فأما الصغیرة والذمیة فقد سکت الحدیث عن خطابهما فترجعان إلی أصلهما وهو عدم الحرمة وعدم الإیجاب فإن الأصل فی الأشیاء الاباحة ولاسیما لغیر المکلفین فانما استثنی الحنفیة الصغیرة والذمیة من أحکام الحداد لانه لم یرد لهما حکم لا لانهم استدلوا بالمفهوم، هذا ما ظهر لی واللہ سبحانه أعلم ۱۲ مرتب

[2] (ج ۱ ص۲۲۶) ۱۲ م

[3] (ج ۱ ص۴۸۸) باب وجوب الإحداد الخ ۱۲ م

بعد یہ الفاظ آئے ہیں "فانها تحدّ علیہ أربعۃ أشهر وعشرا" یہ الفاظ اگرچہ اخبار کے ہیں لیکن اخبار بھی انشاء کے معنی میں ہوکر وجوب کا فائدہ دیتا ہے۔

(۲) مسلمؒ ہی میں حضرت حفصہؓ کی روایت ام عطیہ سے آئی ہے "قالت کنا نُنهیٰ أن نحدّ علیٰ میت فوق ثلاث إلا علی زوج أربعۃ أشهر وعشرا ولا نکتحل ولا نتطیب ولا نلبس ثوبا مصبوغا وقد رخص للمرأۃ فی طهرها إذا اغتسلت احدانا من محیضها فی نبذۃ من قسط وأظفار" اس روایت میں رخصت تحریم کے مقابلہ میں ہے جس کا حاصل یہ کہ اکتحال وغیرہ ناجائز ہے اور ترک زینت واجب ہے۔

(۳) مسلمؒ ہی میں حضرت ام سلمہؓ کی روایت میں متوفّٰی عنہا زوجها کے لئے اکتحال کی اجازت طلب کرنے اور آپ کے اجازت نہ دینے کا ذکر ہے جو احداد کے وجوب پر دال ہے[۳]

مذکورہ بالا تمام تفصیل متوفّٰی عنہا زوجها کے بارے میں تھی، جہاں تک مطلقہ کا تعلق ہے سو رجعیہ کے بارے میں تو ترکِ حِداد متفق علیہ ہے البتہ مبتوتہ یعنی مطلقہ بائنہ یا مغلظہ کے بارے میں اختلاف ہے:

امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کے نزدیک اِس پر بھی حِداد واجب ہے، ابوثورؒ، ابوعبیدؒ اور حکمؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

جبکہ جمہور کے نزدیک اس پر سوگ واجب نہیں، اس لئے کہ شوہر نے اس کو طلاق دیکر وحشت زدہ کر دیا فلا تأسف علیہ۔

لیکن حضرات احناف جواباً فرماتے ہیں کہ سوگ کا وجوب نعمتِ نکاح کے فوت ہونے پر ہے[۴]

قالت زینب وسمعتُ أمّی أم سلمۃ تقول جاءت امرأۃ إلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالت یارسول اللہ إن ابنتی توفّی عنها زوجها وقد اشتکت عینیها أفنکحلها؟ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا، مرّتین أو ثلاث مرّات، کل ذلک یقول: لا۔

---

[۱] (ج ۱ صـ ۴۸۸) باب وجوب الإحداد الخ ۱۲ م

[۲] (ج ۱ صـ ۴۸۸) ۱۲ م

[۳] یہی روایت ترمذی کے زیر بحث باب کے آخر میں بھی آرہی ہے ۱۲ م

[۴] مذکورہ تفصیل کے لئے دیکھئے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ صـ ۴۸۸) اور ہدایہ مع فتح القدیر (ج ۴ صـ ۱۶۱ و ۱۶۲) فصل قال وعلی المبتوتۃ والمتوفّٰی عنها زوجها الخ۔ ۱۲ مرتب

حالتِ عذر میں معتدہ کے لئے سرمہ وغیرہ لگانے کا حکم[1]

اس روایت سے استدلال کرکے ظاہریہ کہتے ہیں کہ معتدہ کے لئے سرمہ وغیرہ لگانا جائز نہیں اگرچہ آنکھوں میں کوئی تکلیف ہی کیوں نہ ہو۔

جبکہ جمہور کے نزدیک بغیر عذر کے سرمہ لگانا اگرچہ جائز نہیں لیکن عذر کی صورت میں رات کو سرمہ وغیرہ لگانے میں کوئی حرج نہیں،

حدیثِ باب کا جمہور یہ جواب دیتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوگا کہ اس عورت کا مرض اس درجہ کا نہیں جس میں سرمہ لگانا ضروری ہو اس لئے آپؐ نے اکتحال کی اجازت نہ دی،

جہانتک دن کا تعلق ہے امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک عذر کی صورت میں دن میں بھی سرمہ لگانے کی اجازت ہے جبکہ امام شافعیؒ دن میں باوجود عذر کے اجازت نہیں دیتے،

امام شافعیؒ کا استدلال ام حکیم بنت اُسَید کی روایت[2] سے ہے جو وہ اپنی والدہ سے نقل کرتی ہیں "أنّ زوجها توفّی وکانت تشتکی عینیها فتکتحل بالجلاء[3] قال أحمد الصواب بکحل الجلاء فأرسلت مولاة لها إلی أمّ سلمة فسألتها عن کحل الجلاء فقالت لا تکتحلی به إلّا من أمر لا بدّ منه یشتدّ علیكِ تکتحلین باللیل وتمسحینه بالنهار ثم قالت عند ذلك أمّ سلمة دخل علیّ رسول الله صلی الله علیه وسلم حین توفّی أبوسلمة وقد جعلتُ علی عینیّ صبرًا فقال ما هٰذا؟ یا أمّ سلمة! فقلتُ إنما هو صَبِرٌ[4] یا رسول الله لیس فیه طیبٌ قال إنّه یشبّ الوجه فلا تجعلیه إلّا باللیل وتنزعیه بالنهار، الحدیث

---

[1] یہ بحث بھی مرتب کی تحریر کردہ ہے۔ ۱۲م

[2] أخرجه أبوداؤد (ج ۱ ص۳۱۵) باب فیما تجتنب المعتدة فی عدّتها ۱۲م

[3] هو بالکسر والمدّ الإثمد وقیل هو بالفتح والمدّ والقصر ضرب من الکحل، النهایه (ج ۱ ص۲۹) ۱۲ مرتب

[4] عصارة شجر مرّ ۱۲م

عذر کی حالت میں دن میں سرمہ وغیرہ لگانے کے جواز پر احناف کی کوئی مضبوط دلیل تلاش کے باوجود نہ مل سکی[۱] واللہ أعلم

ثم قال إنما هي أربعة أشهر وعشرا، وقد كانت إحداكن في الجاهلية ترمي بالبعرة على رأس الحول۔

زمانۂ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ بیوہ ایک تنگ کمرہ میں بدترین کپڑے پہن کر سال بھر مقید رہتی تھی اور اس عرصہ میں ہر طرح کی زینت سے احتراز کرتی تھی، سال بھر گزرنے کے بعد کوئی جانور اس کے کمرے میں بھیجا جاتا جس سے پونچھ کر وہ اپنی شرمگاہ کو صاف کرتی، پھر کمرہ سے نکل کر اسے مینگنی دی جاتی جسے وہ اٹھا کر پھینکتی، یہ انقضاء عدت کی علامت ہوتی تھی[۲] حدیثِ باب کے مذکورہ الفاظ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عدت کے زمانہ میں عورت سخت تکالیف برداشت کیا کرتی تھی، اسلام نے حدود سے متجاوز تمام پابندیاں ختم کردیں اس لئے اسلام کی مقرر کردہ معمولی پابندیوں کو جو بڑی حکمتوں پر مشتمل ہیں بخوشی برداشت کرنا چاہیئے واللہ أعلم۔

باب ما جاء في كفّارة الظّهار

أنبأنا[۳] أبو سلمة ومحمد بن عبد الرحمن بن ثوبان أن سلمان بن صخر الأنصاري

[۱] مذکورہ بحث اور اس سے متعلقہ مذاہب و دلائل کے لئے دیکھئے شرح نووی علی مسلم (ج ۱ ص ۴۸۷، وجوب الإحداد)، فتح القدیر (ج ۳ ص ۲۸۱) فصل قال وعلى المبتوتة الخ، تکملہ فتح الملہم (ج ۱ ص ۲۲۷) ۱۲ مرتب

[۲] نفع قوت المغتذی علی جامع الترمذی (ج ۱ ص ۱۷۷)۔

اس مینگنی کے پھینکنے سے کیا مقصود ہوتا تھا اس میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) إشارة إلى أنها رمت العدة رمي البعرة (كما بيّن في التقرير)۔

(۲) إشارة إلى أن فعل الذي فعلته من التربص والصبر على البلاء الذي كانت فيه لما انقضى كان عندها بمنزلة البعرة التي رمتها استحقارًا له وتعظيمًا لحق زوجها۔

(۳) ترميها على سبيل التفاؤل بعدم عودها إلى مثل ذلك۔

دیکھئے فتح الباری (ج ۹ ص ۴۹۰) قبیل باب الکحل للحادۃ ۱۲ مرتب

[۳] الحدیث أخرجه أبو داود (ج ۱ ص ۳۰۲) باب الظهار وابن ماجه (ص ۱۴۹) باب الظهار بتغییر ۱۲م

أحد بني بياضة جعل امرأته عليه كظهر أمه حتى يمضي رمضان فلما مضى نصف من رمضان وقع عليها ليلاً فأتى رسول الله صلى الله عليه وسلم فذكر ذلك له فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم أعتق رقبة قال لا أجدها قال فصم شهرين متتابعين، قال لا أستطيع قال أطعم ستين مسكينا، قال لا أجد، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لفروة بن عمرو: أعطه ذلك العرق، وهو مكتل يأخذ خمسة عشر صاعاً أو ستة عشر صاعاً إطعام ستين مسكينا"۔

اس روایت سے استدلال کرکے امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ جن ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے گا ان میں سے ہر ایک کو ایک "مُد"[1] گندم دینا ہوگا، کیونکہ اس واقعہ میں آپؐ نے پندرہ صاع دینے کا حکم دیا اور ایک صاع میں چار "مُد" ہوتے ہیں لہٰذا پندرہ صاع میں ساٹھ مُد ہوئے اور ہر فقیر کے حصہ میں ایک مُد آیا۔

اس کے برخلاف حنفیہ کے نزدیک ہر فقیر کو ایک صاع "کھجور" یا "جو" یا نصف صاع گندم دینا ہوگا کما فی صدقۃ الفطر[2]

حنفیہ کا استدلال سُنن[3] ابی داؤد میں سلمہ بن صخر کے طریق سے ابن العلاء البیاضی (جنہوں نے اپنی بیوی سے ظہار کیا تھا) کی روایت سے ہے، اس میں تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا "فأطعم وسقاً من تمر بین ستین مسکینا" اور وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے[4] اس طرح ہر مسکین کے حصہ میں ایک صاع آیا۔

جہاں تک حدیثِ باب کا تعلق ہے اس کی توجیہ یہ ہے کہ اصل حکم تو وسق ہی کا تھا، کما فی روایۃ ابی داؤد اس لئے آپؐ نے شروع میں "أطعم ستین مسکینا" فرماکر اسی کا حکم دیا، لیکن بعد

---

[1] المدّ بالضم وهو رطل وثلث بالعراق عند الشافعيؒ وأهل الحجاز وهو رطلان عند أبي حنيفةؒ وأهل العراق ۔ النهاية (ج ۴ ص ۳۰۸) ۱۲ مرتب

[2] مذاہب کی مذکورہ تفصیل کے لئے دیکھئے المغنی (ج ، ص ۳۶۹ و ۳۷۰) مسألة قال لكل مسكين مد من بر أو نصف صاع من تمر أو شعير۔

اس مقام پر المغنی میں امام مالک کا مذہب اس طرح بیان کیا گیا ہے "لکل مسکین مدان من جمیع الأنواع" ۱۲ مرتب

[3] (ج ۱ ص ۳۰۱) باب فی الظهار۔ ۱۲ م

[4] النهاية (ج ۵ ص ۱۸۵) ۱۲ م

میں جب انہوں نے " لا أجد " کہکر اپنی عدم استطاعت ظاہر کی تو آپؐ نے جو کچھ موجود تھا ان کو دیدیا، گویا پندرہ صاع کا کافی ہوجانا ان کی خصوصیت تھی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو "مرۃً بعد مرۃٍ" چار مرتبہ یہ مکتل بھر کر عطا فرمایا ہو اور اس طرح ساٹھ صاع کی مقدار پوری ہوگئی ہو، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ طحاوی کی روایت[1] میں ہے " أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أعطاہ مکتلین، فی کل منھما خمسۃ عشر صاعًا " اس روایت سے دعویٰ پوری طرح تو ثابت نہیں ہوتا، البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ایک مکتل پر اکتفا نہیں کیا گیا، عین ممکن ہے کہ مکتلین کے بعد دو مکتل اور بھی دیئے گئے ہوں جن کا راوی کو علم نہ ہوسکا ہو۔

نیز علامہ خطابیؒ معالم السنن میں فرماتے ہیں کہ سلمہ بن صخر کی روایت (جس میں ایک وسق یعنی ساٹھ صاع کا ذکر ہے) احوط ہے اور پندرہ صاع والی روایت میں یہ بھی امکان ہے کہ غلّہ کی جو مقدار مہیا ہوئی وہ وقتی طور پر تصدق کے لئے دیدی گئی ہو اور بقیہ مقدار کو دَین کے طور پر واجب فی الذمہ سمجھا گیا ہو کہ گنجائش ہونے پر دیدی جائے گی، اس صورت میں ظاہر ہے کہ پندرہ صاع پر اکتفا نہیں کیا گیا۔

اس کے علاوہ حدیثِ باب میں "عرق" کا لفظ آیا ہے جو زنبیل کے لئے مستعمل ہوتا ہے، اس کی گنجائش کے بارے میں رواۃ کا اختلاف ہے، حدیثِ باب میں اگرچہ راوی نے اس کی تشریح " مکتل یأخذ خمسۃ عشر صاعًا أو ستۃ عشر صاعًا " کے ساتھ کی ہے لیکن ابوداؤد کی ایک روایت میں اس کی تشریح " مکتل[2] یسع ثلاثین صاعًا " کے ساتھ آئی ہے اور سنن ابی داؤد ہی کی ایک اور روایت میں اس کی مقدار " ستون[3] صاعًا " بیان کی گئی ہے، یہ آخری روایت حنفیہ کے مسلک کے مطابق ہے، اس کو اس لحاظ سے بھی ترجیح حاصل ہے کہ حنفیہ کی مستدل وسق (ساٹھ صاع) والی روایت اس کی مؤید ہے۔ واللہ أعلم

---

[1] یہ روایت تلاش کے باوجود طحاوی یا کسی اور کتابِ حدیث میں نہ مل سکی ۱۲ مرتّب

[2] بہامش مختصر سنن ابی داؤد للمنذری (ج ۳ ص۱۳۱ و ص۱۳۲) باب الظہار، ۱۲ م

[3] و[4] سنن ابی داؤد (ج ۱ ص۳۰۲) باب الظہار ۱۲ م

باب ماجاء فی الإیلاء

ایلاء لغت میں حلف کو کہتے ہیں، کہا جاتا ہے آلیٰ یولی إیلاء و ألیۃ، حلف اٹھانا، شریعت کی اصطلاح میں "منع النفس عن قربان المنکوحۃ أربعۃ أشہر فصاعدًا منعًا مؤکدًا بالیمین" [1] کو کہا جاتا ہے۔

عن[2] عائشۃؓ قالت آلیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من نسائہ وحرّم فجعل الحرام حلالاً وجعل فی الیمین کفارۃ۔

یہ ایلاء ایلاء اصطلاحی نہ تھا اس لئے کہ چار ماہ سے کم مدت کے لئے تھا، چنانچہ بخاری[3] شریف میں حضرت ام سلمہؓ کی روایت آئی ہے "أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم آلیٰ من نسائہ شہرًا"

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں آیا ہے "أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم طلّق نساءہ" أخرجہ ابن مردویہ بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنی ازواج مطہراتؓ کو طلاق دیدی تھی لیکن راجح یہ ہے کہ آپؐ نے محض ایک ماہ کے لئے علیحدگی اختیار فرمائی تھی، جیسے کہ حدیثِ باب اسی پر دال ہے، جہاں تک حضرت ابن عمرؓ کی مذکورہ روایت کا تعلق ہے اوّل تو اس کی صحت معلوم نہیں، دوسرے اگر وہ روایت سندًا صحیح بھی ہو تب بھی حضرت ابن عمرؓ کا بیان اس شہرت پر مبنی ہو سکتا ہے جو لوگوں میں عام ہوگئی تھی کہ آپؐ نے اپنی ازواج مطہرات کو طلاق دیدی ہے،

غالب یہ ہے کہ منافقین نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ آپؐ نے اپنی ازواجِ مطہرات کو طلاق دیدی ہے، اور ان کے واسطے سے بعض مسلمانوں میں بھی یہ بات پھیل گئی ورنہ حقیقت وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے[4]۔

---

[1] عنایہ بہامش فتح القدیر (ج۴ ص۴۰) باب الإیلاء ۱۲ م

[2] لم یخرجہ أحد من أصحاب الکتب الستۃ سوی الترمذی قالہ الشیخ محمد فؤاد عبدالباقی رحمہ اللہ، جامع الترمذی (ج۳ ص۵۰۴) رقم ۱۲۰۱ ۱۲ مرتب

[3] (ج۱ ص۲۵۶) کتاب الصوم، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم إذا رأیتم الھلال فصوموا الخ ۱۲ م

[4] دیکھئے تکملہ فتح الملہم (ج۱ ص۱۵۱) باب بیان أن تخییرہ امرأتہ لایکون طلاقًا الا بالنیۃ۔ ۱۲ مرتب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی اور ازواجِ مطہرات سے ایلاء فرمانے کی متعدد وجوہات تھیں۔

اولاً "واقعہ عسل"[1] ثانیاً "واقعہ ماریہ"[2] اگر وہ درست ہو، جن کے نتیجہ میں آیت "یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ"[3] نازل ہوئی، ان کے بعد تیسرا واقعہ[4] ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی جانب سے نفقہ میں اضافہ کے مطالبہ کی صورت میں پیش آیا، اس قسم کی وجوہات کی بناء پر آپؐ نے ایک ماہ کے لئے اپنی ازواجِ مطہرات سے علیحدگی اختیار فرمائی، ایک ماہ پورا ہونے پر آیتِ تخییر[5] نازل ہوئی یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَهَا الآیة۔[6]

---

[1] عن عائشة قالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يشرب عسلاً عند زينب ابنة جحش ويمكث عندها فواطئت أنا وحفصة عن أيتنا دخل عليها فلتقل له أكلت المغافير (واحدها مُغفور شئ ينضحه شجر العُرفُط حلو كالناطف - نهاية (ج ۳ ص۳۷۳) إني أجد منك ريح مغافير قال لا ولكني كنت أشرب عسلاً عند زينب ابنة جحش فلن أعود له وقد حلفت لا تخبري بذلك أحداً - كذا في البخاري (ج ۲ ص۷۲۹) كتاب التفسير، باب تبتغي مرضاة أزواجك الخ ۱۲ مرتب

[2] وأخرج الطبراني في عشرة النساء وابن مردويه من طريق أبي بكر بن عبد الرحمن عن أبي سلمة عن أبي هريرة قال دخل رسول الله صلى الله عليه وسلم بمارية بيت حفصة فجاءت فوجدتها معه فقالت يا رسول الله في بيتي تفعل هذا معي دون نسائك فذكر نحوه (أي حلف رسول الله صلى الله لحفصة لا يقرب أمته وقال هي علي حرام فنزلت الكفارة ليمينه) فتح الباري (ج ۸ ص۶۵۷) باب يا أيها النبي لم تحرم ما أحل الله لك الآية ۱۲ مرتب عفی عنہ

[3] سورۂ تحریم آیت (۱) پ۲۸ ۱۲ م

[4] اس واقعہ کی تفصیل حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت میں آئی ہے، دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ صفحہ ۴۸۰) کتاب الطلاق، باب بیان أن تخییرہ امرأته لا یکون طلاقاً إلا بالنیة ۱۲ مرتب

[5] سورۂ احزاب آیت (۲۸) پ۲۱ ۱۲ م

[6] واقعۂ تخییر سے متعلق مختلف تفصیلات کے لئے دیکھئے تکملہ فتح الملہم (ج ۱ ص۱۶۹ تا ص۱۹۵) باب بیان أن تخییرہ امرأته الخ ۱۲ م

[7] شروع باب سے یہاں تک کی شرح مرتب کا اضافہ ہے۔ ۱۲ مرتب

ایلاء کرنے والے کو اختیار ہے چاہے تو چار ماہ سے قبل رجوع کر کے حلف کو توڑ دے اور کفارۂ یمین ادا کرے اور چاہے تو چار ماہ کی مدت گذر جانے دے، پھر احناف کے نزدیک چار ماہ گذرنے سے خود بخود طلاق بائن واقع ہوجائے گی اور تفریق کے لئے قضاء قاضی کی حاجت نہ ہوگی، جبکہ ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک چار ماہ گزرنے پر خود بخود طلاق واقع نہیں ہوتی بلکہ مدت پوری ہونے پر قاضی زوج کو بلاکر رجوع کا حکم دیگا اگر اس نے رجوع کر لیا تو ٹھیک ورنہ اس کو طلاق دینے کا حکم دے گا[1]۔

ائمہ ثلاثہ کا استدلال آیت قرآنی "لِلَّذِينَ[2] يُؤْلُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَاءُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ" سے ہے کہ اس میں چار مہینے گذرنے کے بعد عزم طلاق کا ذکر کیا گیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ محض مضیِ مدت سے طلاق واقع نہیں ہوتی بلکہ عزم طلاق ضروری ہے۔

حنفیہ کی دلیل حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کے آثار ہیں جو اس بات پر متفق ہیں کہ چار ماہ گذرنے سے خود بخود طلاقِ بائن واقع ہوجائے گی[3]۔

جہاں تک آیتِ قرآنی سے استدلال کا تعلق ہے اس کی تفسیر حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ منقول ہے "انقضاء[4] الاربعة عزيمة الطلاق والفيئ الجماع" واللہ أعلم۔

---

[1] مذاہب کی مذکورہ تفصیل کے لئے دیکھئے المغنی (ج۷، ص۳۱۸ و ۳۱۹) إن مضت أربعة أشهر ورافعته ۱۲م

[2] سورۃ البقرہ آیت ۲۲۶ و ۲۲۷ پ۲ ۱۲م

[3] چنانچہ حضرت عثمانؓ اور زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں "إذا مضت أربعة أشهر فهي واحدة وهي أحق بنفسها تعتد عدة المطلقة"

یہی مضمون حضرت علیؓ حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے، حضرات تابعین رحمہم اللہ کے آثار ان کے علاوہ ہیں۔ دیکھئے مصنف عبدالرزاق (ج۶ ص۴۵۳ تا ۴۵۷) کتاب الطلاق باب انقضاء الأربعة۔ رقم ۱۱۶۳۸ - ۱۱۶۴۴ - اور ۱۱۶۴۵۔

نیز موطا امام محمد (ص۲۶۳) باب الایلاء میں حضرت عمر بن الخطابؓ کا اثر ہے "إذا آلى الرجل من امرأته فمضت أربعة أشهر قبل أن يفيء فقد بانت بتطليقة بائنة الخ" ۱۲ مرتب عفی عنہ

[4] مصنف عبدالرزاق (ج۶ ص۴۵۴، رقم ۱۱۶۴۰) ۱۲ مرتب

باب ماجاء فی اللعان[1]

عن ابن عمرؓ قال لاعن رجل امرأته وفرق النبی صلی اللہ علیہ وسلم بینہما وألحق الولد بالأم[2]: لعان کا معاملہ ایلاء کے برعکس ہے کہ ایلاء میں عندالاحناف نفس مدت کے گذرنے سے طلاق ہوجاتی ہے اور تفریقِ قاضی کی حاجت نہیں ہوتی جبکہ لعان میں احناف کے نزدیک نفسِ لعان سے فرقت واقع نہیں ہوتی بلکہ قاضی کا تفریق کرنا ضروری ہے،

جبکہ ائمۂ ثلاثہ ایلاء میں تو تفریقِ قاضی کے قائل تھے لیکن لعان میں فرقت کے لئے قضاء قاضی کی ضرورت نہیں سمجھتے اور فرقت کے لئے محض لعان کو کافی قرار دیتے ہیں، بلکہ امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ محض مرد کے لعان سے فرقت واقع ہوجاتی ہے اگرچہ ابھی تک عورت نے لعان نہ کیا ہو "لأنہا فرقۃ حاصلۃ بالقول فتحصل بقول الزوج وحدہ کالطلاق[3]"

---

[1] لعان لغت میں دھتکارنے اور دور کرنے کے معنی میں آتا ہے اور احناف کے نزدیک اصطلاحِ شرع میں "شہادات مؤکدات بالأیمان مقرونۃ باللعن قائمۃ مقام حدّ القذف فی حقہ ومقام حد الزنا فی حقہا" کو کہا جاتا ہے۔

جبکہ شوافع کے نزدیک لعان نام ہے "أیمان مؤکدات بالشہادات الخ" کا۔

چونکہ احناف کے نزدیک لعان کی حقیقت "شہادات مؤکدات بالأیمان" ہے اس لئے ان کے نزدیک لعان کے لئے زوجین کا اہل شہادت ہونا ضروری ہے اور شوافع کے نزدیک چونکہ اس کی حقیقت "أیمان مؤکدات بالشہادات" اس لئے ان کے نزدیک لعان کے لئے اہلیتِ یمین کافی ہے واللہ اعلم۔ دیکھئے ہدایہ مع حاشیہ (ج ۲ ص۴۱۱ و ۴۱۷) باب اللعان ۱۲ مرتب عافاہ اللہ

[2] الحدیث أخرجہ البخاری (ج ۲ ص۸۰۱) باب یلحق الولد بالملاعنۃ، کتاب الطلاق ومسلم (ج ۱ ص۴۹۰) کتاب اللعان ۱۲

[3] مذکورہ تفصیل المغنی (ج ۸، ص۶۵ و ص۶۸، کتاب اللعان) سے ماخوذ ہے،

علامہ ابن قدامہؒ امام شافعیؒ کے قول کے بارے میں فرماتے ہیں "ولا نعلم أحدًا وافق الشافعی علی ہذا القول" نیز فرماتے ہیں "وحکی عن البتّی أنہ لایتعلق باللعان فرقۃ" لما روی أن العجلانی لما لاعن امرأتہ طلقہا ثلاثًا فأنفذہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولو وقعت الفرقۃ لما نفذ طلاقہ" پھر امام شافعیؒ اور بتّیؒ کا رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں "وکلا القولین لایصح لأن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فرق بین المتلاعنین ...... وقال سہلؓ فکانت سنۃ لمن کان بعدہما أن یفرق بین المتلاعنین وقال عمرؓ المتلاعنان یفرق بینہما ثم لایجتمعان أبدًا۔ ۱۲ رشید اشرف عفا اللہ عنہ

زیر بحث باب کی دونوں روایتیں حنفیہ کی دلیل ہیں جن میں " ثم فرّق بینهما "
اور " وفرّق النبی صلی اللہ علیہ وسلم بینهما " کے الفاظ آئے ہیں -

لعان[1] سے ثابت شدہ حرمت کی حیثیت

لعان سے متعلق ایک دوسری بحث بھی ہے کہ لعان کے نتیجہ میں ثابت شدہ حرمت کی کیا حیثیت ہے ؟

حضرات طرفینؒ فرماتے ہیں کہ فرقت لعان طلاقِ بائن کے درجہ میں ہے۔ البتہ جب تک لعان برقرار ہو اس وقت تک دوبارہ نکاح بھی درست نہیں لیکن اگر زوج نے زنا کا الزام لگانے میں اپنے آپ کو جھٹلا دیا اور اس پر حدِ قذف جاری ہوگئی[2] یا عورت نے شوہر کے الزام کو درست قرار دیکر اپنی تکذیب کر دی تو اب ان کے لئے دوبارہ نکاح کرنا جائز ہوگیا۔

جبکہ امام ابو یوسفؒ امام زفرؒ اور حسن بن زیادؒ فرماتے ہیں کہ لعان بغیر طلاق کے فرقت ہے اور اس فرقت سے ثابت ہونے والی حرمت دائمی اور ابدی ہے جیسے حرمتِ رضاع اور حرمتِ مصاہرت -

اِن حضرات کا استدلال سنن[3] دارقطنی میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی مرفوع روایت سے ہے " المتلاعنان إذا تفرّقا لا یجتمعان أبدًا "

جبکہ حضراتِ طرفینؒ فرماتے ہیں کہ عویمر عجلانی کے واقعۂ لعان میں آیا ہے
" فلمّا فرغا من تلاعنهما قال عویمر کذبتُ علیها یارسول اللہ ! إن أمسکتها فطلّقها ثلاثًا قبل أن یأمره رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، قال ابن شهاب فکانت سنّة المتلاعنین[4]۔

---

[1] یہ بحث " مرتّب " کا اضافہ ہے ۱۲ م

[2] یہ صورت بدائع الصنائع سے ماخوذ ہے جبکہ فتح القدیر (ج ۴ ص ۲۸۱ ، باب اللعان) میں اس کی مختلف صورتیں آئی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ اگر زوج نے لعان اور تفریق کے بعد اپنے آپ کو جھٹلایا تو اس کے لئے دوبارہ اس عورت سے نکاح جائز ہے حد قذف لگی ہو یا نہ لگی ہو ، اور اگر زوج نے اپنی تکذیب لعان کے بعد قبل التفریق کی تو عورت اس کے لئے بغیر تجدید نکاح کے حلال ہے ۔ انظر فتح القدیر لمزید التفصیل ۱۲ مرتب

[3] (ج ۳ ص ۲۷۶ ، رقم ۱۱۶) باب المهر ۔ نیز سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۳۰۶) باب فی اللعان میں حضرت سہل بن سعدؓ فرماتے ہیں " فمضت السنة بعد فی المتلاعنین أن یفرق بینهما ثم لا یجتمعان أبدًا " ۱۲ مرتب

[4] صحیح بخاری (ج ۲ ص ۸۰۰) باب اللعان ۱۲ م

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طلاق دینے پر سکوت فرمانا، طلاق کو نافذ قرار دینا ہے، لہٰذا ملاعن کے حق میں اصل تو یہ ہے کہ وہ خود طلاق دیدے، اگر وہ طلاق دینے سے باز رہے تو قاضی اس کا نائب بن کر تفریق کرادے گا، جو طلاق کے حکم میں ہوگی کما فی العنٰیۃ۔

اس کے علاوہ اس فرقت کا سبب چونکہ فعلِ زوج ہے اس لئے یہ طلاق کے حکم میں ہوگی، "لأن سبب هٰذه الفرقة قذف الزوج لأنه يوجب اللعان واللعان يوجب التفريق والتفريق يوجب الفرقة فكانت الفرقة بهٰذه الوسائط مضافة إلى القذف السابق، وكل فرقة تكون من الزوج او يكون فعل الزوج سببها تكون طلاقاً كما في العنٰية والخلع والإيلاء"

جہاں تک امام ابو یوسفؒ کی مستدل روایت کا تعلق ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے معنی حقیقی تو یقیناً مراد نہیں اس لئے کہ "متلاعنین" حقیقت میں زوجین کو اس وقت تک کہا جائے گا جب تک لعان کی کارروائی ہو رہی ہو، جب وہ دونوں لعان سے فارغ ہوگئے تو حقیقی معنی کے اعتبار سے متلاعنین نہ رہے، ظاہر ہے کہ یہ مطلب مراد نہیں لیا جاسکتا اس لئے کہ لعان سے قبل فرقت ثابت نہیں ہوتی اور لعان سے فارغ ہونے کے بعد وہ متلاعنین نہیں رہتے، اس لئے "المتلاعنان إذا تفرقا لا يجتمعان أبدًا" کا مطلب یہ ہوگا کہ جب تک وہ صفتِ لعان کے ساتھ متصف ہوں ان میں اجتماع نہیں ہوسکتا لیکن جب زوج نے اپنی تکذیب کردی تو قذفِ زوج جو سبب لعان تھا باقی نہ رہا لہٰذا وہ حکماً بھی متلاعنین نہ رہے، اور جب لعان نہ رہا تو حرمتِ اجتماع بھی ختم ہوگئی اس لئے کہ وہ متلاعنین کے ساتھ خاص تھی[1]، واللہ أعلم بالصواب وإلیہ المرجع والمآب۔

هٰذا آخر ما أردنا إيراده من شرح أبواب الطلاق واللعان، وبه ينتهي الجزء الثالث من كتاب « درس ترمذی » فلله الحمد أولاً وآخراً۔

وذلك يوم الجمعة المبارك التاسع والعشرين من ذي الحجة سنة إحدى عشرة وأربعمائة بعد الألف من الهجرة النبوية على صاحبها ألف ألف صلوٰة وتحية - ۲۹/۱۲/۱۴۱۱ھ - بعد ما طرأت عوارض وفترات طويلة أثناء الترتيب والتحقيق، والله أسأل أن يوفقني لإكمال شرح بقية أبواب الكتاب بالعافية والسهولة۔

والحمد لله الذي بنعمته تتم الصالحات وعلى رسوله أفضل الصلوات والتسليمات وعلى أصحابه الطيبين وأزواجه الطاهرات

ويليه إن شاء الله تعالى - الجزء الرابع أوّله أبواب البيوع۔

رشید اشرف السیفی عفا اللہ عنہ

خویدم الطلبۃ بدار العلوم کراتشی ۱۴ باکستان

---

[1] یہ آخری بحث تغیر و اضافہ کے ساتھ بدائع الصنائع (ج ۳ ص۲۴۵ و ۲۴۶) کتاب اللعان فصل وأما حکم اللعان الخ سے ماخوذ ہے اور مرتب کی تحریر کردہ ہے ۱۲ رشید اشرف عافاہ اللہ۔ وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

للشيخ المفتي محمد رفيع العثماني
رئيس جامعة دار العلوم كراتشي

تصانیف
حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب
احکام زکوۃ
اللہ کا ذکر
بڑا بننے کا شوق
جنت کا آسان راستہ
جہاد کشمیر اور ہماری ذمہ داریاں
حیات مفتی اعظم
دینی جماعتیں اور موجودہ سیاست
درس مسلم شریف
علم الصیغہ
علامات قیامت اور نزول مسیح
اجماع کا مقام
کتابت حدیث
میرے مرشد حضرت عارفی
رحمۃ اللہ علیہ
یورپ کے تین معاشی نظام
یہ تیرے پراسرار بندے